مواعظ سلسلہ

فاتبعوا ملۃ ابراھیم حنیفا

ابوالانبیاء، خلیل اللہ، موحدِ اعظم

سیدنا حضرۃ ابراہیم علیہ السلام

کے حالات و واقعات کا حسین مجموعہ

قرآن و حدیث اور معتبر کتبِ تاریخ کی روشنی میں

- خاندانی حالات
- صفات ابراہیمی
- اولیات ابراہیمی
- معجزات ابراہیمی
- فضائل و مسائل قربانی
- ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت
- بت پرستی و کواکب پرستی کی تردید
- ذبح اسمٰعیل علیہ السلام اور جذبۂ ابراہیمی
- تاریخ و بنائے بیت اللہ
- فضائل و مسائل عشرہ ذی الحجہ

زیف

مولانا کریم بخش صاحب

سلسلہ مواعظ

فاکہۃ السلف ابن القیم میرٹھی

أبو الأنبیاء، خلیل اللہ، موحدِ اعظم

سیدنا حضرۃ ابراہیم علیہ السلام

کے حالات و واقعات کا حسین مجموعہ

قرآن و حدیث اور معتبر کتب تاریخ کی روشنی میں

- خاندانی حالات
- صفاتِ ابراہیمی
- اولیاتِ ابراہیمی
- معجزاتِ ابراہیمی
- فضائل و مسائل قربانی
- ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت
- بت پرستی و کواکب پرستی کی تردید
- ذبح اسمٰعیل علیہ السلام اور جذبۂ ابراہیمی
- تاریخ و بنائے بیت اللہ
- فضائل و مسائل عشرہ ذی الحجہ

مکتبہ عمر بن الخطاب

جملہ حقوق طباعت بحق مکتبہ عمر بن الخطاب ملتان محفوظ ہیں

عرض ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبہ عمر بن الخطاب ملتان نے سیدنا حضرۃ ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات کا حسین مجموعہ کی تصحیح و طباعت میں ہر ممکن احتیاط سے کام لیا ہے لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔
اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

مکتبہ عمر بن الخطاب ملتان
E-Mail: maktabaumerbinalkhattab@gmail.com

نام کتاب: سیدنا حضرۃ ابراہیم علیہ السلام کے حالات و واقعات کا حسین مجموعہ

ازافادات: مولانا کریم بخش صاحب عفا اللہ عنہ

مرتب: مولانا محمد ابوبکر لودھروی حفظہ اللہ (شیخ الحدیث والتفسیر، جامعہ عمر بن الخطاب، ملتان 0300-3662063)

کمپیوٹر کمپوزنگ: عبدالرحمن رضا (0321-6343499)

ناشر: مکتبہ عمر بن الخطاب ملتان

فون: 061-6775251
0301-7574977, 0300-7345151

ای میل: Muaaz5151@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ ..... مکتبہ حقانیہ، ملتان
☆ ..... مکتبہ امدادیہ، ملتان
☆ ..... مکتبہ مجیدیہ، ملتان
☆ ..... مکتبہ اشاعت الخیر، ملتان
☆ ..... تالیفات اشرفیہ، ملتان
☆ ..... مکتبہ ادارہ اسلامیات، لاہور
☆ ..... مکتبہ حبیبیہ رشیدیہ، لاہور
☆ ..... مکتبہ قاسمیہ، لاہور
☆ ..... مکتبہ عثمانیہ، ساہیوال

☆ ..... مکتبہ الحسن، لاہور
☆ ..... مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
☆ ..... قدیمی کتب خانہ، کراچی
☆ ..... مکتبہ لدھیانوی، کراچی
☆ ..... مکتبہ عمر فاروق، کراچی
☆ ..... مکتبہ شیخ، کراچی
☆ ..... مکتبہ اسلامیہ، لاہور / فیصل آباد
☆ ..... جامعۃ الحبیب، فیصل آباد
☆ ..... مکتبہ اسلامیہ، خانپور کٹورہ

☆ ..... مکتبہ عمر فاروق، راولپنڈی
☆ ..... مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
☆ ..... مکتبہ الحرمین، سرگودھا
☆ ..... مکتبہ حرمین، سرگودھا
☆ ..... مکتبہ سراجیہ، سرگودہا
☆ ..... مکتبہ علیہ، اکوڑہ خٹک
☆ ..... مکتبہ رشیدیہ، اکوڑہ خٹک
☆ ..... مکتبہ فاروقیہ، وہاڑی
☆ ..... مکتبہ دار الطاعہ، حاصل پور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَزَلْ وَلَا یَزَالُ، حَیًّا قَیُّوْمًا
قَادِرًا سَمِیْعًا بَصِیْرًا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا
وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا وَمَوْلَانَا وَقَائِدِ
غُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ
وَاَزْوَاجِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ وَاَشْیَاعِہٖ
وَمُحِبِّیْہِ اَبَدَ الْاٰبِدِیْنَ

اجمالی فہرست

☆ ..... تخلیقِ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام
☆ ..... ہابیلؓ وقابیل کی قربانی کا واقعہ
☆ ..... سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ابتدائی حالات وواقعات
☆ ..... صفاتِ حمیدہ کے حامل سیدنا ابراہیم علیہ السلام
☆ ..... اوّلیاتِ ابراہیمی
☆ ..... بُت پرستی وکواکب پرستی کی تردید
☆ ..... آتشِ نمرود اور استقلالِ ابراہیم علیہ السلام
☆ ..... اولادِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام
☆ ..... سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت
☆ ..... ہجرت کے فضائل وبرکات
☆ ..... شراب الابرار یعنی ماء زمزم کے فضائل وخصوصیات
☆ ..... حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ
☆ ..... عظمتِ بیت اللہ الکریم اور تاریخ وبناء بیت اللہ
☆ ..... قربانی شرعاً وعقلاً کیوں ضروری ہے؟
☆ ..... عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل ومسائل
☆ ..... قربانی کے فضائل ومسائل

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

فہرست عنوانات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات وواقعات

☆ عنوانات ---------- صفحہ نمبر

☆ تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مولانا یٰسین صابر صاحب دامت برکاتہم العالیہ ---------- ۳۷

☆ تقریظ: حضرت علامہ شبیر الحق کشمیری صاحب دامت برکاتہم العالیہ ---------- ۳۸

☆ تقریظ: حضرت اقدس مفتی محمد عبداللہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ ---------- ۳۹

☆ عرضِ مؤلف: ---------- ۴۱

☆ تخلیقِ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ☆

☆ بعد از خطبہ مسنونہ ---------- ۴۴

☆ اولادِ آدم کی خونریزی کے خدشے کا اظہار اور اس کا جواب ---------- ۴۵

☆ زمین کی مختلف اجناس سے مٹی لانے کا حکم ---------- ۴۷

☆ سیدنا آدم علیہ السلام کا جسم مبارک ---------- ۴۹

☆ سیدنا آدم علیہ السلام کا چھینک آنے پر دعا پڑھنا ---------- ۵۰

☆ انسان بڑا جلد باز ہے ---------- ۵۰

☆ سیدنا آدم علیہ السلام اور آپ کی ذریت کا تحیۃ (سلام) ---------- ۵۱

☆ سیدنا آدم علیہ السلام کے نام کی وجہ تسمیہ ---------- ۵۱

☆ سیدنا آدم علیہ السلام کی کنیت ---------- ۵۲

☆ آدم علیہ السلام کی جلالت ومنقبت کا اظہار اور فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم ---------- ۵۲

☆ اگر کوئی زندہ یا مردہ آدمی کو سجدہ کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں ---------- ۵۳

☆ ابلیس ملعون کی سرکشی ---------- ۵۳

☆ مٹی اور اس کے کمالات ---------- ۵۴

☆ فرشتوں کا امتحان ---------- ۵۴

☆ سیدنا آدم علیہ السلام کی علمی برتری ---------- ٥٦
☆ حضرت حوّا رضی اللہ عنہا کی پیدائش ---------- ٥٦
☆ پہلا قول ---------- ٥٦
☆ دوسرا قول ---------- ٥٧
☆ فوائدِ عظیمہ ---------- ٥٨
☆ جنت میں رہو، لیکن خاص درخت کے قریب مت جانا ---------- ٥٨
☆ درخت کونسا تھا؟ ---------- ٥٩
☆ شیطان کا وسوسہ ڈالنا اور قسمیں کھانا ---------- ٥٩
☆ سیدنا آدم علیہ السلام کا گڑگڑا کر معافی مانگنا ---------- ٥٩
☆ ہبوط ونزول ---------- ٦٠
☆ پہلا کھانا جو زمین پر کھایا ---------- ٦١
☆ پہلا لباس ---------- ٦٢
☆ میدانِ عرفات میں اولادِ آدم کا اجتماع ---------- ٦٢
☆ فرمانبردار اور نافرمان ---------- ٦٣
☆ حضرت داؤد علیہ السلام کے چہرے کا زیادہ چمکنا ---------- ٦٣
☆ سیدنا آدم علیہ السلام کے ١٢٠ بیٹے اور ١٢٠ بیٹیاں ---------- ٦٤
☆ سیدنا آدم علیہ السلام کا انتقال ---------- ٦٥
☆ غسل، کفن، دفن اور جنازے کا طریقہ ---------- ٦٦
☆ کائنات میں سب سے پہلا جنازہ ---------- ٦٦
☆ فوائدِ جلیلہ ---------- ٦٧
☆ آخری گزارش ---------- ٦٧

☆ ہابیلؓ وقابیل کی قربانی کا واقعہ ☆

☆ بعداز خطبہ مسنونہ ---------- ۶۹
☆ قابیل اور ہابیلؓ کا قصہ ---------- ۷۰
☆ قابیل وہابیل کا قربانی پیش کرنا ---------- ۷۱
☆ ہابیلؓ کی قربانی کا قبول ہونا اور قابیل کی قربانی کا مردود ہونا ---------- ۷۱
☆ قتل کا ارادہ ---------- ۷۲
☆ ہابیلؓ پر خشیتِ الٰہی ---------- ۷۲
☆ شیطان کا قتل کی تعلیم دینا ---------- ۷۳
☆ عالَم میں ہابیلؓ کے قتل پر منحوس اثرات کا ظاہر ہونا ---------- ۷۳
☆ ظلم اور قطع رحمی کی سزا دنیا میں ---------- ۷۴
☆ ہابیل رضی اللہ عنہ کی لاش کی تدفین ---------- ۷۴
☆ قابیل کو نقد سزا کیا ملی؟ ---------- ۷۴
☆ قیامت تک ہر قتل میں قابیل کا حصہ ---------- ۷۶
☆ گویّوں کا امام امرأالقیس ---------- ۷۷
☆ سبق آموز واقعات ---------- ۷۷
☆ اپنے عمل پر مغرور نہیں ہونا چاہیے ---------- ۷۸
☆ قربانی میں جذبات کیسے ہوں؟ ---------- ۷۸
☆ قربانی کی حقیقی روح ---------- ۷۹

☆ درسِ حدیث بعداز جمعۃ المبارک ☆

☆ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ---------- ۸۰
☆ صحابہ رضی اللہ عنہم میں غیرتِ ایمانی ---------- ۸۱

☆ موجودہ دور میں حیا سوز مناظر ---------- ۸۲
☆ آخری گزارش ---------- ۸۳
☆ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی حالات ☆
☆ موحدِ اعظم سیدنا ابراہیم علیہ السلام ---------- ۸۵
☆ پدری سلسلہ نسب ---------- ۸۶
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام اور لقب ---------- ۸۶
☆ آزر کے بارے میں تحقیقِ انیق ---------- ۸۷
☆ صاحب عمدۃ البیان نے محققین مفسرین کے یہ اقوال بیان کئے ہیں ---------- ۸۷
☆ صاحبِ صفوۃ التفاسیر کی تحقیق ---------- ۸۷
☆ آزر ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا ---------- ۸۹
☆ والدہ کا نام اور جائے پیدائش ---------- ۹۰
☆ دنیا کے چار بڑے بادشاہ ---------- ۹۱
☆ سیدنا ذوالقرنین اور سلیمان علیہما السلام ---------- ۹۱
☆ نمرود اور بختِ نصر ---------- ۹۲
☆ موحدِ اعظم کے بارے پیشین گوئی ---------- ۹۲
☆ نمرود کا خواب دیکھنا ---------- ۹۳
☆ حضرت ہندہ کا سبق آموز واقعہ ---------- ۹۴
☆ قیافہ شناسوں کی مہارت ---------- ۹۵
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کی پیشین گوئی اور نمرودی تدبیروں کا فیل ہونا ---------- ۹۶
☆ قدرتِ الٰہی کا ظہور ---------- ۹۷
☆ قدرتِ الٰہی کا عجیب نظارہ ---------- ۹۷

☆ ربوبیتِ الٰہی کا اظہار ۹۸
☆ انبیاء کرام علیہم السلام کا دل ودماغ روشن ہوتا ہے ۹۹

☆ درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک ☆

☆ حدیث نبوی ﷺ ۱۰۰
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر کا عبرت ناک انجام ۱۰۰
☆ اللہ کے ہاں ایمان واعمال کا سکہ چلتا ہے ۱۰۱
☆ اللہ والوں کی شان وشوکت کے واقعات ۱۰۱
☆ اللہ کے دشمن ابوجہل کی ذلت وخواری ۱۰۳
☆ کامیابی وکامرانی کا راستہ ۱۰۳
☆ دِلّی کی طوائفہ عورتوں کی توبہ کا واقعہ ۱۰۳
☆ ایک عورت کی توبہ کا سبق آموز واقعہ ۱۰۴
☆ ایک گنہگار کی توبہ کا سبق آموز واقعہ ۱۰۴
☆ کراچی کی ایک عورت کی توبہ کا واقعہ ۱۰۵
☆ آخری گزارش ۱۰۵

☆ صفاتِ حمیدہ کے حامل سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ☆

☆ حمد وصلوۃ کے بعد ۱۰۸
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مبارک زندگی درس ہائے عبرت وبصیرت ۱۰۸
☆ امتحاناتِ ابراہیمی کی وجوہات ۱۰۹
☆ توحید کے اقسام اور مراتب ۱۱۰
☆ اعلیٰ شخصیت کے پیکر ۱۱۲
☆ تیس (۳۰) صفاتِ ایمانی ۱۱۳

☆ دس صفات کا ذکر سورۃ التوبہ میں ---------- ۱۱۴
☆ دس صفات کا ذکر سورۂ احزاب میں ---------- ۱۱۵
☆ سات صفات کا ذکر سورۃ المؤمنون میں ---------- ۱۱۵
☆ تین صفات کا ذکر سورۃ المعارج میں ---------- ۱۱۶
☆ تیس (۳۰) صفات کا مختصر تذکرہ اور خلاصہ ---------- ۱۱۷
☆ اجتماعی یا انفرادی مال میں خیانت، چوری اور ڈاکہ زنی کرنیوالوں کے بارے میں وعید ------ ۱۱۹
☆ توجہ طلب بات ---------- ۱۲۴
☆ تیس صفات کا خلاصہ ایک آیت میں ---------- ۱۲۴
☆ کلمات سے مراد احکاماتِ شاقہ ---------- ۱۲۵
☆ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زندگی کے نمایاں پہلو ---------- ۱۲۶
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تمام اقوامِ عالَم کے لئے مسلّم مقتدا و پیشوا ---------- ۱۲۹
☆ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم اور اس کی حکمتیں ---------- ۱۳۱
☆ فوائدِ عظیمہ ---------- ۱۳۱
☆ ایک اشکال اور اس کے تین جواب ---------- ۱۳۵
☆ جوابِ اوّل ---------- ۱۳۶
☆ جوابِ دوم ---------- ۱۳۷
☆ جوابِ سوم ---------- ۱۳۹
☆ فائدہ جلیلہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تا قیامت میرا ذکرِ خیر رہے ---------- ۱۴۰
☆ فائدہ نمبر ۲: حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کے ساتھ جائز ہے ---------- ۱۴۰
☆ فائدہ نمبر ۳ ---------- ۱۴۲
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکرِ خیر قرآن کی ۶۳ آیات میں ---------- ۱۴۳

☆ درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک ☆

☆ حدیث پاک ---------- ۱۴۵
☆ ترجمہ وتشریح ---------- ۱۴۶
☆ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا عرب کے پہلوان عمرو بن عبدودّ کو پچھاڑنا ---------- ۱۴۶
☆ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں نہ کہ دشمن ---------- ۱۴۷
☆ غیر تو غیر ہم نے اپنوں کو بھی کھودیا ---------- ۱۴۸
☆ اسلام تو عملی نمونہ تھا، پر ہم نے کیا کیا؟ ---------- ۱۴۸
☆ ذوالحجہ کے دن بڑے قیمتی دن ہیں ---------- ۱۴۹
☆ عشرہ ذوالحجہ میں سب سے بڑا کام اللہ کے نام پر لہو بہانا ہے ---------- ۱۴۹
☆ لہو کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے بخشش کا اعلان ---------- ۱۴۹
☆ حُجاج کرام اپنی قربانی اپنے سامنے کرائیں ---------- ۱۵۰
☆ لوٹ مار اور وہ بھی بیت اللہ میں جا کر ---------- ۱۵۰
☆ آخری گزارش ---------- ۱۵۱

☆ اَوّلیاتِ اِبْرَاھِیْمِی ☆

☆ خطبہ مسنونہ کے بعد ---------- ۱۵۳
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جاری کردہ مبارک سُنن وطرق ---------- ۱۵۴
☆ ۱۔ ختنہ کرنے کی ابتدا ---------- ۱۵۴
☆ شاہی داغ ---------- ۱۵۵
☆ بچے کی پیدائش کے موقع پر چند کاموں کا اہتمام ---------- ۱۵۵
☆ ختنے کے موقع پر ضیافت کی شرعی حیثیت؟ ---------- ۱۵۶
☆ ۲۔ داڑھی کا سُفید ہونا ---------- ۱۵۶

☆ سفید بالوں کی عظمت و وقار ---------- ۱۵۷
☆ ۳۔ سب سے پہلے مہندی استعمال کرنے والے ---------- ۱۵۷
☆ مجاہد کیلئے سیاہ خضاب کی اجازت ---------- ۱۵۹
☆ ایک اہم نکتہ ---------- ۱۶۰
☆ ۴۔ سب سے پہلے عصا استعمال کرنے والے ---------- ۱۶۰
☆ ۵۔ سب سے پہلے منبر کا استعمال ---------- ۱۶۱
☆ رسول اللہ ﷺ کا مبارک منبر ---------- ۱۶۱
☆ رسول اللہ ﷺ کی جدائی پر کھجور کے تنے کا آنسو بہانا ---------- ۱۶۲
☆ ۶۔ سب سے پہلے ضیافت کرنے والے اور ثرید کی روٹی مہمانوں کو کھلانے والے ---------- ۱۶۵
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کنیت ابوالضیوف ---------- ۱۶۵
☆ عربوں میں مہمان نوازی کی صفت ---------- ۱۶۵
☆ ۷۔ شیرمال کی روٹی کا سب سے پہلے استعمال کرنے والے ---------- ۱۶۶
☆ ۸۔ سب سے پہلے جہاد کرنے والے ---------- ۱۶۶
☆ ۹۔ سب سے پہلے تیر کمان بنانے والے ---------- ۱۶۷
☆ ۱۰۔ معانقے کی سنت کو جاری کرنے والے ---------- ۱۶۷
☆ ایک عجیب وغریب سبق آموز واقعہ ---------- ۱۶۷
☆ سجدۂ عبادت اور سجدۂ تحیۃ ---------- ۱۶۹
☆ قحط سالی میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اعزاز واکرام ---------- ۱۷۰
☆ ۱۱۔ شیروں کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں چومنا ---------- ۱۷۰
☆ ۱۲۔ سب سے پہلے جمعہ کے دن کا غسل کرنے والے ---------- ۱۷۰
☆ ۱۳۔ امام الموحدین ---------- ۱۷۲

☆ ۱۴۔سب سے پہلے حنیف کا لقب پانے والے ---------- ۱۷۲
☆ ۱۵۔اَوَّلُ مَنْ لَبِسَ النَّعْلَیْنِ ---------- ۱۷۲
☆ ۱۶۔اَوَّلُ مَنْ قَسَمَ الْفَیْءَ ---------- ۱۷۲
☆ ۱۷۔اَوَّلُ مَنِ اتَّخَذَ سَرَاوِیْلَ ---------- ۱۷۳
☆ ۱۸۔اَوَّلُ مَنْ قَالَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا ---------- ۱۷۳
☆ ۱۹۔هُوَاَوَّلُ مَنْ ضَحّٰی ---------- ۱۷۳
☆ ۲۰۔هُوَاَوَّلُ مَنْ بَوَّاهُ مَکَانَ الْبَیْتِ ---------- ۱۷۳
☆ ۲۱۔هُوَاَوَّلُ نَبِیٍّ اَحْیَی اللّٰهُ لَهُ الْمَوْتٰی ---------- ۱۷۳
☆ ۲۲۔سب سے پہلے اِن کے لئے پردے ہٹادیے گئے ---------- ۱۷۳
☆ ۲۳۔اوّل سُفید جوڑا پہنایا جائے گا ---------- ۱۷۴
☆ ۲۴۔اولادِ مسلمین کے پہلے کفیل ---------- ۱۷۴
☆ ۲۵۔اَوَّلُ مَنْ قَلَّمَ اَظْفَارَهٗ ---------- ۱۷۴
☆ ۲۶۔اَوَّلُ مَنِ اسْتَحَدَّ وَاَوَّلُ مَنْ نَتَفَ الْاِبِطَ ---------- ۱۷۴
☆ ۲۷۔مونچھوں کو مبالغے کے ساتھ کترنا ---------- ۱۷۴
☆ ۲۸۔اَوَّلُ مَنِ اسْتَاکَ ---------- ۱۷۵
☆ ۲۹۔اَوَّلُ مَنْ فَرَقَ شَعْرَهٗ ---------- ۱۷۵
☆ ۳۰۔اَوَّلُ مَنْ تَمَضْمَضَ وَاَوَّلُ مَنِ اسْتَنْشَقَ ---------- ۱۷۶
☆ ۳۱۔اَوَّلُ مَنِ اسْتَنْجٰی بِالْمَاءِ ---------- ۱۷۶
☆ ۳۲۔اَوَّلُ مَنْ هَاجَرَ لِلّٰهِ ---------- ۱۷۶
☆ ۳۳۔وَجَعَلَ مَقَامَهٗ قِبْلَةً ---------- ۱۷۶
☆ ۳۴۔اِمَامًا لِّلنَّاسِ ---------- ۱۷۶

☆ ۳۵۔ اللہ نے اوّلاً ان کا نام حلیم، مُنیب، اور اوّاہ رکھا ---------- ۱۷۷
☆ ۳۶۔ اِنَّهٗ دَعَا اللّٰهَ تَعَالٰی اَنْ یَّجْعَلَ النُّبُوَّةَ فِیْ نَسْلِهٖ فَاسْتَجَابَ لَهٗ ---- ۱۷۷
☆ ۳۷۔ انہوں نے دعا مانگی '' وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ '' ------ ۱۷۷
☆ ۳۸۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُمّت قانت سے پکارا ہے ---------- ۱۷۷
☆ ۳۹۔ بلوغ سے قبل رُشد عطا کئے گئے ---------- ۱۷۸
☆ ۴۰۔ حضور ﷺ اور آپ کی امت کو قربانی کی لائن میں اُن کے اتباع کا حکم دیا گیا ---- ۱۷۸
☆ قربانیوں کا صلہ اور جزاء ---------- ۱۷۸

☆ بُت پرستی وکواکب پرستی کی تردید

☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شاہکار شخصیت ---------- ۱۸۱
☆ ''صابی'' کی تعریف وتحقیق ---------- ۱۸۱
☆ سیاروں، ستاروں میں تاثیر کا ہونا ---------- ۱۸۲
☆ ستاروں کو مؤثر حقیقی ماننے کا عقیدہ ---------- ۱۸۲
☆ ستاروں میں خواص محض سبب کا درجہ رکھتے ہیں ---------- ۱۸۲
☆ علمِ نجوم کی تحصیل میں کہاں تک لگ سکتے ہیں ---------- ۱۸۳
☆ علمِ نجوم کے ممنوع ومذموم ہونے کی پہلی حکمت ---------- ۱۸۴
☆ دوسری حکمت ---------- ۱۸۴
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کو دعوتِ حق دینا ---------- ۱۸۴
☆ صنم کی تحقیق وتفسیر ---------- ۱۸۵
☆ ہندوؤں کا پتھروں کو تراشنا اور بُت بنانا ---------- ۱۸۶
☆ وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ---------- ۱۸۶
☆ عجائبات قدرت کا مشاہدہ ---------- ۱۸۷

☆ کائنات کو دیکھنے کا صحیح اور درست طریقہ ---------- ۱۸۸
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کو دعوتِ حق دینا ---------- ۱۹۰
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناظرے اور مکالمے ---------- ۱۹۰
☆ کواکب پرستی کی تردید ---------- ۱۹۱
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کونسا ستارہ دیکھا ---------- ۱۹۱
☆ دعوت وتبلیغ میں حکمت وتدبر سے کام لینا سنّتِ انبیاء علیہم السلام ہے ---------- ۱۹۱
☆ عِلوی معبودوں کی تردید ---------- ۱۹۳
☆ ڈوبنے والے الٰہ نہیں ہوسکتے ---------- ۱۹۴
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہیں ربّ نہیں مانا ---------- ۱۹۴
☆ قابل غور اور اہم بات ---------- ۱۹۵
☆ دُعاۃ الی اللہ اور مبلغین کے لئے راہ نما اصول ---------- ۱۹۵
☆ قوم کے زعمِ باطل کی تردید ---------- ۱۹۶
☆ قوت وتاثیر کا فنا ہونا ربوبیّت کے منافی ہے ---------- ۱۹۶
☆ ستاروں میں تغیر ان کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے ---------- ۱۹۷
☆ دلیلِ ثانی ---------- ۱۹۷
☆ برأت اور بیزاری کا اعلان ---------- ۱۹۹
☆ ''فَطَرَ'' کی تحقیق ---------- ۲۰۲
☆ ''حَنِیْفًا'' کی تفسیر ---------- ۲۰۲
☆ ایک سبق آموز واقعہ ---------- ۲۰۳
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مکالمہ ---------- ۲۰۳
☆ ریت کے تھیلوں کا غلے میں تبدیل ہونا ---------- ۲۰۵

☆ ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ ---------- ۲۰۵
☆ چند اہم اور ضروری گزارشات ---------- ۲۰۶

☆ آتشِ نمرود اور استقلالِ ابراہیم علیہ السلام ☆

☆ رشد وہدایت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خاص مرتبہ ---------- ۲۱۰
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنی مشرک قوم سے خطاب ---------- ۲۱۰
☆ قوم کا جواب ---------- ۲۱۱
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دونوں محاذوں پر محنت کی ---------- ۲۱۲
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بت کدے میں جا کر بتوں کو توڑنا ---------- ۲۱۳
☆ ایہام اور توریہ ---------- ۲۱۳
☆ اللہ کا شکر کرو کہ اس نے مسلمانوں کے گھر پیدا کیا ---------- ۲۱۴
☆ دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر نمرود اور اس کی قوم کا حسد اور غیض وغضب ---------- ۲۱۵
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کا فیصلہ ---------- ۲۱۵
☆ بابل شہر کے باشندوں کا خلیل اللہ کو جلانے کیلئے ایندھن اکٹھا کرنا ---------- ۲۱۶
☆ منجنیق کے ذریعے خلیل اللہ کو آگ میں ڈالنے کا منصوبہ ---------- ۲۱۷
☆ سیدنا ابراہیمؑ کو آگ میں گرتا دیکھ کر زمین وآسمان کی مخلوقات میں کہرام ---------- ۲۱۸
☆ آگ میں ڈالتے وقت فرشتوں کی آمد ---------- ۲۱۸
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں ---------- ۲۱۸
☆ مشکلات کے حل کے لئے اکسیرِ اعظم ---------- ۲۱۹
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ربّ پر کامل بھروسہ اور ربّ کا براہِ راست مدد کرنا ---------- ۲۲۰
☆ آگ کو ٹھنڈا ہونے اور سلامتی کا حکم ---------- ۲۲۰
☆ بدنصیب جانور ---------- ۲۲۱

☆ خوش قسمت جانور ---------- ۲۲۱
☆ آگ کا گلزار بننا ---------- ۲۲۲
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کا آگ میں تشریف لانا ---------- ۲۲۳
☆ فرشتے کا نزول اُنس کی خاطر ---------- ۲۲۳
☆ نمرود کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ربّ کی عظمت کا اقرار کرنا ---------- ۲۲۴
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مکالمہ ---------- ۲۲۴
☆ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ---------- ۲۲۶
☆ اتمامِ حجت ---------- ۲۲۶
☆ مچھروں کے ذریعہ نمرودی فوج کی تباہی ---------- ۲۲۷
☆ نمرود کا مخلد فی النار ہونا ---------- ۲۲۷
☆ اختتامی کلمات ---------- ۲۲۸

☆ احیائے موتیٰ ☆

☆ حیات بعد الموت کا مشاہدہ ---------- ۲۳۰
☆ فوائدِ جلیلہ ---------- ۲۳۳
☆ حدیثِ نبوی ﷺ ---------- ۲۳۴
☆ مقصودِ نبوی ﷺ ---------- ۲۳۴
☆ توضیح جملہ اولیٰ: نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ ---------- ۲۳۵
☆ ۱۔ تسکینِ اشتیاقِ قلبی ورفعِ انتشارِ ذہنی ---------- ۲۳۶
☆ ۲۔ حصولِ مقامِ اخص و اکمل للیقین ---------- ۲۳۷
☆ حکمت ومصلحت ---------- ۲۳۷
☆ فرق بین الایمان والاطمینان ---------- ۲۳۷

☆ توضیح جملہ ثانیہ مع ازالۂ ایہام قدح شان قولہ: وَرَحِمَ اللّٰهُ لُوْطًا --الخ ------ ۲۳۸
☆ رُكْنٍ شَدِيْدٍ کا مفہوم ------ ۲۳۸
☆ توضیح جملہ ثالثہ: وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ۔ الخ ------ ۲۳۹
☆ لَاَجَبْتُ الدَّاعِيَ کا مفہوم ------ ۲۴۰
☆ اولادِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام ☆
☆ خاندانِ ابراہیمی ------ ۲۴۲
☆ اُم المسلمین سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا ------ ۲۴۲
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے القاب ------ ۲۴۲
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے نام کی وجہ ------ ۲۴۳
☆ فرشتے نے بیٹے کی بشارت دی اور نام بھی تجویز کیا ------ ۲۴۳
☆ ہجرت ------ ۲۴۳
☆ میاں بیوی میں مکالمہ ------ ۲۴۴
☆ آبِ زم زم کا ظہور ------ ۲۴۴
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا مقام ومرتبہ ------ ۲۴۵
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا شاہِ مصر کی دُختر تھیں ------ ۲۴۶
☆ سیدنا اسماعیل علیہ السلام ------ ۲۴۷
☆ شادی ------ ۲۴۷
☆ عرب مستعربہ ------ ۲۴۷
☆ ابتدائے نبوّت کے زمانے کا عرب ------ ۲۵۰
☆ محبوبِ خدا حضرت محمد ﷺ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام میں مشابہت ------ ۲۵۱
☆ فرزندِ عہد ------ ۲۵۲

☆ ذبیح اللہ علیہ السلام ---------- ۲۵۲
☆ جمہور اُمّت کا مسلک ---------- ۲۵۳
☆ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ---------- ۲۵۴
☆ یہودی عالم کی گواہی ---------- ۲۵۴
☆ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیات ---------- ۲۵۵
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں کمالِ تاثیر ---------- ۲۵۶
☆ بنی اسرائیل ---------- ۲۵۷
☆ بنی اسرائیل کا عروج ---------- ۲۵۷
☆ بنی اسرائیل کی مذہبی حیثیت ---------- ۲۵۷
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک مسلم شخصیت ---------- ۲۵۸
☆ ابراہیمی واسماعیلی شخصیت ---------- ۲۵۸
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا اعلان ---------- ۲۵۹
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ---------- ۲۶۰
☆ حبیب الرحمٰن ﷺ اور خلیل الرحمٰن ابراہیم علیہ السلام میں مشابہت کلی ---------- ۲۶۱
☆ محبت کے دس مراتب ---------- ۲۶۵
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ---------- ۲۶۶
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام ---------- ۲۶۶
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ---------- ۲۶۶
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اصل نام یعقوب ہی تھا ---------- ۲۶۷
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل رکھنے کی وجہ ---------- ۲۶۷
☆ اندازِ خطاب میں بنی اسرائیل کہنے کی حکمت ---------- ۲۶۸

☆ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ---------- ۲۶۸
☆ حضرت اسحاق علیہ السلام کا اپنے بیٹوں کے لئے دعا کرنا ---------- ۲۶۸
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے نبوت کی دعا ---------- ۲۶۹
☆ حضرت عیص کے لئے بادشاہت کی دعا ---------- ۲۶۹
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے ماموں لابان کے پاس جانا ---------- ۲۵۹
☆ حضرت یعقوب علیہ السلام کا نکاح ---------- ۲۷۰
☆ اعلانِ نبوت اور کنعان کی طرف کوچ ---------- ۲۷۰
☆ لابان کی فراخ دلی ---------- ۲۷۰
☆ حضرت عیص کا حضرت یعقوب علیہ السلام سے دعا کی درخواست کرنا ---------- ۲۷۱
☆ راحیل کی وفات اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پرورش ---------- ۲۷۱
☆ نعمتیں دیکھ کر یادِ الٰہی بجالائیں ---------- ۲۷۱

☆ ہجرت کی فضیلت وبرکت ☆

☆ ہجرت ایک عظیم الشان عمل ہے ---------- ۲۷۳
☆ اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهَا ---------- ۲۷۴
☆ ہجرت کی برکات ---------- ۲۷۴
☆ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ---------- ۲۷۵
☆ حقیقی مہاجر ---------- ۲۷۶
☆ ہجرت کے وقت دو قسم کے خطرات ---------- ۲۷۶
☆ پہلا خطرہ ---------- ۲۷۶
☆ دوسرا خطرہ ---------- ۲۷۷
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت ---------- ۲۷۹

☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی تفصیل ---------- ۲۸۰
☆ جبّار ظالم کا واقعہ ---------- ۲۸۱
☆ توریہ اور تعریض کا بیان ---------- ۲۸۱
☆ مشکلات کا حل ---------- ۲۸۲
☆ فَتِلْكَ اُمُّكُمْ يَا بَنِيْ مَاءِ السَّمَاء کا مطلب ---------- ۲۸۳
تمام حجابات اُٹھا دیے گئے ---------- ۲۸۴
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے حضرت خلیل علیہ السلام کا نکاح ---------- ۲۸۴
☆ سیدہ ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی مکہ کی طرف ہجرت ---------- ۲۸۴
☆ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے کلام کرنا ---------- ۲۸۷
☆ قبیلہ بنی جرہم کی آمد ---------- ۲۸۸
☆ حضور علیہ السلام کی وصیت ---------- ۲۸۸
☆ مقامِ سَبُع میں حضرت خلیل علیہ السلام کی سکونت ---------- ۲۸۹
☆ عجیب قصّہ ---------- ۲۸۹
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا بیان ---------- ۲۸۹
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ضیافت کرنا ---------- ۲۹۰
☆ حضرت خلیل علیہ السلام کے پاس ملائکہ کی آمد ---------- ۲۹۰
☆ مہمانی کا قصّہ ---------- ۲۹۰
☆ حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کا مسکرانا ---------- ۲۹۱
☆ درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک ☆
☆ حدیثِ نبوی ﷺ ---------- ۲۹۳
☆ سیدہ سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ظالم فرعون کا واقعہ ---------- ۲۹۳

☆ ہر مسئلے کا حل اللہ کے پاس ہے ---------- ۲۹۵
☆ حجاج بن یوسف اور حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ---------- ۲۹۶
☆ سب سے بڑا وظیفہ ---------- ۲۹۶
☆ چند اہم گزارشات ---------- ۲۹۷

☆ صدقِ نیت کی اہمیت اور ایک عمل میں متعدد نیّتیں ☆

☆ نیّت کی خرابی کا ثمرہ ---------- ۳۰۳
☆ نیک نیتی کا ثمرہ ---------- ۳۰۴
☆ شیطان پر سب سے زیادہ گراں اور شاق اخلاص ہے ---------- ۳۰۶
☆ نیت کی اہمیّت ---------- ۳۰۶
☆ دو عجیب نعمتیں ---------- ۳۰۷
☆ احسان کر کے بدلہ نہ چاہنا ---------- ۳۰۷
☆ جلالتِ شان کے باوجود تواضع ---------- ۳۰۷
☆ محدود عمل کی سزا اور جزا دائمی ہونے کی وجہ ---------- ۳۰۹
☆ عمل شروع کرنے سے پہلے اپنی نیت درست کر لینی چاہیے ---------- ۳۱۰
☆ مسئلہ ---------- ۳۱۰
☆ متعدد چیزوں کی نیّت کرنا ---------- ۳۱۰
☆ تنبیہ ---------- ۳۱۲

☆ شرابُ الابرار ☆

☆ زم زم شریف کی وجہ تسمیہ ---------- ۳۱۵
☆ زم زم کے نام ---------- ۳۱۶
☆ ابتدائے زم زم ---------- ۳۱۷

☆ اول متولی کون؟ اور زمزم کا بند کر دینا ---------- ۳۱۸
☆ زم زم شریف کے فضائل ---------- ۳۱۸
☆ فائدہ ---------- ۳۱۹
☆ ماء زم زم پینے کے مسنون آداب ---------- ۳۲۰
☆ زم زم شریف کا پانی کھڑے ہوکر پینا سنّت ہے یا بیٹھ کر؟ ---------- ۳۲۱
☆ ماءزم زم کو دیکھنے سے گناہ جھڑتے ہیں ---------- ۳۲۳
☆ امام الانبیاء ﷺ کا ہر صُبح کو ماءزم زم پینا ---------- ۳۲۳
☆ ماءزم زم کو آپ ﷺ نے نوش فرمانے کے بعد اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا ---------- ۳۲۳
☆ زم زم کے متعلق مزید روایات وفوائد ---------- ۳۲۴
☆ روئے زمین کے تمام پانیوں سے زم زم کا پانی افضل ہے ---------- ۳۲۵
☆ زمزم سے قلبِ نبوی کی صفائی ---------- ۳۲۶
☆ زمزم جنّت کی نہر ---------- ۳۲۸
☆ زمزم میں لعابِ نبوی ---------- ۳۲۹
☆ زمزم بہترین تحفہ ---------- ۳۳۰
☆ آبِ زمزم کے ساتھ طہارت ---------- ۳۳۰
☆ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ماءزم زم کو ہاتھوں اور چہرے پر ملتے رہے ---------- ۳۳۱
☆ زمزم میں غذائیت ---------- ۳۳۱
☆ زمزم ہر بیماری سے شفاء ---------- ۳۳۲
☆ زمزم ہر مقصد کیلئے ---------- ۳۳۴
☆ حکایت ---------- ۳۳۶
☆ ایک شبہ کا ازالہ ---------- ۳۳۷

☆ ایمان کی علامت، نفاق سے برأت ---------- ۳۳۸
☆ سلف کا اہتمام ---------- ۳۴۰
☆ چاہ زم زم کا ظہور ---------- ۳۴۱
☆ قبیلہ جرہم کی آمد ---------- ۳۴۴
☆ چاہِ زمزم کا معدوم ہوجانا ---------- ۳۴۵
☆ چاہِ زمزم کا دوبارہ ظہور، تفصیلی واقعہ ---------- ۳۴۶
☆ تفصیلی روایت ---------- ۳۴۷
☆ کاھنہ شام کی طرف سفر ---------- ۳۴۸
☆ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ عجیبہ کا ظہور ---------- ۳۴۸
☆ خواجہ عبدالمطلب کے حق میں خدائی فیصلہ ---------- ۳۴۹
☆ کھودنے پر دفینہ ظاہر ہوگیا ---------- ۳۵۰
☆ عبدالمطلب کی بیوی کا عمدہ مشورہ ---------- ۳۵۱
☆ عبدالمطلب کی اولاد کی تفصیل ---------- ۳۵۲
☆ قرعہ اندازی برائے ذبح ---------- ۳۵۳
☆ عزّافہِ مدینہ کی طرف سفر ---------- ۳۵۳
☆ ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار پائی ---------- ۳۵۴
☆ حضرت خواجہ عبداللہ کی زوجیّت ---------- ۳۵۴
☆ چاہ زم زم کی آب رسانی اور اکابرینِ قریش کا حسین عمل ---------- ۳۵۴
☆ چاہِ زم زم کی پیائش اور اس کے چشمے کے بارے میں اکابرینِ اُمّت کی تحقیق ---------- ۳۵۶

☆ **حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ** ☆

☆ قربانی کی تاریخ اور اس کی ابتداء ---------- ۳۵۸

☆ اُمتِ محمدیہ ابراہیمی دعا کا صدقہ ---------- ۳۵۹
☆ خلیل اللہ اور حبیب اللہ ---------- ۳۶۰
☆ محبت کے درجات ---------- ۳۶۰
☆ واقعہ عجیبہ ---------- ۳۶۱
☆ دعائے خلیل ---------- ۳۶۲
☆ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ ---------- ۳۶۳
☆ حلیم المزاج بیٹے کی بشارت ---------- ۳۶۳
☆ غلام، صبی اور حلیم کا معنی ---------- ۳۶۴
☆ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اوصافِ عالیہ ---------- ۳۶۴
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خواب ---------- ۳۶۵
☆ ایک باریک نکتہ ---------- ۳۶۵
☆ وحی کی اقسام ---------- ۳۶۶
☆ منحر کی طرف روانگی ---------- ۳۶۶
☆ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے پاس شیطان کا آنا ---------- ۳۶۹
☆ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے پاس شیطان کا آنا ---------- ۳۷۰
☆ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس شیطان کا آنا ---------- ۳۷۰
☆ باپ بیٹے کا مکالمہ ---------- ۳۷۱
☆ بیٹے میں کمالِ فراست ---------- ۳۷۲
☆ اولاد ہو تو اسماعیل علیہ السلام جیسی ہو ---------- ۳۷۲
☆ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی کمالِ تواضع ---------- ۳۷۳
☆ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حوصلہ اور ہمت ---------- ۳۷۴

☆ حضور ﷺ کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم کیوں دیا گیا؟ ---------- ۳۷۸
☆ قربانی کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنّت کیوں فرمایا؟ ---------- ۳۷۹
☆ ذبح کے وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جذبات ---------- ۳۸۰
☆ ذبح کا منظر ---------- ۳۸۱
☆ ماں کی اولاد سے محبت کا ایک واقعہ ---------- ۳۸۲
☆ تکبیراتِ تشریق ---------- ۳۸۳
☆ جذبہ فداکاری ---------- ۳۸۴
☆ کامیابی کا اعلان ---------- ۳۸۵
☆ ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی قربانی کر ڈالی تھی ---------- ۳۸۷
☆ جنتی دُنبہ ---------- ۳۸۷
☆ نکتہ ---------- ۳۸۸
☆ فائدہ جلیلہ: (ماخوذ از روح البیان) ---------- ۳۹۰
☆ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ---------- ۳۹۱
☆ نیک نیتی پر ثواب ---------- ۳۹۲
☆ کثرتِ اولاد کی بشارت ---------- ۳۹۲
☆ یَا ابْنَ الذَّبِیْحَیْنِ ---------- ۳۹۳
☆ سنّت ابراہیم کا مصداق ---------- ۳۹۳
☆ آخری اور اہم گزارشات ---------- ۳۹۴

☆ عظمتِ بیتُ اللہِ الکریم ☆

☆ اولِ عالم ---------- ۳۹۷
☆ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے ---------- ۳۹۹

☆ لوگ بیت اللہ کی طرف کیوں کھنچتے ہیں ۳۹۹
☆ بیت اللہ کی حدود ۴۰۱
☆ بیت اللہ میں گویا اللہ کا عکس ہے ۴۰۱
☆ مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے ۴۰۳
☆ بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت ۴۰۴
☆ مرکزیت کی منتقلی ۴۰۵
☆ برکت وہدایت کا گھر ۴۰۶
☆ آیاتِ بینات ۴۰۶
☆ قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی ۴۰۷
☆ وسطِ عالَم میں ولادت نبوی ﷺ کی حکمت ۴۰۸
☆ ہندو گورنر کے ایم منشی کا تسلیم حق ۴۰۹
☆ گاندھی جی کا صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی حقانیت کے آگے سرنگوں ہونا ۴۱۰
☆ فیضان نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا ۴۱۱
☆ قاری طیب صاحب کے وفد کی شاہِ حجاز ملک عبدالعزیز سے ملاقات ۴۱۲
☆ اہل مکہ کے بجائے تبلیغی جماعت نے دین کا کام اُٹھایا ۴۱۴
☆ شام مرکز سیاست ہے ۴۱۴
☆ مصر مرکز عسکریت ہے ۴۱۵
☆ اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے ۴۱۶

☆ تاریخ وبناء بیت اللہ اور دعواتِ ابراہیم علیہ السلام ☆

☆ سیدنا آدم علیہ السلام اور تعمیرِ بیت اللہ ۴۱۸
☆ سیدنا آدم علیہ السلام اور حجِ مبرور ۴۱۹

☆ امن وایمان کی خوشخبری ---------- ۴۲۰
☆ طوفانِ نوح اور بناء ابراہیمی ---------- ۴۲۲
☆ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آبادی کی بقاء کیلئے دعا فرمائی ---------- ۴۲۴
☆ تعمیرِ بیت اللہ کے بعد ربّ کے حضور دعا مانگنا ---------- ۴۲۵
☆ قواعد کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کی آراء ---------- ۴۲۶
☆ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ ---------- ۴۲۶
☆ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام کلام پوری ہونے کے بعد لانے کی وجہ ---------- ۴۲۷
☆ قبول اور تقبّل میں فرق ---------- ۴۲۸
☆ فوائدِ جلیلہ ---------- ۴۲۸
☆ اُمّتِ مسلمہ کے لئے دعا اور اس کی قبولیت ---------- ۴۲۹
☆ توجہ طلب بات ---------- ۴۳۰
☆ مناسکِ حج کی تعلیم ---------- ۴۳۰
☆ اعلانِ حج ---------- ۴۳۱
☆ وَتُبْ عَلَیْنَآ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ---------- ۴۳۳
☆ بَلَدًا اٰمِنًا اور هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں فرق ---------- ۴۳۴
☆ دین کیلئے طلبِ دنیا منافی کمال نہیں ---------- ۴۳۴
☆ فائدہ ---------- ۴۳۴
☆ اہلِ مکہ میں سے ایک رسول بھیجنے کی دعا اور اس کی قبولیت ---------- ۴۳۵
☆ جس رسول کے آنے کی دعا کی اس کی صفات ---------- ۴۳۹
☆ کتاب اور حکمت کی تعلیم ---------- ۴۴۰
☆ تزکیہ نفس ---------- ۴۴۱

☆ ملتِ ابراہیمی سے اعراض کرنا حماقت ہے ---------- ۴۴۲
☆ ملتِ ابراہیمی اس وقت ملتِ محمدیہ میں منحصر ہے ---------- ۴۴۵
☆ اسلام کا معنی اور مفہوم ---------- ۴۴۶
☆ فوائدِ جلیلہ ---------- ۴۴۸
☆ دینِ اسلام کے علاوہ ہر دین مردود ہے ---------- ۴۵۰
☆ بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل قریش کا بیت اللہ کی تعمیر کرنا ---------- ۴۵۱
☆ اس تعمیرِ نو کا سبب کیا تھا؟ ---------- ۴۵۲
☆ بیت اللہ کی تعمیر تقسیم کار ---------- ۴۵۳
☆ کعبۃ اللہ کے سبز پتھروں کا واقعہ ---------- ۴۵۳
☆ حجرِ اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا واقعہ ---------- ۴۵۴
☆ کعبۃ اللہ اور غلاف ---------- ۴۵۴
☆ ابراہیمی طرز پر کعبہ کی تعمیر ---------- ۴۵۵
☆ حجاج نے عبدالملک کے حکم سے تعمیرِ کعبہ کو پھر بدل دیا ---------- ۴۵۶
☆ عبدالملک بن مروان کو بعد میں صدمہ ہوا ---------- ۴۵۷
☆ حرمت وتعظیم بیت اللہ کے واقعات ---------- ۴۵۸
☆ فضائل ---------- ۴۶۲
☆ مقامِ ابراہیم ---------- ۴۶۴
☆ اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثمرہ دعاء ابراہیم علیہ السلام ☆
☆ منتخب اُمّت ---------- ۴۶۸
☆ فائدہ ---------- ۴۷۰
☆ وَمَاجَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ---------- ۴۷۱

☆ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ ---------- ۴۷۲
☆ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امتوں پر گواہی اور اس کے مطابق فیصلہ الٰہی ---------- ۴۷۴
☆ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری اُمتوں سے افضل ---------- ۴۷۶
☆ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آپس میں گواہی پر بخشش کے فیصلے ---------- ۴۷۶
☆ اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعتدال اور لفظ وسطاً کی تشریح ---------- ۴۷۸

☆ ضمیمہ ☆

☆ وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ---------- ۴۸۰
☆ فائدہ ---------- ۴۸۱
☆ مجاہدہ نفس جہاد اکبر ہے، دلائل قرآن وسنت کی روشنی میں ---------- ۴۸۱
☆ دلیل ۱: ---------- ۴۸۱
☆ دلیل ۲: ---------- ۴۸۲
☆ دلیل ۳: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ---------- ۴۸۲
☆ دلیل ۴: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ---------- ۴۸۵
☆ دلیل ۵: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ---------- ۴۸۵
☆ مفتی رشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک استفتاء اور اس کا جواب ---------- ۴۹۱
☆ جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے ---------- ۴۹۲
☆ فائدہ جلیلہ، کس وقت کون سا عمل افضل ہے ---------- ۴۹۳
☆ افضل الاعمال کا مطلب ---------- ۴۹۵

☆ شرعاً وعقلاً قربانی کرنا کیوں ضروری ہے؟ ☆

☆ تمہید ---------- ۵۰۲
☆ تین اصول ---------- ۵۰۳

☆ خلاصہ ۵۰۵
☆ شرعی تین اصول ۵۰۵
☆ محبوباتِ نفس کی قربانی ۵۰۶
☆ روحِ قربانی اور شبہ کا جواب ۵۰۸
☆ قربانی کی حقیقت ۵۱۰
☆ اطاعت کی انتہاء ۵۱۱
☆ قربانی اور صدقہ میں فرق ۵۱۱
☆ تعامل اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۵۱۲
☆ منکرین قربانی پر طریقِ ردّ ۵۱۲
☆ طریقِ ردّ نمبر ۲ ۵۱۳
☆ متعلقات قربانی کی وضاحت ۵۱۸

☆ عشرہ ذی الحجہ کے فضائل ومسائل ☆

☆ عشرۂ ذی الحجہ کا اجر وثواب ۵۲۳
☆ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ سے کیا مراد ہے؟ ۵۲۴
☆ عشرہ ذی الحجہ کے فضائل واحکام ۵۲۵
☆ عشرہ ذی الحجہ افضل یا رمضان المبارک؟ ۵۲۷
☆ عشرہ ذی الحجہ کے روزوں کا اجر وثواب ۵۲۸
☆ عجیب حدیث ۵۲۹
☆ عشرہ ذی الحج میں ذکرِ الٰہی کی کثرت ۵۳۰
☆ فائدہ ۵۳۱
☆ تکبیراتِ تشریق ۵۳۱

☆ تکبیراتِ تشریق کی اصل ---------- ۵۳۲
☆ نویں ذی الحجہ کی فضیلت ---------- ۵۳۴
☆ عرفہ کی وجہ تسمیہ ---------- ۵۳۵
☆ عرفہ (نویں ذی الحجہ) کے روزے کے فضائل ---------- ۵۳۶
☆ حاجیوں کے لئے عرفہ کا روزہ ---------- ۵۳۷
☆ حجاج کرام کے ساتھ مشابہت کا حکم ---------- ۵۳۷
☆ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں بہانے ڈھونڈتی ہے ---------- ۵۳۷
☆ مسئلہ ---------- ۵۳۸
☆ بال اور ناخن نہ تراشنے کی عجیب توجیہ ---------- ۵۳۸
☆ عید الفطر اور بقر عید کی شب کو زندہ رکھنے کا مطلب ---------- ۵۳۸
☆ قربانی ---------- ۵۳۹
☆ حکمِ قربانی اور عقل کے پجاری ---------- ۵۴۰
☆ تنبیہ ---------- ۵۴۱
☆ حقیقی مُسلم ---------- ۵۴۱

☆ عید الاضحیٰ کا بیان ☆

☆ تمہید ---------- ۵۴۴
☆ عید کا مفہوم ---------- ۵۴۶
☆ عید کی وجہ تسمیہ ---------- ۵۴۶
☆ اسلام میں تہواروں کا تصور ---------- ۵۴۷
☆ اظہارِ عبدیت ---------- ۵۴۸
☆ ایثار وقربانی ---------- ۵۴۸

☆ باہمی تعاون واشتراک ---------- ۵۴۸
☆ اظہارِ مسرت کیسے؟ ---------- ۵۴۸
☆ عید بطور یوم الجائزہ ویوم محاسبہ: تصویر کا دوسرا رُخ ---------- ۵۵۱
☆ عید کے دن یتیم بچوں کا خیال کرنا بھی سنّت ہے ---------- ۵۵۱
☆ احکام ومسائلِ عید ---------- ۵۵۲
☆ عید الاضحیٰ کی نماز جلدی پڑھنا مسنون ہے ---------- ۵۵۳
☆ عید کی بدعات ومنکرات ---------- ۵۵۳
☆ (۱) عید کے دن مختلف گناہوں میں مبتلا ہونا ---------- ۵۵۴
☆ (۲) عید کی تیاری ---------- ۵۵۴
☆ (۳) قربانی تک روزہ رکھنا ---------- ۵۵۴
☆ (۴) عید کارڈ ---------- ۵۵۵
☆ (۵) عید کے دن مصافحہ ومعانقہ ---------- ۵۵۵
☆ مصافحہ ومعانقہ کی ممانعت کیوں؟ ---------- ۵۵۶
☆ شرعی حدود کی پابندی ضروری ہے ---------- ۵۵۷
☆ بدعات کا وبال ---------- ۵۶۲
☆ عید کی مبارکباد ---------- ۵۶۵
☆ عیدی یا گوشت کا لین دین ---------- ۵۶۵
☆ عید کے دن قبرستان جانے کا اہتمام ---------- ۵۶۶
☆ وفات والے گھر جانے کی رسم ---------- ۵۶۶
☆ وفات والے گھر میں سوگ کا سماں ---------- ۵۶۷
☆ قربانی پر اعتراضات کا جائزہ ---------- ۵۶۷

☆ کیا قربانی پیسوں کا ضیاع ہے؟ ---------- ۵۶۷
☆ حرفِ آخر ---------- ۵۶۸

☆ قربانی کے فضائل ومسائل ☆

☆ تمہید ---------- ۵۷۰
☆ تاریخ قربانی، پس منظر، ابتداء ---------- ۵۷۱
☆ قربانی کا ظاہر وباطن ---------- ۵۷۲
☆ قربانی اور زکوٰۃ میں فرق ---------- ۵۷۳
☆ عید قربان کے دن فرزندِ آدم کا سب سے اونچا عمل ---------- ۵۷۴
☆ فقہائے اُمّت کا اتفاق ---------- ۵۷۵
☆ قربانی کا مفہوم ---------- ۵۷۵
☆ قربانی کا مقصد کیا ہے؟ ---------- ۵۷۶
☆ قربانی کی حکمت ---------- ۵۷۷
☆ قربانی کے ذریعہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے ---------- ۵۷۷
☆ قربانی کی روح ---------- ۶۷۸
☆ حکایت ---------- ۵۶۹
☆ فضائل قربانی قرآن وسنت کی روشنی میں ---------- ۵۸۱
☆ قربانی کی فضیلت تو ایسی ہے کہ واجب نہ ہو تب بھی کرنا چاہئے ---------- ۵۸۱
☆ محبت کا جھوٹا دعویٰ ---------- ۵۸۲
☆ قربانی کی فضیلت اور اس کا ثواب ---------- ۵۸۳
☆ مذکورہ روایت کا مفہوم ---------- ۵۸۴
☆ دو اہم فضیلتیں ---------- ۵۸۷

☆ آنحضرت ﷺ خود بھی ہمیشہ قربانی کیا کرتے تھے ---------- ۵۸۹
☆ قربانی نہ کرنے والے کے لئے سخت وعید ---------- ۵۹۰
☆ قربانی صرف تین دن ہے ---------- ۵۹۱
☆ قربانی واجب ہونے کے دلائل ---------- ۵۹۲
☆ قربانی کس پر واجب ہے؟ ---------- ۵۹۴
☆ قربانی کا وقت ---------- ۵۹۵
☆ قربانی کا جانور بے عیب ہو ---------- ۵۹۵
☆ قربانی کے جانوروں میں سے کون سا افضل ہے ---------- ۵۹۷
☆ کیسے جانور کی قربانی کی جائے؟ ---------- ۶۰۰
☆ قربانی کے جانور کی عمر ---------- ۶۰۱
☆ قربانی کے جانور کی عمر کا اعتبار ہوگا نہ کہ دانتوں کا ---------- ۶۰۲
☆ کونسی قربانی افضل ہے؟ ---------- ۶۰۳
☆ بھینس کی قربانی کرنا کیسا ہے؟ ---------- ۶۰۴
☆ جانور کیسے ذبح کیا جائے؟ ---------- ۶۰۵
☆ خود ذبح کرنا مستحب ہے ---------- ۶۰۵
☆ ذبح کے وقت کئی چیزوں کی رعایت ضروری ہے ---------- ۶۰۵
☆ ذبح میں آنحضرت ﷺ کا مبارک عمل ---------- ۶۰۶
☆ گوشت کی تقسیم کے متعلق مسائل ---------- ۶۰۷
☆ دوسرے کی طرف سے قربانی ---------- ۶۰۸
☆ غائب کی طرف سے قربانی ---------- ۶۰۸
☆ مسئلہ ---------- ۶۰۹

مُردوں کی طرف سے قربانی ---------- ۶۰۹
☆ کسی کی طرف سے قربانی کرنے اور قربانی کا ثواب پہنچانے کا فرق ---------- ۶۰۹
☆ میت کی طرف سے قربانی اور اس کے گوشت کا حکم ---------- ۶۱۰
☆ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرنا چاہئے ---------- ۶۱۰
☆ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا ---------- ۶۱۰
☆ جانور کی وہ چیزیں جن کا استعمال ممنوع ہے ---------- ۶۱۱
☆ غریب آدمی کا قربانی کرنا مستحب ہے ---------- ۶۱۲
☆ انتہائی نادار قربانی نہ کرے ---------- ۶۱۲
☆ نفلی قربانی کب افضل ---------- ۶۱۲
☆ قربانی کی کھال کے مسائل ---------- ۶۱۳
☆ قربانی اور اقتصادی مسئلہ ---------- ۶۱۴
☆ قربانی اور من گھڑت خیالات (اغلاط العوام) ---------- ۶۱۵

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا محمد یٰسین صابر صاحب دامت برکاتہم العالیہ

باسم تعالیٰ وتقدس

واضح ہو کہ برادر محترم حضرت مولانا کریم بخش صاحب زید مجدہم مُہتمم جامعہ عمرؓ بن الخطاب و خطیب جامع مسجد فاروق اعظمؓ، فاروقِ اعظم چوک المعروف ٹی چوک ملتان، اپنی گوناں گوں مصروفیات، تدریسی، تبلیغی خطابت، مدرسہ کے انتظام و انصرام کی مصروفیات کے باوجود ماشاءاللہ تصنیف وتالیف کا بھی ذوق وشوق رکھتے ہیں۔ موصوف کی کچھ کُتب چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں اور مزید چھپ رہی ہیں، انہیں میں سے ایک یہ ''ابوالانبیاء موحّدِ اعظم سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حالات وواقعات'' بھی ہے، میں نے یہ دیکھی ہے، ماشاءاللہ موصوف نے انتہائی محنت اور خوبصورت ترتیب وتحقیق سے مضامین کو تحریر اور ثبت فرمایا ہے۔

حق جل شانہ موصوف کی ان کتب کو عوام مسلمین کے لئے زیادہ سے زیادہ نافع بنائیں اور اپنی بارگاہِ عالی میں شانِ قبولیت سے سرفراز فرمائیں۔

این دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

والسلام

جامعہ عمرؓ بن الخطاب کا ایک ادنیٰ مدرس

محمد یٰسین صابر

یکم ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا شبیر الحق کشمیری صاحب دامت برکاتہم العالیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ

اَمَّا بَعْدُ!

برادرم محترم حضرت مولانا کریم بخش صاحب زید مجدہم مہتمم جامعہ عمرؓ بن الخطاب وخطیب جامع مسجد فاروقِ اعظم ملتان درس وتدریس، تبلیغ وخطابت، وعظ ونصیحت، تصنیف وتالیف اور صفاتِ حمیدہ کے جامع ہیں، ہزاروں تشنگانِ علم وعمل موصوف زید مجدہم کی تعلیم وتربیت اور فیوضات سے سیراب ہورہے ہیں، اَللّٰهُمَّ زِدْ فَزِدْ۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی فاضل موصوف زید مجدہم کا تیار کردہ یہ علمی گلدستہ بعنوان ''ابوالانبیاء موحّدِ اعظم سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حالات وواقعات'' بھی ہے، فوائد کثیرہ جلیلہ اور واقعاتِ غریبہ عجیبہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عوام وخواص کے لئے یکساں مفید ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں دُعا ہے کہ اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ عوام وخواص کے لئے نافع بنائے اور مؤلف زید مجدہم اور ان کے جملہ متعلقین کے لئے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین یاربّ العالمین بجاہ سید المرسلین وعلی آلہٖ وصحبہٖ اجمعین؟

کتبہ العبد الضعیف محتاج دعا:

شبیر الحق کشمیری عفا اللہ عنہ (مدرس جامعہ خیر المدارس، ملتان)

یکم ذوالحجہ ۱۴۳۶ھ

تقریظ

حضرت اقدس مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ

بِاسْمِہٖ تَعَالٰی

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَمَّا بَعْدُ!

زیرنظر کتاب جمعہ کے مواعظ اور خطبات کا مجموعہ ہے، ان مضامین کا تعلق اس ہستی سے ہے جنہیں بڑے بڑے امتحانات سے گزارا گیا اور ان تمام امتحانات میں اعلیٰ کامیابیاں حاصل کرنے پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی امامت کے اعلیٰ انعام سے نوازا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمَاتٍ فَاَتَمَّھُنَّ، قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا''۔

اسی انعام کا یہ اثر تھا کہ یہود و نصاریٰ بزعمِ خویش جو ایک دین سماوی کے قائل تھے، وہ اور عرب کے بے علم جاہل مشرکین اپنے لئے ملتِ ابراہیمی کی نسبت کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اپنے کو ان کا متبع قرار دیتے تھے، حتی کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کے اس دعویٰ کی تردید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''مَاکَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا۔۔۔الخ''۔ اور یہ اعلان کیا کہ ملتِ ابراہیمی کی اعلیٰ نسبت حضور علیہ السلام اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہے: ''اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرَاھِیْمَ''۔ ملتِ ابراہیمی سے بے رخی کرنے والے کو سفیہ النفس قرار دیا، چنانچہ ارشاد ہے: ''وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰھِیْمَ اِلَّا مَنْ سَفِہَ نَفْسَہٗ''۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے مختلف مقامات پر سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات کے مختلف پہلو پر روشنی ڈالی۔ قرآن کریم کی تعلیمات چونکہ رہنما اصولوں پر مبنی ہوتی ہیں، لہٰذا جو جزئیات پردۂ خفاء میں تھیں ہمارے مخدوم محترم مبلغ اعظم حضرت اقدس مولانا کریم بخش صاحب دام مجدہم نے بڑے اچھے انداز میں ظاہر فرمایا۔

مختلف مقامات سے زیرنظر مضامین کو دیکھا، ماشاء اللہ اعلیٰ معلومات کا شاہکار پایا، گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ زبان و قلم دل کی کیفیات کے ترجمان ہوتے ہیں، الحمد للہ ان مضامین کو نورانیت سے پر محسوس کیا، ان شاء اللہ قارئین کے قلوب میں علم و عمل، اخلاص وللہیت کی شمع روشن کرنے کا باعث ہوں گے۔ تعمیل ارشاد میں چند سطور لکھ

دی ہیں، ورنہ میری تحریر سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

اللہ پاک ہم سب کو علم، عمل، اخلاص، تقویٰ اور حسنِ خاتمہ کی دولت سے مالا مال فرمائیں اور آخری سانس تک اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمائیں۔ آمین بجاہِ وجھه الکریم وبحق محمد صل اللّٰه علیه وسلم علیک آمین برحمتک یاارحم الرحمین۔

بندہ محمد عبداللہ عفا اللہ عنہ

(خادم الافتاء جامعہ خیر المدارس، ملتان)

۴۔۱۲۔۱۴۳۶ھ

عرضِ مؤلف

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْمَلِکُ لَاشَرِیْکَ لَکَ وَالْفَرْدُ لَانِدَّلَکَ کُلُّ شَیْئٍ ھَالِکٌ اِلَّاوَجْھَکَ لَنْ تُطَاعَ اِلَّابِاِذْنِکَ وَلَنْ تُعْصٰی اِلَّابِعِلْمِکَ تُطَاعُ فَتَشْکُرُ تُعْصٰی فَتَغْفِرُ. اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا وَ قَاعِدِ غُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَعَلَیْنَا مَعَھُمْ اَجْمَعِیْنَ

اَمَّا بَعْدُ!

قرآنِ کریم حق تعالیٰ شانہٗ کا آخری پیغام ہے، ابدی دستور اور مکمل ضابطہ حیات ہے، فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ عملی زندگی اور تربیت کیلئے کامل اور اکمل قانون ہے۔ قرآنی واقعات، اعلیٰ مقاصد اور اشرف اغراض کے حامل ہیں۔ مکارمِ اخلاق اور عُمدہ آداب کی تعلیم ہے۔ واقعات کے ضمن میں علوم و ہدایات، رشد ونصیحت کا سمندر پنہاں ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اطاعت اور فرمانبرداری کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ رہتی دنیا تک وہ روشنی کا مینارہ ہیں، پھر یہ دُعا بھی مانگ رہے ہیں کہ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ الاٰیۃ۔ اے اللہ! جیسے میں نے اپنی پوری توانائیاں تیری اطاعت وفرمانبرداری میں خرچ کرڈالیں ایسے میری ذریت میں بھی اُمت پیدا فرما جو اطاعت وفرمانبرداری میں تیری راہ پر چلے۔

آقاء نامدار ﷺ سید ولد آدم اور رحمۃ اللعالمین ہیں، انہیں بھی قربانی کی لائین میں کہا جارہا ہے فَاتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرَاھِیْمَ حَنِیْفًا۔ جب قربانی کی سب گھاٹیاں طے کردیں اور لختِ جگر پر چھری تک چلا دی تو ایک فرشتے نے زمین وآسمان کے درمیان بامرِ الٰہی یہ اعلان کیا: اے ابراہیم! اللہ ﷻ نے تیری سب قربانیاں قبول کرلیں اور یہ طے کردیا کہ اب نبوت جیسی عظیم الشان چیز تیری ذریت میں رہے گی، ایک بیٹے سے چار ہزار انبیاء بنی اسرائیل آئے اور دوسرے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی ذریت سے محمد رسول اللہ ﷺ جیسا عظیم الشان نبی پیدا کیا جو تمام اقوام عالم اور قیامت تک کیلئے مبعوث ہوئے۔ اس پاک اور آخری نبی نے وہ قربانیاں پیش کیں کہ اللہ تعالیٰ کو تسلی دینے کی ضرورت پڑی فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ

عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ، پھر حضراتِ صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ابراہیم علیہ السلام کی لائین کی ساری قربانیاں دے ڈالیں۔

بیت اللہ، صفا ومروہ، مقامِ ابراہیم، منیٰ، عرفات، مزدلفہ، کروڑوں کی تعداد میں ہر سال قربانیاں، رمی جمرات، ہر سال لاکھوں حجاج کا لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ کا شعار فضاء آسمانی میں گونجتا ہے، یہ ساری چیزیں تا قیامت ابراہیمی تضحیات کو یاد دلاتی رہیں گی کہ اے اُمتِ محمدیہ! اللہ ﷻ کے نام پر ایسے مرمٹو کہ انقیاد، طاعت، امتثال کی وہ مثالیں رقم کردو کہ جدّ الانبیاء، موحّدِ اعظم، ابو محمد ابراہیم علیہ السلام، اور ان کے لختِ جگر اسماعیل علیہ السلام، اور ہماری ماں سیدہ طیبہ ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، اور تاجدارِ مدینہ، شافی محشر، امام الرسل، فخر الانبیاء، حضرت رسولِ پاک علیہ السلام کی یاد تازہ ہوجائے اور یہ سب کچھ اسی مالکِ حقیقی کی خوشنودی کیلئے ہو وَكَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جب اللہ ﷻ نے سارا عالم ابراہیم علیہ السلام کیلئے منکشف کردیا عرش سے فرش تک، اور فرمایا کہ ان میں سے آپ کیا چاہتے ہیں؟ تو اللہ ﷻ کے عظیم الشان خلیل نے فرمایا: اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ الاية میری یہ ساری دوڑ دھوپ زندگی بھر کی، تیرے اوامر کے سامنے گردن جھکانا، اس لئے نہیں کہ میں محتاجوں کی پلٹن لوں، میرا مقصود ومطلوب تیری ذاتِ پاک اور تیری رضا ہے۔

آنے والے صفحات میں اللہ ﷻ کے خلیل کی زندگی تفصیل سے پڑھیں اور عمل کی نیت سے پڑھیں اور قربانی کا عزم کریں۔ اللہ تعالیٰ ﷻ ہمیں صحیح مسلم بنائے اور اپنے پیارے انبیاء کی راہ پر چلائے۔

المذنب المحتاج الی الکریم

کریم بخش عفا اللہ الکریم

وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ''(پ۱، ۲البقرۃ:۳۰)

تخلیقِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

اور دنیا میں پہلی قربانی کا اجمالی تذکرہ

حضرت مولانا کریم بخش صاحب مدظلہ

(مدیر: جامعہ عمرؓ بن الخطاب، ملتان)

تخلیقِ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، وَاِذْقَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً، قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَ نُقَدِّسُ لَکَ، قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ۔[۱]

عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ: خَلَقَ اللّٰہُ آدَمَ حِیْنَ خَلَقَہٗ فَضَرَبَ کَتِفَہُ الْیُمْنٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً بَیْضَآءَ کَاَنَّھُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ کَتِفَہُ الْیُسْرٰی فَاَخْرَجَ ذُرِّیَّۃً سَوْدَآءَ کَاَنَّھُمُ الْحُمَمُ، فَقَالَ: لِلَّذِیْ فِیْ یَمِیْنِہٖ اِلَی الْجَنَّۃِ وَلَا اُبَالِیْ، وَقَالَ: لِلَّذِیْ فِیْ کَفِّہِ الْیُسْرٰی اِلَی النَّارِ وَلَا اُبَالِیْ[۲]

بعد از خطبہ مسنونہ:

حق تعالیٰ شانہٗ نے جب اس کائنات میں انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں سے فرمایا: ''اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً'' میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ فرشتوں نے ادب سے عرض کیا اے ہمارے ربّ! ''اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَآءَ'' آپ زمین میں اسے خلیفہ بنا رہے ہیں جو خون خرابہ کرے گا، فساد برپا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ'' جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

---

[۱] البقرۃ: ۳۰

[۲] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۳۷، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

اولادِ آدم کی خونریزی کے خدشے کا اظہار اور اس کا جواب:

فرشتوں نے اعتراض نہیں کیا، بلکہ ادب سے کہا اے اللہ! وہ تو زمین میں فساد مچائیں گے، خون خرابہ کریں گے۔ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے:

قَوْلُ الْمَلَآئِكَةِ هٰذَا لَيْسَ عَلٰى وَجْهِ الْاِعْتِرَاضِ عَلَى اللّٰهِ وَلَا عَلٰى وَجْهِ الْحَسَدِ لِبَنِيْ آدَمَ ، اِنَّمَا هُوَ سُؤَالُ اسْتِعْلَامٍ وَ اسْتِكْشَافٍ عَنِ الْحِكْمَةِ فِيْ ذٰلِكَ۔ [۱]

فرشتوں کا یہ کہنا کہ آپ زمین میں اُنہیں خلیفہ بنا رہے ہیں جو فساد مچائیں گے اور خونریزی کریں گے، اللہ تعالیٰ پر اعتراض یا بنی آدم پر حسد کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ علی وجہ استکشاف و استعلام تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کی حکمت سے باخبر ہونا مقصود تھا (کہ اگر صرف حمد وثنا اور عبادت ہی مقصود ہے تو اس کے لئے ہم پہلے سے موجود ہیں)۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ فرشتوں کو کیسے پتا تھا؟ ابھی تو انسان آیا ہی نہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ زمین میں فساد مچائے گا اور خون خرابہ کرے گا۔ حضرات مفسّرین نے اس کا جواب یہ دیا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے زمین پر جنات بستے تھے۔ انہوں نے زمین میں بڑا تہلکہ مچایا، آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے فرشتوں سے فرمایا: اِنہیں مار مار کر سمندروں کی طرف بھگا دو۔ ابلیس جس کا نام عزازیل تھا، یہ جنات میں سے ہے۔ جب جنات کو مار کر سمندروں کی طرف نکالا گیا تو فرشتے اِسے گرفتار کر کے اوپر لے گئے۔ كَانَ اِبْلِيْسُ مِمَّنْ اُسِرَ فَاَخَذُوْا مَعَهُمْ اِلَى السَّمَآءِ [۲]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

كَانَ الْجِنُّ مُوَطِّنِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَبْلَ اَنْ يُّخْلَقَ آدَمُ بِاَلْفَيْ سَنَةٍ فَاَفْسَدُوْا فِي الْاَرْضِ وَسَفَكُوا الدِّمَآءَ فَبَعَثَ اللّٰهُ جُنْدًا مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ فَضَرَبُوْهُمْ حَتّٰى اَلْحَقُوْهُمْ بِجَزَائِرِ الْبُحُوْرِ [۳]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۰۰، ط: دار الکتاب العربی

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۵، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۰۲، ط: دار الکتاب العربی

سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق سے دو ہزار سال پہلے زمین پر جنات رہا کرتے تھے، انہوں نے زمین میں خوب فساد مچایا، خون خرابہ کیا، لڑایاں لڑیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا کہ انہیں مارو، چنانچہ فرشتوں نے جنات کو مار مار کر سمندروں اور جزیروں کی طرف بھگا دیا۔

اب چونکہ ملائکہ جنات کے حالات دیکھ چکے تھے اسی وجہ سے کہا کہ جب انسان آئیں گے تو وہ بھی یہی کام کریں گے، یعنی جنات کی طرح انسان بھی زمین میں فتنہ وفساد برپا کریں گے۔ جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

اَنَّ الْجِنَّ اَفْسَدُوْا فِی الْاَرْضِ قَبْلَ بَنِیْ آدَمَ فَقَالَتِ الْمَلَآئِکَةُ ذٰلِکَ فَقَاسُوْا هٰؤُلَآءِ بِاُولٰئِکَ۔[۱]

تخلیقِ آدم سے پہلے زمین پر جنات نے خوب خون خرابہ کیا اور فساد مچایا، تو فرشتوں نے بنی آدم کو جنات پر قیاس کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھی زمین پر آ کر فتنہ وفساد برپا کریں گے۔

بعض حضرات کہتے ہیں:

لِمَا اطَّلَعُوْا عَلَیْهِ مِنَ اللَّوْحِ الْمَحْفُوْظِ لوحِ محفوظ پر اللہ کا علم درج تھا، جب اس پر فرشتوں کی نگاہ پڑی تو انہوں نے انسان کے اندر پیدا ہونے والی چیزیں اس میں لکھی دیکھیں، اس میں یہ بھی درج تھا کہ انسانوں میں فتنہ فساد اور قتل وغارت گری بھی ہوگی۔ اس کو دیکھ کر انہوں نے سمجھا کہ جو مخلوق آئے گی وہ لڑے گی اور قتل وغارت کرے گی۔[۲]

بعض حضرات سے مروی ہے کہ فرشتوں کو ہاروت وماروت کے ذریعہ اولادِ آدم کے بارے میں علم ہوا کہ وہ خون خرابہ کریں گے، چنانچہ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے:

اَلسِّجِلُّ مَلَکٌ وَکَانَ هَارُوْتُ وَمَارُوْتُ مِنْ اَعْوَانِهٖ وَکَانَ لَهٗ کُلَّ یَوْمٍ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۰۲، ط: دار الکتاب العربی

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۲، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

ثَلَاثُ لَمَحَاتٍ يَنْظُرُهُنَّ فِيْ أُمِّ الْكِتَابِ فَنَظَرَ نَظْرَةً لَمْ تَكُنْ لَّهُ فَأَبْصَرَ فِيْهَا خَلْقُ آدَمَ وَمَاكَانَ فِيْهِ مِنَ الْأُمُوْرِ فَأَسَرَّ ذٰلِكَ إِلٰى هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ كَانَا مِنْ أَعْوَانِهِ. فَلَمَّا قَالَ تَعَالٰى إِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيْفَةً (الاية) قَالَا ذٰلِكَ اِسْتِطَالَةً عَلَى الْمَلَائِكَةِ۔[۱]

اللہ کے دوفرشتے ہاروت اور ماروت تھے، ان کے اوپر ایک اور فرشتہ تھا سجل، وہ لوحِ محفوظ کے علم سے زیادہ واقف تھا، اُس نے کہا یہ جو مخلوق آئے گی، یہ زمین میں فساد اور تہلکہ مچائے گی۔

اس بناء پر ملائکہ نے (اعتراض کے طور پر نہیں) تحقیقِ حال کے طور پر کہا: اے ہمارے پروردگار! آپ اُن کو پیدا کررہے ہیں جو زمین میں فساد برپا کریں گے اور خون بہائیں گے۔ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ عبادت کے لیے پیدا کرنا ہے تو ہم تو ہر لحہ، ہر آن اور ہر گھڑی حاضر ہیں، آپ کے کمالات، آپ کی تقدیس، آپ کی تحمید، آپ کی تہلیل اور آپ کی تسبیح بیان کررہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: اِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[۲] جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ تمہاری نگاہ تو نافرمان انسانوں پر ہے اور ربُّ العالمین دیکھ رہے ہیں کہ آدم علیہ السلام کی اولاد میں لاکھوں انبیاء آئیں گے، صدیقین، شہداء اور صالحین آئیں گے، رونے والے اور گڑگڑانے والے آئیں گے۔ چنانچہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنی کمالِ قدرت کے ساتھ سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمالیا۔

زمین کی مختلف اجناس سے مٹی لانے کا حکم:

بَعَثَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ جِبْرِيْلَ فِي الْأَرْضِ لِيَأْتِيَهُ بِطِيْنٍ مِّنْهَا فَقَالَتِ الْأَرْضُ: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ أَنْ تَنْقُصَ مِنِّيْ أَوْ تُشَيِّنَنِيْ فَرَجَعَ وَلَمْ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج:۱، ص:۲۰۲، ط: دار الکتاب العربی

[۲] البقرۃ:۳۰

يَأْخُذْ، وَقَالَ رَبِّ اِنَّهَا عَاذَتْ بِكَ فَاَعَذْتُهَا، فَبَعَثَ اللّٰهُ مِيْكَائِيْلَ فَعَاذَتْ مِنْهُ فَاَعَاذَهَا فَرَجَعَ فَقَالَ كَمَا قَالَ جِبْرِيْلُ ، فَبَعَثَ مَلَكَ الْمَوْتِ فَعَاذَتْ مِنْهُ فَقَالَ: وَاَنَا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَرْجِعَ وَلَمْ اُنَفِّذْ اَمْرَهٗ فَاَخَذَ مِنْ وَجْهِ الْاَرْضِ وَخَلَطَهٗ وَلَمْ يَأْخُذْ مِنْ مَّكَانٍ وَّاحِدٍ وَاَخَذَ مِنْ تُرْبَةٍ بَيْضَآءَ وَحَمْرَآءَ وَسَوْدَآءَ فَلِذٰلِكَ خَرَجَ بَنُوْ آدَمَ مُخْتَلِفِيْنَ[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے فرمایا کہ زمین کی مختلف اجناس سے مٹی لاؤ۔ پہاڑی علاقہ بھی ہے، ریگستان بھی ہے، زرخیز زمینیں بھی ہیں، کھاری زمینیں بھی ہیں، زمین کے سُفید ٹکڑے بھی ہیں، سیاہ ٹکڑے بھی ہیں، ہرنوع کی مٹی اکٹھی کرو!

سیدنا جبرائیل علیہ السلام زمین سے مٹی لینے آئے تو زمین نے کہا: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ اَنْ تَنْقُصَ مِنِّيْ میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں کہ تو میری مٹی میں سے نقص (کمی) کرے، میری مٹی نہ اُٹھاؤ، میری مٹی کم نہ کرو۔ میرے بھائیو! اللہ کی پناہ بڑی پناہ ہے، اللہ کا نام سن کر جبرائیل علیہ السلام پیچھے ہٹ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا، وہ زمین سے مٹی لینے لگے، زمین بولی: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْكَ اَنْ تَنْقُصَ مِنِّيْ میں اللہ کی پناہ میں آنا چاہتی ہوں، مجھے عیب دار نہ کرو، میری مٹی نہ لو۔ چنانچہ اللہ کا نام سن کر میکائیل علیہ السلام بھی واپس چلے گئے۔

تیسری مرتبہ حق تعالیٰ شانہٗ نے ملک الموت کو بھیجا، وہ زمین سے مٹی اکٹھی کرنے لگے، زمین نے پھر وُہی کہا، اس نے کہا مجھے میرے ربّ کا امر ہے، میں اپنے ربّ کے امر سے تجاوز نہیں کرسکتا، میں ہر صورت میں اللہ کا امر پورا کر کے جاؤں گا۔ تُو اللہ کی پناہ چاہتی ہے تو میں بھی اُسی اللہ کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ تو ملک الموت نے زمین سے مختلف انواع کی مٹی اکٹھی کر کے بارگاہ الٰہی میں حاضر کردی۔

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص: ۱۳۳، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

پھر حق تعالیٰ شانہٗ نے ملائکہ سے اس مٹی کو گوندھوایا، نہ جانے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں فرشتوں سے اللہ نے ہاتھ لگوایا۔ کتنا زیادہ نور آیا ہوگا؟ نیک آدمی آٹا گوندھے کتنی برکت آتی ہے اور ملائکہ نے جب گوندھا ہوگا تو کیا انوارات اس میں آئے ہوں گے؟

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ[۱] ''اللہ تعالیٰ نے انسان کی بناوٹ مٹی سے کی ہے''۔ مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ[۲] جب گارا چپکنے لگے، گارا زیادہ دیر پڑا رہے تو اس سے بُو آتی ہے، ہم اپنے جسم پر خارش کریں، پھر سونگھیں تو بُو آتی ہے۔ اسی سے اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کا جسم مبارک:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ آلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: كَانَ طُوْلُ آدَمَ سِتِّيْنَ ذِرَاعًا فِیْ سَبْعِ اَذْرُعٍ عَرْضًا[۳]

سیدنا آدم علیہ السلام کا جسم مبارک ساٹھ ہاتھ لمبا اور سات ہاتھ چوڑا تھا۔

فَكَانَ جَسَدًا مِّنْ طِيْنٍ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً مِّنْ مِّقْدَارِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ[۴]

وہ جسم مبارک چالیس سال مٹی ہی کی شکل میں پڑا رہا۔

لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ تَرَكَهٗ مَاشَاءَ اَنْ يَّدَعَهٗ فَجَعَلَ اِبْلِيْسُ يُطِيْفُ بِهٖ فَلَمَّا رَاٰهُ اَجْوَفَ عَرَفَ اَنَّهٗ خَلْقٌ لَا يَتَمَالَكُ[۵]

اللہ ربُّ العزت کی تجلیات اس پر پڑتی رہیں۔ فرشتے حیران تھے، ابلیس انہی میں رہتا تھا، یہ بھی چکر لگاتا تھا، اُس خالی ڈھانچے سے گزرتا تھا، کہتا تھا گھبراؤ نہیں، یہ اندر سے بھرا ہوا نہیں ہے، اسلئے یہ اپنے ارادے میں مضبوط نہیں ہوگا۔

---

[۱] السجدہ: ۷

[۲] الحجر: ۲۸

[۳] البدایہ، ج: ۱، ص: ۱۳۸، ط: رشیدیہ، کوئٹہ، مسند احمد، رقم الحدیث: ۷۹۵۲، ج: ۲، ص: ۳۹۵

[۴] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۳۴، ط: رشیدیہ، کوئٹہ،

[۵] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۳۴، ط: رشیدیہ، کوئٹہ،

سیدنا آدم علیہ السلام کا چھینک آنے پر دعا پڑھنا:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَمَّا نُفِخَ فِيْ آدَمَ فَبَلَغَ الرُّوْحُ رَأْسَهُ عَطَسَ فَقَالَ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، فَقَالَ لَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ[1]

اللہ تعالیٰ نے چالیس سال کے بعد اپنی کمالِ قدرت سے روح ڈالی، سر میں آئی، ناک کے نتھنوں میں آئی، سیدنا آدم علیہ السلام کو چھینک آئی، انہوں نے کہا: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ''، اللہ تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا: يَرْحَمُكَ اللّٰهُ آدم تیرے اوپر میری رحمت ہو۔

شریعتِ مصطفیٰ میں ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب چھینک آئے تو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ یا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہو، یہ تین لفظ حدیث میں آئے ہیں۔ چھینکنے والا ان تینوں میں کوئی ایک کہہ دے، اللہ کا امر پورا ہو جائے گا۔

پھر سننے والا کہے يَرْحَمُكَ اللّٰهُ اللہ تم پر رحمت فرمائے، احسان اور مہربانی کرے۔ پھر چھینکنے والا یہ کہے يَهْدِيْكُمُ اللّٰهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ اللہ تمہیں ہدایت دے، تمہارے دل اور حالات کو ٹھیک کرے۔ یہ بھی پڑھ سکتا ہے يَغْفِرُ اللّٰهُ لِيْ وَلَكُمْ۔

میرے محترم بھائیو! چھینک کا آنا بہت بڑی نعمت ہے، اس کے آنے پر دعائیں پڑھنی چاہئیں، ہاں وہ آدمی جسے زکام ہو وہ دعا نہ پڑھے۔ جمائی (تثاؤب) سستی کی علامت ہے اللہ کے نبی اس سے محفوظ رہتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام کو نہ نیند میں احتلام ہوتا ہے اور نہ ہی جمائی آتی ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ جو چھینک آنے پر دعاؤں کا اہتمام کرے گا اللہ تعالیٰ داڑھ کے درد سے محفوظ رکھیں گے۔

انسان بڑا اجلد باز ہے:

بہر حال حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی، انہوں نے کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ پھر روح آنکھوں میں آئی، سامنے مناظر دیکھے، پھر روح نیچے آئی کانوں اور زبان نے اپنا کام کرنا شروع کیا۔ جب روح آدھے دھڑ

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص: ۱۳۴، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

سے نیچے ہوئی تو سیدنا آدم علیہ السلام اُٹھنے لگے، دل میں آیا کہ یہ بڑے شاندار پھل ہیں، ان کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ [۱] انسان کے مزاج میں جلد بازی ہے۔[۲]

سیدنا آدم علیہ السلام اور آپ کی ذریت کا تحیۃ (سلام):

قَالَ اللّٰهُ يَاآدَمُ اِذْهَبْ اِلٰى هٰؤُلَآءِ النَّفَرِ فَقُلْ لَهُمْ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَقُوْلُوْنَ فَجَاءَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ فَقَالَ وَعَلَيْكَ السَّلَامُ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ . فَقَالَ يَاآدَمُ هٰذَا تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ [۳]

پھر جب روح تمام جسم میں پہنچ گئی اور کامل ہوگئی، تو سامنے ملائکہ کھڑے تھے اللہ نے فرمایا: آپ انہیں سلام کریں، چنانچہ آدم علیہ السلام نے انہیں کہا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فرشتوں نے جواب دیا وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: هٰذَا تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ یہ تیرا بھی سلام ہے اور تیری اولاد کا بھی سلام ہے اور جنت میں اہلِ جنّت کا بھی یہی سلام ہوگا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کے نام کی وجہ تسمیہ:

آدم: اگر یہ عربی لفظ ہے تو بمعنی صفحہ زمین یعنی زمین کی اوپر کی سطح۔ عند البعض اس کا اشتقاق اُدْمَةٌ سے ہے جس کے معنی ہیں گندم گوں۔ بعض کے نزدیک اَدْمٌ سے ہے بمعنی شرکت، چونکہ وہ پانی اور مٹی کی شرکت اور خمیر سے بنے ہیں اس لئے انہیں آدم کہا جاتا ہے۔ عند البعض اَدَمَةٌ بمعنی قابلِ اتباع وتقلید کے ہیں۔

آدم: اگر یہ سُریانی یا عبرانی لفظ ہے جیسا کہ علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ کہہ رہے ہیں، بمعنی خاک، آدم

---

[۱] الانبیاء: ۳۷

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص: ۱۳۴، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص: ۱۳۵، ط: رشیدیہ، کوئٹہ، صحیح البخاری باب خلق آدم وذریتہ ج۱ ص ۴۶۸، کتاب الاستیذان ج ۲ ص ۹۱۹

یعنی خاکی۔

قرآن کریم میں تین لفظ آئے ہیں: صَلْصَال ، حَمَأ اور مَسْنُوْن۔ مسنون: جس پر سالہا سال گزرنے سے تغیر آ گیا ہو، حمأ: کیچڑ، صلصال: بجتی ہوئی مٹی، کھنکھناتی ہوئی، بجنے والی مٹی جیسے ٹھیکرا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی جو ٹھیکری کی طرح تھی، اُس سے پیدا کیا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی کنیت:

سیدنا آدم علیہ السلام کی کنیت دنیا میں ابوالبشر اور جنّت میں ابومحمد ہوگی، اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ اللہ تعالیٰ نے انسانی مخلوق میں سیدنا آدم علیہ السلام کو سب سے زیادہ حسین بنایا۔[۱]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

اَهْلُ الْجَنَّةِ يُدْعَوْنَ بِاَسْمَآئِهِمْ اِلَّا اٰدَمَ فَاِنَّهٗ يُكَنّٰى اَبَا مُحَمَّدٍ[۲]

''جنّت میں حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت ابومحمد ہوگی، اس کے علاوہ کسی کو کنیت سے یاد نہیں کیا جائے گا''۔

آپ علیہ السلام کی یہ کنیت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہارِ شرف کے لئے ہوگی۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی جلالت ومنقبت کا اظہار اور فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم:

حق تعالیٰ شانہٗ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی جلالت، منقبت اور مرتبے کو ظاہر کرنے کے لئے فرشتوں کو آپ کے سامنے جھکایا۔ جیسے ہم کسی کو سلام کرتے ہیں، ایسے ہی فرشتوں کو تعظیم کے لئے حکم دیا کہ آدم کے سامنے جھکو۔ قرآن میں ہے:

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ، فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ، فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ، اِلَّآ

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۵۱، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۵۱، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

اِبْلِیْسَ ط [۱]

یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، چنانچہ جب میں اُسے پوری طرح بنادوں اور اُس میں اپنی رُوح پھونک دُوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر جانا، پھر ہوا یہ کہ سارے کے سارے فرشتوں نے تو سجدہ کیا، البتہ ابلیس نے نہ کیا۔

میرے بھائیو! یہ سجدہ عبادت کا نہیں تھا بلکہ احترام اور سلامی کا تھا، اس کو سجدہ تعظیم کہتے ہیں، اللہ نے اس کا صرف فرشتوں کو حکم دیا یا بعض امتوں میں یہ جائز رہا، شریعتِ محمدی میں اس سے منع کر دیا گیا۔

اگر کوئی زندہ یا مردہ آدمی کو سجدہ کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یا تو وہ اُس آدمی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر سجدہ کر رہا ہے اور اس سجدہ کو عبادت سمجھتا ہے، یہ حرام ہے اور واضح اور صریح کفر ہے۔

(۲) اگر احترام کے لئے جھک رہا ہے تو یہ شرک نہیں، مگر گناہ کبیرہ ہے اور اسے بھی ہماری شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

ابلیس ملعون کی سرکشی:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کا مرتبہ ومقام ظاہر کرنے لئے سب فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا، چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا اِلَّا اِبْلِیْسَ ابلیس نے نہیں کیا۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ جنات نے آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے زمین میں تہلکہ مچایا، فرشتوں نے مار مار کے اُنہیں سمندروں کی طرف دھکیل دیا۔ ابلیس کو گرفتار کر کے آسمانِ دنیا پر لے گئے، یہ تائب ہو گیا کہ مجھ سے جو غلطی ہوئی معافی چاہتا ہوں۔

فرشتوں کی دیکھا دیکھی ابلیس بھی عبادت میں لگ گیا اور بہت بڑا عبادت گزار بن گیا، یہاں تک کہ بعض فرشتے اِسے رئیس الملائکۃ کہنے لگے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور ملائکہ

---

[۱] سورۂ ص: ۷۱، ۷۲، ۷۳

کو اس کے سامنے جھکایا۔ اب یہ حکم فرشتوں کو تھا، ابلیس فرشتہ نہیں تھا، اسے تو اللہ تعالیٰ نے آگ سے پیدا کیا تھا، لیکن فرشتوں میں رہنے کی وجہ سے تبعاً اس کو بھی حکم تھا کہ تو بھی جھک۔ مگر حسد، عناد اور نخوت کی وجہ سے اس نے انکار کیا اور کہنے لگا میں کیسے آدم کے سامنے جھکوں؟

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ[۱]

''میں اُس سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے پیدا کیا آگ سے اور اُسے پیدا کیا مٹی سے''۔

آگ اوپر کو جاتی ہے اور اس میں یہ یہ کمالات ہیں۔

مٹی اور اس کے کمالات:

اسے کیا پتہ تھا کہ جس مٹی سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا ہے اس میں کیا کیا کمالات وصفات ہیں، اس میں تواضع ہے، وہ ساری انسانیت کو اپنے اوپر بسا رہی ہے، اللہ نے مٹی میں نمو رکھی ہے، فصلیں اس سے اُگتی ہیں، مٹی میں کمالِ تذلّل اور انکساری ہے، اللہ تعالیٰ نے ہزاروں کمالات مٹی میں رکھے ہیں، یہی وہ کمالات ہیں جو آدم علیہ السلام کو بلندیوں پر لے گئے، لیکن ابلیس انکاری بنا۔ ربّ العالمین نے اسے مردود قرار دیا اور حکم دیا: فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ[۲] یہاں سے تو نیچے چلا جا، تو میرا نافرمان ہے، تو نے میرا حکم نہیں مانا، میری جنت سے نکل جا، یہاں تجھے رہنے کی اجازت نہیں ہے۔

فرشتوں کا امتحان:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی مزید برتری ظاہر کرنے کے لئے فرشتوں کا امتحان لیا، کیونکہ فرشتوں نے کہا تھا کہ اے اللہ! اس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہم تیری عبادت کے لئے کافی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میرے علم کا وارث ہے اور یہ علم میں تم سے آگے نکل جائے گا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے روبرو سیدنا آدم علیہ السلام کو چیزوں کے نام گنوائے کہ یہ زمین ہے، یہ پہاڑ ہیں، یہ دریا ہیں، یہ ہوائیں ہیں، یہ آگ ہے، یہ کھانے پینے کی چیزیں ہیں،

---

[۱] الاعراف: ۱۲

[۲] ص: ۷۷

پرندوں کے نام یہ ہیں، ان جانوروں کے نام یہ یہ ہیں، گھریلو استعمال کی چیزوں کے نام یہ ہیں اور بنی آدم کی یہ یہ ضروریات ہیں، جتنی بھی انسان یا کسی فرد کو زمین اور زمین کی چیزوں کی ضرورت ہے، ان سب کے نام اللہ تعالیٰ نے گنوادیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

هِيَ هٰذِهِ الْاَسْمَاءُ الَّتِيْ يَتَعَارَفُ بِهَا النَّاسُ اِنْسَانٌ وَدَآبَّةٌ وَاَرْضٌ وَسَهْلٌ وَبَحْرٌ وَجَبَلٌ وَجَمَلٌ وَحِمَارٌ وَاَشْبَاهُ ذٰلِكَ مِنَ الْاُمَمِ وَغَيْرِهَا۔[۱]

یہ وہ نام تھے جن کو لوگ آپس میں جانتے ہیں جیسے انسان، جانور، آسمان، سمندر، پہاڑ، اونٹ، گدھا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت ربیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو تمام ملائکہ کے نام سکھائے تھے، اور عبدالرحمن بن زید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو ان کی اولاد کے نام بھی سکھادیئے تھے۔[۲]

وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ عَلَّمَهٗ اَسْمَاءَ الذَّوَاتِ وَاَفْعَالِهَا مُكَبَّرِهَا وَمُصَغَّرِهَا كَمَا اَشَارَ اِلَيْهِ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا[۳]

صحیح بات یہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے انواع وغیرہ کے نام اور اُن کے کاموں کے نام سکھائے تھے، جیسے انسان، چوپایہ، زمین اور ان کے کام وغیرہ۔ خواہ وہ چھوٹی چیزیں ہوں یا بڑی جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اب ملائکہ سے فرمایا: اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ ان کے نام بتاؤ۔ اب جس کو کسی شئی سے مناسبت ہی نہ ہو وہ کیا نام جانے؟ ایک آدمی ڈاکٹر ہے وہ ڈاکٹری آلات سے واقف ہے، اس کے سامنے کاشتکار کو بٹھادو، پھر ان آلات کے نام لیتے جاؤ، بعد میں پوچھو کہ ان کے نام کیا ہیں تو وہ کہے گا مجھے کیا پتہ کیا نام لئے

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۲، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۲، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۲، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

آپ نے؟ فرشتوں کو کیا پتہ؟ اس کا نام بھوک ہے، یہ دال کہلاتی ہے، یہ مرغی ہے، یہ تیتر ہے، یہ بٹیر ہے، انہوں نے جب کھانا ہی نہیں تو پتہ کیسے ہوگا؟ چنانچہ وہ جواب نہ دے سکے۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی علمی برتری:

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا: اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ اے آدم! تو خبر دے۔ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ سیدنا آدم علیہ السلام نے ساری چیزوں کے نام فوراً سنا دیے، ایک بھی نہیں بھولے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْۤ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ[۱] میں نہیں کہتا تھا کہ جو چیز میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علمی برتری کو فرشتوں پر ظاہر فرمایا۔

حضرت حوّا کی پیدائش:

اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام جنت میں رہنے لگے، تھوڑی سی گھبراہٹ محسوس ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے سکون کے لئے حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ حوّا کو حوّا اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ نے انہیں حیّ (زندہ) سے پیدا کیا۔ اس میں بھی دو قول ہیں، قرآن نے اتنا بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حوّا علیہما السلام کو پیدا کیا اور اُنہی کی نسل کو آگے چلایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً[۲]

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کی بیوی پیدا کی، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیئے۔

پہلا قول:

كَانَ يَمْشِيْ فِيْهَا وَحْشِيًّا لَيْسَ لَهٗ فِيْهَا زَوْجٌ يَسْكُنُ اِلَيْهَا. فَنَامَ نَوْمَةً

---

[۱] سورۃ البقرۃ: ۳۳۔

[۲] سورۃ النساء: ۱

فَاسْتَقْيَظَ وَعِنْدَ رَأْسِهٖ اِمْرَاَةٌ قَاعِدَةٌ خَلَقَهَا اللّٰهُ مِنْ ضِلْعِهٖ فَسَأَلَهَا مَنْ اَنْتِ؟ قَالَتْ: اِمْرَاَةٌ، قَالَ: وَلِمَ خُلِقْتِ قَالَتْ: لِتَسْكُنَ اِلَيَّ ۔فَقَالَتْ لَهُ الْمَلَائِكَةُ يَنْظُرُوْنَ مَا بَلَغَ مِنْ عِلْمِهٖ مَا اِسْمُهَا يَا آدَمُ؟ قَالَ: حَوَّاءُ، قَالُوْا وَلِمَ كَانَتْ حَوَّاء، قَالَ: لِاَنَّهَا خُلِقَتْ مِنْ شَيْءٍ حَيٍّ [۱]

سیدنا آدم علیہ السلام کو جب جنت میں داخل کیا گیا تو آپ علیہ السلام جنت میں پریشان رہتے تھے اور اجنبیت محسوس کرتے تھے، کیونکہ ان کے لئے کوئی ساتھی (بیوی) نہیں تھی جس سے وہ راحت وسکون حاصل کریں۔ ایک مرتبہ تھوڑی سی دیر سوئے، جب بیدار ہوئے تو اپنے سر کے پاس ایک عورت کو بیٹھے پایا جس کو اللہ تعالیٰ نے اُن کی پسلی سے پیدا فرمایا تھا۔

کامل لباس کے ساتھ کائنات کی حسین ترین عورت بیٹھی ہے، سیدنا آدم علیہ السلام نے فرمایا: تو کون ہے؟ کہنے لگی میں تیری بیوی ہوں۔ فرمایا: کس لئے تجھے پیدا کیا گیا ہے؟ کہا تاکہ تجھے سکون پہنچے، تجھے خوش کرنے کے لئے اللہ نے مجھے پیدا کیا۔ فرشتے جو ساتھ کھڑے دیکھ رہے تھے انہوں نے سیدنا آدم علیہ السلام کی وسعتِ علمی کا اندازہ لگانے کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ فرمایا حوّا، فرشتوں نے پوچھا حوّا کیوں؟ فرمایا اس لئے کہ یہ حسی (جاندار) چیز سے پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی جنت میں رہنے لگے۔

دوسرا قول:

یہ ہے کہ ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئیں، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

اَنَّهَا خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعِهِ الْاَقْصَرِ الْاَيْسَرِ وَهُوَ نَائِمٌ وَعِنْدَ رَأْسِهٖ اِمْرَاَةٌ قَاعِدَةٌ ۔[۲]

حوّاء حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں طرف کی چھوٹی پسلی سے پیدا کی گئی جب کہ آپ سو رہے تھے۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۶، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۶، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

یعنی اُن کی پیدائش میں کجی رکھ دی ہے۔ اسلئے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: اسے سیدھا نہ کرنا، زیادہ سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو ٹوٹ جائے گی یعنی طلاق کی نوبت آجائے گی، اس کے مزاج میں جو کجی ہے، اُسی کجی ہی سے کام لے لو:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا فَاِنَّ الْمَرْءَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعٍ وَاِنَّ اَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلْعِ اَعْلَاهُ فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ وَاِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ اَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا [۱]

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی کا برتاؤ رکھو، بے شک عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اور پسلی میں زیادہ ٹیڑھا حصہ بالائی حصہ ہوتا ہے (جہاں سے اس کی پیدائش ہے) پس اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو تم اس کو توڑ دو گے (یعنی طلاق ہوجائے گی) اور اگر چھوڑ دو گے تو برابر ٹیڑھی ہی رہے گی۔ لہٰذا عورتوں کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ رکھو۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوّا کو خمیرِ آدم سے پیدا کیا، یعنی اُس بقایا مٹی سے جس سے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہی لکھا ہے۔

فائدہ عظیمہ:

خُلِقَتْ مِنْ ضِلْعٍ میں مستورات کی کجی کی تمثیل سے سب عورتیں مراد نہیں، اکثریت کی بات ہے۔ مستورات میں تو حضرت آسیہ، حضرت مریم، ازواجِ مطہرات اور نبی ﷺ کی بیٹیاں بھی ہیں جن کا رُتبہ لاکھوں انسانوں سے اُونچا ہے۔ یہ اکثریت کے اعتبار سے کجی ہے، اس لئے کجی کی طرف اشارہ کیا ورنہ حقیقت میں خمیرِ آدم سے پیدا کی گئی ہے۔

جنت میں رہو، لیکن خاص درخت کے قریب مت جانا:

حق تعالیٰ شانہٗ نے ان سے فرمایا: يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا

---

[۱] صحیح البخاری کتاب الانبیاء، باب حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی پیدائش، ج:۱، ص:۴۶۹، البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۷

حَيْثُ شِئْتُمَا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، جہاں سے مرضی ہو کھاؤ پیو، وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ لیکن اتنی بات ہے کہ یہ خاص درخت ہے اس کے قریب نہ جانا۔[۱]

درخت کونسا تھا؟

قِيْلَ هِيَ الْكَرْمُ، عَنْ اَبِيْ مَالِكٍ: هِيَ النَّخْلَةُ، عَنْ مُجَاهِدٍ: هِيَ التِّيْنَةُ۔[۲]

بعض روایات میں ہے انگور کا درخت تھا، بعضوں نے کہا انجیر کا درخت، بعضوں نے کہا کھجور کا درخت اور بعضوں نے کہا گندم کا درخت تھا۔ گندم تو کوئی درخت نہیں، وہ تو ایک پودا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ عالم دوسرا ہے، ہوسکتا ہے وہاں یہ درخت کی شکل میں ہو۔

شیطان کا وسوسہ ڈالنا اور قسمیں کھانا:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ [۳] شیطان نے وسوسہ ڈالا، وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ[۴] میں تم دونوں سے قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ جس درخت سے روک رہے ہیں، اگر تم نے کھالیا تو تم فرشتوں کی طرح سدا جنت میں رہو گے۔

سیدنا آدم علیہ السلام اللہ کے قُرب کے شائق تھے، اللہ کی محبت میں فَنَسِيَ آدَمُ آدم علیہ السلام کو نسیان ہوا اور اس درخت کا پھل میاں بیوی نے کھالیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ [۵] ہم نے تو تمہیں روکا تھا کہ اس کا تم نے پھل نہیں کھانا، یہ کیوں کھایا؟

سیدنا آدم علیہ السلام کا گڑگڑا کر معافی مانگنا:

بس! وہ پھل کھانے کی دیر تھی اللہ تعالیٰ نے ان سے جنت کا لباس اتار لیا۔ اب یہ شرم کی وجہ سے

---

[۱] البقرۃ:۳۵

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۱۷، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] الاعراف:۲۰

[۴] الاعراف:۲۱

[۵] الاعراف:۲۲

بھاگنے لگے فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا[۱] ننگے ہو گئے، جنت کے پتے توڑ کر اپنے اوپر چپکانے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا آدم کیوں بھاگ رہے ہو؟ کہا اے اللہ! تیرے حیا کی وجہ سے، غلطی ہوگئی، اے میرے پروردگار! میں معافی چاہتا ہوں۔ حضرت آدم علیہ السلام زار و قطار روئے، قرآن کریم نے اُن کی ایک دعا کو ذکر کیا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ [۲]

اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نقصان اُٹھانے والے لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔

اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنی دعائیں مانگی ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہاری توبہ تو قبول ہے لیکن تمہیں نیچے زمین پر جانا ہوگا، وہاں میرے احکامات آئیں گے، جو میرے پیغام کو قبول کرے گا اس کا اصل ٹھکانا یہی جنت ہے اور جو قبول نہیں کرے گا اس کے لئے دوسرا ٹھکانا (جہنم) بنایا ہے۔

علامہ ابنِ جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَقَامَ فِي الْجَنَّةِ قَبْلَ اَنْ يَّهْبِطَ ثَلَاثًا وَّاَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَّاَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ [۳]

''دونوں میاں بیوی تنتالیس سال چار مہینے جنت میں رہے، پھر زمین پر اُترے''۔

زمین پر اُترنے کے بعد میاں بیوی جدا رہے حتی کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سیدنا آدم علیہ السلام کو حکم دیا: اَنْ يَّاْتِيَ اَهْلَهٗ کہ وہ اپنی اہلیہ کے پاس جائے۔[۴]

ہبوط ونزول:

ھبوط ونزولِ آدم وحوا علیہما السلام میں متعدد اقوال ہیں:

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام مکہ

---

[۱] طٰہٰ: ۱۲۱۔

[۲] الاعراف: ۲۳

[۳] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۴۲، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۴] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۲۶، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

اور طائف کے درمیان مقامِ دحنا میں اُترے۔

حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سیدنا آدم علیہ السلام ہند میں اُترے اور سیدہ حوا جدّہ میں۔

سُدّی رحمہ اللہ کا قول بھی ہند کا ہے، نیز فرمایا حجرِ اسود بھی اُن کے ساتھ اُترا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: آدم علیہ السلام صفا پر اور حوا علیہا السلام مروہ پر اُتریں۔ یہی بات درست ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کو طواف کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے تعلیم دیا، نزول کے بعد انہوں نے جہاں جہاں دُنیا میں قدم رکھے وہاں بستیاں آباد ہوئیں۔

بہترین دن جمعہ کا دن ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ قَالَ: خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ فِیْهِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ فِیْهِ خُلِقَ آدَمُ وَفِیْهِ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ وَفِیْهِ اُخْرِجَ وَفِیْهِ تَقُوْمُ السَّاعَةُ[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا بہترین دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی، اسی دن ان کا جنت میں دخول ہوا اور اسی میں ان کو جنت سے نکالا گیا، اور اسی میں قیامت قائم ہوگی۔

پہلا کھانا جو زمین پر کھایا گیا:

سیدنا آدم علیہ السلام نے دنیا میں جو پہلا کھانا کھایا وہ گندم ہے، اَنْ جَآءَهٗ جِبْرِیْلُ بِسَبْعِ حَبَّاتٍ مِّنْ حِنْطَةٍ حضرت جبرائیل علیہ السلام سات دانے گندم کے لائے اور کہا یہ وہ چیز ہے جس سے آپ جنت میں نہ رُکے، اب اس کو زمین میں بکھیر دو، ایک دانہ دُنیا کی گندم کے لاکھ دانوں کے بقدر بڑا تھا۔ اس کو کاشت کیا، پھر کاٹا، پھر پیسا، پھر آٹا گوندھا، بڑی مشقت کے بعد کھایا، اس لئے تو فرمایا: فَلَا یُخْرِجَنَّكُمَا

---

[1] مسند امام احمد، ج: ۲، ص: ۵۴۰، البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۲۵، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

مِنَ الْجَنَّةِ شیطان تمہیں جنت سے نہ نکال دے، فَتَشْقٰى ورنہ مشقت میں پڑ جاؤ گے۔[۱]

پہلا لباس:

پہلا لباس بھیڑ کی اُون کا لباس تھا۔ اُون کاٹی، سوت بنایا، پھر کاتا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا جبہ بنا اور حضرت حوّا کا کرتا اور دوپٹہ بنا۔

میدانِ عرفات میں اولادِ آدم کا اجتماع:

اللہ تعالیٰ نے عرفات کے میدان میں تمام اولادِ آدم کو ان کی پیٹھ سے نکال کر جمع کیا، قرآن میں ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ [۲]

کہ ہم نے اولادِ آدم کو آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالا۔

کیونکہ روحیں تو پہلے پیدا ہو چکی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ہر روح کو چھوٹا سا جسم دے کر ساری ذریت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالا۔ غور سے سنو! جیسے اللہ کے لئے یہ مشکل نہیں کہ ساری وسعتوں کو لپیٹ کر ایک ذرّے میں رکھ دے اور ایک ذرہ کو بڑھا کر پوری دنیا میں پھیلا دے، اسی طرح ساری اولاد، آدم ہی سے نکلی، دنیا میں جتنی کھجوریں ہیں پہلی گٹھلی میں تھیں، دنیا میں جتنی گائیں آرہی ہیں، سب پہلی گائے ہی میں تھیں، دنیا میں جتنے تربوز آرہے ہیں، یہ سب پہلے ہی بیج میں تھے۔ جیسے انسان کے نطفے کے ایک قطرے میں لاکھوں جرثومے جمع کر دیے، وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ۔

اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی شکل میں نکال کر اُن سے عہد لیا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ سب نے عرض کیا کیوں نہیں؟ ہم سب گواہی دیتے ہیں کہ آپ ہمارے پروردگار ہیں۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ اَخَذَ الْمِيْثَاقَ مِنْ ظَهْرِ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِنُعْمَانَ يَوْمَ عَرَفَةَ

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص: ۱۴۳، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] الاعراف: ۱۷۲

فَاَخْرَجَ مِنْ صُلْبِهٖ كُلَّ ذُرِّيَّةٍ ذَرَأَهَا فَنَثَرَهَا بَيْنَ يَدَيْهِ (الحدیث) [۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت والی اولاد سے نعمان نامی میدان میں عرفہ کے روز عہد لیا، وہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن تمام کو حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے پھیلا دیا، پھر اُن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے عرض کیا کیوں نہیں؟

فرمانبردار اور نافرمان:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ حِيْنَ خَلَقَهٗ فَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُمْنٰى فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً بَيْضَآءَ كَاَنَّهُمُ الذَّرُّ وَضَرَبَ كَتِفَهُ الْيُسْرٰى فَاَخْرَجَ ذُرِّيَّةً سَوْدَآءَ كَاَنَّهُمُ الْحُمَمُ، فَقَالَ: لِلَّذِيْ فِيْ يَمِيْنِهٖ اِلَى الْجَنَّةِ وَلَا اُبَالِيْ، وَقَالَ: لِلَّذِيْ فِيْ كَفِّهِ الْيُسْرٰى اِلَى النَّارِ وَلَا اُبَالِيْ [۲]

ربُّ العالمین نے ساری ذریّت آدم علیہ السلام کے دائیں بائیں بکھیر دی۔ اِدھر (دائیں طرف) دیکھا تو سارے چہرے چمک رہے ہیں، ادھر (بائیں طرف) سارے چہرے سیاہ۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے؟ فرمایا: یہ تیری ذریت ہے، یہ (دائیں طرف والی) تیری جو اولاد ہے یہ دنیا میں جا کر اپنے اختیار سے نیک کام کرینگے، انہیں میں جنت میں بھیجوں گا اور یہ (بائیں طرف والے) اپنے اختیار سے میری نافرمانی کریں گے، انہیں جہنم میں بھیجوں گا۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے چہرے کا زیادہ چمکنا:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۴۰، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۳۷، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

سَلَّم: لَمَّا خَلَقَ آدَمَ مَسَحَ ظَهْرَهٗ فَاَخْرَجَ مِنْهُ مَاهُوَ مِنْ ذَرَارِیْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ فَجَعَلَ یَعْرِضُ ذُرِّیَّتَهٗ عَلَیْهِ فَرَاٰی فِیْهِمْ رَجُلًا یَزْهَرُ فَقَالَ: اَیْ رَبِّ مَنْ هٰذَا؟ قَالَ: هٰذَا ابْنُکَ دَاوٗدُ. قَالَ: اَیْ رَبِّ کَمْ عُمُرُهٗ؟ قَالَ: سِتُّوْنَ عَامًا قَالَ: اَیْ رَبِّ زِدْفِیْ عُمُرِهٖ قَالَ: لَا. اِلَّا اَنْ اُزِیْدَهٗ مِنْ عُمُرِکَ وَکَانَ عُمُرُ آدَمَ اَلْفَ عَامٍ فَزَادَهٗ اَرْبَعِیْنَ عَامًا۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کی کمر کو چھوا، جس سے اُن کی تمام اولاد نکل آئی، اللہ تعالیٰ نے اُن کو حضرت آدم علیہ السلام پر پیش کیا، ایک چہرہ زیادہ چمکتا ہوا نظر آیا، عرض کیا اے اللہ! یہ کون ہے؟ فرمایا: یہ تیرا بیٹا داؤد ہے۔ اے اللہ! اس کی عمر کتنی ہے؟ فرمایا: اس کی عمر ساٹھ (۶۰) سال ہے، اے اللہ! میری عمر کتنی ہے؟ فرمایا: تیری عمر ہزار سال ہے، کہا اے اللہ! اس کی عمر تھوڑی رکھی ہے، میری عمر میں سے چالیس سال اس کو دے دیجئے۔

فائدہ جلیلہ:

سیدنا آدم علیہ السلام نے جب اولاد کو دیکھا ''فِیْهِمْ اَجْذَمُ، اَبْرَصُ، اَعْمٰی'' ان میں جذام، برص، اندھے پن اور مختلف بیماریوں والے تھے، پوچھا اے ربّ! ایسا کیوں کیا؟ جواب ملا کَیْ یَشْکُرُوْا نِعْمَتِیْ تاکہ میری نعمتوں کی شکرگزاری کریں۔

سیدنا آدم علیہ السلام کے ۱۲۰ بیٹے اور ۱۲۰ بیٹیاں:

وَقِیْلَ مِائَةٌ وَّعِشْرِیْنَ بَطْنًا فِیْ کُلِّ وَاحِدٍ ذَکَرٌ وَّاُنْثٰی. اَوَّلُهُمْ قَابِیْلُ وَاُخْتُهٗ قَلِیْمَا وَآخِرُهُمْ عَبْدُ الْمُغِیْثِ وَاُخْتُهٗ اَمَةُ الْمُغِیْثِ[۲]

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۳۸، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۴۹، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

سیدنا آدم علیہ السلام کے ۱۲۰ لڑکے اور ۱۲۰ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ حضرت حوا کے ہر حمل سے دو بچے پیدا ہوئے، ایک بیٹا ایک بیٹی۔ سب سے پہلے بیٹے کا نام قابیل اور سب سے پہلی بیٹی کا نام قلیما تھا اور سب سے آخری بیٹے کا نام عبدالمغیث اور آخری بیٹی کا نام امۃ المغیث تھا۔

سیدنا آدم علیہ السلام کا انتقال:

اِنَّ اٰدَمَ لَمَّا حَضَرَهُ الْمَوْتُ قَالَ: لِبَنِيْهِ اَیْ بُنَیَّ اِنِّیْ اَشْتَهِیْ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ فَذَهَبُوْا یَطْلُبُوْنَ لَهٗ، فَاسْتَقْبَلَتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ وَ مَعَهُمْ اَكْفَانُهٗ وَحُنُوْطُهٗ وَمَعَهُمُ الْفُؤُوْسُ وَالْمَسَاحِیْ وَالْمَكَاتِلُ فَقَالُوْا لَهُمْ یَابَنِیْ آدَمَ مَاتُرِیْدُوْنَ وَمَا تَطْلُبُوْنَ، قَالُوْا: اَبُوْنَا مَرِیْضٌ وَاشْتَهٰی مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، فَقَالُوْا لَهُمْ اِرْجِعُوْا فَقَدْ قُضِیَ قَضَاءُ اَبِیْكُمْ[۱]

حضرت آدم علیہ السلام کا جب انتقال ہونے لگا تو اپنے بیٹوں سے کہا، میرا پھل کھانے کو دل چاہا رہا ہے، لہٰذا جنگل میں سے کہیں سے تلاش کر کے لے آؤ۔ وہ تلاش کرنے جا رہے تھے راستے میں فرشتے ملے جن کے پاس کفن، خوشبو اور قبر کھودنے کے آلات بیلچے، پھاوڑے، ٹوکری وغیرہ اشیاء تھیں۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو، کہا والد صاحب کی چاہت پوری کرنے۔ انہوں نے کہا واپس چلو تمہارے والد صاحب کا وقت آ گیا ہے۔

لَمَّا احْتُضِرَ آدَمُ اَتَتْهُ الْمَلَائِكَةُ لِتَقْبِضَهٗ قَالَ: اِنَّهٗ قَدْ بَقِیَ فِیْ عُمْرِیْ اَرْبَعُوْنَ عَامًا، فَقِیْلَ: اِنَّكَ قَدْ وَهَبْتَهَا لِابْنِكَ دَاوٗدَ، قَالَ: مَا فَعَلْتُ[۲]

چنانچہ وہ فرشتے سیدنا آدم علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارا وقت آ گیا ہے فرمایا: ابھی تو چالیس سال باقی ہیں، انہوں نے کہا آپ نے چالیس سال داؤد علیہ السلام کو نہیں دیے؟ آدم علیہ السلام بھول گئے، کہا میں نے تو نہیں دیے۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۵۳، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] مسند احمد رقم الحدیث ۲۲۷۴ ج۱ ص ۳۳۰، البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۳۸، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سیدنا آدم علیہ السلام بھول گئے اس کی اولاد بھی قیامت تک بھولتی رہے گی۔ صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات ہے جو بھول چوک سے پاک ہے، ''مَاكَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا''۔

غسل، کفن، دفن اور جنازے کا طریقہ:

میرے محترم بھائیو! اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا ہے، یہاں کے ہر کام کو سبب کے ساتھ جوڑا ہے۔ جب آدم علیہ السلام فوت ہو گئے تو فرشتوں نے اولادِ آدم کو غسل، کفن، جنازہ اور دفن کا طریقہ سکھایا کہ یہ کسی ہے اس سے گڑھا کھودتے ہیں، ہم تمہارے سامنے تمہارے والد کو نہلائیں گے۔ اب فرشتے نہلا رہے ہیں، اولاد دیکھ رہی ہے، پھر عبادت کی جگہیں جہاں آدمی عبادت کرتا ہے یعنی ہاتھ، ناک، پیشانی، گھٹنے اور پاؤں، ان جگہوں پر حنوط اور خوشبو لگائی، جو جنت سے لائے تھے اور وہ کفن جو جنت سے لائے تھے وہ پہنایا۔

کائنات میں سب سے پہلا جنازہ:

فرشتوں نے کہا اب ہم تمہارے سامنے تمہارے والد صاحب کا جنازہ پڑھتے ہیں اور یہی طریقہ قیامت تک چلے گا۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام آگے ہوئے، فرشتے اور اولاد پیچھے کھڑی ہوئی، کائنات میں پہلا جنازہ سیدنا آدم علیہ السلام کا جبرائیل علیہ السلام نے پڑھایا۔

اس کے بعد دفن کا طریقہ بتایا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو قبر کھودی ہوئی رکھ دیتا، کیسوں کے ساتھ قبر کھودوائی، کہ تم بھی آئندہ اسی طرح قبر کھودنا اور اس میں دفن کرنا۔ فرشتوں نے کہا جیسے ہم نے کیا ہے اگر کوئی فوت ہو جائے تو غسل یوں دینا، کفن یوں پہنانا، پھر جنازہ یوں پڑھنا اور پھر قبر کھود کر یوں دفن کرنا۔

قَبَضُوْهُ وَغَسَّلُوْهُ وَكَفَّنُوْهُ وَحَنَّطُوْهُ وَحَفَرُوْلَهٗ وَلَحَّدُوْهُ وَصَلُّوْا عَلَيْهِ ثُمَّ دَخَلُوْا قَبْرَهٗ فَوَضَعُوْافِيْ قَبْرِهٖ ثُمَّ حَثَوْاعَلَيْهِ ثُمَّ قَالُوْا: يَابَنِيْ اٰدَمَ هٰذِهٖ سُنَّتُكُمْ۔[1]

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۱۵۳، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

فوائدِ جلیلہ:

۱۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو جمعہ کی آخری گھڑی میں پیدا کیا اور اُن کی وفات بھی جمعہ کے دن ہوئی، سیدنا آدم علیہ السلام کے جنازہ پر فرشتوں نے چار تکبیریں کہیں، مکۃ المکرمہ میں جبل ابی قُبیس میں دفن ہوئے۔ حضرت حوا علیہا السلام کا ایک سال بعد انتقال ہوا۔

۲۔ سیدنا آدم علیہ السلام کی وفات پر ساری مخلوق سات دن روتی رہی۔

آخری گزارش:

میرے محترم بھائیو! یہ میں نے تھوڑی سی تمہید باندھی ہے، کیونکہ آگے ان شاء اللہ قربانی کا بیان بھی آئے گا، آدم علیہ السلام کے بیٹوں کی قربانی کا ذکر بھی ہوگا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں بھی ساری زندگی انبیاء کرام علیہم السلام اور بالخصوص سید الاولین والآخرین کی کامل اتباع نصیب فرمائے، خاص کر قربانی کی لائن میں اللہ تعالیٰ نے جیسے ابراہیم علیہ السلام کو مقام دیا اور آپ ﷺ نے ان کی کامل اتباع کی، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی زندگی کی ہر نہج میں اپنے پیاروں کی راہ پر چلائے۔ آمین۔

(وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

"اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ"۔ (المائدہ:۲۷)

ہابیل وقابیل

کی

قربانی کا واقعہ

ہابیل وقابیل کی قربانی کا واقعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۔[۱]

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَيْسَ مِنْ نَفْسٍ تُقْتَلُ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلٰى اِبْنِ آدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِّنْهَا لِاَنَّهٗ سَنَّ الْقَتْلَ اَوَّلًا[۲]

وَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ: مَنْ سَنَّ فِي الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ كُتِبَ عَلَيْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يُنْقَصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ[۳]

خطبہ مسنونہ کے بعد:

گزشتہ جمعہ سیدنا آدم علیہ السلام اور حوّا علیہا السلام کا تذکرہ گذر چکا ہے، اس جمعہ اُن کے بیٹوں کی قربانی کا تذکرہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو ایک سو بیس بیٹے اور ایک سو بیس بیٹیاں عطا فرمائی تھیں۔ ایک قول یہ ہے کہ بڑا بیٹا اور بیٹی جنت میں پیدا ہوئے اور محققین علما فرماتے ہیں کہ ساری اولاد زمین پر پیدا ہوئی۔ ہر بطن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ پہلا بیٹا قابیل اور بیٹی اقلیمہ پیدا ہوئی، آخری بیٹا عبدالمغیث اور آخری بیٹی اَمَۃ المغیث پیدا ہوئی (مُغیث اللہ کا نام ہے بمعنی فریادرسی کرنے والا، اللہ کا بندہ، اللہ کی بندی)۔[۴]

سیدنا آدم علیہ السلام کے بارے میں آتا ہے:

---

[۱] المائدہ: ۲۷

[۲] صحیح البخاری، ج ۲، ص ۱۰۸۸۔ مسند احمد، ج: ۱، ص: ۴۹۸

[۳] صحیح المسلم: ج ۲، ص ۳۴۱

[۴] البدایہ والنہایہ، ج: ۱، ص: ۱۴۹، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

كَانَ عُمُرُ آدَمَ اَلْفَ عَامٍ [۱]

''سیدنا آدم علیہ السلام کی عمر ایک ہزار سال تھی''۔

اِن کی اپنی زندگی میں ہی ان کی اولاد کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ چکی تھی:

وَقَدْ ذَكَرَ اَهْلُ التَّارِيْخِ اَنَّ آدَمَ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى رَاٰى مِنْ ذُرِّيَّتِهٖ مِنْ اَوْلَادِهٖ وَاَوْلَادِ اَوْلَادِهٖ اَرْبَعَ مِائَةِ اَلْفِ نَسَمَةٍ [۲]

اہل تاریخ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات نہ ہوئی جب تک کہ انہوں نے اپنی اولاد کی اولاد، پھران کی اولاد نہ دیکھ لی، اور تقریباً چار لاکھ جانیں دیکھ کر پھر وفات پائی۔

قابیل اور ہابیلؓ کا قصہ:

قرآنِ کریم کے چھٹے پارہ میں سیدنا آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ [۳]

اے محمد ﷺ! آپ اپنی اُمت کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا قصہ سُنا دیں، جب دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی تھی، اُن میں سے ایک کی قربانی قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی، اُس دوسرے نے پہلے سے کہا کہ میں تجھے قتل کر ڈالوں گا، پہلے نے کہا اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں سے قربانی قبول کرتا ہے جو متقی ہوں۔

قرآنِ کریم تاریخ یا قصوں کی کتاب نہیں ہے، ان واقعات میں بے شمار عبرت کے مضامین ہوتے ہیں جو ہمارے لئے رہبر اور رہنما ہیں۔ یہ اُن کی قربانی کا قصہ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اسے بیان کیا۔

---

[۱] مسند احمد: رقم الحدیث ۲۲۷۴، ج۱، ص ۳۳۰، البدایۃ: ج۱، ص ۶۸

[۲] البدایۃ والنھایۃ: ج۱، ص: ۱۴۹، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] المائدہ: ۲۷

سیدنا آدم علیہ السلام کا بڑا بیٹا قابیل اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والی بیٹی اقلیمہ تھی، آدم علیہ السلام کی شریعت میں اُن دونوں کا نکاح آپس میں حرام تھا۔ ایک حمل کا بیٹا دوسرے حمل کی بیٹی سے اور دوسرے حمل کا بیٹا پہلے حمل کی بیٹی سے نکاح کرتا تھا۔

اللہ کی شان! قابیل کے ساتھ جو بہن پیدا ہوئی وہ حسین تھی اور دوسرے بیٹے ہابیل کے ساتھ جو بہن پیدا ہوئی وہ اِتنی حسین نہ تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بڑے بیٹے سے فرمایا کہ تم ہابیل کی ہمشیرہ سے نکاح کرلو اور ہابیل تمہاری ہمشیرہ سے نکاح کرلے۔ مگر وہ بگڑ گیا اور کہنے لگا میرے ساتھ جو پیدا ہوئی ہے میں اسی سے ہی نکاح کروں گا۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے فرمایا یہ تو حرام ہے، لیکن وہ اَڑ گیا، پہلی خطا اس کی نیت کی خرابی سے شروع ہوئی۔

قابیل وہابیل کا قربانی پیش کرنا:

جب قابیل نے اپنی بات پر اصرار کیا تو آدم علیہ السلام نے فرمایا یوں کرو، اس جھگڑے کو ختم کرنے کی ایک صورت ہے، وہ یہ کہ تم اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کرو۔ جس کی قربانی قبول ہوگئی، اُس کا مؤقف صحیح ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کو یقین تھا کہ شریعت یہی ہے، اس لئے صاف ظاہر ہے کہ قربانی ہابیل رضی اللہ عنہ ہی کی قبول ہوگی۔ ہابیل رضی اللہ عنہ ریوڑ چراتا تھا، اس کے پاس ایک دُنبہ تھا جو بہت عمدہ تھا، پہاڑ کی چوٹی پر جا کر اُسے ذبح کیا اور ڈرتے ہوئے کہا: اے میرے اللہ! میری اس قربانی کو قبول فرما اور جو حق ہے اس کو ظاہر فرما۔

قابیل کھیتی باڑی کرتا تھا۔ اپنے کھیت میں سے رَدّی قسم کا غلہ پہاڑ پر لے گیا، اللہ کی بارگاہ میں بطور قربانی کے پیش کیا۔ پچھلی اُمتوں میں سُفید قسم کی آگ آ کر قربانی کو جلا دیتی تھی، جس کی قربانی جل گئی گویا اللہ کی بارگاہ میں وہ قبول ہوگئی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ قابیل کی نیت شروع ہی سے فاسد تھی کہ قربانی قبول ہو یا نہ ہو میں اپنی سگی بہن سے ہی نکاح کروں گا۔

ہابیلؓ کی قربانی کا قبول ہونا اور قابیل کی قربانی کا مردود ہونا:

جب دونوں نے اپنی اپنی قربانی پیش کردی تو اوپر سے آگ آئی اور اُس نے ہابیلؓ کی قربانی کو جلا دیا۔

اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مالک نے میری قربانی قبول کر لی اور قابیل کا غلہ ویسے ہی پڑا رہا، کوئی آگ نہ آئی۔ بجائے اس کے کہ وہ توبہ کرتا، حسد کی آگ میں جلنے لگا، چڑ میں آ گیا اور جھلا اُٹھا کہ تیری قربانی قبول ہوگئی، میری کیوں قبول نہیں ہوئی!؟ ہابیل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قربانی اللہ ہی قبول کرتے ہیں میرے ہاتھ میں تو نہیں ہے، اللہ کی نگاہ ہر ایک کے دِل پر ہے، اللہ تعالیٰ ہر ایک کا تقویٰ اور اخلاص دیکھتے ہیں۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ [۱] جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اُس کی قربانی قبول کرینگے۔ اہلِ اخلاص، اہلِ صدق اور اہلِ تقویٰ کی قربانی قبول ہوتی ہے۔

قتل کا ارادہ:

اَب قابیل حسد کی آگ میں جلا ہوا تھا، اس نے اِرادہ کیا کہ میں اپنے بھائی ہابیل کو قتل کروں گا۔ ہابیل رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا لَاَقْتُلَنَّكَ میں تمھیں قتل کروں گا۔

ہابیل رضی اللہ عنہ پر خشیتِ الٰہی:

ہابیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا تم کرتے ہو تو کرو:

مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ [۲]

میں تمہاری طرف اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، میں مقتول رہ جاؤں گا، مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ تم نے یہ کام کرنا ہے تو کر لو میں نہیں کروں گا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: حالانکہ ہابیل رضی اللہ عنہ طاقت میں اُس سے زیادہ تھا، اگر یہ مُکافات کرتا تو کر سکتا تھا، لیکن یہ اس بات سے ڈرا کہ میرا اس پر ہاتھ اُٹھانا درست نہیں، کہیں میں ظالم نہ بن جاؤں۔

سیدنا آدم علیہ السلام بیت اللہ حج کرنے آئے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ساتوں آسمانوں پر بیت العزت اور زمین پر یہ میرا گھر بیت اللہ ہے تم اس کا طواف کرو!

---

[۱] المائدۃ: ۲۷۔

[۲] المائدۃ: ۲۸

شیطان کا قتل کی تعلیم دینا:

لَمَّا قَصَدَ قَابِيْلُ قَتْلَهٗ لَمْ يَدْرِ كَيْفَ يَقْتُلُهٗ . قَالَ اِبْنُ جُرَيْجٍ : فَتَمَثَّلَ لَهٗ اِبْلِيْسُ وَاَخَذَ طَيْرًا فَوَضَعَ رَأْسَهٗ عَلٰى حَجَرٍ ثُمَّ شَدَخَ رَأْسَهٗ بِحَجَرٍ آخَرَ وَقَابِيْلُ يَنْظُرُ اِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْقَتْلَ۔ [۱]

قابیل سوچ رہا تھا کہ قتل کیسے کروں۔ شیطان انسانی شکل میں اس کے پاس آیا اور ایک پرندے کو پتھر مارا، وہ خبیث اُس کو تعلیم دے رہا تھا کہ یوں مارو۔ حضرت ہابیل رضی اللہ عنہ سوئے ہوئے تھے، قابیل نے اوپر سے زور سے پتھر مارا، پھر اُن کے سر مبارک پر ہتھوڑے سے ضرب لگائی جس سے وہ شہید ہو گئے۔ [۲]

زمین کانپی، ایک روایت میں ہے کہ سات دِن زمین کانپتی رہی، یہ روئے زمین پر پہلا قتل تھا۔

عالَم میں ہابیلؓ کے قتل پر منحوس اثرات کا ظاہر ہونا:

۱۔ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام مکۃ المکرمہ میں تھے۔ درخت کی طرف مسواک بنانے گئے تو دیکھا کانٹے آ گئے، پہلے درختوں پر کانٹے نہیں ہوا کرتے تھے۔

۲۔ دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ پہلے درختوں پر پھل خراب نہیں ہوتے تھے، اب خراب ہونے لگ گئے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کے بعض چشمے کڑوے ظاہر کر دیئے، پہلے سارا پانی میٹھا ہوا کرتا تھا۔

۴۔ زمین کی مٹی جمی ہوئی تھی، اس پر دھول اور گرد اُڑنا شروع ہو گئی۔

سیدنا آدم علیہ السلام کانپ گئے کہ یہ کوئی حیرت انگیز واقعہ ہوا ہے۔ درختوں، پھلوں، زمین اور پانی میں جو اِتنے اَثرات آ گئے ہیں ضرور کسی نے کوئی منحوس کام کیا ہے۔ میرے عزیزو! ایک قتل پر یہ منحوس اَثرات ظاہر ہوئے۔ جب عام قتل وغارت ہو گی تو پھر کتنے بُرے اَثرات ظاہر ہونگے؟

---

[۱] تفسیر البغوی: ج ۲ ص ۲۹، روح المعانی: ج ۴ ص ۱۱۴

[۲] تفسیر ابن کثیر: ج ۲ ص ۵۲۳

ظلم اور قطع رحمی کی سزا دنیا میں:

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

مَامِنْ ذَنْبٍ اَحْرٰی اَنْ یُعَجِّلَ بِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ مَعَ مَا یُؤَخِّرُ لَهٗ فِی الْآخِرَةِ مِنْ بَغْیٍ اَوْ قَطِیْعَةِ رَحِمٍ۔[۱] وَفِیْ رِوَایَةٍ: ذَنْبَانِ مُعَجَّلَانِ لَا یُؤَخَّرَانِ اَلْبَغْیُ وَقَطِیْعَةُ الرَّحِمِ۔[۲]

اللہ تعالیٰ دو چیزوں کی سزا جلدی دیتے ہیں: (۱) قطع رحمی کی سزا، ماں باپ یا رشتہ داروں کے ساتھ قطع رحمی کی ہے تو مرنے سے پہلے اس کی سزا آئے گی۔ (۲) ظلم کی سزا، یہ بھی اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے دیں گے اور آخرت کی سزا بھی معاف نہیں ہوگی۔

ہابیل رضی اللہ عنہ کی لاش کی تدفین:

قابیل قتل کرنے کے بعد پریشان ہوا کہ اب کیا کروں؟ کیونکہ پہلے کوئی میت تو دیکھی نہیں تھی۔ اب لاش کو لیکر پھر رہا ہے، ایک مدت گزر گئی۔ دو کوّے تھے، اُن میں سے ایک کوّا مر گیا تو دوسرے کوّے نے زمین کو چونچ اور پنجے کے ساتھ کھودا یُوَارِیْ سُوْءَةَ اَخِیْهِ تاکہ وہ اپنے ہم جنس کوّے کو دفن کرے۔ قابیل کے سامنے دفن کیا۔ یہ کہنے لگا: یٰوَیْلَتٰٓی اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ [۳] میں تو اس کوے سے بھی گیا گزرا ہوں۔ اُس نے تو اپنے ہم جنس کو دفن کیا، مجھے تو دفن کا طریقہ بھی نہیں آ رہا۔ پھر اس نے گڑھا کھود کر حضرت ہابیل رضی اللہ عنہ کو چھپا دیا۔

قابیل کو نقد سزا کیا ملی؟

اللہ تعالیٰ نے سزا کیا دی؟ ایک روایت میں آتا ہے:

---

[۱] مسند احمد: رقم الحدیث ۲۰۳۹۸، ج ۵، ص ۴۵

[۲] مسند احمد: رقم الحدیث ۲۰۴۰۴، ج ۵، ص ۴۶

[۳] المائدۃ: ۳۱۔

قَالَ مُجَاهِدٌ: عُلِّقَتْ اِحْدٰى رِجْلَى الْقَاتِلِ بِسَاقِهَا اِلٰى فَخِذِهَا مِنْ يَوْمَئِذٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ فِي الشَّمْسِ حَيْثُمَا دَارَتْ دَارَ، عَلَيْهِ فِي الصَّيْفِ حَظِيْرَةٌ مِّنْ نَارٍ وَعَلَيْهِ فِي الشِّتَاءِ حَظِيْرَةٌ مِّنْ ثَلْجٍ۔[۱]

اس کی پنڈلی ران سے چمٹ گئی اور اس کا ہاتھ اکثر ران سے چمٹا رہتا تھا۔ دوسرا یوں ہی چلتا تو اس کا چہرہ خود بخود سورج کی طرف ہوجاتا تھا جیسے سورج مکھی کا پھول سورج کی طرف ہوجاتا ہے۔ گرمی میں کوئی ہاتھ لگاتا تو تنور کی طرح گرم ہوتا اور سردی میں کوئی ہاتھ لگاتا تو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

اُس کا بیٹا پیدا ہوا تو وہ اندھا پیدا ہوا۔ پھر اس اندھے سے پیدا ہونے والی اولاد نے سب سے پہلے دُنیا میں طبل، ڈھول، باجے بجائے اور شراب پی۔ اس لئے کہ حرام کام کی نحوست چلتی ہے، وہ آگے اولاد میں سرایت کرجاتی ہے۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی:

كُنْ كَخَيْرِ ابْنَيْ آدَمَ[۲] مسلمان کے ساتھ لڑائی ہوجائے تو آدم علیہ السلام کا جو بہترین بیٹا تھا (ہابیلؓ) ویسے بننا، قابیل نہ بننا، یعنی مظلوم بن جانا ظالم نہ بننا۔

ایک جگہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا تَوَاجَهَ الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَ الْمَقْتُوْلُ فِي النَّارِ، قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذَا الْقَاتِلُ فَمَا بَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ: اِنَّهٗ اَرَادَ قَتْلَ صَاحِبِهٖ[۳]

جب دو مسلمان تلواروں کے ساتھ آمنے سامنے ہوں تو قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ فرمایا: ان میں سے ہر ایک دوسرے کو مارنا چاہتا تھا، نیت دونوں کی خراب تھی۔ ایک قاتل بن

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج ۲، ص ۵۲۳

[۲] البدایۃ: ج ۱، ص ۷۱۔ ابوداؤد: باب النہی عن السعی فی الفتنۃ: ج ۲، ص ۲۳۵۔ مسند احمد: رقم الحدیث ۱۶۱۴، ج ۱، ص ۲۳۴

[۳] سنن ابی داؤد باب فی النہی عن القتال فی الفتنۃ، ج ۲، ص ۲۳۷۔ صحیح البخاری: باب اذا التقی المسلمان بسیفیہما ج ۲، ص ۱۰۴۹۔ صحیح المسلم: کتاب الفتن، ج ۲، ص ۳۸۹۔ مسند احمد: رقم الحدیث ۲۰۴۹۶، ج ۵، ص ۸۵

گیا، دوسرا مقتول، کیونکہ مقتول کا ارادہ بھی قتل کرنے کا تھا۔

اور اگر مقتول نے صبر کیا تو پھر ویسے ہوگا جیسے ہابیل رضی اللہ عنہ نے کہا تھا:

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ [۱]

کہ پھر میرے گناہ بھی تُو ہی لے گا۔ جب کوئی کسی کو ظلماً قتل کرے تو قاتل پر مقتول کے گناہ آجاتے ہیں اور مقتول پاک، صاف ہوجاتا ہے۔

قیامت تک ہر قتل میں قابیل کا حصہ:

اب قابیل نے خبیث طریقہ جاری کیا تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

لَیْسَ مِنْ نَفْسٍ تُقْتَلُ ظُلْمًا اِلَّا کَانَ عَلٰی اِبْنِ آدَمَ الْاَوَّلِ کِفْلٌ مِّنْهَا لِاَنَّهٗ سَنَّ الْقَتْلَ اَوَّلًا [۲]

قیامت تک جتنے قتل ہوں گے، ہر قتل میں قابیل کا حصہ بھی شامل ہے، اس لئے کہ سب سے پہلے قتل کا طریقہ اُسی نے جاری کیا تھا۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ سَنَّ فِی الْاِسْلَامِ سُنَّةً سَیِّئَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهٗ کُتِبَ عَلَیْهِ مِثْلُ وِزْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا یُنْقَصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَیْءٌ۔ [۳]

جو کوئی غلط طریقہ جاری کرے، غلط قانون بنائے، گناہ کی کوئی چیز جاری کرے، جتنے لوگ اس پر چلیں گے، اُنہیں ہر ایک کو اپنا گناہ بھی ہوگا، لیکن اُس گناہ کے موجد کو اپنا گناہ تو ملے گا اور جتنے لوگ اُس گناہ کو اختیار کریں گے اُن سب کے گناہوں کا وبال بھی اُس پر ہوگا۔

---

[۱] المائدہ: ۲۹

[۲] صحیح البخاری: باب اثم من دعا الی ضلالة اَوْسَنَّ سُنَّةً سَیِّئَةً، ج ۲، ص ۱۰۸۸۔ مسند احمد: رقم الحدیث ۳۶۲۹، ج ۱، ص ۴۹۸

[۳] صحیح المسلم: ج ۲، ص ۳۴۱

گویّوں کا امام امرأالقیس:

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

امراء القیس گانا گاتے ہوئے جہنم میں جائے گا۔ جتنے گویّے ہیں سب اُس کے پیچھے ہونگے۔ اُن سب کا اِمام امراء القیس ہوگا۔ جیسے ایوب علیہ السلام صابرین کے امام ہونگے، صبر کرنے والے اُن کے پیچھے جنت میں جارہے ہونگے۔

میرے بھائیو! اللہ نے ہمیں سبق دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قربانی اس کی قبول کرتے ہیں جو نبی کی اطاعت کرے۔ ہابیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے والد کا کہنا مانا، اللہ کا کہنا مانا۔ ظالم نہیں بنا، مظلوم بنا۔ دِل میں اخلاص، تقویٰ اور صدق تھا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے رہتی دُنیا تک اس کا ذکر اپنے پاک کلام میں محفوظ فرمادیا

سبق آموز واقعات:

۱۔ عامر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ رورہے تھے، کسی نے پوچھا کیوں رورہے ہو؟ یہی آیت پڑھنے لگے: اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ مالک کے ہاں تو تقوے والے کا عمل قبول ہے، میرے بارے میں نہ جانے کیا فیصلہ ہوچکا ہے، موت کے وقت وہ رورہے ہیں۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ساری زمین سونے کی بنا کر میرے قبضے میں دے دی جائے، اس سے زیادہ مجھے یہ پسند ہے کہ میرا کوئی عمل اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوجائے۔ عمل کرنا اصل نہیں ہے اصل قبولیت ہے کہ میں نے جو عمل کیا وہ اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوا یا نہیں۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے یہ یقین ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ نے میری ایک نماز قبول کرلی ہے، مجھے یہ دُنیا ومافیا سے زیادہ پسند ہے۔[۱]

۳۔ شیطان رئیس الملائکہ اور طاؤس الملائکہ تھا۔ اُس نے آسمانِ دُنیا پر بڑی عبادت کی، فرشتوں کی صحبت میں رہتا تھا۔ اللہ کا حکم نہیں مانا، ضد اور حسد میں آگیا۔ مالک کے سامنے جرح کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج ۲، ص ۵۲۰

نے وہ ساری چیزیں سلب کرلیں اور ہمیشہ کے لئے اُسے مردود قرار دے دیا۔

اپنے عمل پر مغرور نہیں ہونا چاہیے:

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ روح المعانی میں لکھتے ہیں:

آدمی شیطان کے معاملے کو دیکھ کر ڈرے کہ لاکھوں سال عبادت کی۔ جب عُجب پسندی، حُبِّ جاہ آئی، تکبر اور حسد آیا اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے لگا تو اللہ نے جو صفات رکھی تھیں وہ ساری سلب کرلیں۔ بعد میں اُس کا ہر عمل، ہر قول اس کو جہنم میں لیکر جانے والا بنا۔ اس پر وہ آگے لکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے عمل پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ موجودہ عمل اور فعل پر دارومدار نہیں، دارومدار تو اس پر ہے کہ موت پر ہمارے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا، اس لئے ہر آدمی اللہ کی بارگاہ میں ڈرے۔

حضور پاک ﷺ کی دُعاؤں میں ہے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَ عُمُرِیْ آخِرَہٗ وَخَیْرَ اَعْمَالِیْ خَوَاتِیْمَہٗ

اے اللہ! زندگی کا آخر بہترین بنادینا اور اعمال کا آخر بہترین بنادینا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے عُمّال کو لکھا:

ہر جگہ اللہ کی رضا اور تقویٰ (ڈر) کو شامل کرو۔ اس سے تمہارا عمل بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوگا، تم اجر کے مستحق بنو گے، اسی کی بناء پر تمہارے اوپر اللہ کی طرف سے انعامات آئیں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''کوئی عمل چھوٹا نہیں، چھوٹا عمل بھی قبول ہوگیا تو یہ آدمی چمک گیا۔ اس لئے کہ وہ چھوٹا، چھوٹا نہ رہا جسے مالک نے قبول کرلیا''۔

قربانی میں جذبات کیسے ہوں؟

میرے بھائیو! یہ قربانی آرہی ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی نقل ہے۔ جذبات وہی پیدا کرو جو ہابیل رضی اللہ عنہ کے تھے۔ ڈر رہے ہیں کہ میری قربانی قبول ہوئی ہے یا نہیں؟ حکمِ الٰہی کی اطاعت کررہے ہیں،

اللہ کے نبی اور اپنے باپ سیدنا آدم علیہ السلام کی بات کو مان رہے ہیں، مظلوم بنے، ظالم نہیں بنے۔ قیامت تک آنے والے انسانوں میں سب سے پہلے شہید وہی ہیں۔ اللہ کی بارگاہ میں اس کا صدق، اخلاص اور تقویٰ کام آیا اور جس نے حسد کیا، اپنے باپ کی بلکہ درحقیقت اللہ کی نافرمانی کی، وہ مردود ہوا اور چونکہ اس کی ندامت دل سے نہیں تھی، اس لئے وہ جہنم کی آگ میں گیا۔ قتل پر ندامت نہیں تھی، ندامت تو اس بات پر تھی کہ میں اپنے بھائی کو دفن کیسے کروں؟ اگر وہ سچی توبہ کرتا، مالک کی طرف رجوع کرتا، تائب بنتا، گڑگڑاتا، تو توبہ قبول ہوتی۔

قربانی کی حقیقی روح:

میرے بھائیو! قربانی قریب آرہی ہے۔ اصل قربانی یہ ہے کہ زندگی کا سارا رُخ مالک کی طرف ہو جائے۔ ایک صورت جانور کے ذبح کرنے کی ہے وہ لازماً کرنی پڑے گی۔ قربانی کی حقیقی روح یہ ہے کہ ہمارے اندر وہ تقویٰ آجائے جو ہابیل رضی اللہ عنہ میں تھا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں تھا اور سید الاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ میں تھا۔ ربُّ العالمین اُس کا کوئی ذرّہ ہمیں بھی نصیب فرمائے (آمین)

درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک

حدیثِ نبوی ﷺ:

وَعَنْ اَبِی السَّائِبِ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰی اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ فَبَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ اِذْسَمِعْنَاتَحْتَ سَرِیْرِہٖ حَرَکَۃً فَنَظَرْنَا فَاِذَافِیْهِ حَیَّۃٌ فَوَثَبْتُ لِاَقْتُلَهَا وَاَبُوْ سَعِیْدٍ یُصَلِّیْ فَاَشَارَ اِلَیَّ اَنْ اَجْلِسَ فَجَلَسْتُ فَلَمَّا انْصَرَفَ اَشَارَ اِلٰی بَیْتٍ فِی الدَّارِ فَقَالَ اَتَرٰی هٰذَاالْبَیْتَ فَقُلْتُ نَعَمْ . فَقَالَ کَانَ فِیْهِ فَتًی مِّنَّا حَدِیْثُ عَهْدٍ بِعُرْسٍ قَالَ: فَخَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِلَی الْخَنْدَقِ فَکَانَ ذٰلِکَ الْفَتٰی یَسْتَاْذِنُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَنْصَافِ النَّهَارِ فَیَرْجِعُ اِلٰی اَهْلِهٖ. فَاسْتَاْذَنَهٗ یَوْمًا فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خُذْعَلَیْکَ سِلَاحَکَ فَاِنِّیْ اَخْشٰی عَلَیْکَ قُرَیْظَةَ فَاَخَذَالرَّجُلُ سِلَاحَهٗ ثُمَّ رَجَعَ فَاِذَا امْرَاَتُهٗ بَیْنَ الْبَابَیْنِ قَائِمَةٌ فَاَهْوٰی اِلَیْهَابِالرُّمْحِ لِیَطْعَنَهَا بِهٖ وَاَصَابَتْهُ غَیْرَةٌ. فَقَالَتْ لَهُ اکْفُفْ عَلَیْکَ رُمْحَکَ وَادْخُلِ الْبَیْتَ حَتّٰی تَنْظُرَ مَاالَّذِیْ اَخْرَجَنِیْ فَدَخَلَ فَاِذَابِحَیَّةٍ عَظِیْمَةٍ مُنْطَوِیَةٍ عَلَی الْفِرَاشِ فَاَهْوٰی اِلَیْهَا بِالرُّمْحِ فَانْتَظَمَهَابِهٖ ثُمَّ خَرَجَ فَرَکَزَهٗ فِی الدَّارِ فَاضْطَرَبَتْ عَلَیْهِ فَمَا یَدْرِیْ اَیُّهُمَا کَانَ اَسْرَعَ مَوْتًا الْحَیَّةُ اَمِ الْفَتٰی . قَالَ: فَجِئْنَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَذَکَرْنَا ذٰلِکَ وَقُلْنَا اُدْعُ اللّٰهَ یُحْیِیْهِ لَنَا. فَقَالَ: اِسْتَغْفِرُوْا لِصَاحِبِکُمْ ثُمَّ قَالَ اِنَّ لِهٰذِهِ الْبُیُوْتِ عَوَامِرَ فَاِذَا رَاَیْتُمْ مِنْهَاشَیْئًا فَحَرِّجُوْا عَلَیْهَاثَلٰثًا فَاِنْ ذَهَبَ وَاِلَّا فَاقْتُلُوْهُ فَاِنَّهٗ کَافِرٌ . وَقَالَ لَهُمُ اذْهَبُوْا فَادْفِنُوْا صَاحِبَکُمْ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ اِنَّ بِالْمَدِیْنَةِ جِنًّا قَدْ اَسْلَمُوْا فَاِذَا رَاَیْتُمْ مِّنْهُمْ شَیْئًا فَاٰذِنُوْهُ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ فَاِنْ بَدَالَکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاقْتُلُوْهُ

فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ۔ رَوَاهُ مُسْلِمٌ۔ [۱]

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں غیرتِ ایمانی:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھ رہے تھے، اُن کا ایک مہمان ان کے گھر میں داخل ہوا، دیکھا وہ نماز پڑھ رہے ہیں تو انتظار کرنے لگا کہ یہ نماز پڑھ لیں۔ اتنے میں وہ مہمان کیا دیکھتا ہے کہ کھجور کی چھڑیاں پڑی ہیں اور اُن میں ایک سانپ ہے۔ یہ اُٹھنے لگا تاکہ میں ماروں، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (نفل) نماز ہی میں اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھ گیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے فرمایا: میں آپ کو ایک واقعہ سُناتا ہوں، ہم لوگ خندق کھود رہے تھے، ہمارا ایک نوجوان تھا، اُس کی نئی شادی ہوئی تھی، دوپہر کے وقت گرمی ہوتی تھی، خندق نہیں کھودی جاسکتی تھی تو وہ اپنی بیوی کے پاس گھر آجاتا تھا۔

اللہ کے نبی ﷺ سے اجازت لی کہ میں گھر سے ہوآؤں، آپ ﷺ نے فرمایا: نیزہ لے کے جایا کرو، راستے میں بنی قریظہ کے یہودی ہیں کہیں تمہیں نقصان نہ پہنچائیں۔ ایک دفعہ نیزہ لے کر آیا تو دیکھا اُس کی بیوی دروازے پر باہر آئی کھڑی ہے، انہیں غصہ آیا کہ میری بیوی گھر کے باہر؟ غصے میں اُس کو مارنے کا ارادہ کیا۔ بیوی نے کہا نیزہ تھام کر رکھیں، پہلے اندر تو جائیں دیکھیں کیا قصہ ہے۔ اندر گئے تو دیکھا ایک سانپ کنڈل مارے بیٹھا ہے، انہوں نے جاکر وہ نیزہ سانپ پر مارا، پھر سانپ کو اُس نیزے میں پرویا اور اُس کو باہر صحن میں گاڑھ دیا۔ سانپ پھڑکنے لگا اور پھر مرگیا اور یہ نوجوان بھی مرگیا۔ جب یہ خبر پھیلی تو ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! دُعا کردیں اللہ تعالیٰ اسے زندہ کردے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: وہ آخرت میں پہنچ گیا، اُس کیلئے بخشش کی دُعا کرو، مدینہ منورہ میں جنات تھے کچھ تو ایمان لاچکے ہیں، میں نے تمہیں کہا تھا کہ تین دن اعلان کرواگر جن ہے تو چلا جائے، اس نے جن کو مارا، جنات نے قصاص میں اسے ماردیا۔ تو وہ جن سانپ کی شکل میں تھا۔

---

[۱] مشکوٰۃ المصابیح، ج: ۲، ص: ۳۷۳، ط: رحمانیہ، لاہور

میرے محترم دوستو! یہ حدیث بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں غیرت کا کتنا بڑا حصہ تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے صحیح بخاری میں انہتر (۶۹) اور صحیح مسلم میں ستتر (۷۷) شعبے ایمان کے بیان کئے، اعلیٰ درجہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور ادنیٰ درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا، فرمایا اِن میں اُجلیٰ اور خصوصی شعبہ حیا ہے۔ اللہ نے جسے حیا دے دیا اُسے مکارمِ اخلاق کی اعلیٰ چیز مل گئی اور جس سے حیا مفقود ہو گیا پھر:

''بے حیا باش ہر چہ خواہی کُن'' بے حیا بن جا پھر جو کرنا ہے کر لے۔

موجودہ دور میں حیا سوز مناظر:

ہم گھروں میں بار بار اس کی تعلیم کریں تا کہ ہمارے بیٹے، بیٹیوں، گھر والوں اور رشتے دار خواتین میں حیا کا مضمون واضح ہو۔ بچیوں میں پردے اور حجاب کا شوق پیدا ہو۔ عموماً چونکہ گھروں سے باہر آنا جانا زیادہ ہے اور گھروں میں بھی میڈیا چل رہا ہے، اُس میں جو مناظر دکھائے جا رہے ہیں وہ عریاں اور ننگے ہیں، اُس میں جو خواتین لائی جا رہی ہیں وہ اللہ کے ڈر سے عاری اور خالی ہیں، اس لئے باطل یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی بہنیں اور بیٹیاں ننگی ہو جائیں، جب حیا نہیں ہوگا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے: ''اِذَا لَمْ تَسْتَحِيْ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ''۔

اس لئے ہر روز آپ سُنتے ہیں شادیاں ہوئیں، گھروں میں جھگڑے شروع ہو گئے، لڑکی کا علیحدہ ذہن ہے، لڑکے کا علیحدہ ذہن ہے۔ اگر لڑکے کا ذہن دینداری کا ہے بچی دینداری پر آنے کو تیار ہی نہیں۔ ہمیں کئی دوست ملتے ہیں جو کہتے ہیں کہ پریشان ہیں، بیوی کہنا ماننے کو تیار نہیں، حجاب کی بات کہتے ہیں تو اس پر تیار نہیں ہوتی، بعض دفعہ رونے بیٹھ جاتے ہیں کہ اب کیا کریں؟

ایک وبا یہ پھیلی ہے کہ عام طور پر خواتین نے گھروں میں کام چھوڑ دیا ہے، کھانا ہوٹل سے آ رہا ہے، کوئی مہمان آیا، ہوٹل سے کھانا منگواؤ، خود محنت کرنے کا مادہ ہی نہیں کہ ہم کھانا یہیں پکائیں، سادگی سے پک جائے گا، زیادہ کھانا ہوگا اور پیسے بھی بچ جائیں گے۔ اس لئے گھروں سے جفاکشی اور سادگی نکل گئی، ہر مہینے نیا ڈیزائن، نیا جوتا اور نئے کپڑے آ رہے ہیں، کم از کم ہر مہینے ورنہ تو ہر ہفتے آ رہے ہیں۔ لاکھ روپے آمدنی

ہے مگر فقر کا شکوہ ہے، جب معیارِ زندگی اتنا اونچا ہے تو پھر اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟

ایک حدیث میں ہے ایک وقت آئے گا تمہاری بیویاں ایسے کپڑے پہنیں گی کہ تم کما کما کے تھک جاؤ گے پوری نہیں پڑے گی، اس لئے گھروں میں تعلیم بہت ضروری ہے، حیاۃ الصحابہؓ کی دوسری جلد میں معاشرت کا بیان ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیویوں کے حالات ہیں۔ تھوڑی تھوڑی تعلیم کرتے رہیں ان شاء اللہ رنگ لائے گی، ایک قطرہ دو منٹ کے بعد گرے آپ صبح دیکھیں گے بالٹی بھری ہوگی۔ آج ذہن منتشر ہیں، اللہ ورسول کی بات سُننے کے لیے تیار نہیں، اس لئے ذہن سازی بہت ضروری ہے۔ ورنہ جتنے اللہ کے حکم ٹوٹیں گے پریشانی بھی بڑھے گی، جیسے قابیل نے ہابیلؓ کو شہید کیا تو روئے زمین میں کانٹے نکل آئے، بعض پھل کڑوے ہوگئے، زمین سے کڑوا پانی نکلنے لگا، گرد وغبار اُڑنے لگی، ایک قتل نے سارے عالم پر اثر ڈالا، اللہ کی ایک نافرمانی کی اتنی بڑی نحوست ہے۔

آخری گزارش:

ربُّ العالمین معاشرت، حیا اور دوسرے احکامات میں پاک نبی ﷺ کی اتباع کامل عطا فرمائے، اس کے لئے دعوت بھی دینا، دعائیں بھی مانگنا، گھروں میں تعلیم بھی کرانا، سارے نیکی کے اسباب اختیار کرنا پھر ذکر اذکار اور وظائف بھی کام دیں گے۔ دعائیں کر رہا ہے قرضے اُترنے کی اور خرچہ کر رہا ہے ڈبل، تو فضول خرچے والے کی دعائیں قبول ہوجائیں گی؟ قرآن میں آیا ہے کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، جب ہم شیطان کے بھائی بن جائیں گے تو دعا کہاں قبول ہوگی؟ یہ تو یہاں تک لکھا ہوا ہے کہ ایک غیبت کرو قبولیتِ دُعا گئی، ایک حسد کرو دُعا ختم، سارا دن دوکان پر جھوٹ بولنا اور جھوٹے وعدے کرنا اور پھر سود پر پیسے دینا۔ بعض تاجروں نے ایسی سکیمیں بنائی ہیں جو ۱۰۰ فیصد سودی ہیں، اب ظاہر میں مال آرہا ہے، جب اللہ لے گا تو سارا لے گا، کنگال ہوجائیں گے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

''وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ''۔ (الانبیاء:۵۱)

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے ابتدائی حالات

حضرت مولانا کریم بخش صاحب مدظلہٗ

(مدیر: جامعہ عمرؓ بن الخطاب، ملتان)

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابتدائی حالات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا اَبَدَ الْآبِدِیْنَ وَدَهْرَ الدَّاهِرِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَکُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ۔[۱]

موحّدِ اعظم سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام:

میرے پیارے عزیزو! قربانی قریب آرہی ہے اور یہ قربانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یاد ہے، اس لئے آج سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔ سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر اور موحّدِ اعظم ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بہت اونچا مقام اور عظیم مرتبہ عطا فرمایا، آپ علیہ الصلوۃ والسلام حضرت نوح علیہ السلام سے دو قرن بعد میں تشریف لائے، بعض علمائے تاریخ نے فرمایا کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا نوح علیہ السلام تک کا زمانہ ایک ہزار سال کا ہے اور سیدنا نوح علیہ السلام سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام تک کا زمانہ بھی ایک ہزار سال کا ہے۔

اور بعض علمائے تاریخ کی تحقیق یہ ہے:

وَکَانَ بَیْنَ الطُّوْفَانِ وَبَیْنَ مَوْلِدِ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَلْفٌ وَّ مِائَتَانِ وَثَلَاثٌ وَّسِتُّوْنَ سَنَةً، وَذٰلِکَ بَعْدَ خَلْقِ آدَمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ وَسَبْعٍ وَّ ثَلَاثِیْنَ سَنَةً[۲]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام طوفانِ نوح کے ایک ہزار دوسو تریسٹھ (۱۲۶۳) سال بعد پیدا ہوئے اور سیدنا

---

[۱] الانبیاء: ۵۱

[۲] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

آدم علیہ السلام سے تین ہزار سینتیس (۳۰۳۷) سال بعد دُنیا میں تشریف لائے۔ سریانی اور عبرانی زبان میں ابراہیم کو ابراہام بھی کہتے ہیں ''قوموں کا سردار اور بڑا''۔

پدری سلسلہ نسب:

''سیدنا ابراہیم بن تارخ بن ناحور بن ساروغ بن راغو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ''تارخ'' کی عمر ۷۵ سال تھی اور اس کی کل عمر ۲۵۰ سال ہوئی، تارخ کے تین بیٹے تھے (۱) ابراہیم علیہ السلام (۲) ناحُور (۳) ھاران۔ حضرت لوط علیہ السلام ھاران کے بیٹے ہیں، ھاران اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہوگیا تھا۔ سلسلہ نسب میں ناحور کی کل عمر ۱۴۸ سال، ساروغ ۲۳۰ سال، راغو ۲۳۹ سال، فالح ۴۳۹ سال، عابر ۴۶۴ سال، شالخ ۴۳۳ سال، ارفخشد ۴۳۸ سال اور نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کی کل عمر ۶۰۰ سال تھی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام اور لقب:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تورات میں تارخ بن ناحور ہے اور قرآن کریم نے اُن کے والد کا نام آزر ذکر کیا ہے۔

''وَقَالَ مُجَاهِدٌ: اِنَّ اِسْمَ آزَرَ لَيْسَ اِسْمُ اَبِيْهِ ، اِنَّمَا هُوَ اِسْمُ صَنَمٍ''[۱]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کا نام تارخ تھا، پھر بادشاہ کے خاص الخاص وزیر بنے اور خاص کر مذہبی امور کے وزیر تھے، بتوں کی حفاظت کرنا، بتوں کو بیچنا اور اُن کی نگرانی کرنا ان کا کام تھا، بتوں میں بڑا بُت آزر تھا اس نسبت سے اُنہیں بھی آزر کہتے ہیں۔

بعضوں نے آزر نام اور تارخ لقب بتایا اور بعضوں نے تارخ نام اور آزر لقب بتایا ہے۔ اور آزر کا معنی محترم اور شیخ بھی ہے، اس لئے بھی اُنہیں آزر کہتے تھے۔

---

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

آزر کے بارے میں تحقیقِ انیق:

مشہور یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ ہے اور آزر ان کا لقب ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ کا رجحان بھی یہی ہے۔

عندالبعض والد کا نام تارخ ہے اور آزر چچا ہے، عربی محاورات میں چچا پر باپ کا اطلاق عام ہے جیسے یعقوب اور اسرائیل۔ علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے شرح مواہب میں اسی کو اختیار کیا ہے، یہی نظریہ علامہ سدی اور علامہ سیوطی رحمہما اللہ کا ہے کہ آزر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا، بلکہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر رسائل لکھے ہیں کہ حضور ﷺ سے آدم علیہ السلام تک سب آباء مسلم تھے۔

صاحب عمدۃ البیان نے محققین مفسرین کے یہ اقوال بیان کئے ہیں:

قرآن پاک کے الفاظ ''وَاِذْقَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ'' سے ظاہر ومتبادر یہی ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تھا جو کہ کافر ومشرک اور بت پرست ہی نہیں، بت گر اور بت فروش بھی تھا۔ جن روایات میں ان کا نام تارخ بتایا گیا ہے اول تو وہ دراصل اسرائیلی روایات ہیں نہ کہ قرآن وسنّت کی نصوص۔ پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ان کی بنا پر قرآن حکیم کے اس ظاہر ومتبادر مفہوم میں خواہ مخواہ تاویل سے کام لیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے اُس شخص کے یہ دونوں نام ہوئے ہوں، جیسا کہ تمام ثقہ علماء ومفسرینِ کرام کا کہنا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی یہی مروی ہے۔[۱]

علامہ ابن جریر اور ضحاک رحمہما اللہ نے جزم ویقین کے ساتھ کہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تھا۔[۲]

صاحبِ صفوۃ التفاسیر کی تحقیق:

صاحب صفوۃ التفاسیر اس موقع پر لکھتے ہیں:

صحیح یہی ہے اور محققین نے تصریح کی ہے کہ آزر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام

---

[۱] روح المعانی

[۲] تفسیر المراغی

تھا، اور نصوص کتاب وسنّت اس شخص کے کفر پر صریح طور پر دلالت کرتی ہیں۔ اصل یہی ہے کہ لفظ کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے اور جب تک کوئی قرینہ صارفہ موجود نہ ہو اس کو اس کے ظاہر سے نہ پھیرا جائے۔ پس اہلِ بدعت کا اس طرح کی اسرائیلی روایات کے سہارے یہ کہنا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام تارخ تھا اور وہ مؤمن اور موحد تھے، سراسر باطل ہے۔ یہ دراصل شیعوں کا عقیدہ ونظریہ ہے، جن کا کہنا یہ ہے کہ نبی اور امام کے باپ دادا میں سے کوئی کافر ومشرک نہیں ہوسکتا۔ اسی شیعی عقیدے ونظریے کے جراثیم اپنوں کی سادگی، اہلِ بدعت کی غلو پسندی اور غیروں کی چالاکی وطمع سازی وغیرہ مختلف عوامل واسباب کے باعث اہلِ حق کی کتابوں میں سرایت کر گئے۔ چنانچہ علامہ شام شیخ محمد جمال الدین القاسمی مرحوم ومغفور اس موقع پر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس ارشادِ ربانی میں شیعوں پر قطعی رد ہے جن کا دعویٰ ہے کہ کسی بھی نبی کے باپ دادا میں سے کوئی کافر نہیں ہوسکتا، اور اسی بنا پر انہوں نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ نہیں چچا تھا۔[1]

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوۃ والسلام کے باپ کے کافر ہونے کی تصریح تو حضرت رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنے قولِ حق وصدق میں فرمائی ہے، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، چنانچہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قیامت کے روز حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ آزر سے ملیں گے اس حال میں کہ اُس کے چہرے پر کفر کی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے کہیں گے کہ کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ میری نافرمانی اور خلاف ورزی نہ کرو، تو وہ کہے گا ''فَالْيَوْمَ لَآ اَعْصِيْكَ'' کہ اب میں آپ کی نافرمانی کبھی نہیں کروں گا۔ تب

[1] محاسن التاویل المعروف تفسیر القاسمیؒ، ج:۲، ص:۵۸۴، ط: دار الفکر بیروت

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے رب کے حضور عرض کریں گے کہ میرے مالک آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تم کو قیامت کے روز رسوا نہیں کروں گا، تو اس سے بڑھ کر رسوائی اور کیا ہوگی کہ میرا باپ آج دوزخ میں جا رہا ہے۔ اللہ پاک جواب میں فرمائیں گے کہ میں نے جنت کو کافروں پر حرام قرار دے رکھا ہے، پھر اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اپنے پاؤں کے نیچے دیکھو تو وہ دیکھیں گے کہ ان کا باپ آزر ایک گھنے بالوں والے بجو کی شکل میں پڑا ہوگا، تو اس کو اس کے پاؤں سے پکڑ کر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔[۱]

واضح رہے: کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا، جیسا کہ حضراتِ اہلِ علم نے اس کی تصریح فرمائی ہے: **وَلَا يَقْدَحُ ذٰلِكَ فِيْ مَقَامِ اِبْرٰهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ**[۲]۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے آنجناب کی شانِ عالی اور مقامِ رفیع میں اور نکھار پیدا ہوتا ہے کہ ایسے کٹر کافر، پکے مشرک، بت پرست، بُت گر اور بت فروش باپ کے گھر میں جنم لینے اور کفر وشرک کے اندھیروں میں ڈوبے ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے کے باوجود آپ علیہ السلام ایمان ویقین اور اخلاص و توحید کے ایسے مقام پر فائز ہوئے کہ ابوالانبیاء اور امام الموحدین کا شرف وامتیاز حاصل کیا جو قدرتِ الٰہی کا ایک معجزہ اور کرشمہ ہے۔ ''**عَلَيْهِ وَعَلٰى نَبِيِّنَا اَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ وَاَتَمُّ التَّسْلِيْمَاتِ . مَاتَبْقٰى هٰذِهِ الْاَحْرُفُ وَالْكَلِمَاتُ عَلٰى هٰذِهِ الْاَوْرَاقِ وَالصَّفْحَاتِ**''۔

آزر ہی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا:

حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ آزر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ تھا۔ فرمانِ الٰہی ہے: **وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ** ''جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر کو''۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا ہے، اس

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، ج:۱، ص: ۴۷۳

[۲] صفوۃ التفاسیر

کے خلاف کوئی قوی اور مضبوط دلیل نہیں ہے، ایک دو روایتیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ تھا اور آزر اُن کا چچا تھا، اور یہ روایتیں اتنی ضعیف ہیں کہ قرآن کریم کے مقابلہ میں حجت نہیں ہوسکتیں۔[۱]

والدہ کا نام اور جائے پیدائش:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ صاحبہ کا نام امیلہ تھا، امام کلبی رحمہ اللہ نے نونا بنت کرنبا ذکر کیا ہے۔

''كَانَ مَوْلِدُهٗ بِبَابِلَ مِنْ اَرْضِ السَّوَادِ بِنَاحِيَةٍ يُقَالُ لَهَا كُوْثَا'' سیدنا ابراہیم علیہ السلام عراق کے علاقہ کلدانی یعنی بابل میں کوثا نامی بستی میں پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش دمشق کے علاقہ غُوطہ اور بستی برزہ میں ہوئی، یہ بستی جبلِ قاسیُون میں ہے۔

''وَالصَّحِيْحُ اَنَّهٗ وُلِدَ بِبَابِلَ وَاِنَّمَا نُسِبَ اِلَيْهِ هٰذَا الْمَقَامُ لِاَنَّهٗ صَلّٰى فِيْهِ اِذْ جَآءَهٗ مُعِيْنًا لِلُوْطٍ عَلَيْهِ السَّلَامُ''[۲]

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ علاقہ بابل میں پیدا ہوئے، برزہ کی طرف غالباً اس لئے نسبت ہے کہ اس جگہ ایک مدت کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کی مدد کے لئے آئے، وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نماز بھی ادا کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اپنا خاندان بابل سے کنعان لے گئے، علاقہ حرّان میں پڑاؤ ڈالا، اسی جگہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا انتقال ہوا تھا۔ اس علاقے کے لوگ کواکبِ سبعہ کی عبادت کرتے تھے، جن لوگوں نے دمشق کو آباد کیا اُن کا یہی مذہب تھا، مشہور سات ستاروں اور قطب ستارے کی پوجا کرتے تھے، دمشق شہر کے سات دروازوں پر اِن کی تصاویر بنی ہوئی تھیں، ان کے لئے عید اور قربانی کے اعمال بھی کرتے تھے، غرض سارا عالم کفر میں گھرا ہوا تھا۔

---

[۱] ذخیرۃ الجنان، ص: ۱۶۸

[۲] قصص الانبیاء لابن کثیر ص: ۱۱۲

دنیا کے چار بڑے بادشاہ:

بابل میں نمرود بن کنعان کی حکومت تھی، یہ ان چار بادشاہوں میں سے ایک ہے جنہوں نے ساری دنیا (یا اکثر) دنیا پر حکومت کی۔

حدیث شریف میں ہے:

مَلَكَ الْاَرْضَ اَرْبَعَةٌ :مُؤْمِنَانِ وَكَافِرَانِ، فَاَمَّاالْمُؤْمِنَانِ فَسُلَيْمَانُ بْنُ دَاوٗدَ وَ ذُوالْقَرْنَيْنِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ ،وَاَمَّا الْكَافِرَانِ فَنَمْرُوْدُ وَبُخْتُ نَصَرَ۔ [۱]

''چار بادشاہ ہیں جنہوں نے ساری دنیا پر حکومت کی، دو مسلمان اور دو کافر۔ مسلمانوں میں سیدنا سلیمان علیہ السلام اور سیدنا ذوالقرنین علیہ السلام ہیں، کافروں میں نمرود اور بخت نصر ہیں''۔

اور البدایہ والنہایہ میں ہے:

قَدْ مَلَكَ الدُّنْيَا فِيْمَا ذَكَرُوْا اَرْبَعَةٌ ، مُؤْمِنَانِ وَكَافِرَانِ ، فَالْمُؤْمِنَانِ ذُوالْقَرْنَيْنِ وَسُلَيْمَانُ وَالْكَافِرَانِ النَّمْرُوْدُ وَبُخْتُ نَصَرٍ [۲]

دنیا میں چار بادشاہ ایسے آئے ہیں جو پوری دنیا یا دنیا کی اکثر آبادی کے بادشاہ بنے ہیں، ان میں دو مسلمان اور دو کافر ہیں: مسلمانوں میں سیدنا سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کی بادشاہی عطا کی اور کافروں میں نمرود بن کنعان اور بختِ نصر روئے زمین کے بادشاہ گزرے ہیں۔

سیدنا ذوالقرنین اور سلیمان علیہما السلام:

سیدنا ذوالقرنین علیہ السلام کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے کچھ بعد کا ہے، اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کا زمانہ بہت بعد کا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے تقریباً سات

---

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

[۲] البدایۃ والنھایۃ: کتاب قصص الانبیاء، ج ۱، ص ۹۹، ط: عمریہ، کوئٹہ

سوسال بعد آئے اور سیدنا عیسیٰ بن مریم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چودہ سوسال بعد آئے، اور سید الاولین والآخرین حضرت رسولِ پاک علیہ السلام سیدنا عیسی علیہ السلام سے تقریباً پونے چھ سو سال بعد تشریف لائے۔

نمرود اور بختِ نصر:

کافر بادشاہوں میں ایک نمرود ہے، یہ دنیا کی اکثر آبادی کا بادشاہ تھا، جہاں کہیں چھوٹے بادشاہ تھے وہ اسکے ماتحت تھے اور دوسرا بڑا کافر بادشاہ بختِ نصر ہے، اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے پندرہویں پارے میں کیا کہ جس نے بیت المقدس پر چڑھائی کی۔ بنی اسرائیل جب اللہ کی نافرمانیوں کے درپے ہوئے تو اللہ نے اس مجوسی بادشاہ کو اُن پر مسلط کیا، اُس نے اسّی ہزار انسان قتل کئے، بنی اسرائیل کا اتنا لہو بہایا کہ صہیُون پہاڑ پر لہو کی ندیاں بہتی رہیں، اسّی ہزار قید کئے، بیت المقدس کا سارا سونا اُتارا، خواتین کی بالیاں، پازیب اور ہار تک اُتار لئے، سوا لاکھ بیل گاڑیاں سونے کی بھر کر لے گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اِن چاروں میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کو نبوت بھی دی اور بڑی بادشاہت بھی دی، کیونکہ ان کی بادشاہت بر و بحر پر تھی، جنات بھی تابع تھے، جنگل کے درندے اور حشرات الارض پر بھی ان کی بادشاہت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمام طیور اور حشرات الارض کی بولیاں بھی اُنہیں سمجھا دی تھیں، اور ان کے لئے تمام مادی اور روحانی نظام بھی مسخر کر دیا۔

موحّدِ اعظم کے بارے پیشین گوئی:

وَكَانَ نَمْرُوْدُ اَوَّلَ مَنْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهِ التَّاجَ، وَتَجَبَّرَ فِي الْاَرْضِ، وَدَعَا النَّاسَ اِلٰى عِبَادَتِهٖ۔[۱]

نمرود وہ پہلا شخص ہے جس نے سر پر تاج رکھا، یہ پہلا ظالم ہے جس نے زمین میں ظلم برپا کیا اور یہ پہلا مشرک ہے جس نے الوہیت اور خدائی کا دعوی کیا اور لوگوں کو اپنی عبادت پر مجبور کیا۔

---

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

وَكَانَ لَهُ كُهَّانٌ وَمُنَجِّمُوْنَ ، فَقَالُوْا لَهُ: اِنَّهُ يُوْلَدُ فِيْ بَلَدِكَ فِيْ هٰذِهِ السَّنَةِ غُلَامٌ يُغَيِّرُ دِيْنَ اَهْلِ الْاَرْضِ وَيَكُوْنُ هَلَاكُكَ، وَزَوَالُ مُلْكِكَ عَلٰى يَدَيْهِ ، وَيُقَالُ: اِنَّهُمْ وَجَدُوْا ذٰلِكَ فِيْ كُتُبِ الْاَنْبِيَاءِ ۔ [۱]

''اِس کے زمانے میں کاہنوں اور نجومیوں کا بہت چرچا تھا، ایک دن انہوں نے نمرود سے کہا ہمیں سابقہ انبیاء کی کتب سے معلوم ہوا ہے کہ اس سال تیرے شہر میں ایک بچہ پیدا ہو گا جو تیری بادشاہت اور تیرے دین کی ہلاکت کا سبب بنے گا''۔

کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں نے اپنے فن کے مطابق اندازہ لگا کر نمرود سے کہا ایک ایسا شخص پیدا ہونے والا ہے جس کا دین تیرے دین کے علاوہ ہوگا اور تیرے لیے مشکلات کا سبب بنے گا، تجھے وہ الٰہ اور رب نہیں مانے گا۔ انہوں نے یہاں تک بتا دیا کہ وہ لڑکا فلاں علاقے میں ہوگا اور اس سال پیدا ہوگا۔

نمرود کا خواب دیکھنا:

امام سدّی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

رَاٰى نَمْرُوْدُ فِيْ مَنَامِهٖ كَاَنَّ كَوْكَبًا طَلَعَ فَذَهَبَ بِضَوْءِ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ لَهُمَا ضَوْءٌ، فَفَزِعَ مِنْ ذٰلِكَ فَزَعًا شَدِيْدًا، وَدَعَا السَّحَرَةَ وَالْكَهَنَةَ وَالْقَافَةَ، وَهُمُ الَّذِيْنَ يُخْبِطُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَسَاَلَهُمْ عَنْ ذٰلِكَ؟ [۲]

نمرود نے ایک دن حیرت انگیز خواب دیکھا کہ ایک ستارہ طلوع ہوا جس کی روشنی چاند پر چھا گئی، اگلے دن وہ دن کو نظر آیا تو اُس کی روشنی سورج سے بھی بڑھ گئی۔ وہ پریشان ہوا اور گھبرا گیا کہ نہ معلوم کیا قصہ پیش آنے والا ہے، اُس نے کاہنوں، نجومیوں اور قیافہ شناسوں کو بلایا کہ یہ کیا قصہ ہے؟

کاہن جنات سے خبریں پوچھتے ہیں، کبھی کوئی سچی خبر مل گئی۔ نجومی ستاروں کے ذریعے خبریں معلوم کرتے ہیں اور قیافہ شناس باہر کی ظاہری علامات سے اندازہ لگاتے ہیں۔ پیشین گوئی کبھی سچی ہوتی ہے اور

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

[۲] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

کبھی جھوٹی، اس لئے کہ حقیقی اور یقینی علم تو ربُّ العالمین کو ہے۔ ان کے پاس بعض علامات تھیں جن کے ذریعہ وہ اندازہ لگا لیتے تھے جیسے ایک نبی کو اللہ تعالیٰ نے طیرہ کا علم دیا، زمین پر خاص خطوط کھینچتے تھے اس کے ذریعے علم حاصل کرتے، اس نبی کے اُٹھ جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس علم کو بھی اُٹھالیا۔

حضرت ہندہ کا سبق آموز واقعہ:

مکہ مکرمہ میں عتبہ کی بیٹی ہندہ تھی جو ابوسفیان کی بیوی ہیں، یہ پہلے فاکہہ کے نکاح میں تھی، فاکہہ قریشی سردار تھا، یہ گھر کی بیٹھک میں آرام کر رہی تھیں، دروازہ کھلا ہوا تھا، باہر سے کوئی آدمی آیا وہ بیٹھک میں جانے لگا تو دیکھا خاتون سوئی ہوئی ہے، وہ وہاں سے باہر نکل گیا، باہر کہیں سے فاکہہ آرہا تھا اُس نے دیکھا یہ اس کمرے سے باہر نکلا ہے، چنانچہ اُس نے اپنی بیوی پر تہمت لگادی۔ ہندہ نے کہا میں تو سوئی ہوئی تھی، مجھے تو کوئی پتہ نہیں ہے، لیکن بات طول پکڑ گئی، بیٹی والے بھی اکٹھے ہوئے اور بیٹے والے بھی، آخر فاکہہ نے ہندہ کو طلاق دے دی۔

بعد میں عتبہ نے اپنی بیٹی سے پوچھا کوئی گناہ ہو گیا ہو تو مجھے بتادو؟ ورنہ ہم قیافہ شناس یا کاہن کے پاس جائیں گے، اُس نے کہا واللہ! مجھ سے کوئی گناہ نہیں ہوا۔

اُس زمانے میں یمن میں ایک بہت بڑا کاہن رہتا تھا، ان دونوں قبیلوں نے کہا ہم اس کاہن کے پاس چلتے ہیں، مکہ اور یمن کا راستہ تقریباً ایک ہزار میل کا ہے، راستے میں باپ نے دیکھا کہ بیٹی کا رنگ اُڑا ہوا ہے تو باپ نے کہا بیٹی کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ابھی بھی بتادو؟ اُس نے کہا ابا جان! غلطی تو کوئی نہیں ہوئی، لیکن یہ کاہن لوگ ہیں جنات اِنہیں آکر خبریں دیتے ہیں، کبھی سچی ہوتی ہیں اور کبھی جھوٹی، اللہ نہ کرے اِنہوں نے جھوٹی خبر دے دی تو میرے لئے زندہ رہنا بھی مشکل ہو جائیگا، باپ نے کہا میں کچھ انتظام کرتا ہوں۔

عتبہ نے اپنے گھوڑے کے نفس میں گندم کا دانہ رکھ کر کپڑے میں لپیٹ دیا، تاکہ کسی کو پتہ نہ لگے، یمن پہنچ گئے، کاہن نے دیکھا قریشی سردار آئے ہیں اُن کے لئے ضیافت کا انتظام کیا۔ عتبہ نے اُس کاہن سے سب سے پہلے یہ بات پوچھی کہ یہ بتاؤ راستے میں میرا کوئی خاص معاملہ ہوا ہے؟ اُس نے کہا ہاں! پوچھا کیا؟ اُس نے کہا آپ نے اپنے گھوڑے کے نفس میں گندم کا دانہ رکھا ہے، عتبہ نے کہا مکہ کے جنات سے

پوچھ کر بتاؤ، ہماری بیٹی پر تہمت لگی ہے، یہ لڑکے والے بیٹھے ہیں اور ہم لڑکی والے ہیں کیا قصہ ہے؟ اُس نے کہا یہ عورت پاک دامن ہے، شک کی بنا پر خواہ مخواہ فاکہہ نے تہمت لگادی اور اس کی پیٹھ سے ایک عظیم بادشاہ پیدا ہوگا۔

اب فاکہہ شرمندہ ہوا اور بھاگ کر ہندہ کو چمٹنے لگا کہ دوبارہ نکاح کرتے ہیں، اُس نے کہا دفع ہو جا، جب پہلے میری بات نہیں مانی تو میں کیسے تجھ پر اعتماد کروں۔ بعد میں ابوسفیان سے نکاح ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے بیٹا دیا امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

قیافہ شناسوں کی مہارت:

اللہ کے نبی ﷺ کو حضرت اُسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑا پیار تھا، اُن کے والد حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اصل عرب تھے، بچپن میں گم ہوگئے تھے، اس لئے قبائل نے اِنہیں غلام بنالیا پھر مکہ میں فروخت ہوئے، حضرت حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیلئے ان کو خرید لیا، جب حضور ﷺ کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ہوا تو انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کردیا۔ یہ بڑے خوبصورت رنگ کے تھے، پہلے زینب بنت جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نکاح ہوا، نبھاؤ نہ ہوسکا تو طلاق ہوگئی، پھر ام ایمن رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، اللہ تعالیٰ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا سے اُسامہ دیا۔ اللہ کی شان! ام ایمن رضی اللہ عنہا حبشیہ تھی، رنگ کی کالی تھی، بیٹا ماں پر چلا گیا، اب باپ حسین وخوبصورت اور بیٹا کالا، بعض لوگ یہ کہنے لگے کہ یہ اپنے باپ کا نہیں ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کو یقین تھا کہ یہ زید ہی کا بیٹا ہے، عرب میں ایک قیافہ شناس تھا، شکلیں دیکھ کر بتاتا تھا کہ یہ کس کا بیٹا ہے۔

ایک دن یہ دونوں باپ بیٹا مسجدِ نبوی میں سوئے ہوئے تھے، چادر تانی ہوئی تھی، دونوں کے پاؤں باہر نکلے ہوئے تھے، باپ کے پاؤں سفید اور بیٹے کے پاؤں کالے، قیافہ شناس نے دیکھ کر کہا یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے خبر سُنی تو آپ کو بڑی خوشی ہوئی، اگرچہ یہ دلیلِ قطعی نہیں لیکن جب اس قسم کی بات حقائق سے مل جائے تو آدمی کو خوشی ہوتی ہے، اس وجہ سے آپ ﷺ کو بڑی خوشی ہوئی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش کی پیشین گوئی اور نمرودی تدبیروں کا فیل ہونا:

فَقَالُوْا: هُوَ مَوْلُوْدٌ يُوْلَدُ فِيْ نَاحِيَتِكَ هٰذِهِ السَّنَةَ يَكُوْنُ هَلَاكُكَ وَهَلَاكُ اَهْلِ بَيْتِكَ عَلٰى يَدَيْهِ . قَالَ: فَاَمَرَ نَمْرُوْدُ بِذَبْحِ كُلِّ غُلَامٍ يُوْلَدُ فِيْ تِلْكَ النَّاحِيَةِ تِلْكَ السَّنَةَ . وَاَمَرَ بِعَزْلِ الرِّجَالِ عَنِ النِّسَاءِ ، وَجَعَلَ عَلٰى كُلِّ عَشَرَةٍ رَجُلًا رَقِيْبًا اَمِيْنًا . فَاِذَا حَاضَتِ الْمَرْاَةُ خَلّٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا اِذَا اَمِنَ الْمُوَاقَعَةَ . فَاِذَا طَهُرَتْ عُزِلَ الرَّجُلُ عَنْهَا. فَرَجَعَ آزَرُ اَبُوْ اِبْرَاهِيْمَ فَوَجَدَ اِمْرَاَتَهٗ قَدْ طَهُرَتْ مِنَ الْحَيْضِ فَوَقَعَ عَلَيْهَا فِيْ طُهْرِهَا فَحَمَلَتْ بِاِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔ [1]

نجومی، قیافہ شناس اور کاہنوں نے نمرود سے کہا ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیرے ملک، تیرے دین اور تیرے خاندان کی جڑیں اُکھاڑے گا اور پیدا بھی تیرے علاقے میں ہوگا۔ نمرود نے اپنی کابینہ کو بلایا، اس میں چھ آدمی بڑے وجیہ قسم کے تھے، اُن سے کہا مشورہ دو، مشورے میں یہ طے ہوا کہ یہ کونسا مشکل کام ہے، آپ کے علاقے کی چند بستیاں اور چھوٹا سا شہر ہے، میاں بیوی میں جدائی ڈال دی جائے۔

بعد میں کاہنوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ آج وہ لڑکا اپنے باپ کی پشت سے ماں کے رحم میں منتقل ہوگا، چنانچہ یہی فیصلہ ہوا کہ میاں بیوی میں جدائی ڈال دو، ہر دس آدمیوں پر ایک نگران مقرر کردو، نمرود نے کہا جہاں زیادہ خطرہ ہے کہ یہ بستی ہے تو وہاں میں اپنا خاص الخاص آدمی نگران مقرر کردوں گا۔ عورتوں پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ امیلہ کو نگران مقرر کردیا اور مردوں پر آپ کے والد آزر کو نگران بنادیا۔

اللہ کی شان! سارے سوئے ہوئے تھے، آزر کی بیوی ماہانہ مجبوری سے پاک ہوچکی تھی، صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے، بہت خوبصورت لگ رہی تھی، دونوں میاں بیوی نے ملاپ کرلیا۔ اگلے دن کاہنوں نے بتادیا کہ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ وہ بچہ باپ کی پشت سے ماں کے رحم میں چلا گیا ہے۔ پوچھا کون سا ہے؟ انہوں نے کہا یہ تو ہمیں پتہ نہیں، لیکن اتنا ہے کہ وہ بچہ ماں کے رحم میں منتقل ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والے ہیں، باطل کے نظام اور اُن کی طاقت کو فیل کر کے دکھاتے ہیں۔

---

[1] عرائس المجالس، ص: ۷۴، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

پھر انہوں نے منصوبہ بنایا کہ سب خواتین پر نگرانی رکھی جائے، جس کے پیٹ کا اُبھار (حمل) نظر آئے اُس پر نظر رکھی جائے، اس سال جو بھی بچہ پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے، لکھا ہے کہ بہت سی خواتین کو قید کیا گیا اور ان سے جو بچے پیدا ہوئے اُنہیں قتل کیا گیا۔

قدرتِ الٰہی کا ظہور:

اللہ بھی بڑی قدرت والے ہیں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ امیلہ کے پیٹ میں اُبھار ہی نہیں ہونے دیا، اُن کی ظاہری شکل ایسے بنادی جیسے حمل ہے ہی نہیں۔ جب وقتِ مقررہ آیا، دردِزہ شروع ہوا، اُس نے کہا اگر بچہ یہاں پیدا ہوا تو ذبح کر دیا جائے گا، وہ ویرانے میں چلی گئی، ایک جگہ گڑھا تھا وہاں بچہ پیدا ہوا، کپڑے میں لپیٹا، اِدھر اُدھر کچھ لکڑیاں اکٹھی کر کے سایہ کیا، بچے کو وہی چھوڑ کر واپس آ گئی اور چپکے سے اپنے خاوند کو بتا دیا۔ اولاد سے تو ہر کسی کو محبت ہے، جب رات ہوئی تو باپ چلا گیا، اُس نے غار بنائی، اُس میں صاف ستھری جگہ پر بیٹے کو سلایا اور غار کے منہ پر پتھر رکھ دیا تا کہ کوئی جانور اس میں گھس نہ آئے۔

قدرتِ الٰہی کا عجیب نظارہ:

جب موقع ملتا ماں آ کر دودھ پلا جاتی، تاریخی روایات میں ابوزریق رحمۃ اللہ علیہ نے قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب واقعہ نقل کیا ہے:

كَانَتْ اُمُّ اِبْرَاهِيْمَ كُلَّمَا دَخَلَتْ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَجَدَتْهُ يَمُصُّ اِبْهَامَهٗ، فَقَالَتْ ذَاتَ يَوْمٍ لَاَنْظُرَنَّ اِلٰى اَصَابِعِهٖ، فَوَجَدَتْهُ يَمُصُّ مِنْ اِصْبَعٍ مَاءً، وَمِنْ اِصْبَعٍ لَبَنًا، وَمِنْ اِصْبَعٍ عَسَلًا وَمِنْ اِصْبَعٍ سَمَنًا۔[1]

ایک دن ماں آئی، کیا دیکھا کہ بیٹا انگلیاں چوس رہا ہے، ایک انگلی سے دودھ نکل رہا ہے، دوسری سے پانی نکل رہا ہے، تیسری سے شہد نکل رہا ہے اور چوتھی سے گھی نکل رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے غیب سے خوراک کا انتظام کر دیا، صاف ظاہر ہے جب غیبی رزق ہے تو اُس میں قوت بھی بہت زیادہ ہوگی، اس لئے آناً فاناً بڑے ہوتے چلے گئے، جیسے سیدہ مریم علیہا السلام کی پیدائش ہوئی تو اللہ

---

[1] عرائس المجالس، ص: ۷۵، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

نے ہفتے میں مہینے کے بقدر، مہینے میں سال کے بقدر بڑا کر دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پندرہ دن میں سمجھ دار، پھرتیلا، بھاگنے والا بچہ نظر آنے لگے، جس سے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ ابھی پیدا ہوا ہے، جو ذبح کرنے والے تھے اللہ تعالیٰ نے اُن کی طمع کاٹ دی۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی میں اپنی کمالِ قدرت کے ساتھ اس ظالم کے ظلم سے بچایا اور اس ظالم کا منصوبہ فیل کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہیں، جب چاہیں، جیسے چاہیں، جو کرنا چاہیں، اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش اور تربیت خرقِ عادت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طاقت سے کس طرح اُن کی پرورش کی، کیسے نمرودیوں کی ساری تدبیروں کو فیل کر کے دکھایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ [۱] ''بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے اُن میں خاص الخاص ہدایت کا نورڈالا تھا''۔

ربوبیتِ الٰہی کا اظہار:

لَمَّا شَبَّ اِبْرَاهِیْمُ عَلَیْهِ السَّلَامُ وَهُوَ فِی السَّرَبِ، قَالَ لِاُمِّهٖ: مَنْ رَّبِّیْ؟ قَالَتْ: اَنَا، قَالَ: فَمَنْ رَّبُّکِ؟ قَالَتْ: اَبُوْکَ، قَالَ: فَمَنْ رَّبُّ اَبِیْ؟ قَالَتْ لَهٗ: نَمْرُوْدُ، قَالَ: فَمَنْ رَّبُّ نَمْرُوْدَ؟ قَالَتْ لَهٗ: اُسْکُتْ، فَسَکَتَ۔ [۲]

''ایک مرتبہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی والدہ سے پوچھا میرا رب کون ہے؟ ماں نے کہا میں، فرمایا آپ کا ربّ کون ہے؟ کہا تیرا باپ، فرمایا میرے والد کا ربّ کون ہے؟ کہا نمرود، فرمایا نمرود کا ربّ کون ہے؟ ماں نے کہا خاموش ہو جا تو وہ خاموش ہو گئے''۔

آزر شام کو گھر آیا تو اُس نے کہا آپ کا بیٹا عجیب سوال کرتا ہے۔ اب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے سوال کیا کہ ابا جان میرا رب کون ہے؟ کہا تیری ماں، پھر پوچھا میری ماں کا ربّ کون ہے، کہا میں، پھر پوچھا آپ کا ربّ کون ہے؟ کہا نمرود، فرمایا نمرود کا ربّ کون ہے؟ ''فَلَطَمَهٗ لَطْمَةً وَقَالَ:

[۱] الانبیاء: ۵۱

[۲] عرائس المجالس، ص: ۷۶، ط: دار الفکر، بیروت لبنان

اُسْکُتْ'' توباپ نے زور سے تھپڑ مارا کہ یہ کیا باتیں کرتے ہو، خاموش ہوجاؤ، خبردار جوآئندہ یہ باتیں کیں تو۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا دل ودماغ روشن ہوتا ہے:

میرے بھائیو! حق تعالیٰ شانہٗ ابتداء ہی سے انبیاء کرام علیہم السلام میں ہدایت کا فطرتی نور ڈالتے ہیں، اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ بلوغ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کبائر وصغائر سارے گناہوں سے پاک ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُنہیں کفر وشرک کے قریب بھی نہیں بھٹکنے دیتے، اللہ تعالیٰ اُن کے قلب اور ذہن میں ایسا نور پیدا کرتے ہیں کہ وہ کبائر وصغائر اور کفر وشرک سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عالَم ایسا بنایا ہے جو خود ایک دلیل اور حجت ہے کہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

سیدنا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک بچہ اگر پہاڑ کی چوٹی پر پیدا ہو، کوئی انسان اُسے نہ ملے، اُسی حال میں بالغ ہوگیا، اب اس سے پوچھو کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ وہ بداہۃً جواب دے گا کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا بڑا خبیر، علیم اور قادر ہے، جو تنِ تنہا ساری کائنات کا نظام چلا رہا ہے، اس لئے کہ انسان کی عقل دلائل میں سب سے بڑی دلیل اور حُجّتوں میں سب سے بڑی حجت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عام انسان کو ایسی عقل دی تو انبیاء کرام علیہم السلام کی عقول کا کیا کہنا۔

درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک

حدیثِ نبوی ﷺ:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: یَلْقٰی اِبْرٰهِیْمُ اَبَاهُ اٰزَرَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَعَلٰی وَجْهِ اٰزَرَ قَتَرَةٌ وَغَبَرَةٌ. فَیَقُوْلُ لَهٗ اِبْرٰهِیْمُ اَلَمْ اَقُلْ لَکَ لَاتَعْصِنِیْ. فَیَقُوْلُ اَبُوْهُ فَالْیَوْمَ لَااَعْصِیْکَ. فَیَقُوْلُ اِبْرٰهِیْمُ: یَارَبِّ! اِنَّکَ وَعَدْتَّنِیْ اَنْ لَّاتُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ فَاَیُّ خِزْیٍ اَخْزٰی مِنْ اَبِی الْاَبْعَدِ. فَیَقُوْلُ اللّٰهُ: اِنِّیْ حَرَّمْتُ الْجَنَّةَ عَلَی الْکَافِرِیْنَ ثُمَّ یُقَالُ: یَااِبْرٰهِیْمُ! مَا تَحْتَ رِجْلَیْکَ فَیَنْظُرُ فَاِذَاهُوَ بِذِیْخٍ مُتَلَطِّخٍ فَیُؤْخَذُ بِقَوَائِمِهٖ فَیُلْقٰی فِی النَّارِ۔ [۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر کا عبرت ناک انجام:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کا باپ آزر ملے گا، اس کے چہرے پر پراگندگی ہوگی، غبار ہوگا، پریشانی ہوگی، غم ہوگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے: میں نے کہا نہیں تھا کہ میری نافرمانی نہ کرنا۔ اس کا باپ کہے گا آج میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کہیں گے: اے میرے ربّ! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے اس دن رسوا نہیں کریں گے جس دن بندوں کو قبروں سے اٹھایا جائے گا، اس سے بڑی رسوائی کیا ہوگی کہ میرا والد ہلاک ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے میں نے جنت کو کافروں پر حرام قرار دیدیا ہے، تیرا باپ حالت کفر میں مرا ہے اس پر جنت حرام ہے۔ پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! اپنے پاؤں کے نیچے دیکھو! سیدنا ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے کہ ایک بالوں سے بھرا ہوا بجو ہے جو گندگی میں لتھڑا ہوا ہے۔ (یہ ان کا باپ ہوگا جس کی

---

[۱] صحیح البخاری، ج:۱، ص: ۴۷۳

صورت مسخ کردی جائے گی) پھر اس بچو کی ٹانگیں پکڑ کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔''

آزر کی صورت جب مسخ ہوجائے گی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے نفرت ہوجائے گی اور رسوائی کا خیال ختم ہوجائے گا۔

اللہ کے ہاں ایمان واعمال کا سکہ چلتا ہے:

میرے دوستو! اللہ تعالیٰ کے ہاں حسب نسب نہیں چلتا، ربُّ العالمین کے ہاں ایمان اعمال کا سکہ چلتا ہے۔ نبی کا باپ ہے آزر، لیکن اس کے سامنے آگ میں جارہا ہے۔ ابولہب (عبدالعزی) حضور ﷺ کا سگا چچا ہے، قریشی بھی ہے، ہاشمی بھی ہے، لیکن ہمیشہ آگ میں رہے گا۔ آپ ﷺ کی چچی ام جمیل وہ بھی اسی کے ساتھ آگ میں ہوگی۔ بخاری شریف میں ہے سب سے کم عذاب آپ ﷺ کے چچا عبدمناف (ابوطالب) کو ہوگا، آگ کی جوتی اسے پہنائی جائے گی۔ **مَنْ بَطَّأَ بِهٖ عَمَلُهٗ لَمْ يُسْرِعْ بِهٖ نَسَبُهٗ** جس کا ایمان وعمل کسی کو پیچھے ڈالے اس کا نسب اس کو آگے نہیں کرسکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں: ہماری گدی بہت اونچی ہے، ہمارا نسب بڑا عالی ہے، ہم تو فلاں خاندان کے ہیں، گردنیں اونچی کرکے چلتے ہیں۔ اللہ کے ہاں خاندان اور قوم کے اعتبار سے فیصلے نہیں ہیں، ربُّ العالمین کے ہاں فیصلے ایمان وعمل کے پیمانے پر ہیں۔

اللہ والوں کی شان وشوکت کے واقعات:

۱۔ ساہوال میں ایک بزرگ تھے مولانا فقیراللہ صاحب، مولانا عبداللہ رائے پوری کے والد اور حضرت شیخ الہند کے شاگرد۔ حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹوں کے استاد تھے، آخری زندگی میں نابینا ہوگئے تھے، بڑے علماء میں تھے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہتے تھے مجھ جیسے سید اس موچی کی جوتی کے نیچے ہیں (مولانا فقیراللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قوم کے موچی تھے)۔

۲۔ میرے بھائیو! حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ قریشی ہیں، نہ ہاشمی اور نہ عربی ہیں، لیکن کتنا بڑا اونچا مقام لے گئے آج بھی دنیا میں آجائیں تو ہر آدمی سعادت سمجھے گا کہ کاش! ان کے منہ کا لعاب، انکے پاؤں کی مٹی کا ذرہ ہمیں نصیب ہوجائے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''سیدنا بلال

رضی اللّٰہ عنہ'' کہ بلال ہمارا سردار ہے۔ حبش کے رہنے والے تھے، ''حبشی'' لیکن اللہ تعالیٰ ایمان وعمل میں کتنی بلندی پر لے گئے۔

۳۔ اصفہان میں ایک حبشی آیا، بہت بڑا فقیہ اور عالم تھا، لوگ زیارت کے لئے نکلے، سارا شہر امڈ پڑا۔ وہ جب حدیثیں بیان کرنے لگا تو ایک سید آگے بڑھا اس نے کہا: یہ کیا ظلم ہے کہ میں سادات میں ہوں، بادشاہ کا بیٹا ہوں اور یہ حبشی ہے سارے اس پر جھک رہے ہیں، مجھے ہر جگہ دھکے مل رہے ہیں۔ اس عالمِ ربانی نے کہا بات یہ ہے کہ میں نے آپ کے نانا حضرت محمد ﷺ کے اعمال اختیار کیے، اللہ نے میرے دل میں رُوشنی پیدا کی، اس روشنی کی چمک لوگوں میں گئی اور اس کی مہک کو اور لوگوں نے بھی محسوس کیا۔ واقعی میں حبشی تھا، لیکن میں نے آپ کے نانا حضرت محمد ﷺ کی اقتداء کی اور تو ہمارے آباء واجداد جو غلط راہ پر تھے ان کی راہ پر چلا، اللہ نے تیرے دل میں سیاہی پیدا کی، تیرے جسم میں بدبو ہوئی، لوگوں نے نفرت کی۔

۴۔ عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ مکہ مکرمہ میں تھے۔ ہاتھ کے لنجے تھے، ناک پھینا تھا اور رنگ سیاہ تھا۔ عبدالملک کا بیٹا ہشام مسئلہ پوچھنے آیا تو تین گھنٹے کے بعد آنے کا موقعہ ملا۔ وہ کہنے لگا: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کالے میں کیا نور بھر دیا۔

۵۔ ابن حبیب رحمۃ اللہ علیہ مصر میں تھے اور عربی نہیں تھے عجمی تھے: كَأَنَّهُ فَحْمٌ ایسے رنگ تھا جیسے کوئلہ (انتہائی سیاہ) ہوتا ہے، لیکن سارا مصر یہ چاہتا تھا کہ ابن حبیبؒ ہمارے گھر میں قدم رکھ دے، ابن حبیبؒ ہمارے بچے کے سر پر ہاتھ رکھ دے۔ گورنر آکر دوزانوں ہو کر بیٹھتا تھا۔

۶۔ طاؤس رحمۃ اللہ علیہ یمن میں تھے، یہ بھی عجمی اور غلام تھے لیکن سارا یمن ان پر ٹوٹتا تھا، ان پر جان دینے کو تیار تھا۔

۷۔ ذہاب ابن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ، میمون ابن مہران رحمۃ اللہ علیہ، یہ سارے عجمی ہیں، لیکن لوگ ان پر جان دینے والے بنے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، ان کے دادا، پردادا مجوسی ہیں، لیکن اللہ نے انہیں کائنات کا ثریا بنایا، اللہ نے سورج کی طرح چمکایا۔

اللہ کے دشمن ابوجہل کی ذلت وخواری:

ابوجہل قبیلہ بنی مخزوم کا ہے، ابوالحکم ہے اور قریشی ہے، لیکن مخلّد فی النار ہے، ہمیشہ کی آگ میں گیا۔ کہتے ہیں ہمارا نسب اعلیٰ ہے، ہماری گدی اعلیٰ ہے۔ میرے بھائیو! وہاں نسب اور گدیاں کام نہیں آئیں گی، وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ محمد عربی ﷺ کی اتباع کس نے کی۔

کامیابی وکامرانی کا راستہ:

میرے بھائیو! آدمی اپنے آپ کو چمکانا چاہتا ہے تو پاک نبی ﷺ کی راہ اپنالے۔ ذلیل عزت پاجائے گا، گڑھوں میں گرے ہوؤں کو اللہ تعالیٰ بلندیوں پر پہنچائیں گے، اللہ پاک ان میں خوشبو اور نور بھریں گے۔ سدا کی زندگی بنے گی جو محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں چلے گا۔ امیر ہے یا غریب، بادشاہ ہے یا فقیر، راستہ یہی ایک ہی ہے۔ بادشاہت میں کامیابی نہیں ہے، نمرود دُنیا کا بہت بڑا بادشاہ تھا، چار سو سال حکومت کی، لیکن آج کوئی بھی اپنے بیٹے کا نام نمرود رکھنے کو تیار نہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ان کے بارے میں بغض ڈال دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف لوگ نبیوں کے نام پر بھی قربان ہوتے ہیں، نبیوں کے بارے میں کوئی ہتک کرے آدمی جان دینے کو تیار، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر قربان، اللہ نے انہیں روشنی، نور اور دین کا معیار بنایا۔ حضور ﷺ نے رہتی دنیا تک کے انسانوں سے فرمایا: اگر مجھ تک پہنچنا ہے تو ان کو دیکھو! اور ان کی راہ پر چلو!

میرے بھائیو! اسی کی محنت اور اسی کی کوشش ہے۔ ہماری وجہ سے کوئی بھائی ہدایت پر آگیا، نیکی پر چلا، توبہ کرلی، بھلائی پر آیا، ہمارے لئے سعادت ہے۔ گونگے بن کے نہ رہیں، حق کو پھیلانا، حق کی علمبرداری ہماری زندگی کا وظیفہ حیات ہے۔ گرے پڑے لوگوں کو توبہ کی طرف لانا، توبہ اور نیک اعمال کا غسل دینا، جب توبہ کرلے گا تو اللہ کا پیارا بن جائے گا۔ خاص کر وہ لوگ جو گرے پڑے ہیں، لوگ جنہیں حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کتنے گلوکار تھے، کتنی رقاصائیں تھیں؟ اللہ پاک نے کتنا اونچا کیا؟

دِلّی کی طوائفہ عورتوں کی توبہ کا واقعہ:

موتی نامی ایک طوائفہ تھی، بازارِ حُسن کی نائکہ، کنجریوں کے محلے میں رہتی تھی۔ مولانا اسماعیل شہید رحمۃ

اللہ علیہ نے وہاں جا کر سدا لگائی۔ اس نے پیسے دے کر اپنی نوکرانی بھیجی، مولانا نے فرمایا اپنی نائکہ سے کہو اسماعیل آیا ہوا ہے وہ یہ پیسے نہیں لینا چاہتا، وہ کہتا ہے میں اللہ کا قرآن سنانا چاہتا ہوں۔ صحن میں چلے گئے اور پھر سورۃ التین شروع کی اور اس کو بیان کرتے رہے، سورج چڑھ گیا، ان سب گلوکارہ اور ناچنے والی عورتوں کی چیخیں تھیں۔ یہ عورت (موتی) جو سب کی سردار تھی، جس پر لوگ پیسہ نچھاور کرتے تھے توبہ تائب ہوئی، پھر ایک مجاہد کے ساتھ اس کا نکاح ہوا، یہی عورت بالاکوٹ میں شہید ہونے والے مجاہدین کے گھوڑوں کے لئے غلہ پیستی تھی۔ ساری رات اللہ کی عبادت کرنے والی بنی۔ اللہ پاک اس کو کتنی بلندی پر لے گئے؟ اس لئے کسی مسلمان کو ضائع نہ کریں، اسے قریب کریں۔

ایک عورت کی توبہ کا سبق آموز واقعہ:

ایک عورت سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس آئی کہ مجھ سے گناہ ہو گیا۔ بچہ پیدا ہوا اسے مار ڈالا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے غصے میں کہا تیری کوئی توبہ قبول نہیں۔ پھر اللہ کے نبی ﷺ کے پاس گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوہریرہ! ہلاک ہو گیا تُو، اے ابوہریرہ! ہلاک ہو گیا تُو، تُو کون ہے اس کی توبہ میں حائل ہونے والا؟ جاؤ اسے توبہ کی خوشخبری دو! جو نادم ہو کر آئے گا، مالک سے معافی مانگے گا، اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک رات گزر گئی، دوسرے دن وہ عورت ملی، جب سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بات سن کے گئی تھی، رو رہی تھی کہ اے اللہ! مجھے یہ حسن اس لئے دیا تھا کہ میں آگ میں جلتی رہوں۔ اس کے آنسو تھمنے کو نہیں آ رہے تھے۔ انہوں نے جا کر خوشخبری دی، اس کا ایک باغ تھا وہ اللہ کے نام پر دے دیا اور اس رحمان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے سجدے میں گر گئی جس نے اس کی توبہ قبول کی۔

ایک گنہگار کی توبہ کا سبق آموز واقعہ:

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں نے شکوہ کیا کہ یہ آدمی ایسا ہے ہم اس سے تنگ ہو چکے ہیں۔ کہا بھائی! سارا شہر آپ سے تنگ ہے نکل جاؤ۔ اللہ کی شان ایسا زخم لگا، روتے روتے جنگل کی طرف گیا، دل پھٹ گیا اور کہنے لگا اے میرے مولا! آج میری ماں ہوتی، آج میرا باپ ہوتا تو وہ بھی میرا سر اپنی گود میں رکھتے، تُو تو کہتا ہے کہ میں ماں باپ سے ستر گنا زیادہ مہربان ہوں، اگر میری بخشش سے تیرے

خزانے میں کمی آرہی ہے تو نہ بخش، توبہ کر کے فوت ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ آپ اس کا جنازہ پڑھائیں اور جس نے اپنی بخشش کرانی ہو اس کے جنازے میں شریک ہو۔

کراچی کی ایک عورت کی توبہ کا واقعہ:

میرے بھائیو! دعوت کی محنت توبہ کی محنت ہے۔ تقریباً سترہ سال پہلے (ملتان میں) کراچی سے مستورات کی ایک جماعت آئی تھی۔ اس میں ایک پائلٹ کی بیوی تھی، انگلش کے ساتھ ڈبل ایم اے کیا ہوا تھا، پہلے بڑی آزادانہ زندگی تھی، پھر اس عورت نے پلٹا کھایا، توبہ کی۔ اس کے خاوند نے کہا یہ وہی عورت ہے جو پہلے سر پر دوپٹہ نہیں رکھتی تھی، اب ایسی نیک خاتون بنی ہے کہ ڈیڑھ سو بچیوں کو قرآن وحدیث پڑھا رہی ہے۔ خواتین بتاتی تھیں کہ ہم نے اس سے بڑی رونے والی نہیں دیکھی۔

آخری اور اہم گزارش:

میرے بھائیو! کسم پرسوں کو سینے سے لگانا، گری ہوئی امت کو سنبھالنا، جو گندی نالی میں پڑے ہیں، ان پر پانی ڈالنا، ان کو وہاں سے نکالنا، ان کو دھکے نہ دینا۔ کیا خیال ہے آپ کا ایک مجرم روتا ہوا اگر محمد ﷺ کی دربار میں جاتا آپ اس کے آنسو نہ پونچھتے؟

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا[1] ''جنہوں نے زیادتی کرلی، آپ کے پاس آ جائیں، اے محمد ﷺ! آپ ان کے لئے بخشش کی دعا مانگیں، وہ بھی اپنے لئے مانگیں، آپ اللہ کو غفور ورحیم پائیں گے''۔

بھئی کیا آپ اپنی بری اولاد کو گھر سے نکال دو گے؟ بیٹا غلط ہوگیا ماں باپ تو نہیں بھولتے، ماں تو تڑپتی ہے، پریشان ہوتی ہے، کب لوٹے گا۔

بھئی یہ ایک محنت ہے، وہ لوگ جو گندے ماحول میں چلے گئے انہیں پلٹا دینا، انہیں حوصلہ دینا کہ رحمان سے کیوں مایوس ہو، اس کی رحمت انتظار میں ہے، صبح وشام اس کی رحمت ہاتھ پھیلائے ہوئے ہے، اے صبح

---

[1] النساء: ۶۴

کے گنہگار شام کو آجا! اے شام کے گنہگار صبح کو آجا! میرا دروازہ تیرے لئے کھلا ہوا ہے، اب بس کر میرے دروازے پر آجا میں تیرے سارے گناہ معاف کردوں گا۔ ہم محنت تو کریں پھر دیکھیں کیسے حالات پلٹا کھاتے ہیں، کیسے زندگیوں میں انقلاب آتا ہے، اللہ ربُّ العزت ہمیں اپنے دین کی محنت کیلئے قبول فرمائے، آمین۔

(وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ
قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ: ۱۲۴)

صفاتِ حمیدہ کے حامل

سیدنا ابراہیم علیہ السلام

وہ صفاتِ حمیدہ، عالیہ اور اوصافِ کمالیہ جن کی وجہ سے
سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو امامِ عالم بنایا گیا

صفاتِ حمیدہ کے حامل سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ:

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَإِذِ ابْتَلٰٓى إِبْرٰهِمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ۔[1]

حمد وصلوۃ کے بعد:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر اور موحدِ اعظم ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بہت اونچا مقام اور عظیم مرتبہ عطا فرمایا، اور قرآن مجید میں تقریباً ۲۵ سورتوں میں ۶۳ کے قریب آیات مبارکہ میں ان کا مبارک تذکرہ کیا۔ آج کے جمعہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ وہ کیا صفات تھیں اور وہ کون سے کلمات واحکامات تھے جن کی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو امامِ عالم بنایا گیا؟ جو ازل سے اُن میں ودیعت کی گئیں تھیں، زندگی کے بے شمار امتحانات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ صفات تمام انسانوں کو ظاہر کر کے دکھلائیں، مسلسل قربانیوں کی وجہ سے یہ صفات جھلکتی اور چمکتی گئیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مبارک زندگی درس ہائے عبرت وبصیرت:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مبارک زندگی درس ہائے عبرت وبصیرت ہے، اُن کی ذات کو یہود ونصاریٰ اور مشرکین سبھی نے اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کیا ہے، وہ قربانی میں صدق وصفا کے پیکر تھے۔ مدعی تو سبھی ہیں کہ ہم ابراہیمی ہیں مگر زبانی دعوؤں سے کام نہیں چلتا، اصل تو اُن کی زندگی اپنانے کی بات ہے، اُن کی مقدس تعلیمات پر چلنے والے ہی ابراہیمی کہلا سکتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے دعوے سراسر غلط ہیں، یہ لوگ خواہشات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

---

[1] البقرہ: ۱۲۴

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جو اللہ نے آزمایا حالانکہ وہ ذاتِ عالی اپنے علمِ ازلی وابدی کی وجہ سے سب کچھ جانتی ہے، اللہ تعالیٰ کے علم میں ماضی، حال اور استقبال سب برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں آزمائش کی بھٹیوں سے گزار کر رہتی دُنیا تک کے انسانوں پر آشکارا اور واضح کرنا تھا کہ میرے چُنے ہوئے اور کھرے بندے یہ ہیں، چونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ساری زندگی توحید کی تعلیم وتبلیغ، کفر وشرک کی بیخ کنی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایثار وقربانی سے بھری ہوئی ہے۔ قوم، باپ اور ظالم بادشاہ سب بت سازی، بت فروشی اور بُت سجودی کی دلدل میں غرق تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سارے محاذوں پر تن تنہا کامل اخلاص اور بے مثل استقامت کے ساتھ جہاد کیا، باپ نے گھر سے نکال دیا، قوم وبادشاہ نے آپ کو ہولناک آگ میں ڈالا (جس کا تذکرہ آئندہ کریں گے) اللہ تعالیٰ نے اسے گلِ گلزار بنا دیا۔ آخر کار وطنِ مالوف کو خیر باد کہہ دیا، پھر آگے بیٹے کی عظیم الشان قربانی (جس کا تذکرہ آئے گا)۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مالکِ حقیقی کی خوشنودی کی خاطر بے پناہ قربانیاں دیں، مرحلہ وار امتحانات سے گزرتے ہوئے کامیابی کی بلندترین چوٹی پر جا پہنچے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے اپنا گھر بنوایا، مناسکِ حج جاری کروائے، جہاں چوبیس گھنٹے طواف اور نماز کی عبادت ہو رہی ہے، رہتی دُنیا تک کیلئے مرجع الخلائق، محبوبیت، مرجعیت اور نافعیت کا مرکزی روشن منارہ اور ہدایت کا تا قیامت چمکنے والا وھّاب آفتاب بنا دیا۔ اب قدرے ابتلاءات کی تفصیل ذکر کرتے ہیں۔

امتحاناتِ ابراہیمی کی وجوہات:

اللہ تعالیٰ شانہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان دو وجہ سے لیا:

۱۔ اُن کی اعلیٰ تربیت کر کے اُنہیں سب سے اُونچے مقام پر پہنچانا تھا، جس کے وہ مستحق تھے۔ مشکلات، امتحانات اور مصائب کے خطرات سے نکال کر اللہ نے اُنہیں بلندیوں پر پہنچایا، اسلئے کہ انسان کا نکھار مشکلات سے ہوتا ہے۔

عام آدمی پر ابتلاء آئے اور وہ اللہ کی طرف رجوع کرے، اللہ تعالیٰ اس کا تزکیہ فرماتے ہیں، طہارت عطاء کرتے ہیں، انابت نصیب فرماتے ہیں اور نیک بناتے ہیں۔ اور نبیوں پر جب ابتلاء آئے، وہ گناہوں

سے معصوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرتے ہیں، ایمان اور نور کی بلندیوں تک پہنچاتے ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کو ایک آئینہ بنانا تھا۔ مکہ کے مشرک کہتے تھے کہ ہم ابراہیمی ہیں ، یہودی دعوے دار تھے کہ ہم ابراہیمی ہیں اور نصرانی بھی کہا کرتے تھے کہ ہم ابراہیمی ہیں۔

مکہ کے مشرکین نے اللہ کا گھر بنایا تھا، وہ اُس کے مجاور بنے ہوئے تھے، متولّی اور خادم تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ حقدار ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام اونچا تھا، اس لئے ہر ایک اپنا سلسلہ اور کڑی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتا تھا کہ ان کا نام لینے سے ہمارا بھی شرف ظاہر ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے تقابل کر کے بتایا کہ دیکھو! تم کہاں اور ابراہیم کہاں! تم شرک اور کفر میں ڈوبے ہوئے ہو، قدم قدم پر اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہو جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام خالص توحید کے علمبردار تھے، تم اپنی عبدیت میں جھوٹے ہو اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام صدق وصفا کے پیکر تھے۔ تم اللہ کے باغی ہو، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تو ساری زندگی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ تم نے بیت اللہ میں بُت بنا کر رکھے ہوئے ہیں، تم اللہ کی ذات وصفات میں شرک پر شرک کرتے ہو، تم بہت بڑے ظلم پر اُترے ہوئے ہو، سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو اس ظلم سے مُبرّا تھے، وہ مُوحّدِ اعظم تھے، وہ تو دنیا میں توحید وحق کے امام تھے۔ تم کہاں اور ابراہیم کہاں؟

اے یہودیو اور نصرانیو! تم نے اللہ کے دین کی تحریف کی، تم نے ہر آن، ہر گھڑی اللہ کی نافرمانیاں کیں اور ابراہیم علیہ السلام کی ساری زندگی اور زندگی کا ہر ورق، ہر صفحہ، ہر سطر، ہر سال، ہر مہینہ، ہر دن، ہر گھنٹہ اور ہر لمحہ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے بھرا پڑا ہے۔ تمہاری کیا نسبت ہے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے؟!

توحید کی اقسام اور مراتب:

صاحب روح البیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ قدس سرّہ سے سُنا ہے کہ توحید کی تین قسمیں اور مراتب ہیں:

۱۔ توحید الافعال

۲۔ توحید الصفات

۳۔ توحید الذات

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَهُ الْاِحْرَازُ بِجَمِيْعِ مَرَاتِبِ التَّوْحِيْدِ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو توحید کے یہ تینوں مراتب حاصل تھے اس لئے کہ مراتبِ توحید کے حصول سے موانع اور حواجب بھی تین ہیں:

۱۔ مال ۲۔ اولاد ۳۔ جسم

تَوْحِيْدُ الْاَفْعَالِ اِنَّمَا يَحْصُلُ بِالْفَنَاءِ عَنِ الْمَالِ وَ تَوْحِيْدُ الصِّفَاتِ بِالْفَنَاءِ عَنِ الْوَلَدِ وَ تَوْحِيْدُ الذَّاتِ بِالْفَنَاءِ عَنِ الْجِسْمِ وَالرُّوْحِ

توحید افعال مال قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہے، توحید صفات کا مرتبہ اولاد قربان کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور توحید ذات جسم اور روح بطور فدیہ کے فناء کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

فَاَخَذَاللّٰهُ مِنْ اِبْرَاهِيْمَ الْمَالَ تَحْقِيْقًا لِلتَّوْحِيْدِ الْاَوَّلِ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سارا مال لے کر انہیں توحیدِ افعال کے مرتبے سے نوازا، وَابْتَلَاهُ بِذِبْحِ الْوَلَدِ تَحْقِيْقًا لِلتَّوْحِيْدِ الثَّانِيْ اور توحید صفات کے مرتبہ پر نوازنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اپنے لختِ جگر اسماعیل علیہ السلام کی قربانی مانگی وَبِجِسْمِهٖ حِيْنَ رُمِيَ بِهٖ فِيْ نَارِ نَمْرُوْدَ تَحْقِيْقًا لِلتَّوْحِيْدِ الثَّالِثِ اور توحید ذات کے اعلیٰ مرتبے پر نوازنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جسم و روح کی قربانی مانگی جس کے لئے انہیں نارِ نمرود میں جانا پڑا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنا سب کچھ اللہ کے نام پر قربان کر دیا اور اپنا سب کچھ ہمیشہ باقی رہنے والی آخرت کے لئے چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور آپ سب کو بھی توحید کی حقیقت عطا فرمائے (آمین)۔

آزمائش کے ورود کی اصل حقیقت:

اللہ تعالیٰ نے ذبحِ ولد کے واقعہ میں فرمایا:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ ''بے شک یہ (یعنی ذبحِ ولد) بہت بڑی آزمائش ہے'' اَلْاِبْتِلَاءُ الْبَيِّنُ الَّذِيْ يَتَمَيَّزُ فِيْهِ الْمُخْلِصُ مِنْ غَيْرِهٖ ایسی واضح اور کھلی آزمائش جس میں غیر مخلص، مخلص سے جدا ہو

جائیں، اَلْمِحْنَةُ الْبَيِّنَةُ الصَّعُوْبَةُ اِذْلَاشَيْئَ اَصْعَبُ مِنْهَا ایسی واضح مشقت والی محنت کہ اس سے مشکل کوئی چیز نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے گویا یہ خبر دی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کیلئے یہ آزمائش ظاہر کے اعتبار سے تو واقعی آزمائش تھی لیکن باطنی اعتبار سے یہ کوئی آزمائش نہیں تھی لِاَنَّ فِیْ حَقِیْقَتِهٖ بُلُوْغَ مَنَازِلِ الْمُشَاهَدَاتِ وَشُهُوْدَ اَسْرَارِ حَقَائِقِ الْمُكَاشَفَاتِ هٰذَا مِنْ عَظَائِمِ الْقُرْبَاتِ اس لئے کہ حقیقتاً یہ امتحان سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدات کے اعلیٰ مراتب تک پہنچانے کیلئے تھا گویا علیم الیقین کے درجے سے بڑھ کر عین الیقین تک انہیں پہنچانا مقصود تھا اور یقیناً یہ بہت بڑی عبادت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں پر کسی آزمائش کے ورود کی اصل اور حقیقت ہی یہ ہے کہ ان کیلئے مشاہدہ حق سے کوئی چیز لمحہ اور لحظہ بھر کیلئے بھی رکاوٹ نہ بنے، یہ لوگ ہر وقت اور ہر لمحہ مشاہدہ حق کی کیفیت میں رہیں یہ آزمائش اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب بندوں کے درمیان ہوتی ہی نہیں فَالْبَلَاءُ لَهُمْ عَيْنُ الْوَلَاءِ یعنی جو چیز ہمارے اعتبار سے ان کیلئے آزمائش نظر آتی ہے وہ درحقیقت ان مقربین کیلئے قرب اور وصلِ محبوب کا ذریعہ ہوتی ہے۔

قَالَ الْحَرِيْرِيُّ اَلْبَلَاءُ عَلٰى ثَلَاثَةِ اَوْجُهٍ علامہ حریری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ افراد کے اعتبار سے بلاء اور آزمائش تین قسم کی ہوتی ہیں:

۱۔ عَلَى الْمُخَالِفِيْنَ نَقْمٌ وَّ عُقُوْبَاتٌ مخالفین پر جو بلاء اور مصیبت نازل ہوتی ہے وہ گویا دنیا میں ہی ان کے کرتوتوں کی سزا ہوتی ہے۔

۲۔ وَعَلَى السَّابِقِيْنَ تَمْحِيْصٌ وَّكَفَّارَاتٌ اور سابقین یعنی نیکوکاروں پر جو بلاء اور آزمائش آتی ہے وہ ان کا تزکیہ کرنے کے لئے ہوتی ہے اور دنیا میں ان کی لغزشوں کا کفارہ ہوتی ہے۔

۳۔ وَعَلَى الْاَوْلِيَاءِ وَالصِّدِّيْقِيْنَ نَوْعٌ مِّنَ الْاِخْتِبَارَاتِ اور اولیاء وصدیقین جو کہ مقرب لوگوں میں سے ہوتے ہیں ان پر آنے والی بلاء اور آزمائش گویا ان کے مقامِ ولایت اور مقامِ وصل کا امتحان ہوتی ہے۔

اعلیٰ شخصیت کے پیکر:

میرے عزیز دوستو! اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا، تاکہ لوگوں کو خبر ہو جائے کہ سیدنا

ابراہیم علیہ السلام کس عظیم کردار کے مالک تھے اور کتنے اونچے مقام پر پہنچے ہوئے تھے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ ''ہم نے ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا''۔ یہ امتحان اُن کی جلالتِ شان اور عظیم مرتبے کو ظاہر کرنے کیلئے تھا۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ میں ابراہیم کا ذکر بعد میں کرنا چاہیے تھا، ربّ کا لفظ پہلے آتا، یوں ہونا چاہئے تھا وَاِذِ ابْتَلٰى رَبُّهٗ اِبْرٰهِيْمَ ابراہیم کے ربّ نے ابراہیم کا امتحان لیا۔ لفظِ ابراہیم الفاظ کے اعتبار سے پیچھے ہے، مفعول بن رہا ہے فاعل نہیں مگر لائے پہلے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمتِ شان، تفخیمِ شان اور جلالتِ قدر کو ظاہر کرنے کے لئے ابراہیم کا لفظ اپنی ربوبیت سے پہلے ذکر کیا، تاکہ لوگوں کے سامنے عیاں اور واضح ہوجائے کہ ابراہیم کوئی عظیم شخصیت ہے۔ اللہ ربُّ العزت نے امتحان لیا بِكَلِمَاتٍ چند احکامات اور اوامر کے ساتھ۔ کلمات سے مراد وہ تیس صفاتِ ایمانی ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں اتم واکمل تھیں۔

تیس (۳۰) صفاتِ ایمانی:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّهٗ قَالَ: مَا ابْتُلِيَ اَحَدٌ بِهٰذَا الدِّيْنِ فَقَامَ بِهٖ كُلِّهٖ غَيْرُ اِبْرَاهِيْمَ، قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ۔ قُلْتُ لَهٗ مَا الْكَلِمَاتُ الَّتِيْ اِبْتَلَى اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ بِهِنَّ فَاَتَمَّهُنَّ؟ قَالَ: اَلْاِسْلَامُ ثَلَاثُوْنَ سَهْمًا مِنْهَا عَشْرُ آيَاتٍ فِيْ بَرَاءَةٍ: اَلتَّآئِبُوْنَ اِلٰى آخِرِ الْآيَةِ۔ وَعَشْرُ آيَاتٍ فِيْ اَوَّلِ سُوْرَةٍ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَسَأَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ۔ وَعَشْرُ آيَاتٍ فِي الْاَحْزَابِ: اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ، الى آخر الآية۔ فَاَتَمَّهُنَّ كُلَّهُنَّ فَكُتِبَتْ لَهٗ بَرَاءَةٌ۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک تفسیر یہ بھی آئی ہے کہ صفاتِ ایمانی جو مؤمنین میں ہیں وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں اکمل درجے کی تھیں۔ وہ تیس صفات کہ جب وہ کسی مؤمن میں ہوں تو وہ کامل بنتا ہے اور جب وہ کسی نبی میں ہوں تو وہ اکمل بنتا ہے، اسلئے کہ ہماری عبادت اور نبی کی عبادت میں فرق

ہے، ہماری انابت اور نبی کی انابت میں فرق ہے، ہمارے صدق اور نبی کے صدق میں بڑا فرق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی کی صفاتِ نورانیہ کا پوری اُمّت مل کر بھی مقابلہ نہیں کرسکتی۔

اللہ تعالیٰ نے ان تیس صفات میں سے دس کا ذکر سورۂ توبہ میں کیا، دس کا ذکر سورۃ احزاب میں کیا، سات صفات کا ذکر سورۃ مؤمنون میں کیا اور بقیہ تین صفات کا ذکر ۲۹ ویں پارے کی سورۃ المعارج میں کیا۔ یہ مؤمنین کی کامل صفات ہیں۔

دس صفات کا ذکر سورۃ التوبہ میں:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ[۱]

کوئی مؤمن کامل بننا چاہتا ہے تو اس میں توبہ ہو، اللہ کی طرف کامل رجوع ہو، عابد ہو، اللہ کا حامد ہو، ہر آن ہر گھڑی اللہ کی تعریف کرنے والا ہو، روزہ رکھنے والا ہو، سِيَاحَةُ اُمَّتِيْ اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ دین کی خاطر جان لگا دینے والا ہو۔

اَلرَّاكِعُوْنَ مؤمن کو دیکھو! رکوع کر رہا ہے یا سجدہ کر رہا ہے، یعنی نماز اور عبادت کا اس کو شغف حاصل ہے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ مؤمن بھلائی کو پھیلانے والا ہوتا ہے وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اور برائی سے روکنے والا ہوتا ہے۔

وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ اللہ کی حدود میں رہ کر اس کے احکامات کو پورا کرتا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ دسویں صفت ایمان کی ذکر کی ہے یعنی توبہ، عبادت، حمد، روزہ رکھنا، علمِ الٰہی حاصل کرنا، بھلائی کو پھیلانا، برائی سے روکنا، اللہ نے جو حدود بتائی ہیں کہ یہاں تک کام کرسکتے ہو، آگے نہ جاؤ، اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا، ایمان اور قتال فی سبیل اللہ کی صفت سے متصف ہونا۔

---

[۱] التوبۃ: ۱۱۲۔

دس صفات کا ذکر سورۂ احزاب میں:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا[۱]

اسلام کامل، ایمان کامل، اعلیٰ درجے کا فرمانبردار، قول اور عمل میں اعلیٰ درجے کا صدق اور سچائی۔ حالات آئیں تو ان حالات میں صبر کی حقیقت حاصل ہو، اللہ کے نام پر مال خرچ کرنے والا ہو، روزہ رکھنے والا ہو، عفت اور پاکدامنی اختیار کرنے والا ہو اور اللہ کو بہت یاد کرنے والا ہو۔

سات صفات کا ذکر سورۃ المؤمنون میں:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ، الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ، اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ[۲]

ان کی نماز میں خشوع ہے، دل اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہیں، بیہودہ باتوں کے قریب نہیں جاتے، لایعنی سے بچتے ہیں، زکوۃ فرض ہوگئی تو وہ ادا کرتے ہیں، اعلیٰ درجے کا اپنا تزکیہ کرتے ہیں۔ امانت رکھی جائے تو خیانت نہیں کرتے، وعدہ خلافی نہیں کرتے، وعدے کا ایفاء کرتے ہیں اور نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی وقت پر ادا کرتے ہیں۔ یہ صفات بیان کرنے کے بعد فرمایا: اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ،

---

[۱] الاحزاب: ۳۵۔

[۲] المؤمنون: ۱ تا ۹

الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ [۱] جن میں یہ صفات ہوں گی وہ فردوسِ اعلیٰ یعنی جنت کے محلات میں جائینگے۔

تین صفات کا ذکر سورۃ المعارج میں:

سورۂ معارج میں اللہ تعالیٰ شانہٗ نے انہی صفات کو بیان کیا ہے، تین صفتیں اس میں زیادہ بیان کیں:

لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ [۲] کہ وہ سائل اور محروم کو دیتے ہیں۔ ایسا سائل جس کا مکر ظاہر ہے کہ یہ مکار ہے ،سائل نہیں، اس کو نہیں دینا چاہئے۔

سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک سائل آیا، اسکو کچھ مال عطاء کیا، اس کی ضرورت پوری ہوگئ۔ دوسری گلی میں جا کر پھر صدا لگادی، تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کوڑا مارا اور اس کی خرجین سے سارا راشن نکال دیا اور فرمایا: تو سائل نہیں ہے، لوگوں کو دھوکہ دینے والا ہے، مانگنے کی عادت بن گئی ہے۔

اگر ظن غالب یہی ہے کہ مانگنا اس کی عادت ہے تو پھر یہ سائل نہیں ہے اور بہت سے سائل (ضرورتمند) ایسے ہوتے ہیں جو سوال کرتے ہوئے شرماتے ہیں: لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وہ چمٹ کر سوال نہیں کرتے، طبیعت ان کی شرمیلی ہے۔ فرمایا تم خود ہی اس کی جستجو کرو اور اس تک مال وغیرہ پہنچاؤ۔

بعض مکار ہوتے ہیں، آپ دیکھتے ہیں مسجدوں میں رونے کھڑے ہوجاتے ہیں اور باہر جا کر ہوٹلوں پر عمدہ سے عمدہ کھانا کھاتے ہیں۔ بعضوں نے اپنی بناوٹی فائلیں بنائی ہوئی ہیں۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا: جو جھوٹا سائل ہوگا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے چہرے کا تمام گوشت اُتار دیں گے۔ میرے دوستو! مساجد تو اللہ سے مانگنے کی جگہیں ہیں، مساجد میں سوال ٹھیک نہیں، یہاں تو ہم سب اللہ سے مانگنے آئے ہیں اور یہ اللہ کے گھر آ کر بھی غیر سے مانگ رہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ [۳] مؤمنین کاملین کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ شہادت کو قائم رکھتے ہیں۔ بہت جگہ گواہی دینی پڑتی ہے، شہادت کی اپنی شرائط ہیں۔ کہ گواہ کون بن سکتا ہے؟ کس موقع

---

[۱] المؤمنون: ۱۰، ۱۱

[۲] المعارج: ۲۵

[۳] المعارج: ۳۳

پر بن سکتا ہے؟ اسکی بہت تفصیلات ہیں۔ ضرورت کے وقت بڑے علماء سے پوچھنی چاہئیں۔

تیس (۳۰) صفات کا مختصر تذکرہ اور خلاصہ:

اَلتَّآئِبُوْنَ: توبہ، یہ وہ نعمت ہے جس سے سابقہ سب گناہ منہدم ہوجاتے ہیں: اَلتَّائِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ

توبہ کی چار شرائط ہیں:

۱۔ **اَنْ یَّقْلَعَ عَنِ الْمَعْصِیَۃِ:** جس گناہ میں مبتلا ہے اُس سے بالکلیہ علیحدہ ہوجائے۔

۲۔ **اَنْ یَّنْدَمَ عَلَیْھَا:** دل اپنے کئے پر شرمندہ ہو، رو رہا ہو۔

۳۔ **اَنْ یَّعْزَمَ عَزْمًا جَازِمًا اَنْ لَّا یَعُوْدَ اِلٰی مِثْلِھَا اَبَدًا:** پکا عزم کرے کہ اب ان شاء اللہ ایسا گناہ کبھی نہیں کروں گا، دوبارہ اُس معصیت کی طرف نہیں لوٹوں گا، بشرطیکہ اللہ کی معیت ونصرت شامل حال ہو۔[۱]

۴۔ سابقہ اعمال متروکہ کی قضا اور حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی۔

اَلْعَابِدُوْنَ: عبادت کی جتنی قسمیں ہیں اُن سب کو ادا کرے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نذر اور قربانی وغیرہ سب کو اخلاص اور سنّت کے مطابق ادا کرنا۔

اَلْحَامِدُوْنَ: خوشی، غمی، عسر ویُسر وغیرہ کے جمیع حالات میں اللہ تعالیٰ کا شاکر بن کر رہے، رضا بالقضا کی صفت ہو، ہر حال میں شکر کرنے والے اور حمد کرنے والے، حدیث میں آیا ہے بغیر حساب کے جنّت میں داخل کردیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ لوگ بہت ہی پسند ہیں جو مالک کے کمالات بیان کرنے میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

سَآئِحُوْنَ: سائح، روزہ رکھنے والے، ہر ماہ کے ایامِ بیض کے تین روزے، سوموار اور خمیس کے روزے رکھنے والے اور اس کا اہتمام کرنے والے۔ ان کے سینے غِل اور کھوٹ سے پاک رہتے ہیں، یہ صائم الدھر کہلاتے ہیں۔ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں بعض حضرات سخت گرمیوں میں روزے رکھنے کے بہت خواہش مند رہتے تھے۔

سَآئِحُوْنَ: کی دوسری تفسیر اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد ہے جو ذروۃِ دین اور سنامِ اسلام ہے۔ حضور علیہ السلام کا مبارک ارشاد ہے: سِيَاحَةُ أُمَّتِيْ اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

اَلرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ: اُن کا سکون اور آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، رکوع اور سجدے میں راتیں گزارتے ہیں، مالک کے سامنے تذلل، پیشانی اور ناک رگڑنے میں سعادت سمجھتے ہیں۔

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: معروفات کو پھیلانا اور منکرات سے روکنا اُن کا وظیفہ حیات ہے۔ توحید وسنّت کی دعوت کو لے کر سارے عالم میں چھا جانے کے جذبات میں، احیاء دین، اشاعتِ دین اور اللہ تعالیٰ کے کلمے کو پھیلانا اور اُسے سربلند کرنا اُن کی گھٹی میں ہے، استمرار ودوام کے ساتھ اس میں لگے ہوئے ہیں۔

وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: حلت وحرمت، جائز وناجائز، سُنت وبدعت، طہارت ونجاست، عمل صحیح وفاسد، عقل وقلبِ سلیم وقلبِ اسود کی جو حدود شریعت نے متعین کی ہیں اُن کی خوب نگہداشت رکھتے ہیں۔

نمازوں کو خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں: نماز کو کمال دھیان سے ادا کرتے ہیں، اعضا میں کمال درجے کا سکون اور قلب میں خشیتِ الٰہی ہوتی ہے۔

لغو اور بیہودہ چیزوں سے اعراض کرتے ہیں: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا[1] گندی مجالس سے منہ پھیر کر اپنے مقصد کی طرف رواں دواں رہتے ہیں، فساق وفجار اور غافل لوگوں کی محافل سے کنارہ کش، موسیقی اور گانے کی مجالس سے کمال اجتناب اُن کا وطیرہ ہے۔

لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ: زکوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ مال پاک رہے اور باعثِ برکت ہو، گویا جسمانی طہارت کے ساتھ ساتھ مالی طہارت کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ: جنّت میں داخل ہونے والوں میں عفیف اور متعفف (عن السوال) ذوعیال لوگ بھی ہوں گے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان عالی ہے: اپنی زبان اور شرمگاہ کی ضمانت دے دو میں

---

[1] الفرقان: ۷۲

محمد (علیہ السلام) جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لِاَمَانٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ: امانت میں خیانت نہیں کرتے، لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ۔ امانت کی کماحقہ حفاظت اُن کا شعار ہے، عہد و پیمان کو خوب نبھاتے ہی: لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ، عہد شکنی عنداللہ مذموم وقبیح چیز ہے۔ وعدے اور عہد کو کچے دھاگے کی طرح نہیں سمجھتے کہ جب چاہا توڑ دیا۔ عہد شکن قیامت میں اس حال میں آئیں گے کہ اُن کی سُرین کے ساتھ جھنڈا ہوگا تاکہ لوگ اُن کو پہنچان لیں، کتنی بڑی رسوائی ہے؟

اجتماعی یا انفرادی مال میں خیانت، چوری اور ڈاکہ زنی کرنے والوں کے بارے میں وعید:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ فَذَكَرَ الْغُلُوْلَ فَعَظَّمَهٗ وَعَظَّمَ اَمْرَهٗ ثُمَّ قَالَ: لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ بَعِیْرٌ لَهٗ رُغَاءٌ یَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ. لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ فَرَسٌ لَهٗ حَمْحَمَةٌ فَیَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ شَاةٌ لَهَا ثُغَاءٌ یَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ نَفْسٌ لَهَا صِیَاحٌ فَیَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ رِقَاعٌ تَخْفِقُ فَیَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ لَا اُلْفِیَنَّ اَحَدَكُمْ یَجِیْءُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عَلٰى رَقَبَتِهٖ صَامِتٌ فَیَقُوْلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَغِثْنِیْ فَاَقُوْلُ لَا اَمْلِكُ لَكَ شَیْئًا قَدْ اَبْلَغْتُكَ۔ [۱]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے ایک دِن ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور (اس خطبہ کے دوران) مالِ غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا: چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بہت بڑا گناہ بتایا اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا اور پھر فرمایا کہ ''خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر بلبلاتے ہوئے اُونٹ کو لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے (یعنی جو شخص مالِ غنیمت میں سے مثلاً اونٹ کی خیانت کرے گا تو وہ شخص میدانِ حشر میں اس حالت میں آئے گا کہ اس کی گردن پر وہی اونٹ سوار ہوگا اور بلبلا رہا ہوگا) اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی (شفاعت) کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں (یعنی میں تمہیں اللہ کے عذاب سے چھٹکارا نہیں دلاسکتا) کیونکہ میں نے تمہیں (دنیا میں) شریعت کے احکام پہنچادیئے تھے۔

(اور خبردار!) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ہنہناتے ہوئے گھوڑے کو لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے (یعنی تمہیں پہلے ہی آگاہ کردیا گیا تھا کہ مالِ غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں ناحق تصرف بہت بڑا گناہ ہے)۔

(اور خبردار) میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر ممیاتی ہوئی بکری لادے ہوئے (میدانِ حشر) میں آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کی جائے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچادیئے تھے۔

(اور خبردار) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن

پر کسی چلاتے ہوئے آدمی کو (یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لیا ہو) لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

(اور خبردار) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کپڑے رکھے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔

(خبردار) میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لادے ہوئے (میدانِ حشر میں) آئے اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یارسول اللہ! میری فریادرسی کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہہ دوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے"۔

وَعَنْهُ قَالَ اَهْدٰی رَجُلٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُلَامًا يُقَالُ لَهٗ مِدْعَمٌ فَبَيْنَمَا مِدْعَمٌ يَحُطُّ رَحْلًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَصَابَهٗ سَهْمٌ عَائِرٌ فَقَتَلَهٗ فَقَالَ النَّاسُ هَنِيْئًا لَهُ الْجَنَّةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِیْ اَخَذَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ لَنْ تُصِيْبَهَا الْمَقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا فَلَمَّا سَمِعَ ذٰلِكَ النَّاسُ جَاءَ رَجُلٌ بِشِرَاكٍ اَوْ شِرَاكَيْنِ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ شِرَاكٌ مِّنْ نَارٍ اَوْ شِرَاكَانِ مِنْ نَارٍ [1]

---

[1] متفق علیہ، صحیح البخاری: کتاب الایمان والنذور، باب هل یدخل فی الایمان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں ایک غلام ہدیہ کے طور پر پیش کیا جس کا نام مدعم تھا (ایک دِن غالباً کسی میدانِ جنگ میں) وہ رسولِ کریم ﷺ کا کجاوہ اُتار رہا تھا کہ اچانک کسی نامعلوم شخص کا تیر آ کر اس کو لگا، جس سے وہ جاں بحق ہوگیا۔ لوگوں نے کہا: مدعم کو جنت مبارک ہو یعنی مدعم خوش قسمت رہا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہوا اور جنت میں پہنچ گیا۔ (یہ سن کر) رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں! ایسا نہیں ہے، اس ذات کی قسم! جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، وہ چادر جس کو مدعم نے خیبر کے دِن مالِ غنیمت میں سے اس کی تقسیم سے قبل لے لیا تھا، آگ بن کر مدعم پر شعلے برسا رہی ہے۔ جب (ان) لوگوں نے (اس شدید وعید وتنبیہ کو) سنا (جنہوں نے مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو سہل سمجھ لیا تھا اور یہ گمان کرلیا تھا کہ چھوٹی موٹی اور حقیر چیزوں کو لے لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا تو وہ کانپ گئے اور انہوں نے مالِ غنیمت میں سے جو چھوٹی موٹی چیزیں لے لی تھیں ان کو لا لا کر واپس کرنے لگے یہاں تک کہ) ایک شخص ایک تسمہ یا دو تسمے (واپس کرنے کے لئے) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لایا۔ آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا: یہ آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں؟ یعنی خیانت کی چیز ہر حالت میں دوزخ کا سزاوار کرے گی خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضی اللہ عنہ قَالَ كَانَ عَلٰى ثَقَلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ كِرْكِرَةُ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ فِي النَّارِ فَذَهَبُوْا يَنْظُرُوْنَ فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْ غَلَّهَا[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام کرکرہ تھا (کسی غزوے میں) رسول کریم ﷺ (کی طرف سے سامان و اسباب) کا نگران مقرر ہوا،

---

[1] صحیح البخاری: کتاب الجہاد، باب القلیل من الغلول، رقم الحدیث: ۳۰۷۴

جب اس کا انتقال ہوا تو رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا: وہ (کرکرہ) دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔
چنانچہ لوگوں نے (اس کے سامان کو) دیکھنا شروع کیا تو اس میں ایک کملی پائی گئی جس کو اس نے مالِ غنیمت میں سے خیانت کر کے لے لیا تھا۔

عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ: نمازوں کی محافظت، وقت پر ادائیگی اور جماعت کا اہتمام بھی ان سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

اسلام اور ایمان: اُن کے قلوب نورِ ایمانی سے لبریز اور اعضاء اطاعت الٰہی کے منقاد و مطیع ہیں، حقیقی مؤمن اور کامل مُسلم ہیں۔

وَالْقَانِتِيْنَ وَالْقَانِتَاتِ: اُن کے مرد و عورتیں صفت قناعت کے ساتھ متصف ہیں، کم سے کم چیزوں پر گزارہ، زندگی سادہ اور اسراف وتبذیر سے بہت دور۔

وَالصَّادِقِيْنَ وَالصَّادِقَاتِ: راستی وصدق اُن کے مزاج کا جزء لاینفک ہے، قولاً عملاً، اخلاقیات ومعاملات میں سچائی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ حضور علیہ السلام نے خصوصًا سچے تاجروں کے بارے میں فرمایا: اُن کا حشر قیامت کے دن جماعتِ مقرّبین کے ساتھ ہوگا۔

وَالصَّابِرِيْنَ وَالصَّابِرَاتِ: خواہشات سے اجتناب پر پختگی اور ثابت قدمی، طاعات کی ہر لائن پر ثبات وپختگی اور حوادث ومصائب پر رضا بالقضاء کا جذبہ ہے، اس وجہ سے اُنہیں معیّتِ الٰہی حاصل ہے۔

وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ: اللہ تعالیٰ کے نام پر مصارفِ صحیحہ پر خرچ کرنے میں دوام ہے۔

يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ [1]: تنگی وفراخی دونوں حال میں اللہ کے بندوں پر خرچ کرنا اُنہیں بہت محبوب ہے۔

وَالذَّاكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذَّاكِرَاتِ: مالکِ حقیقی کی تعریف وتحمید اور تمجید وتہلیل میں والہانہ مشغول رہتے ہیں، اذکارِ مسنونہ، ہر وقت اللہ کا جلال ودبدبہ اُنہیں مستحضر رہتا ہے۔ مقامِ غفلت میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں، کثرتِ تلاوت، استغفار اور صلوٰۃ علی النبی علیہ السلام میں مشغول رہتے ہیں،

---

[1] آلِ عمران: ۱۳۴

اور حقیقی ذاکر وہ ہے جو کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو اور تمام گناہوں سے بچنے کا پورا اہتمام کرے۔

توجہ طلب بات:

میرے محترم بھائیو! مومنین کاملین کی یہ تیس (۳۰) صفات اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: یہ صفات ہیں جو مومنین میں ہونی چاہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں یہ صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں، اعلیٰ درجے کی تھیں۔ ایک ہمارا صدق ہے، ایک نبی کا صدق ہے۔ ایک ہماری عبادت ہے، ایک نبی کی عبادت ہے۔ ایک ہمارا خشوع ہے ایک نبی کا خشوع ہے۔ ایک ہمارا ایمان ہے اور ایک نبی کا ایمان ہے۔ ایک اُمتی کا اسلام ہے ایک نبی کا اسلام ہے اور نبی بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام جیسے جو ان صفات کے کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کی صفات کا نور تو اتنا زیادہ ہے کہ سورج بھی ماند پڑ جائے۔

تیس صفات کا خلاصہ ایک آیت میں:

بعض مفسرین نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اُن تیس صفات کو جن کی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سیادت وقیادتِ عالمی عطا ہوئی، ایک آیت میں بیان کر دیا:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۔

''ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے تھے جبکہ انہوں نے صبر کیا، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے''۔[۱]

یقین، علمی اور اعتقادی کمال ہے، صبر، عملی اور اخلاقی کمال ہے۔ بہت سی صفات کا تعلق قلب سے ہے۔ ایمان کے بعد ستتر (۷۷) شعبے ہیں، اڑتیس (۳۸) کا تعلق اعتقاد اور قلب سے ہے، دس کے قریب شعبوں کا تعلق زبان سے اور باقی شعبوں کا تعلق اعضاء سے ہے۔ ایقان اور ایمان اعلیٰ درجہ کا علمی اور اعتقادی کمال ہے اور بہت سی صفات صبر کی ہیں، صدق اس میں آجاتا ہے، اطاعت اس میں آجاتی ہے۔ تو

---

[۱] السجدہ: ۲۴

معاصی سے بچنا اور مصائب پر جمنا یہ سب صبر ہے، صبر ایک مختصر لفظ مگر جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر بہت سی صفات جمع ہیں، آگے اس کی شاخیں ہیں۔ ان دو صفات یعنی صبر اور ایقان و ایمان نے تیس (۳۰) صفات کو اپنے اندر جمع کیا ہوا ہے۔ اُن حضرات میں یہ تیس (۳۰) صفات تھیں، اللہ نے اِن صفات کے حاملین کو امامِ عالم بنایا، جیسے حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان صفات کو اپنایا تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں عالمی مقتدا و امام بنایا۔ بعض مفسرین نے فرمایا: یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ہم نے امتحان لیا کلمات کے ساتھ، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر یہ صفات پیدا کرو۔

کلمات سے مراد احکاماتِ شاقّہ:

اور بعض حضرات نے فرمایا: یہاں احکامات سے مراد احکاماتِ شاقّہ ہیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے پورے کئے۔ پہلے اپنے گھر سے دُشمنی شروع ہوئی، ہر روز والد صاحب جھگڑ رہے ہیں، یہاں تک کہ ابا جی نے کہہ دیا کہ میں تجھے سنگسار کر دونگا، لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا[1] چھوڑ کر چلا جا، ورنہ میں پتھر مار مار کر ہلاک کر دونگا۔ کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد بُت ساز بھی تھے، بُت پرست بھی اور بُت فروش بھی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو یہ چیز ناگوار گزری، اس لئے بار بار والد کو توحید کی دعوت دیتے رہے اور فرماتے رہے کہ آپ غیر اللہ کے سامنے نہ جھکیں، نفع و نقصان، عزت و ذلّت اور کامیابی و ناکامی پر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا قبضہ ہے، مخلوق کے ہاتھ میں بدون اذنِ الٰہی کچھ بھی نہیں۔

پھر ساری قوم، برادری اور سارا علاقہ اس خطرناک مرض یعنی شرک میں مبتلا تھا۔ بت پرستی کے اندر، توہمات میں، سورج کی پوجا، چاند کی پوجا، کواکب کی پوجا، توہّم پرستی، جنّات کی پوجا اور اپنے ہاتھوں سے بُت بنانا اور ان کی پوجا کرنا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس محاذ پر اپنی پوری قوت لگائی، بھرپور دعوت دی اور اپنی ساری قوم و برادری سے جہاد کیا۔ فرمایا اے میری قوم! اُعْبُدُوا اللّٰهَ اللہ کی بندگی کرو، کیوں تم شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں غوطے لگا رہے ہو۔

---

[1] مریم: ۴۶

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زندگی کے نمایاں پہلو:

حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ (اللہ کے دوست) تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا [۱]۔ وہ جوان مردوں کے سردار ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کسی نے یا سید البشر کہہ کر پکارا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

آپ علیہ السلام بہت زیادہ مہمان نواز تھے، صبح کا ناشہ اور رات کا کھانا مہمان کے بغیر نہیں کھاتے تھے، اور بسا اوقات دو دو میل یا اس سے بھی زیادہ چل کر مہمان کو ڈھونڈ کر لاتے تھے۔ آپ علیہ السلام کی ضیافت قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔

آپ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی کہ وہ آپ علیہ السلام کی نسل میں نبوت کو جاری رکھے تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمایا اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام اور سیدنا اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں نبوت کو جاری فرمایا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> میں آٹھ ہزار نبیوں پر مبعوث کیا گیا ہوں جن میں سے چار ہزار نبی، بنی اسرائیل میں سے تھے اور یہی وہ شخصیت ہیں جن کا ذکرِ خیر بعد کی اُمتوں میں بھی جاری رہے گا، اور سوائے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اور کوئی بھی نبی ایسا نہیں ہے کہ جس کی تصدیق اور فضیلت اور مدحت کے بارے میں تمام مخلوق کی زبانیں ہمیشہ جاری رہی ہوں اور یہ آپ علیہ السلام کی اسی دعا کی بدولت ہے: ''وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ''۔ [۲]

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام مختلف آزمائشوں میں مبتلا کئے گئے اور آپ علیہ السلام کی وفا کی گواہی دی گئی، اسی بارے میں ارشادِ ربانی ہے: وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمَاتٍ فَاَتَمَّهُنَّ [۳] اور وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى'' [۴]

---

[۱] النساء: ۱۲۵

[۲] الشعراء: ۸۴

[۳] البقرۃ: ۱۲۴

[۴] النجم: ۳۷

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک فرمانبردار اُمت تھے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: ''اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِيْفًا وَّلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ''۔[۱]

اُمت کا معنی یہ ہے کہ آپ خیر کی تعلیم دینے والے تھے اور آپ علیہ السلام کے اندر خیر اور فضیلت کی تمام وہ اقسام جمع تھیں جو کسی ایک پوری اُمت میں جمع ہوتی ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر کا قول ہے:

لَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكَرٍ اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ

اللہ پر کوئی مشکل نہیں ہے کہ وہ پورے عالم کو فردِ واحد میں جمع کر دے۔

آپ علیہ السلام وہ شخصیت ہیں جن کو بلوغت سے پہلے ہی رشد و ہدایت عطا کر دی گئی تھی، آپ علیہ السلام موحّدین کے امام ہیں اور آپ کو توحید کے بارے میں حجت قرار دیا گیا ہے۔ پس آپ نے دلیل کے ذریعے مخلوقِ خدا کو اپنے بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک حق کی طرف بلایا جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ''وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ (الاية)۔[۲]

آپ علیہ السلام کی ذات کو سب سے پہلے یہ شرف حاصل ہوا کہ جس کو اللہ ربُّ العزت نے حَنِيْفًا مُّسْلِمًا کا نام دیا جیسا کہ قرآن میں آتا ہے: ''وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا''۔[۳]

اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو یہود و نصاریٰ کے دعوؤں سے بری الذمہ قرار دیا اور آپ علیہ السلام کے لئے اسلام اور اخلاص کی گواہی دی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا''۔[۴]

اللہ ربُّ العزت نے آپ علیہ السلام کو لوگوں کا امام بنایا جیسا کہ ارشاد ہے: ''اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا [۵] ایک اور مقام پر اللہ ربُّ العزت نے فرمایا: قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [۶]

---

[۱] النحل: ۱۲۰

[۲] الانعام: ۸۳

[۳] آل عمران: ۶۷

[۴] آل عمران: ۶۷

[۵] البقرۃ: ۱۲۴

[۶] الممتحنۃ: ۴

حضرت محمد ﷺ جو خیر الانبیاء ہیں اور ان کی اُمت جو خیر الامم ہے ان کو بھی ملتِ ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا [۱] وَقَالَ: قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا (الآیۃ)

اللہ نے آپ علیہ السلام کو حلیمًا (تحمل والا) منیبًا (رجوع کرنے والا) اور اَوَّاهًا (نرم دل) کے القابات سے نوازا۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ [۲]

الحلیم: حلیم اس بادشاہ کو کہتے ہیں جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے۔

اَلاَوَّاہ: اس کو کہتے ہیں جو گناہوں کے بہت زیادہ ذکر پر آہ وزاری کرتا ہو۔

المنیب: جو دل سے اللہ ربُّ العزت کی طرف پلٹ جائے۔

ابو ادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول! اللہ ربُّ العزت نے کتنی کتابیں نازل فرمائیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سو صحیفے اور چار کتابیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے۔ حضرت شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے نازل کئے اور حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس صحیفے نازل کئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے نازل کئے اور چار کتابیں توراۃ، انجیل، زبور اور قرآن پاک نازل کیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں کیا تھا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ساری مثالیں تھیں کہ اے آزمائشوں میں گھرے ہوئے جابر اور مغرور بادشاہ! میں نے تجھے اس لئے دنیا میں نہیں بھیجا تھا کہ تو دنیا کا مال ومتاع اکٹھا کرے بلکہ میں نے تجھے اس لئے بھیجا تھا کہ تو مظلوم کی فریادرسی کرے کیونکہ میں مظلوم کی دعا کو ردّ نہیں کرتا اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو اور اس میں دیگر مثالیں بھی تھیں۔

---

[۱] النحل: ۱۲۳

[۲] ھود: ۷۵

عاقل شخص جب تک اس کی عقل پر پردہ نہ پڑ جائے اس پر لازم ہے کہ اس کی زندگی میں چار اوقات ضرور ہونے چاہئیں:

۱) ایک ایسی گھڑی جس میں وہ اپنے رب کے حضور مناجات کرے۔

۲) اور ایک گھڑی ایسی ہو جس میں اللہ ربُّ العزت کی بنائی گئی تمام تخلیقات میں غور وفکر کرے۔

۳) اور ایک گھڑی ایسی ہو جس میں وہ اپنے تمام اگلے پچھلے اعمال پر اپنے آپ (نفس) کا محاسبہ کرے۔

۴) اور ایک وقت ایسا ہو جس میں وہ سب سے الگ تھلگ ہو کر تنہائی میں اللہ ربُّ العزت سے اپنے کھانے پینے (یعنی رزق کی کشادگی) اور اس کے علاوہ دیگر حاجات کے بارے میں سوال کرے۔

اور عاقل پر لازم ہے کہ وہ تین چیزوں کے سوا کسی پر طاعن نہ بنے۔

۱) آخرت کے لئے زادِ راہ اکٹھا کرنے میں۔

۲) اپنی معاش کی بہتری کے لئے کمائی کرنے میں۔

۳) حلال اشیاء سے نفع اُٹھانے میں۔

نیز عاقل شخص پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کی بصیرت رکھتا ہو، اپنی حالت کو جاننے والا ہو اور اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا ہو۔[۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام تمام اقوامِ عالَم کے لئے مسلّم مقتدا و پیشوا:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اصل میں ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا، فرمانبردار اللہ کا، سب سے ایک طرف ہو کر اور نہ تھا

---

[۱] ماخوذ از عرائس المجالس

شرک کرنے والوں میں، حق ماننے والا اس کے احسانوں کا، اس کو اللہ نے چُن لیا اور چلایا سیدھی راہ پر، اور دی ہم نے دُنیا میں اس کو خوبی اور وہ آخرت میں اچھے لوگوں میں ہے، پھر حکم بھیجا تجھ کو ہم نے کہ چل دِین ابراہیم پر جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں۔

مذکورہ چار آیتوں میں سے پہلی آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تمام اقوامِ عالم کا مسلم مقتدا ہونا بیان فرمایا، جو نبوت و رسالت کا اعلیٰ مقام ہے اس سے ان کا عظیم الشان نبی و رسول ہونا ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ہی **مَاكَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ** سے ان کا کامل توحید پر ہونا بیان فرمایا۔ اُن میں شرک کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ وہ تو حنیف ہیں، سب سے کٹ کر ایک اللہ کے ہیں۔

اور دوسری آیت میں ان کا شکر گزار اور صراطِ مستقیم پر ہونا بیان فرما کر **اَنْعُم** جمع قلت ذکر کر کے بتلایا کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی نعمت کے اعلیٰ شکر گزار تھے چہ جائیکہ بڑی نعمتیں۔ اے کفّار! تم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہوئے اپنے کو ان کا متبع کس زبان سے کہتے ہو؟

تیسری آیت میں ان کا دنیا و آخرت میں کامیاب و بامراد ہونا بتایا، حَسَنَۃ کا ذکر کر کے بتلایا کہ دنیا و آخرت کی عجیب و غریب نعمتیں عطا فرمائیں اور چوتھی آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اثبات کے ساتھ آپ کا صحیح ملتِ ابراہیم کا پابند ہونا بیان فرما کر یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان اور آپ کی اطاعت کے بغیر یہ دعویٰ صحیح نہیں ہوسکتا۔

لفظ اُمّت چند معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے، مشہور معنی جماعت اور قوم کے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس جگہ یہی معنی منقول ہیں اور مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام تنہا ایک فرد ایک اُمت اور قوم کے کمالات و فضائل کے جامع ہیں۔ (۲) اور ایک دوسرا معنی لفظ اُمّت کے مقتدائے قوم اور جامع کمالات کے بھی آتے ہیں، بعض مفسرین نے اس جگہ یہی معنی لئے ہیں۔ (۳) اور تیسرا معنی اُمت کا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معلّم بھی بتلایا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تمام انسانیت کے معلّم تھے۔ اور **قانت** کے معنی تابع فرمان کے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں وصفوں میں خاص

امتیاز رکھتے ہیں۔ مقتدا ہونے کا تو یہ عالم ہے کہ پوری دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے لوگ سب آپ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور آپ کی ملت کے اتباع کو عزت وفخر جانتے ہیں۔ یہود، نصاریٰ، مسلمان تو ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہی ہیں، مشرکینِ عرب، بت پرستی کے باوجود اس بُت شکن کے معتقد اور ان کی ملت پر چلنے کو اپنا فخر جانتے ہیں اور قانت ومطیع ہونے کا خاص امتیاز ان امتحانات سے واضح ہوجاتا ہے جن سے اللہ کے یہ خلیل گزرے ہیں۔ آتشِ نمرود، اہل وعیال کو لق ودق جنگل میں چھوڑ کر چلے جانے کا حکم، پھر آرزوں سے حاصل ہونے والے بیٹے کی قربانی پر آمادگی یہ سب وہ امتیازات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان القاب سے معزز فرمایا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم اور اس کی حکمتیں:

حق تعالیٰ نے جو شریعت واحکام حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمائے تھے۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت بھی بعض خاص احکام کے علاوہ اس کے مطابق رکھی گئی اور اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء ورسل سے افضل ہیں، مگر یہاں افضل کو مفضول کے اتباع کا حکم دینے میں دو حکمتیں ہیں:

اوّل تو یہ کہ وہ شریعت پہلے دنیا میں آچکی ہے اور معلوم ومعروف ہوچکی ہے، آخری شریعت بھی چونکہ اس کے مطابق ہونے والی تھی، اس لئے اس کو اتباع کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے دوسرے بقول علامہ زمخشری یہ حکم اتباع بھی منجملہ اکرام واعزاز خلیل اللہ کے ایک خاص اعزاز ہے اور اس کی خصوصیت کی طرف لفظ ثُمَّ سے اشارہ کردیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تمام فضائل وکمالات ایک طرف اور ان سب پر فائق یہ کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے افضل رسول وحبیب کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم فرمایا۔

فوائدِ عظیمہ:

مشرکینِ عرب چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا مقتدا اور پیشوا مانتے تھے ان کی ملت اور شریعت کے اتباع کو واجب سمجھتے تھے، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے کیسے موحد اور شکر گزار اور فرمانبردار بندے تھے، سرتاپا توحید وتفرید میں غرق تھے، معاذ اللہ مشرک نہ تھے، لہٰذا مشرکین عرب اور اہل کتاب کا یہ سمجھنا کہ ہم ملت ابراہیم پر ہیں بالکل غلط ہے بلکہ اصل ملت ابراہیمیہ کے پیرو اور متبع یہ محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تم اگر اصل دینِ ابراہیمی پر چلنا چاہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اختیار کرو۔ توحید و تفرید میں سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہی طریقہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام حنیف کا تھا اور مشرکین کے سنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے چند اوصاف ذکر فرمائے تاکہ ان کے عقائد شرکیہ اور خیالات فاسدہ کا رَدّ ہوتا کہ مسلمان اُس پر عمل کریں اور غیر توبہ کریں۔

۱۔ **اُمَّةً**: پیشوا تھے اور مقتدائے عالم تھے، اور معلم اعظم تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک کامل اُمت تھے یعنی وہ ایسے امام اور ہادی اور پیشوا تھے کہ ان کی تنہا ذات میں وہ تمام صفات وکمالات جمع تھے جو متفرق طور پر ایک اُمت میں جمع ہوں گویا کہ وہ تنہا ایک کامل اُمت کے قائم مقام تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر سوائے ابراہیم علیہ السلام کے کوئی مومن نہ تھا وہ تنہا اُمت تھے۔ اس لئے ان کو اُمت کہا گیا۔

۲۔ **قَانِتًا**: اللہ تعالیٰ کے حکم بردار اور فرمانبردار بندے تھے۔ اللہ کے حکموں پر چلنے والے تھے اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال حرام کرنے والے نہ تھے۔

۳۔ **حَنِيْفًا**: سب سے مڑ کر ایک اللہ کے ہو رہے تھے، سوائے جمال حق کے کسی طرف مائل نہ تھے۔

۴۔ **وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ**: شرک سے پاک اور منزہ تھے، خالص موحّد تھے، بچپن سے لے کر اخیر عمر تک توحید پر قائم رہے۔

۵۔ **شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ**: اللہ کے شکر گزار بندے تھے، سرتاپا شکر تھے۔

۶۔ **اِجْتَبٰهُ**: اللہ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے روزِ ازل میں ان کو اپنی نبوت ورسالت وخلّت کے لئے چن لیا تھا: جس کا ظہور دنیا میں ہوا۔

۷۔ **وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ**: راہ راست پر تھے یعنی اسلام اور دینِ حق پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سیدھی راہ کی طرف چلایا جس طرف اور جس طرح اللہ تعالیٰ اُن کو چلاتا تھا، اُس طرف اور اسی طرح چلتے تھے۔

۸۔ **وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً**: ہم نے ان کو دنیا میں بھی بھلائی دی: یعنی دنیا میں ہم نے ان کو رسالت

اور خلّت اور صدقِ گفتار اور ذکرِ جمیل اور قبولِ عام دیا کہ کُل اہلِ ادیان ان سے محبت رکھتے ہیں اور یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب ان کو خیر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور مسلمان اپنی نمازوں میں یہ پڑھتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

نیز اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں یہ خوبی اور بھلائی دی کہ ان کے بیٹے اور پوتے بھی نبی ہوئے۔

۹۔ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ : اور آخرت میں بھی وہ بلاشبہ نیکوں میں سے ہے۔

۱۰۔ خاتم الانبیاء کو ملّتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک فضیلت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شخص کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا گیا اور چونکہ یہ فضیلت گزشتہ فضائل سے بڑھ کر ہے اس لئے تفاوت رُتبی ظاہر کرنے کیلئے لفظِ ثُمَّ لایا گیا اور اس طرح فرمایا ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اشارہ اس طرف ہے کہ یہ فضیلت تمام فضائل سے بڑھ کر ہے اور ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰھِیْمَ سے یہ بتلایا کہ مشرکینِ عرب کا یہ سمجھنا کہ ہم ملّتِ ابراہیمی پر ہیں غلط ہے۔ اصل ملّتِ ابراہیمی پر ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں جن کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کریں، لہٰذا جو شخص ملّتِ ابراہیمی کی پیروی کا مدعی ہو اس کو چاہیے کہ ملتِ محمدیہ کا اتباع کرے، کیونکہ ملّتِ ابراہیمیہ اور ملتِ محمدیہ باہم متحد اور متفق ہیں۔

یہ امر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل میں سے ہے کہ خاتم الانبیاء اور سید الاولین والآخرین کو آپ علیہ السلام کی ملت کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ اگر ملت ابراہیمی صحیح اور درست نہ ہوتی تو افضل الانبیا کو اس کے اتباع کا حکم نہ ہوتا۔ آخر کو اوّل کے ساتھ نسبت اور وابستگی ہوتی ہے۔ توحید خالص اور اسلام یعنی اللہ کے سامنے گردنِ اطاعت ڈال دینا اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ اور سپرد کر دینا۔ اس کی ابتدا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی جس کی وجہ سے ان کو دنیا اور آخرت میں نیکی اور بھلائی ملی۔ اب اسی توحید کامل کی انتہاء خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی اور جو اصول اور عقائد اور قواعد کلیہ درباره حلال وحرام ملت ابراہیمی

میں تھے وہ آخری ملت یعنی شریعتِ محمدیہ میں باقی رکھے گئے۔ درمیان میں یہود اور نصاریٰ کو ان کے حالات کے مناسب بعض مخصوص احکام دیئے گئے، آخر میں دُعاء ابراہیمی کے مطابق: ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'' خاتم الانبیاء مبعوث ہوئے تو ملتِ ابراہیمی کو دوبارہ زندہ کر دیا تا کہ توحیدِ خالص اور اسلام یعنی اللہ ذوالجلال کی فرماں برداری از سرِ نو زندہ ہو جائے اور شرک کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔

چنانچہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یعنی حلال وحرام میں اور دین کی باتوں میں اصل ملت ابراہیم علیہ السلام ہے، عرب کے لوگ آپ علیہ السلام کو حنیف کہتے ہیں اور شرک کرتے ہیں، اس کی راہ پر نہیں، اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی خوبی اور آسودگی اور قبولیت سارے جہاں میں دی تھی درمیان میں یہود اور نصاریٰ کو موافق ان کے حال کے اور حکم بھی ہوئے آخر پیغمبر بھی اسی ملت پر آئے (انتہیٰ) لہٰذا اے مشرکینِ عرب! تم کو چاہیے کہ اس برگزیدہ نبی کا اتباع کرو کیونکہ اس نبی کا راستہ وہی ہے جس کے اتباع کا تم دعویٰ کرتے ہو۔

آں حضرت ﷺ بلاشبہ افضل الانبیاء اور خاتم النبین ہیں اور نبوت و رسالت کے تمام فضائل و کمالات کے جامع ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو انبیاء سابقین کے اقتداء کا حکم دیا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ۔ مطلب یہ تھا کہ دعوت اور تبلیغ میں ان کے طریقے پر چلیں، اسی طرح ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ کا مطلب سمجھیں کہ اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ توحید اور ابطالِ شرک میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کیجئے۔

ملّتِ ابراہیمی بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہے۔ آپ ﷺ نبوت و رسالت اور ملت و شریعت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع نہ تھے بلکہ مستقل نبی اور رسول تھے، آپ ﷺ ایسے نہ تھے جیسا کہ انبیاء بنی اسرائیل توریت اور شریعت موسویہ کے تابع تھے، حق جل شانہٗ نے قرآنِ کریم میں انبیاء سابقین کی شریعتوں کے بعض احکام کا ذکر فرمایا ہے اور توریت و انجیل کے بھی بعض احکام کا قرآن کریم میں ذکر ہے اور آپ ﷺ نے ان پر عمل بھی فرمایا ہے لیکن آپ ﷺ کا یہ عمل اس بنا پر نہ تھا کہ انبیاء

بنی اسرائیل کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شریعت موسویہ کے تابع تھے بلکہ بحکمِ الٰہی اور باتباعِ وحی الٰہی تھا، براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی اور جبرائیل امین علیہ السلام اللہ کا پیغام اور اس کے احکام لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتے تھے۔ اسی طرح ملتِ ابراہیمی کا اتباع وحی ربانی اور حکمِ یزدانی کی بنا پر تھا نہ کہ اس بنا پر کہ آپ مستقل نبی اور مستقل رسول نہ تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تابع تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء ومرسلین سے افضل اور اکمل تھے اور بحکمِ ربانی انبیاء سابقین کے طریقے پر چلتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کے تابع نہ تھے بلکہ حکمِ الٰہی کے تابع تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام انبیاء کے اتباع اور اقتدا کا حکم اس لئے دیا گیا کہ آپ سب کے بعد مبعوث ہوئے نہ کہ اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیگر انبیاء سے فضیلت میں کم تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ کے نزدیک اکرم الاولین والآخرین ہیں اور سب سے اکمل اور افضل ہیں اور فضیلت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ سب سے زیادہ اور اشمل ہے۔

ایک اشکال اور اس کے تین جواب:

اس مقام پر ایک اشکال ہے وہ یہ کہ ملت ابراہیمیہ اور ملتِ محمدیہ کیا اصول فروع میں دونوں ملتیں متحد اور متفق ہیں اور دو اعتبار سے یعنی اصول کے اعتبار سے بھی اور فروع کے اعتبار سے بھی باہم ایک دوسرے کا عین ہیں یا فقط اصولِ دین میں دونوں ملتیں متحد ہیں توحید اور نبوت اور معاد میں تو متفق ہیں مگر فروع میں مختلف ہیں۔

پس اگر شق اوّل کو اختیار کریں یعنی یہ کہیں کہ دونوں اُمتیں (ملت محمدیہ اور ملت ابراہیمیہ) اصول و فروع دونوں میں متفق اور متحد ہیں تو یہ لازم آئے گا کہ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مستقل نبی اور صاحبِ شریعت جدیدہ نہ ہوں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان انبیاء بنی اسرائیل کی سی ہو کہ جو شریعت موسویہ کی تجدید اور ترویج کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ملت ابراہیمیہ کی تجدید وترویج کیلئے مبعوث ہوئے تھے اور یہ امر صریح البطلان ہے۔

اور اگر شق ثانی کو اختیار کریں یعنی یہ کہیں کہ دونوں ملتیں اصولِ دین میں تو متحد ہیں اور فروع میں مختلف ہیں تو ایسی صورت میں یہ اشکال لازم آتا ہے کہ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی ملت کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ اصولِ دین میں تو انبیاء کرام کی شریعتیں اور ملتیں متحد اور متفق ہیں، دین تمام انبیاء کا ایک ہے اور شریعت ہر ایک کی جداگانہ ہے **کَمَا قَالَ تَعَالٰی:**

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ[1]

اس اعتبار سے تو یہودی اور نصرانی بھی ملت ابراہیمی کے متبع ہیں مسلمانوں کی کیا خصوصیت۔ اس اشکال کے کئی جواب ہیں۔

جوابِ اوّل:

ہر شریعت میں تین باتیں ہیں:

اوّل: اصولِ عقائد یعنی اللہ کی ذات وصفات پر ایمان لانا اور انبیاء اور رسل کو حق سمجھنا اور قیامت کو حق جاننا۔

دوم: قواعدِ کلیہ: جو احکام جزئیہ اور مسائل فرعیہ کا ماخذ ہوتے ہیں اور تمام جزئیات میں انہی کلیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

سوم: فروع اور مسائل جزئیہ اور احکامِ شرعیہ۔

قسم اوّل کا نام دین ہے جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام میں مشترک ہے، اس میں زمانہ کے اختلاف سے کوئی تغیر اور تبدّل نہیں ہوتا اور نہ اس میں نسخ واقع ہوتا ہے، اس لئے کہ عقائد اور اصولِ دین از قبیل خبر ہیں کہ اللہ ایک ہے اور قیامت برحق ہے اور خبر میں عقلاً نسخ جاری نہیں ہوسکتا ورنہ خبر کا کاذب ہونا لازم آئے گا۔ نسخ، عقلاً انشاء یعنی حکم، امر اور نہی میں جاری ہوتا ہے۔

اور قسم ثانی کا نام ''ملت'' ہے یعنی ملت ان اصول اور قواعدِ کلیہ کا نام ہے جن پر احکام جزئیہ کا دارومدار ہو۔ اور اصولِ کلیات اور فروع جزئیات کا نام شریعت ہے جو ہر رسول کی جدا اور الگ ہے۔

پس ملتِ محمدی اور ملتِ ابراہیمی کا توافق اور اتحاد انہی اصول اور کلیات میں مراد ہے جن پر احکام جزئیہ کی بنا ہے۔ باقی رہی شریعت، سو ہماری شریعت سب شریعتوں سے جدا اور الگ ہے اور مستقل ہے۔ اور

---

[1] شوریٰ: ۱۳

دونوں ملتوں کے توافق کے معنی یہ ہیں کہ ملت ابراہیمی کے اصول اور قواعدِ کلیہ شریعت محمدیہ میں بتمام وکمال موجود ہیں۔ ان میں کوئی تفاوت نہیں اگر بعض فروع مستخرجہ اور احکامِ جزئیہ میں بحسبِ مصلحت زمانہ کچھ فرق آ گیا تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں لہٰذا ہم یہ کہتے ہیں کہ ملت محمدیہ اور ملت ابراہیمیہ اصول احکام اور قواعد کلیہ میں متفق ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ہماری شریعت اور ہمارا دین وآئین بعینہٖ وہی دین وآئین ہے اور وہی شریعت ہے کہ جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا اس لئے کہ شریعت اور دین وآئین میں لحاظ فروع اور جزئیات کا بھی ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ شریعتِ ابراہیمی کے تمام فروع اور جزئیات بعینہٖ شریعت محمدیہ میں محفوظ نہیں۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ ملت اور شریعت میں فرق ہے، اتحاد اور اتفاق باعتبار ملت کے ہے نہ کہ باعتبار شریعت کے۔ ملت (یعنی اصول واحکام اور قواعد کلیہ) کے اعتبار سے دونوں ملتیں (یعنی ملّتِ محمدیہ اور ملّتِ ابراہیمیہ) باہم متوافق اور متحد ہیں اور شریعت کے اعتبار سے دونوں ملتیں جُدا جُدا ہیں اور علیحدہ علیحدہ ہیں۔

جواب دوم:

اور بعض علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ شریعت محمدیہ بعینہٖ شریعت ابراہیمیہ ہے۔ ان حضرات نے ملت اور شریعت میں فرق نہیں کیا اور یہ کہا ہے کہ دونوں شریعتیں اصول وفروع میں متفق اور متحد ہیں جیسا کہ ظاہر آیات اور احادیث سے مفہوم ہوتا ہے: **مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ۔ ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا** اور حدیث **اتیتکم بالحنیفة السمحة البیضاء** وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی آیات اور احادیث سے مفہوم یہی ہوتا ہے کہ دونوں ملتیں اور دونوں شریعتیں اصولاً اور فروعاً متفق اور متحد ہیں مثلاً توحید، بتوں کا توڑنا، ختنہ، عقیقہ اور قربانی، ہدی، مناسکِ حج، خصالِ فطرت، غسلِ جنابت، اشہرِ حرم کی تحریم، ابطالِ کہانت ونجوم اور ابطالِ بت پرستی، رزق وشفا، موت وحیات کو بلاواسطہ مسبب الاسباب کی طرف سے سمجھنا، نجوم وکواکب کا معتقد نہ ہونا، سعودت ونحوست کو من جانب اللہ جاننا، اصول مکارمِ اخلاق یعنی صبر ورضا اور تسلیم وتفویض وغیرہ وغیرہ۔ یہ ملتِ ابراہیمی کے احکام ہیں جو شریعت محمدیہ میں بعینہٖ باقی ہیں لیکن خوب سمجھ لو کہ دونوں ملتوں کے متفق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ ملتِ ابراہیمی کے

تمام فروع واصول ملتِ محمدیہ میں بتمام وکمال محفوظ ہیں، اگرچہ صدہا بلکہ ہزارہا اصول وفروع شریعتِ محمدیہ میں زیادہ ہیں مگر مخالف نہیں بلکہ اسی کی شرح اور بسط اور تتمیم وتکمیل ہے۔

پس ملتِ ابراہیمی بمنزلہ متن کے ہے اور شریعتِ محمدیہ بمنزلہ شرح کے ہے اور ہزارہا زوائد وفوائد پر مشتمل ہے اور مجمع الزوائد اور منبع الفوائد ہے اور اسی معنی کو شرح کو متن کے تابع کہا جاتا ہے اور متن شرح کے لئے بمنزلہ اساس کے ہوتا ہے جیسا کہ صاحبِ مشکوٰۃ کو صاحبِ مصابیح کے تابع کہا جاتا ہے اس لئے کہ مشکوٰۃ اگرچہ صدہا زوائد پر مشتمل ہے مگر اس کی تاسیس اور بناء مصابیح السنہ پر ہے، اس بنا پر مشکوٰۃ کو مصابیح کے تابع کہا جاتا ہے۔

اسی طرح سمجھو کہ شریعتِ محمدیہ ملت ابراہیمیہ کے تمام احکام کو مع احکام زائدہ اپنے اندر لئے ہوئے ہے اور ملتِ ابراہیمی کے احکام شریعت محمدیہ کے احکام زائدہ کے ساتھ ایسے مخلوط ہو گئے ہیں کہ شدت اختلاط اور کثرتِ امتزاج کی وجہ سے دونوں ملتوں کے احکام میں تمیز اور فرق نہایت دشوار ہے اور شریعت موسویہ میں نہ تو ملتِ ابراہیمی کے اصول وقواعد کی رعایت ہے اور نہ وہ ملتِ ابراہیمی کے تمام احکام کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

پس حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل نبی اور صاحبِ شریعت جدیدہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اگرچہ ملتِ ابراہیمی کے اصول اور فروع کو حاوی ہے لیکن ہزارہا زوائد اور فوائد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک جدید شئے ہے آپ کی شریعت میں ہزارہا احکام ملتِ ابراہیمی پر زیادہ کئے گئے ہیں اور انبیاء بنی اسرائیل نے شریعت موسویہ اور احکامِ تورات پر کسی حکم کا اضافہ نہیں کیا، وہ فقط دینِ موسوی کے مروّج تھے اس لئے وہ مستقل نبی اور رسول نہ تھے بخلافِ شریعت محمدیہ کے اس میں ملت ابراہیمی کے احکام پر بے شمار احکام کا اضافہ ہوا۔

الغرض شریعت محمدیہ میں ملت ابراہیمیہ کے تقریباً تمام اصول اور احکام بعینہٖ باقی ہیں گویا کہ شریعتِ محمدیہ شریعتِ ابراہیمیہ کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور ان کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے مگر امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ملتِ ابراہیمی کے تمام احکام بالکل مندرس ہو چکے تھے، صفحہ ہستی پر کہیں ان کا نام ونشان نہ رہا تھا، سوائے

جدید وحی کے ان کے معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پس حق جل شانہٗ نے آں حضرت ﷺ کو جدید وحی کے ذریعے سے ملتِ ابراہیمیہ کے احکام پر مطلع کیا، اس لئے آپ صاحبِ شریعتِ جدیدہ کہلائے۔ شریعت جدید ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس شریعت کے احکام جدید ہوں کہ جو اس سے پہلے نازل نہ ہوئے ہوں بلکہ شریعت کے جدید ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ اس کا نزول جدید ہو اور ازسرنو عالم غیب سے اس کی تلقی ہوئی ہو۔ اس وجہ سے حضرت یوشع اور حضرت عزیر علیہما السلام کو صاحب کتاب جدید اور صاحب شریعت جدیدہ نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ شریعت موسویہ ان میں موجود اور محفوظ تھی۔ ازسرنو عالم غیب سے بذریعہ وحی جدید اس کا نزول نہ ہوا تھا اور توریت ان سے پہلے نازل ہو چکی تھی اور انبیاء بنی اسرائیل پر سوائے احکام تورات کے دوسرے احکام بذریعہ وحی جدید نازل نہیں ہوئے تھے سابق وحی کے تابع تھے اور آں حضرت ﷺ کسی سابق وحی کے تابع نہ تھے۔ عالم غیب سے ہر روز جدید وحی نازل ہوتی تھی اس لئے آپ ﷺ صاحبِ شریعت جدیدہ ہوئے اور خاتم الانبیاء اور ناسخ الادیان ہوئے۔

جواب سوم:

ملتِ ابراہیمیہ کے اتباع سے مراد یہ ہے کہ توحید اور صراطِ مستقیم اور دینِ اسلام کی دعوت اور تبلیغ اور کفار سے محاجہ اور مناظرہ میں اور کفر کافری سے تبری اور بیزاری میں اور مکارمِ اخلاق یعنی رضا و تسلیم اور صبر و شکر میں اپنے جد امجد ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اختیار کیجئے کہ نرمی کے ساتھ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی دعوت دیجئے اور ابراہیم علیہ السلام کی طرح دلائل اور براہین قاطعہ سے کفر اور شرک اور نجوم اور کہانت کا ابطال فرمایئے اور شعائرِ اسلام جیسے استقبالِ کعبہ، جمعہ کی تعظیم، ختنہ، قربانی اور مناسکِ حج کو صحیح طریقہ سے جاری فرمایئے اور ملتِ ابراہیمی میں جن مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہوگئی ان سے ملتِ ابراہیمی کو پاک وصاف کر دیجئے، چونکہ آنحضرت ﷺ کی بعثت دعاءِ ابراہیمی کی اجابت کا ثمرہ ہے بناءِ کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی: ''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ''۔

تفسیر ابن کثیر میں ابوالعالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا کہ اے ابراہیم! تیری دعا قبول ہوئی۔ اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا، اس وجہ سے حدیث میں آیا ہے: اَنَا دَعْوَةُ اَبِیْ اِبْرَاهِیْمَ یعنی میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں۔ اس لئے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے اتباع کا حکم آیا جس کی دعا سے یہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر ومبعوث ہوا۔

فائدہ جلیلہ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تا قیامت میرا ذکرِ خیر رہے:

''وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ''[۱] اس آیت مبارکہ میں ''لسان'' سے مراد ذکر ہے اور ''لی'' کا لام نفع کے لئے ہے، آیت کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اے اللہ! مجھے ایسے پسندیدہ طریقے اور عمدہ نشانیاں عطا فرما جس کی دوسرے لوگ قیامت تک پیروی کریں اور مجھے ذکرِ خیر اور عمدہ صفت سے یاد کیا کریں۔[۲]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی، یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ مکہ تک ملتِ ابراہیمی سے محبت والفت رکھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، اگرچہ ان کا طریقہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف کفر وشرک ہے مگر وہ دعویٰ یہی کرتے ہیں کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور اُمّتِ محمدیہ تو بجا طور پر بھی ملّتِ ابراہیمی پر ہونے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی ہے۔

فائدہ نمبر ۲: حُبِّ جاہ مذموم مگر چند شرائط کے ساتھ جائز ہے:

حُبِّ جاہ یعنی لوگوں سے اپنی عزت کرنے اور مدح کرنے کی خواہش شرعاً مذموم ہے، قرآن کریم نے دارِ آخرت کی نعمتوں کو حُبِّ جاہ کے ترک پر موقوف قرار دیا ہے: ''تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا''۔ ہم نے آخرت کے گھر کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا علو اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

اس جگہ آیت ''وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ'' میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ

---

[۱] الشعراء: ۸۴

[۲] ابن کثیر، روح المعانی

دعا کہ آنے والی نسلوں میں میری تعریف وثنا ہوا کرے بظاہر حُبِّ جاہ میں داخل معلوم ہوتی ہے لیکن آیت کے الفاظ میں غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس دعا کا اصل مقصد حُبِّ جاہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا ہے کہ ایسے نیک اعمال کی توفیق بخشیں جو میری آخرت کا سامان بنیں اور اس کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو بھی اعمالِ صالحہ کی رغبت ہو اور میرے بعد بھی لوگ اعمالِ صالحہ میں میری پیروی کرتے رہیں۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس سے کوئی وجاہت کا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہی نہیں جس کو حُبِّ جاہ کہا جا سکے۔ قرآن وحدیث میں جہاں طلبِ جاہ کو ممنوع اور مذموم قرار دیا ہے اس کی مراد وہی دُنیوی وجاہت اور اُس سے دُنیوی منافع حاصل کرنا ہے۔

امام ترمذی ونسائی رحمہما اللہ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے گلّے میں چھوڑ دیے جائیں، وہ بکریوں کے ریوڑ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جتنا دو خصلتیں انسان کے دین کو نقصان پہنچاتی ہیں: ایک مال کی محبت، دوسرے اپنی عزت وجاہ کی طلب۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بسندِ ضعیف دیلمی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہ وثنا کی محبت انسان کو اندھا بہرا کر دیتی ہے۔

ان تمام روایات سے مراد وہ حُبِّ جاہ اور طلبِ ثنا ہے جو دُنیوی مقاصد کے لئے مطلوب ہو یا جس کی خاطر دین میں مداہنت یا کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے۔ اور جب یہ صورت نہ ہو تو طلبِ جاہ مذموم نہیں۔

حدیث میں خود رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا منقول ہے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا

''یا اللہ! مجھے خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا دیجئے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بنا دیجئے''۔

یہاں بھی لوگوں کی نظر میں بڑا بنانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ نیک اعمال میں میری پیروی کریں۔ اسی لئے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جو شخص واقع میں صالح اور نیک ہو، لوگوں کی نظر میں نیک بننے کے

---

[۱] رواہ الطبرانی عن ابی سعید الخدریؓ والبزار عن ابی ہریرۃؓ

لئے ریاکاری نہ کرے اس کے لئے لوگوں کی طرف سے مدح وثنا کی محبت مذموم نہیں۔

ابنِ عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیتِ مذکورہ سے ثابت ہوا کہ جس نیک عمل سے لوگوں میں تعریف ہوتی ہو اُس نیک عمل کی طلب وخواہش جائز ہے، اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دُنیا میں عزت وجاہ کی محبت تین شرطوں کے ساتھ جائز ہے:

اوّل: یہ کہ اس سے مقصود اپنے آپ کو بڑا اور اُسکے بالمقابل دوسرے کو چھوٹا یا حقیر قرار دینا نہ ہو، بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے ہو کہ لوگ میرے معتقد ہو کر نیک اعمال میں میرا اتباع کریں۔

دوسرے: یہ کہ جھوٹی ثناخوانی مقصود نہ ہو کہ جو صفت اپنے اندر نہیں ہے لوگوں سے اس کی خواہش رکھے کہ وہ اس صفت میں اُس کی تعریف کریں۔

تیسرے: یہ کہ اس کے حاصل کرنے کے لئے کسی گناہ یا دین کے معاملے میں مُداہنت اختیار نہ کرنی پڑے۔

فائدہ نمبر ۳:

''وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' [۱] اس میں اپنی اولاد اور ازواج کے لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا ہے کہ ان کو میرے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک بنادے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک بنانے سے مراد حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ اُن کو اللہ کی طاعت میں مشغول دیکھے، یہی ایک انسان کے لئے آنکھوں کی اصلی ٹھنڈک ہے، اور اگر اولاد کی ظاہری صحت وعافیت اور خوشحالی بھی اس میں شامل کی جائے تو وہ بھی درست ہے۔

یہاں اس دعا سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے صرف اپنے نفس کی اصلاح اور اعمالِ صالحہ پر قناعت نہیں کر لیتے بلکہ اپنی اولاد اور بیبیوں کی بھی اصلاحِ اعمال واخلاق کی فکر کرتے ہیں اور اس کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی کوشش میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُن کی صلاحیت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا رہے۔ اس آیت کے اگلے جملے میں دعا کا یہ جزء بھی ہے: ''وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' یعنی ہمیں متقی لوگوں کا امام وپیشوا بنادے۔ اس میں بظاہر اپنے لئے جاہ ومنصب اور بڑائی حاصل کرنے کی

---

[۱] الفرقان: ۷۴

دعا ہے جو دوسری نصوصِ قرآن کی رُو سے ممنوع ہے جیسے قرآن کا ارشاد ہے: ''تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا'' یعنی ہم نے دارِ آخرت کو مخصوص کر رکھا ہے اُن لوگوں کے لئے جو زمین میں اپنا عُلو اور بڑائی نہیں چاہتے اور نہ زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔

اس لئے بعض علماء نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ ہر شخص اپنے اہل وعیال کا قدرتی طور پر امام وپیشوا ہوتا ہی ہے، اس لئے اس دعا کا حاصل یہ ہوگیا کہ ہماری اولاد اور اہل وعیال کو متقی بنا دیجئے اور جب وہ متقی ہوجائیں گے تو طبعی طور پر یہ شخص متقین کا امام وپیشوا کہلائے گا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کی دعا نہیں بلکہ اولاد وازواج کے متقی بنانے کی دعا ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس دُعا میں اپنے لئے کوئی ریاست وامامت اور پیشوائی طلب کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اس دعا کا یہ ہے کہ ہمیں ایسا بنا دیجئے کہ لوگ دین وعمل میں ہماری اقتداء کیا کریں اور ہمارے علم وعمل سے اُن کو نفع پہنچے تاکہ اس کا ثواب ہمیں حاصل ہو۔

حضرت مکحول شامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دعا کا مقصود اپنے لئے تقوی کا ایسا اعلیٰ مقام حاصل کرنا ہے کہ دُنیا کے متقی لوگوں کو بھی ہمارے عمل سے فائدہ پہنچے۔

قرطبی نے یہ دونوں قول نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ ان دونوں کا حاصل ایک ہی ہے کہ ریاست وامامت کی طلب جو دین اور آخرت کے فائدہ کے لئے ہو وہ مذموم نہیں بلکہ جائز ہے۔ اور آیت ''لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا'' میں اس ریاست واقتدار کی خواہش کی مذمت ہے جو دُنیوی عزت وجاہ کے لئے ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکرِ خیر قرآن کی ۶۳ آیات میں:

قرآنِ عزیز کے رشد وہدایت کا پیغام چونکہ ملّتِ ابراہیمی کا پیغام ہے اس لئے اُس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے، مندرجہ ذیل جدول اُن تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے:

سورۃ کا نام	آیات نمبرز	سورۃ کا نام	آیات نمبرز
البقرۃ	۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۱۵۸، ۱۶۰	ص	۴۵
آلِ عمران	۳۳، ۳۵، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵، ۹۷	الزخرف	۲۶
النساء	۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳	النجم	۳۷
الانعام	۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۵۱	الممتحنہ	۴
التوبۃ	۷۰، ۱۱۴	یوسف	۶، ۳۸
ہود	۶۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶	الحجر	۵۱
ابراہیم	۳۶	مریم	۴، ۴۶، ۵۸
النحل	۱۲۰، ۱۲۳	الحج	۲۶، ۴۳، ۷۸
الانبیاء	۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹	العنکبوت	۱۶، ۳۱
الشعراء	۶۹	الصّافّات	۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹
الاحزاب	۷۰	الشوریٰ	۱۳
الحدید	۲۶	الذایات	۲۴
الاعلیٰ	۱۹	مجموعہ: ۲۵ سورتیں	۶۳ آیات

اختتامیہ کلمات:

میرے محترم دوستو اور بزرگو! یہ تیس صفات سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں بدرجہ اتم واکمل موجود تھیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ کیفیت کے اعتبار سے ہمارے لیے اُن کی صفات کا کروڑواں حصہ بھی حاصل کرنا مشکل ہے، لیکن پوری کوشش کریں اُن کی صفاتِ حمیدہ کی کچھ جھلک اپنے اندر پیدا کریں ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس نقل کو اصل کے ساتھ بدل دیں، روزِ محشر اُن کے قدموں میں جگہ مل جائے۔ آج ہم مسلمان نیچے جا رہے

ہیں، تنزّل ہی تنزّل ہے، اس لئے کہ ہم صفاتِ انبیاء علیہم السلام سے عاری ہوتے جارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارا مُعین وناصر ہو، ہمت کی ضرورت ہے، مایوس نہ ہوں، توبہ کے بعد پلٹا کھائیں تاکہ اُن حضرات کی مبارک زندگیوں کا کچھ نہ کچھ حصّہ ہمیں بھی نصیب ہوجائے۔ اللہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

درسِ حدیث بعداز جمعۃ المبارک

حدیث:

عَنِ ابْنِ اِسْحَاقَ قَالَ: خَرَجَ عَمْرُوابْنُ عَبْدِ وَدٍّ وَهُوَمُقَنَّعٌ بِالْحَدِيْدِ، فَنَادٰى مَنْ يُّبَارِزُ؟ فَقَامَ عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ رضی اللہ عنہ فَقَالَ: اَنَا لَهَا يَانَبِيَّ اللّٰهِ! فَقَالَ: اِنَّهٗ عَمْرٌو، اِجْلِسْ۔ ثُمَّ نَادٰى عَمْرٌو اَلَارَجُلٌ يَّبْرُزُ فَجَعَلَ يُؤَنِّبُهُمْ وَيَقُوْلُ: اَيْنَ جَنَّتُكُمُ الَّتِيْ تَزْعُمُوْنَ اَنَّهٗ مَنْ قُتِلَ مِنْكُمْ دَخَلَهَا؟ اَفَلَا تُبْرِزُوْنَ اِلَيَّ رَجُلًا؟ فَقَامَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ فَقَالَ: اَنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! فَقَالَ: اِجْلِسْ۔ ثُمَّ نَادٰى الثَّالِثَةَ، فَقَالَ: فَذَكَرَ شِعْرَهٗ ، قَالَ : فَقَامَ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَنَا، فَقَالَ: اِنَّهٗ عَمْرٌو، فَقَالَ: وَاِنْ كَانَ عَمْرًا ، فَاَذِنَ لَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَمَشٰى اِلَيْهِ حَتّٰى اَتٰى وَهُوَ يَقُوْلُ:

لَا تَعْجَلَنْ فَقَدْ اَتَاكَ مُجِيْبُ صَوْتِكَ غَيْرَ عَاجِزْ
فِيْ نِيَّةٍ وَّ بَصِيْرَةٍ وَالصِّدْقُ مَنْجٰى كُلِّ فَائِزْ
اِنِّيْ لَاَرْجُوْ اَنْ اُقِيْمَ عَلَيْكَ نَائِحَةَ الْجَنَائِزْ
مِنْ ضَرْبَةٍ نَّجْلَاءَ يَبْقٰى ذِكْرُهَا عِنْدَ الْهَزَاهِزْ

فَقَالَ لَهٗ عَمْرٌو: مَنْ اَنْتَ؟ قَالَ: اَنَا عَلِيٌّ ، قَالَ: اِبْنُ عَبْدِ مَنَافٍ؟ قَالَ: اَنَا عَلِيُّ ابْنُ اَبِيْ طَالِبٍ ، فَقَالَ: يَاابْنَ اَخِيْ ! مِنْ اَعْمَامِكَ مَنْ هُوَ اَسَنُّ مِنْكَ؟ فَاِنِّيْ اَكْرَهُ اَنْ اُهْرِيْقَ دَمَكَ، فَقَالَ لَهٗ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ :لٰكِنِّيْ وَاللّٰهِ! لَااَكْرَهُ اَنْ اُهْرِيْقَ دَمَكَ، فَغَضِبَ، فَنَزَلَ وَسَلَّ سَيْفَهٗ كَاَنَّهٗ شُعْلَةُ نَارٍ، ثُمَّ اَقْبَلَ نَحْوَ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ مُغْضَبًا، وَاسْتَقْبَلَهٗ عَلِيٌّ بِدَرَقَتِهٖ فَضَرَبَهٗ عَمْرٌو فِيْ دَرَقَتِهٖ فَقَدَّهَا، وَاَثْبَتَ فِيْهَا السَّيْفَ وَاَصَابَ رَأْسَهٗ فَشَجَّهٗ، وَضَرَبَهٗ عَلِيٌّ رضی اللہ عنہ عَلٰى حَبْلِ

عَاتِقِهٖ فَسَقَطَ وَثَارَ الْعَجَاجُ وَسَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ التَّكْبِيْرَ، فَعَرَفْنَا اَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَدْ قَتَلَهٗ ۔۔۔ الحدیث۔[۱]

ترجمہ وتشریح:

غزوہ خندق میں پندرہ ہزار کے قریب کافر تھے۔ کافروں نے اکٹھا حملہ کیا، مسلمانوں نے مدینہ کی ایک طرف سے خندق کھودی۔ تین طرف سے پہاڑ تھے، وہاں سے خطرہ نہیں تھا۔ تین میل کی خندق حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے چھ دن میں کھود ڈالی (اللہ اکبر) گہری اتنی کہ گھوڑا گرے تو نکل نہ سکے، چوڑی اتنی کہ شہسوار پھلانگ نہ سکے، اس خندق کی کل لمبائی ساڑھے تین میل تھی۔

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا عرب کے پہلوان عمرو بن عبدوَدّ کو پچھاڑنا:

ایک شخص آیا اس کا نام تھا عَمْرُو بن عَبْدِوَدّ، یہ کافروں کا بڑا جرنیل تھا، بڑی لڑائیاں لڑ چکا تھا، اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور خندق سے پار پہنچ گیا۔ مسلمانوں کے سامنے آکر اعلان کرنے لگا مَنْ يُّبَارِزُنِيْ میرا مقابلہ کون کرے گا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ!! وہ پھر کہنے لگا: مَنْ يُّبَارِزُ کون ہے جو سامنے آئے؟ تمہاری وہ جنت کہاں ہے؟ جس کے تم بڑے مشتاق ہو کہ ہم شہید ہوتے ہیں تو جنت میں جاتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر کھڑے ہوئے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: وہ عمرو ہے، بیٹھ جاؤ!! پھر تیسری دفعہ پکارا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: هُوَ عَمْرُو بْنُ عَبْدِوَدٍّ وہ عمرو بن عبدود ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کوئی بھی ہو۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے سامنے مقابلے کیلئے آگئے، اس نے پوچھا آپ کون ہیں؟ فرمایا میں علی ہوں، اُس نے کہا عبدِ مناف کے بیٹے ہیں؟ فرمایا میں

---

[۱] حیاۃ الصحابہ ج:۱، ص:۲۸۶، ط: فیضی کتب خانہ، لاہور۔

علی بن ابی طالب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہوں۔ اُس نے کہا میں نہیں چاہتا کہ میں تیرا لہو بہاؤں، تیرے چچا نہیں ہیں؟ کوئی بڑی عمر والا آتا وہ میرا مقابلہ کرتا، میں تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا، تیرا لہو نہیں بہانا چاہتا، تو میرے جوڑ کا آدمی نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں تو تیرا لہو بہانا چاہتا ہوں۔ وہ آگ کی طرح بھڑکا (یعنی غصے میں آیا) اور اُس نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ کیا۔ سر پر لوہے کی ڈھال تھی وہ کٹ گئی، سر پر تھوڑا سا زخم آیا، تلوار سے کچھ نقصان ہوا۔ اب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی باری تھی، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جست ماری، گردن اور کندھے کے درمیان تلوار ماری، لگنے کی دیر تھی، دھڑام سے نیچے گر گیا، بڑی مٹی اُٹھی، مسلمان خوش ہو گئے، اللہ کے نبی ﷺ کا چہرہ چمک اُٹھا۔

جب آئے تو عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا آپ اس کی زرہ نہیں اُتار کے لائے؟ اس کی زرہ بہت قیمتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا میں اُتار لیتا لیکن جب میری تلوار لگی وہ ننگا ہو گیا تو میں نے شرم کے مارے منہ پھر لیا۔

اس جگہ (حیاۃ الصحابہؓ میں) تو یہی ہے، دوسری جگہ آتا ہے ان کافروں نے پیغام بھیجا کہ ہمارا بہت بڑا جرنیل اور سردار تھا، دس ہزار دراہم یا پانچ ہزار دراہم لے لیں اور اس کی لاش ہمیں دے دیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: یہ گندگی کا ڈھیر ہے، نجس محض ہے، ہم پیسے لیکر کیا کریں گے، اس گندگی کو اُٹھالو، جیسے گند پڑا ہو، تو کافر کی لاش بھی گند ہے، جہنم کا ایندھن ہے۔

ہم تمہارے خیر خواہ ہیں نہ کہ دشمن:

میرے پیارے بھائیو اور دوستو! اللہ کے دین کیلئے ہمارے بڑوں نے کیسی کیسی قربانیاں دیں؟ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانوں میں اُترے، سخت سے سخت امتحانات، پتہ نہیں زندہ واپس آئیں گے یا نہیں۔ جس دین کی خاطر انہوں نے یہ قربانیاں دیں، شہید ہوئے، ان کی بیویاں بیوہ ہوئیں، بچے یتیم ہوئے، وطن چھوڑا، ماں باپ کو چھوڑا، ہجرت کا مقصد یہ تھا کہ پاک کلمہ دُنیا میں پھیلے، جو رکاوٹ آجائے اس رکاوٹ کو

ہٹادیا جائے۔حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مقابلے میں آنے والے کفار سے کہتے تھے کہ ہم تمہارے خیرخواہ ہیں، ہم تمہارے دُشمن نہیں ہیں، تمہیں قتل کرنے کا شوق نہیں ہے، تم مسلمان ہوجاؤ ہمارے بھائی ہو، ورنہ ہمارے تابع ہوجاؤ، ایمان نہیں لاتے تو جبر واکراہ نہیں، لیکن ہمارے تابع ہوکر رہو اور ہماری زندگی دیکھو تاکہ مسلمان کی عملی زندگی سامنے آئے، جزیہ ادا کرو، اُسے ہم تمہاری فلاح وبہبود میں خرچ کریں گے۔

پہلے قولی دعوت ہوتی پھر جزیہ اور ٹیکس تھا۔یہ تفصیلی دعوت ہوتی تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے ان کی رات، ان کا دِن، ان کی بود و باش، ان کی معاشرت اور ان کی معیشت، ان کی عبادات، ان کی نیک زندگی دیکھیں گے، حسن سلوک، اخلاقیات ہر وقت سامنے ہونگی۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کو دیکھ کر پلٹا کھائیں گے۔اُن حضرات کا یہ جذبہ تھا، یہ درد تھا۔

غیر تو غیر ہم نے اپنوں کو بھی کھودیا:

میرے بھائیو! آج دین پھیلانا تو بہت دور، ہمارے ہزاروں مسلمان دین سے نکل گئے، آج اپنے مسلمانوں میں عملی ارتداد شروع ہے، غیر مسلم ممالک میں جاکر مرتد ہوگئے، دین کو خیرباد کہہ دیا۔ برازیل میں سات سالوں میں تین سو عرب مرتد ہوگئے، انہوں نے اپنے نام بھی بدل دیئے کہ ہمیں اسلامی نام بھی اچھا نہیں لگتا۔آپ چلے جائیں باہر ملکوں میں، مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ہیں، کوئی خال خال ہیں جو اللہ کے دین پر ہیں ورنہ ان کی زندگی اور کافروں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں، ان کا اور کافروں کا رہن سہن، تہذیب و معاشرت، بود و باش ایک ہے، اب کافر اس زندگی سے کیا متاثر ہوگا۔ہجرت تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی کی اور ملکوں میں گئے لیکن وہ مال کمانے نہیں گئے تھے، وہ دین پھیلانے گئے تھے۔اسلئے قومیں ان کو دیکھ کر پلٹا کھاتی تھیں۔افسوس! اب ہماری اور غیروں کی زندگی عموماً ایک جیسی ہے۔

اسلام تو عملی نمونہ تھا، پر ہم نے کیا کیا؟

بعض غیر مسلم ممالک میں بعض کافر مسلمان ہوئے، پھر مسلمانوں کے معاملات، مسلمانوں کی معیشت اور مسلمانوں کا لین دین دیکھ کر دوبارہ مرتد ہوگئے کہ کتابوں میں پڑھا تو اچھا تھا باہر تو وہ مسلمان نظر نہیں

آتا۔ ان کی تجارت ہماری طرح ہے، ان کی منڈیاں ہماری طرح ہیں، ان کے دفتری نظام ہمارے نظام سے بھی بدتر ہیں۔ آج بھی اسلام عملی نمونہ ہے، عمل میں طاقت مقناطیس کی طرح تھی، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، حقیقی اسلام بھی لوگوں کو کھینچتا ہے۔

ذوالحجہ کے دن بڑے قیمتی دن ہیں:

میرے بھائیو! خود بھی نیت کریں، ابراہیمی یادگار کا عشرہ گزر رہا ہے، انہوں نے قربانی کی بڑی اعلیٰ مثالیں اور شعائر قائم کئے۔ یہ جو ذوالحجہ کے دن ہیں بڑے اونچے دن ہیں۔ اس میں ایک نفلی روزہ ایک سال کے نفلی روزوں سے افضل ہے۔ عرفہ کے دن کا روزہ (نویں کے دن کا روزہ) غیر حاجی کیلئے دو سال کے نفلی روزے کے برابر ہے۔ یہ بڑے ہی اُونچے دِن ہیں، یہ عید بھی بڑی اُونچی عید ہے، رمضان کی عید سے اُونچی ہے، یہ دن رات بے شمار انوارات اور برکات اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔

بڑی قربانی دی گئی، بیٹے کو ذبح کرنا آسان نہیں، بیٹے کی قربانی ہے، موجودہ قربانی تو اُس کا بدل ہے۔ اے اللہ! میری جان، میری اولاد تیرے نام پر وقف ہے۔ میں اپنی جان ہتھیلی میں لیکر پھر رہا ہوں۔ مجھے تیری ذات کے علاوہ کوئی نہیں چاہیے۔ میری جان، میری اولاد، یہ سب چھوٹے ہیں، تیری ذات اعلیٰ وارفع ہے، میں سب کچھ قربان کرسکتا ہوں لیکن تیری ذات کو نہیں چھوڑ سکتا۔

عشرۂ ذوالحجہ میں سب سے بڑا کام اللہ کے نام پر لہو بہانا ہے:

یہ عشرہ اُن ہی کی یادگار میں ہے۔ یہ قربانی کرائی جاتی ہے، وُہی جذبہ بیدار کرایا جاتا ہے، انہوں نے دُعا مانگی تھی، اے اللہ! ایسی اُمت دیدے جو میری طرح قربانی دے تو یہ اُمتِ محمدی، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا صدقہ ہے۔ یہ اُمت اسلئے پیدا ہوئی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرز پر قربانیاں دے۔ اس میں جانور بھی پیش کرنا ہے، اچھے سے اچھا۔ فرمایا لہو کا قطرہ زمین پر پہنچنے سے پہلے اللہ بخشش کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جنہیں توفیق دی ہے وہ زیادہ قربانیاں کریں۔ چار کرے، چھ کرے، دس کرے، والد، والدہ کی طرف سے، دادا، دادی، نانا، نانی کی طرف سے اور دیگر رشتے داروں کی طرف سے۔

لہو کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے بخشش کا اعلان:

جب لہو کا قطرہ پہنچنے سے پہلے اس کی بخشش ہے تو ماں باپ کی طرف سے قربانی کرنے سے انؔ کی بھی بخشش ہوگی۔ یہ سعادتِ عظمیٰ ہے، اب بھی ایسے لوگ ہیں، منیٰ میں ایک آدمی دس دس قربانیاں، بیس بیس قربانیاں، تیس تیس قربانیاں، پچاس پچاس قربانیاں کرتا ہے۔ مکہ کی ایک قربانی ایک لاکھ قربانیوں کے برابر ہوتی ہے، ہم تو پیسے بچاتے ہیں۔ اللہ ربُّ العزت ہماری غلطیاں معاف کرے۔

حُجاج کرام اپنی قربانی اپنے سامنے کرائیں:

میرے عزیزو! حج پر بعض ایسے ٹھگ پھر رہے ہوتے ہیں، لوگ اعتماد کر کے قربانی کے پیسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں، وہ قربانی کرتے ہی نہیں۔ اب ان کی زندگی میں کیا سکون ہوگا؟ یہ پیسہ ان کی زندگی میں کیا رنگ لائے گا؟ وہاں لوگوں نے کاروبار بنائے ہوئے ہیں، حجاج بیچارے گھبراتے ہیں کہ قربانی کیسے کریں گے؟ اگر آدمی خود ہمت کرلے، **مَنْحَرْ** (قربانی والی جگہ) پر چلا جائے تو کوئی مشکل نہیں۔ پیچھے باڑے میں میلوں تک ہر قسم کے جانور کھڑے ہوتے ہیں، وہاں قصاب بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے پاس چھری نہیں ہے تو وہ تھوڑا سا معاوضہ لیں گے اور ایک منٹ میں آپ کے سامنے قربانی ذبح ہوگی۔ وہاں جو گورنمنٹ کرتی ہے وہ علیحدہ ہے، اس کے علاوہ بھی **مَنْحَرْ** ہیں، ذبح کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ لوگ وہاں جاتے ہیں، تسلی ہوجاتی ہے کہ اپنے ہاتھوں سے قربانی کی، اس میں مشقت تو ضرور ہے، حج کے سفر میں مشقت تو ہوتی ہی ہے لیکن ہم مشقت سے بھاگتے ہیں، بس ہمت کی ضرورت ہے، پھر اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہے۔

لوٹ مار اور وہ بھی بیت اللہ میں جا کر:

ایک ساتھی بتا رہا تھا کہ ایک آدمی ہر سال لوگوں سے پیسے لے لیتا تھا، قربانی نہیں کرتا تھا۔ کسی نے خبر دی کہ یہ آدمی تو صحیح نہیں ہے، حجاج دیکھنے گئے تو وہ اپنے خیمے میں لیٹا ہوا تھا، ان کو موبائل پر جواب دے رہا تھا کہ ہاں آپ کی قربانی ہوگئی، حالانکہ خود لیٹا ہوا ہے نہ جانے ہزاروں مسلمانوں کو اُس ظالم نے قربانی سے محروم کیا، لوٹ مار اور وہ بھی بیت اللہ میں جا کر لوٹنا۔ اُس مقدس جگہ پر جا کر لوٹنا اپنی نسلوں کی بربادی ہے۔

جو چوری کرے، چوری ویسے حرام، پھر بیت اللہ میں، پھر جو چوری مکہ میں طواف کے دوران اور حجر اسود پر، اس چوری میں کتنی خباثت ہوگی؟ لوگ اعتماد کر رہے ہیں، قربانی کیلئے پیسے دے رہے ہیں، یہ خوش ہو جاتا ہے کہ مجھے لاکھوں ریال بچ رہے ہیں، یہ خوش نہ ہو، جب اللہ پکڑیں گے تو اس کی سزا ہمیشہ بھگتنی پڑے گی، ایسے لوگوں کا انجام بہت خطرناک ہوتا ہے، اُس کی پکڑ بڑی دردناک ہے۔ اللہ حلال کی روزی دے، حرام سے بچائے۔

آخری گزارش:

میرے بھائیو! یہ مہینہ قربانی کا ہے، آپ سب یہ نیت کریں کہ اے اللہ! آج تک جو شریعت کے خلاف چلے، تیرے حبیب حضرت محمد ﷺ کی زندگی چھوڑی ہے، اب نہیں چھوڑیں گے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سُنن کو زندہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قربانی کی لائن میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر چلنے والا بنائے۔ (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ:۱۲۴)

اَوّلِیّاتِ اِبْرَاھِیْمِی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جاری کردہ

مُبارک سنن وطُرق

اَوّلیاتِ اِبرَاھِیمِی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰھٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔[۱]

عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ اَنَّہٗ سَمِعَ سَعِیْدَ بْنَ الْمُسَیِّبِ یَقُوْلُ: اِنَّ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ اَوَّلُ مَنِ اخْتَتَنَ، وَاَوَّلُ مَنْ اَضَافَ الضَّیْفَ، وَاَوَّلُ مَنِ اسْتَحَدَّ، وَاَوَّلُ مَنْ قَلَّمَ اَظْفَارَہٗ، وَاَوَّلُ مَنْ قَصَّ الشَّارِبَ، وَاَوَّلُ مَنْ شَابَ۔

عَنْ سَعْدِ بْنِ اِبْرَاھِیْمَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ: اَوَّلُ مَنْ خَطَبَ عَلَی الْمَنَابِرِ اِبْرَاھِیْمُ عَلَیْہِ السَّلَامُ ۔قَالَ غَیْرُہٗ :وَاَوَّلُ مَنْ ثَرَّدَ الثَّرِیْدَ ، وَاَوَّلُ مَنْ ضَرَبَ بِالسَّیْفِ ، وَاَوَّلُ مَنِ اسْتَاکَ، وَاَوَّلُ مَنِ اسْتَنْجٰی بِالْمَآءِ، وَاَوَّلُ مَنْ لَبِسَ السَّرَاوِیْلَ۔[۲]

خطبہ مسنونہ کے بعد:

میرے محترم دوستو اور بزرگو! چند جمعوں سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مُبارک تذکرہ چل رہا ہے، پچھلے جمعہ کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں صفاتِ حمیدہ کا بیان ہوا تھا کہ وہ کونسی صفات تھیں جن کی وجہ سے اُنہیں امامِ عالَم بنایا گیا، اس جمعہ اوّلیاتِ ابراہیمی کا تذکرہ ہوگا، وہ چیزیں جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے شروع کرائیں، پھر بعد میں آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام اُن سُنن اور طُرق کا اہتمام کرتے رہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا خصوصی اہتمام فرمایا۔ بعض حضرات ابتلاء کلمات سے یہی مراد لیتے ہیں۔

---

[۱] البقرہ: ۱۲۴

[۲] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۳۵۷: ط: قدیمی، کراچی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے جاری کردہ مبارک سنن وطرق

۱۔ ختنہ کرنے کی ابتدا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جب قومِ عمالقہ کے ساتھ جہاد کیا تو ایک خلقتِ عظیمہ جانبین سے قتل ہوئی، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کی پہچان میں دقت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ختان کو اہلِ اسلام کے لئے علامت بنادیا، ''فَاخْتَتَنَ يَوْمَئِذٍ فِي الْقُدُوْمِ بِالْقُدُوْمِ''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام مُلکِ شام میں قدوم نامی جگہ پر تھے اور تیشہ جس کے ساتھ لکڑی کو تراشتے ہیں اس کو بھی قدوم کہتے ہیں۔ وہاں اللہ کا اَمر آیا کہ آپ ختنہ کریں، اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اَسّی سال کی تھی۔ ان سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام پیدا ہوئے تھے وہ مختون (ختنہ شدہ) ہوتے تھے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اِخْتَتَنَ اِبْرَاهِيْمُ النَّبِيُّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَهُوَ اِبْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً

حضور اکرم ﷺ کا فرمانِ عالی شان ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسّی سال کی عمر میں ختنہ کیا۔[۱]

ایک اور حدیث میں آپ علیہ السلام کا فرمان ہے:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اُمِرَ اَنْ يَّخْتَتِنَ وَهُوَ حِيْنَئِذٍ اِبْنُ ثَمَانِيْنَ سَنَةً، فَعَجَّلَ وَاخْتَتَنَ بِالْقُدُوْمِ فَاَشَدَّ عَلَيْهِ الْوَجْعُ فَدَعَا رَبَّهٗ ،فَاَوْحٰى اِلَيْهِ، اِنَّكَ عَجَّلْتَ قَبْلَ اَنْ نَّأْمُرَكَ بِآلَتِهٖ، فَقَالَ: يَارَبِّ! كَرِهْتُ اَنْ اُؤَخِّرَ اَمْرَكَ۔[۲]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اللہ کا اَمر آیا کہ ختنہ کرو، چنانچہ ایک تیشہ پڑا ہوا تھا اسکو اُٹھا کر خلوت میں ختنہ کیا۔ وہ انتہائی کُند تھا، بڑا خون بہا اور درد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے

---

[۱] صحیح البخاری ج ۱ ص ۴۷۳

[۲] تفسیر درمنثور، ج ۱ ص ۲۱۶ ط: بیروت، لبنان

فرمایا ابراہیم! آپ نے عُجلت کی، ہم تمہیں تعلیم دیتے کہ آلے کو تیز کیسے کرنا ہے اور پھر کیسے ختنہ کرنا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! آپ کا حکم ہو اور ابراہیم ایک گھڑی تاخیر کرے یہ نہیں ہوسکتا۔

شاہی داغ:

یہ ختنہ شاہی داغ ہے۔ جیسے اصطبل کے شاہی گھوڑے نشان زدہ کردیئے جاتے ہیں کہ یہ شاہی گھوڑے ہیں اور شاہ کے کام آئیں گے، کوئی اور ان کو استعمال نہیں کرسکتا ایسے ہی ختنہ سرکاری مہر ہے کہ اس کو تم نے حلال جگہ پر استعمال کرنا ہے، ہر جگہ پر اس کو استعمال نہیں کرنا۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر چند کاموں کا اہتمام:

۱۔ حضور علیہ السلام کے پاس بچوں کو لایا جاتا یُحَنِّکُھُمْ، بَارَکَ اللّٰہُ لَکُمْ، تحنیک فرماتے اور برکت کی دعا دیتے۔ نیز فرماتے اللہ تعالیٰ اس کو نیک اور متقی بنائے۔ بہتر یہی ہے کہ کسی صالح آدمی سے گھٹی دلائی جائے۔ تحنیک میں عجوہ کھجور افضل ہے، خوب چبا کر بچے کے تالو پر لگادی جائے تاکہ یہی مبارک لعاب اس کی پہلی خوراک بن جائے، اگر کھجور نہ مل سکے تو شہد وغیرہ میں لعاب ملادی جائے۔

۲۔ بچے کا نیک نام تجویز کیا جائے۔

۳۔ عقیقہ کردیا جائے، فَاَھْرِقُوْا دَمًا وَّاَمِیْطُوْا عَنْہُ الْاَذٰی، بچے کی گندگی صاف کردی جائے، اس کی برکت سے بچہ نیک بنے گا (ان شاء اللہ) آفات ومصائب اللہ تعالیٰ دور فرمادیں گے، پیدائش کے دن بھی جائز ہے مگر ساتویں دن افضل ہے، بعد میں بھی کرسکتے ہیں۔ عقیقہ کے جانور میں وہی شرائط ہیں جو قربانی کے جانور میں ہیں۔

۴۔ بچے کے بال منڈادیے جائیں، بہتر ہے کہ بعد میں سر پر زعفران وغیرہ کی خوشبو لگادی جائے اور بالوں کے بقدر چاندی صدقہ کردی جائے۔

۵۔ پانچواں کام ختنہ کرنا ہے، ویسے جو شخص اسلام لاتا، آپ علیہ السلام ختنے کا حکم دیتے۔ ختنہ اسلامی شعار ہے، تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی سُنّت ہے، ختنے کے ذریعے نظافت وطہارت حاصل ہوتی ہے۔ نیز

اطبا کہتے ہیں کہ آدمی کئی بیماریوں سے بچ جاتا ہے، حقِ زوجیت میں لذت کا سبب ہے۔

اگر بچہ بیمار اور کمزور نہیں تو ساتویں دن کسی ماہر سے ختنہ کرالیا جائے۔ بالغ ہونے کے بعد بھی ختنہ کا حکم ہے بشرطیکہ کوئی عذر و مجبوری نہ ہو۔ ختنہ کرنے والا ختنہ کی غرض سے بقدرِ ضرورت اس محل پر نگاہ ڈال سکتا ہے۔

ختنے کے موقع پر ضیافت کی شرعی حیثیت:

دُعِیَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِی الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِلٰی خِتَانٍ، فَاَبٰی اَنْ یُّجِیْبَ، فَقِیْلَ لَہٗ، فَقَالَ: اِنَّا کُنَّا لَا نَاْتِی الْخِتَانَ عَلٰی عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا نُدْعٰی لَہٗ۔[۱]

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو کسی نے دعوت دی کہ آج ہمارے بیٹے کا ختنہ ہے، ہم نے ضیافت کی ہے، آپ تشریف لے آئیں۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ خلافِ سنت ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ختنے کے موقع پر ضیافت کرنے کا حکم نہیں دیا۔

ہمارے بعض دیہاتوں میں اس پر لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے، یہ تداعی و بُلانا بدعت ہے۔

۲۔ داڑھی کا سُفید ہونا:

ھُوَ اَوَّلُ مَنْ شَابَ: سب سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی داڑھی سفید ہوئی۔ ''**فَلَمَّا رَآہُ ھَالَہ ذٰلِکَ**'' سیدنا ابراہیم علیہ السلام سفیدی دیکھ کر حیران ہوگئے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جتنے بھی انبیاء کرام علیہم السلام آئے اُن کے بال سفید نہیں ہوتے تھے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا نوح علیہ السلام میں تقریباً سترہ سو سال کا فاصلہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی عمر چودہ سو سال ہے، ساڑھے نو سو سال صرف دعوت کا زمانہ ہے۔ اللہ کی شان! اللہ نے ایسی صحت دی تھی کہ بڑے بڑے مصائب بھی آئے، لیکن موت تک نہ داڑھی کا ایک بال سفید ہوا نہ ایک دانت گرا۔

---

[۱] مسند احمد، مسند الشامیین، رقم الحدیث ۱۷۹۲۹ ج ۴ ص ۲۶۶

سفید بالوں کی عظمت ووقار:

فَلَمَّا رَأَى الشَّيْبَ قَالَ: يَارَبِّ مَاهٰذَا؟ قَالَ: وَقَارٌ، قَالَ: يَارَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا [۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی داڑھی میں سفید بال دیکھے تو پوچھا: یااللہ! یہ کیا؟ فرمایا یہ وقار ہے، عزت کی چیز ہے۔ عرض کیا: اے اللہ! اگر یہ عزت کی چیز ہے اور وقار ہے تو اے اللہ! میری داڑھی اور سفید کردے، میرے وقار کو بڑھادے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَا تَنْتِفُوا الشَّيْبَ، مَامِنْ مُّسْلِمٍ يَّشِيْبُ شَيْبَةً فِي الْاِسْلَامِ اِلَّا كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ [۲]

ہمارے نبی ﷺ نے سفید بالوں کے بارے میں فرمایا: لَاتَنْتِفُوْا ان کو مت اُکھاڑا کرو! فَاِنَّهٗ نُوْرُ الْمُسْلِمِ یہ مسلمان کا نور ہیں مَنْ شَابَ شَيْبَةً فِي الْاِسْلَامِ جو اسلام میں بوڑھا ہوگیا، اس کے ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی مل رہی ہے، ایک گناہ معاف ہورہا ہے اور ایک درجہ بلند ہورہا ہے كَانَتْ لَهٗ نُوْرًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن ہر بال نور بنے گا۔ [۳]

جب پل صراط سے گزریں گے، وہاں نور کی ضرورت ہوگی تو یہ بال جو اللہ کی نسبت پر اسلام میں سفید ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس کو نور بنائیں گے۔ پل صراط پر مؤمنین کو جو نور حاصل ہوگا، کن اعمال کی وجہ سے ہوگا؟ تفسیرِ مظہری میں وہ تفصیلاً بیان کیے ہیں، مثلاً نماز کی محافظت، تلاوتِ قرآن کی آیات، سورۃ کہف کا پڑھنا اور حج وعمرہ میں سر منڈانا، رمی جمرات، بازار میں اللہ کا ذکر، اللہ کے راستے میں تیراندازی اور جو مسلمانوں سے مصائب ومشکلات دور کرے گا وغیرہ، یہ سب اعمال نور کا سبب ہوں گے۔

۳۔ سب سے پہلے مہندی استعمال کرنے والے:

سب سے پہلے مہندی کا استعمال سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا: عربی میں مہندی کو حِنَّا کہتے ہیں۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج ۱ ص ۳۵۷ ط: قدیمی، کراچی، مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الادب، ج ۸ ص ۳۲۶ و ج ۷ ص ۴۴۹

[۲] سنن ابی داؤد، باب فی نتف الشیب، ج ۲ ص ۲۲۵ ط: امدادیہ، ملتان

[۳] ترمذی، باب ماجاء من شاب شیبۃ فی سبیل اللہ ج ۱ ص ۲۹۲، ط: قدیمی، کراچی

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

غَيِّرُوا هٰذَا بِشَيْءٍ وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ۔[۱]

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: غَيِّرُوا الشَّيْبَ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ۔[۲]

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى لَايَصْبِغُوْنَ فَخَالِفُوْهُمْ۔[۳]

داڑھی کا رنگ بدل دو، داڑھی کو رنگین کردو، یہودیوں کی مشابہت مت اختیار کرو۔ یہود اپنی داڑھی کو مہندی کا رنگ نہیں لگاتے تھے۔

غَيِّرُوا الشَّيْبَ سفیدی کو تبدیل کرو، وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ کالا نہ کرو، داڑھی کو بالکل کالا خضاب لگانا منع ہے۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَكُوْنُ قَوْمٌ يَخْضِبُوْنَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ بِالسَّوَادِ كَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ لَايَرِيْحُوْنَ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایسے کردینا كَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ جیسے کبوتر کا سینہ کالا ہے۔ فرمایا ایسے شخص کو جنت کی خوشبو بھی نصیب نہیں ہوگی۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَحْسَنَ مَا غُيِّرَ بِهٖ هٰذَا الشَّيْبُ اَلْحِنَّاءُ وَالْكَتَمُ۔[۴]

مہندی محض یا کتم کے ساتھ ملا کر، دونوں طرح جائز ہے، مہندی کا رنگ سُرخ ہوتا ہے اور کتم کا سبز اور سیاہ ہوتا ہے۔ اس سے داڑھی زرد نہیں رہتی، سیاہی مائل ہوجاتی ہے۔

---

[۱] صحیح مسلم، باب خضاب الشیب بصفرۃ وحمرۃ وتحریمہ بالسواد، ج: ۲، ص: ۱۹۹

[۲] جامع الترمذی، باب ماجاء فی الخضاب ج ۱ ص ۳۰۵، ط: قدیمی، کراچی

[۳] صحیح البخاری، باب الخضاب، ج ۲ ص ۸۷۵، صحیح المسلم باب خضاب الشیب، ج ۲ ص ۱۹۹، سنن ابی داؤد باب فی الخضاب، ج ۲ ص ۲۲۶، سنن النسائی، الامر بالخضاب، ج ۲ ص ۲۹۲، سنن ابن ماجہ باب الخضاب بالحناء، ص ۲۸۸)

[۴] ترمذی باب ماجاء فی الخضاب، ج ۱ ص ۳۰۵، سنن ابی داؤد باب فی الخضاب، ج ۲ ص ۲۲۶ واللفظ لہ، سنن ابن ماجہ باب الخضاب بالحناء، ص ۲۵۸

قَدِ اخْتَضَبَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْحِنَّاءِ وَالْكَتَمِ وَاخْتَضَبَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِالْحِنَّاءِ بَحْتًا [۱]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حِنّا اور کتم دونوں ملا کر لگاتے تھے۔ سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ حِنّا محض (خالص مہندی) لگاتے تھے۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ مَا عَدَدْتُّ فِيْ رَأْسِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلِحْيَتِهٖ اِلَّا اَرْبَعَ عَشْرَةَ شَعْرَةً بَيْضَاءَ۔ [۲]

آپ علیہ السلام کے بال مبارک زیادہ سُفید ہوئے ہی نہیں۔ چودہ سے لیکر چوبیس تک کی روایات ہیں لیکن مشہور روایت اُنیس (۱۹) کی ہے کہ اُنیس کے قریب آپ ﷺ کے بال سفید ہوئے۔

اِنَّمَا كَانَ الْبَيَاضُ فِيْ عَنْفَقَتِهٖ وَفِي الصُّدْغَيْنِ وَفِي الرَّأْسِ نَبْذٌ۔ [۳]

عنفقہ (داڑھی بچہ) صُدغین (کن پٹی) اور مقدم الرأس میں تقریباً اُنیس بال سفید ہوئے۔

جب آپ ﷺ زیتون کا تیل استعمال کرتے تھے تو وہ سفیدی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ اللہ نے اپنے حبیب ﷺ کو سُفیدی سے مبّرا کیا۔ اللہ نے آپ ﷺ کے حُسن کو آخر تک باقی رکھا۔

مجاہد کیلئے سیاہ خضاب کی اجازت:

اَمَّا الْخِضَابُ بِالسَّوَادِ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ مِنَ الْغُزَاةِ لِيَكُوْنَ اَهْيَبَ فِيْ عَيْنِ الْعَدُوِّ فَهُوَ مَحْمُوْدٌ مِّنْهُ ،اِتَّفَقَ عَلَيْهِ الْمَشَائِخُ۔ وَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ لِيُزَيِّنَ نَفْسَهٗ لِلنِّسَاءِ وَلِيُحَبِّبَ نَفْسَهٗ اِلَيْهِنَّ فَذٰلِكَ مَكْرُوْهٌ، عَلَيْهِ عَامَّةُ الْمَشَائِخِ وَبِنَحْوِهٖ وَرَدَ الْاَثَرُ عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔ [۴]

---

[۱] صحیح المسلم باب شیبہ ﷺ ج ۲ ص ۲۵۹ واللفظ لہ، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث ۲۰۱۷۸ ج ۱۱ ص ۱۵۴

[۲] صحیح المسلم باب شیبہ ﷺ ج ۲ ص ۲۵۹ واللفظ لہ، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث ۲۰۱۷۸ ج ۱۱ ص ۱۵۴

[۳] صحیح المسلم باب شیبہ ﷺ ج ۲ ص ۲۵۹

[۴] المحیط البرھانی لابن مازۃ البخاری، ج ۶ ص ۱۲۲، ط: غفاریہ، کوئٹہ

مجاہد کیلئے اجازت ہے کہ وہ کافر پر رُعب ڈالنے کیلئے سیاہ خضاب لگا سکتا ہے۔ یا ایسا عالمِ ربانی ہے جس کا اکثر باطل قوتوں سے واسطہ رہتا ہے وہ بھی اپنی داڑھی کو سیاہ کرسکتا ہے۔ اللہ نے اسکو رُعب کی اجازت دی ہے جیسے ہمارے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ لگاتے تھے۔ کیونکہ ساری زندگی انگریز کے ساتھ اُن کا جہاد رہا۔ جوں ہی انگریز چلا گیا خضاب لگانا چھوڑ دیا۔

دھوکے کیلئے سیاہ خضاب لگانا بالاتفاق حرام ہے۔ زینت کیلئے لگانے میں قدرے اختلاف ہے لیکن قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زینت کیلئے عورت خاوند کیلئے لگائے تو اس کیلئے مکروہ تنزیہی ہے معمولی کراہت آجاتی ہے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کثیر الزواج تھے اس لئے وہ لگاتے تھے۔

ایک اہم نکتہ:

میرے محترم عزیز دوستو! یہ بات غور سے سنو! بعض روایات میں آرہا ہے کہ سُفید داڑھی والے سے اللہ حیاء کرتے ہیں، ہر سفید بال نورِ مسلم ہے، سُفید بال کو مت اُکھاڑو اور بعض روایات میں آرہا ہے کہ داڑھی کا رنگ سفید ہے تو اس کو رنگین کرو۔

اللہ تعالیٰ حضراتِ فقہاء عظامؒ کی قبروں کو نور سے بھرے، انہوں نے اس مسئلے پر محاکمہ کیا ہے کہ حُسن و خوبصورتی کو دیکھا جائے گا، اگر مہندی اور کتم لگانے میں خوبصورتی ہوتی ہے تو پھر مہندی اور کتم لگائے اور اگر سفید رکھنے میں خوبصورت لگتی ہے تو سفید رہنے دے۔ مقصد یہ ہے کہ آدمی کا حُسن باقی رہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی اجازت دی ہے۔ ایسی ہیئت اختیار کرنا جس میں انسان حَسین نظر آئے بہتر ہے۔ حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا زندگی میں اگر ایک دفعہ بھی خضاب مہندی لگایا تب بھی اس حدیث پر عمل کرلیا۔

۴۔ سب سے پہلے عصا استعمال کرنے والے:

سب سے پہلے عصا سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے استعمال کیا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے آخری زندگی میں اور سفر میں عصا لیا۔ عید کے موقع پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ لیکر آگے چلتے تھے۔ آپ ﷺ عید کی نماز مسجد سے باہر پڑھا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ میں باب السلام سے آگے کئی مسجدیں کھڑیں ہیں۔ اللہ کے

نبی ﷺ وہاں عید نماز پڑھاتے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سُترے کے طور پر اُس عصا کو آگے نصب کر دیتے تھے۔ اسلئے کہ اگر کھلی جگہ ہے تو امام کے سامنے کم از کم ایک ہاتھ لمبی اور اُنگلی جتنی موٹی لکڑی ہوتا کہ نمازیوں کے خشوع خضوع میں فرق نہ آئے۔ امام کا سُترہ مقتدیوں کو کافی ہے۔ بالکل ناک کے سامنے نہ ہو بلکہ دائیں یا بائیں آنکھ کے سامنے ہوتا کہ کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ لکڑی کی عبادت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ شرک کی جڑیں کاٹی ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ اَتَّخِذِ الْعَصَا فَقَدِ اتَّخَذَهَا اَبِيْ اِبْرَاهِيْمُ [۱]

آپ علیہ السلام نے فرمایا: سب سے پہلے عصا میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے لیا۔

۵۔ سب سے پہلے منبر کا استعمال:

سب سے پہلے منبر کا استعمال سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنْ اَتَّخِذِ الْمِنْبَرَ فَقَدِ اتَّخَذَهُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمُ [۲]

حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی منبر بنایا تھا۔

ایک اور روایت میں حضور ﷺ نے فرمایا:

اَوَّلُ مَنْ خَطَبَ عَلَى الْمَنَابِرِ اِبْرَاهِيْمُ خَلِيْلُ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ [۳]

''سب سے پہلے منبر پر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے خطبہ دیا''۔

رسول اللہ ﷺ کا مبارک منبر:

آپ علیہ السلام نے ایک منبر بنوایا۔ قبیلہ نجار آپ ﷺ کا ننھیال ہے۔ مدینہ منورہ میں جتنے قبائل ہیں

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۷ ط: قدیمی، کراچی

[۲] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۷ ط: قدیمی، کراچی

[۳] مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الدلائل، ج ۸ ص ۳۲۳، ۳۶۰، ج ۷ ص ۴۴۹ ط: امدادیہ، ملتان

اُن قبائل میں سب سے اونچا مقام قبیلہ نجار کا ہے۔

اَرْسَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى فُلَانَةِ اِمْرَأَةٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ قَدْ سَمَّاهَا سَهْلٌ مُرِىْ غُلَامَكِ النَّجَّارَ اَنْ يَّعْمَلَ لِىْ اَعْوَادًا اَجْلِسُ عَلَيْهِنَّ اِذَا كَلَّمْتُ النَّاسَ ، فَاَمَرَتْهُ فَعَمِلَهَا مِنْ طَرْفَاءِ الْغَابَةِ ۔[۱]

آپ ﷺ نے قبیلہ نجار کی ایک رشتہ دار عورت سے فرمایا کہ تم اپنے خادم سے کہو کہ میرے لئے منبر بنائے۔

اِسْمُ اِمْرَأَتِهٖ فُكَيْهَةُ بِنْتِ عُبَيْدِ بْنِ دَلِيْمٍ وَهِىَ اِبْنَةُ عَمِّهٖ ، كَانَ بِالْمَدِيْنَةِ نَجَّارٌ وَاحِدٌ يُقَالُ لَهٗ مَيْمُوْنٌ [۲]

اُس عورت کا نام فکیہۃ تھا اور اس کے غلام کا نام میمون تھا۔ فکیہۃ نے اپنے غلام میمون سے کہا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے لئے منبر بناؤ۔

اُحد پہاڑ کے پیچھے ایک جگہ کا نام ہے غابہ۔ وہاں سے جھاؤ کی لکڑی لی اور اُس سے آپ ﷺ کا منبر بنایا۔ اُس کی تین سیڑھیاں رکھیں۔

رسول اللہ ﷺ کی جدائی پر کھجور کے تنے کا آنسو بہانا:

قَالَ (جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ) كَانَ جِذْعٌ يَقُوْمُ عَلَيْهِ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا وُضِعَ لَهُ الْمِنْبَرُ سَمِعْنَا لِلْجِذْعِ مِثْلَ اَصْوَاتِ الْعِشَارِ حَتّٰى نَزَلَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَضَعَ يَدَهٗ عَلَيْهِ ۔[۳]

آپ ﷺ منبر بننے سے پہلے کھجور کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ جب منبر بنا تو آپ ﷺ منبر پر تشریف لے گئے۔ پہلا ہی دن تھا کہ وہ کھجور کا تنا اِتنا رویا کہ مسجد کے اندر جو آخری آدمی تھا وہ بھی رونے کی آواز سُن رہا تھا۔

---

[۱] صحیح البخاری کتاب الجمعۃ، باب الخطبۃ علی المنبر، ج۱ ص ۱۲۵

[۲] فتح الباری باب الصلوۃ فی السطوح والمنبر والخشب، ج۱ ص ۶۴۱ ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۳] صحیح البخاری کتاب الجمعۃ، باب الخطبۃ علی المنبر، ج۱ ص ۱۲۵ ط: قدیمی، کراچی

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے شاگرد ہیں اس روایت کو بیان کر کے بے تحاشہ روتے تھے کہ مسلمانو! اللہ کے نبی ﷺ کے فراق میں کھجور کا تنا تو اتنا روئے اور تمہارے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کہ تمہیں رونا نہیں آتا۔

فَلَمَّاكَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ قَعَدَالنَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ الَّذِيْ صُنِعَ فَصَاحَتِ النَّخْلَةُ الَّتِيْ كَانَ يَخْطُبُ عِنْدَهَا حَتّٰى كَادَتْ اَنْ تَنْشَقَ فَنَزَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَخَذَهَافَضَمَّهَااِلَيْهِ فَجَعَلَتْ تَاَنُّ اَنِيْنَ الصَّبِيِّ الَّذِيْ يسكت حَتّٰى استقرت۔[۱]

آپ ﷺ منبر سے نیچے اُترے اور اُس کو ایسے بغل میں لیا جیسے بچے کو بغل میں لیتے ہیں، آخر میں ایسے اُس کی ہچکیاں بندھیں کہ جیسے بچہ بے قرار ہو اور ماں باپ اُس کو لیں، جیسے بچہ ہچکیاں لیتے لیتے چُپ ہوتا ہے ایسے ہی وہ تنا چُپ ہوا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا: لَوْ لَمْ اَلْتَزِمْهُ مَازَالَ بَاكِيًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اگر میں اِسے اپنے سینے سے نہ لگاتا تو یہ قیامت تک روتا رہتا۔ آپ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں، شجر وحجر سب کے آپ ﷺ نبی ہیں۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنِّيْ لَاَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ اَنْ اُبْعَثَ اِنِّيْ لَاَعْرِفُ الْاٰنَ۔[۲]

آپ ﷺ نے فرمایا: میں وہ پتھر جانتا ہوں جو اعلانِ نبوت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا۔

بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے اُس تنے سے فرمایا: کیا تو یہ نہیں چاہتا کہ جنت میں اہلِ جنت کیلئے کھجور کا درخت بنے، پھر اُسے دفن کر دیا گیا۔

اللہ کے نبی ﷺ کے منبر کی تین سیڑھیاں تھیں۔ آپ ﷺ اوپر والی سیڑھی پر بیٹھے۔ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو ایک سیڑھی چھوڑ کر دوسری پر بیٹھے کہ اُس پر آقا ﷺ بیٹھتے تھے۔ ادب کا تقاضہ یہ ہے، اسلام تو سراپا ادب کا نام ہے۔

---

[۱] روایۃ البخاری المذکور فی حاشیہ شرح الوقایۃ

[۲] صحیح مسلم باب فی معجزات النبی ﷺ ج ۲ ص ۲۴۵ واللفظ لہ، جامع الترمذی باب فی آیات النبوۃ النبی ﷺ ج ۲ ص ۲۰۳

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو وہ نچلے والی سیڑھی پر بیٹھے کہ ان دونوں حضرات کا مقام اونچا ہے، میں وہاں کیسے بیٹھوں۔

جب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا، ذوالنورین اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی دو بیٹیاں اُن کے نکاح میں دیں۔ حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا جن سے ایک بیٹا ہوا تھا جو چھ سال کی عمر میں فوت ہوا، پھر وہ فوت ہوگئیں تو آپ ﷺ نے حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کر دیا، تو دو بیٹیاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں گئیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔

حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہ کا بھی انتقال ہوگیا تو آپ ﷺ نے یوں فرمایا: (ایک روایت میں چالیس اور ایک میں سو کا ذکر ہے) کہ میری چالیس بیٹیاں ہوتیں یکے بعد دیگرے فوت ہوتیں تو میں عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دیتا۔ کتنا بڑا اونچا مقام ہے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا کہ سید الاولین والآخرین، سارے نبیوں کے سردار کی ایک بیٹی نہیں بلکہ دو بیٹیاں ان کے نکاح میں آئیں، دُہرے داماد بنے، کتنا بڑا اشرف اللہ نے اُنہیں عطا فرمایا، اس لئے اُنہیں ذوالنورین (دونوروں والے) کہتے ہیں۔

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں چھ سال تو اُسی نیچے والی سیڑھی پر بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹھا کرتے تھے۔ چھ سال کے بعد منبر کے اوپر بیٹھے، کیونکہ سارے نیچے بیٹھتے جائیں گے تو آئندہ خطیب نیچے کنویں میں ہوگا اور مجمع اوپر ہوگا۔ فرمایا ادب مزاجِ اسلام ہے اور اوپر بیٹھنا حدِ اسلام ہے، انہوں نے مزاجِ دین بھی بتایا اور اجازت بھی بتائی ہے کہ یہاں بیٹھنا بھی جائز ہے، یہ حدِ دین ہے۔

جب امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا تو اُنہوں نے ایک اور منبر بنوایا اور ان سیڑھیوں کو اُس کے ساتھ اوپر کر دیا۔ مدینہ منورہ میں ایک لمبا منبر بنا ہوا ہے، یہ اُس زمانے کا تو نہیں ہے لیکن بعد کے بادشاہوں نے اُس کی نقل اُتاری ہے۔

۶۔سب سے پہلے ضیافت کرنے والے اور ثرید کی روٹی مہمانوں کو کھلانے والے:

كَانَ لَا يَتَغَدّٰى وَلَا يَتَعَشّٰى اِلَّا مَعَ ضَيْفٍ، وَرُبَمَا مَشٰى مِيْلَيْنِ اَوْ اَكْثَرَ حَتّٰى يَجِدَ ضَيْفًا سیدنا ابراہیم علیہ السلام اُس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک کوئی مہمان نہ مل جاتا۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ اَوَّلُ مَنْ اَضَافَ الضَّيْفَ لوگوں میں سب سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کی ضیافت کی۔[۱]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کنیت ابوالضیوف:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مہمانوں کے ساتھ بڑی محبت تھی، چاشت کے وقت کھانا کھاتے تھے۔ایک کوس یعنی ڈیڑھ میل تک سفر کرتے کہ کوئی مہمان مل جائے۔بعض دفعہ دو تین دن گزر جاتے کھانا تناول نہ فرماتے کہ مہمان ملے گا تو کھانا کھاؤں گا،اس لئے اُنہیں ابوالضیوف (مہمانوں والے) کہا جاتا ہے۔

كَانَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُكْنٰى اَبَا الضَّيْفَانِ۔[۲]

عربوں میں مہمان نوازی کی صفت:

عربوں میں اللہ نے جو مہمان نوازی کی صفت رکھی ہے کہ مہمان آتا ہے تو باغ باغ ہو جاتے ہیں،مہمان کو کھلانا اپنے کھانے سے زیادہ پسندیدہ ہے،یہ آقا نامدار ﷺ کی سنت ہے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے۔حضور ﷺ کے پاس ایک بڑا پیالہ تھا،اس میں ثرید بناتے تھے،چار آدمی مل کر اُس کو اُٹھاتے تھے،تقریباً پندرہ بیس آدمی بیٹھ کر وہ ثرید کھاتے تھے۔جب مجمع زیادہ ہوتا تو آپ ﷺ التحیات کی شکل میں بیٹھ جاتے تاکہ دوسروں کیلئے بیٹھنے کی جگہ بنے۔ایک اعرابی نے کہا: مَا هٰذِهِ جِلْسَةٌ یہ آپ کا عجیب بیٹھنا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا بندہ ہوں اور اپنے لئے تواضع کو پسند کرتا ہوں۔

ثرید،روٹی کو گوشت میں پکانا یا ملانا،یہ عمدہ اور زود ہضم خوراک ہے جو عربوں میں بہترین کھانا ہے،اس کی ابتداء بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی۔

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷ ص ۴۴۹

[۲] البدایہ والنہایہ، کتاب قصص الانبیاء، ج ۱ ص ۹۵ ط: عمریہ، کوئٹہ

۷۔ شیر مال کی روٹی کا سب سے پہلے استعمال کرنے والے:

اَوَّلُ مَنِ اتَّخَذَ الْخُبْزَ الْمُبَلْقَسَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ ۔[۱]

''سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے شیر مال کی روٹی بنا کر مہمانوں کو کھلائی''۔

شیر مال یہ ہے کہ میدہ کو دودھ میں گوندھ کر نرم روٹی بنانا۔ جب کوئی قابلِ اعزاز آدمی آتا، جس سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو محبت ہوتی تھی تو اُسے شیر مال کھلاتے تھے۔

آپ علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز یہ تھا کہ حسبِ حیثیت مہمان کی مہمان نوازی کرتے تھے، تاکہ لوگوں کو اُن کے مرتبہ پر اُتارا جائے۔

۸۔ سب سے پہلے جہاد کرنے والے:

هُوَ اَوَّلُ مَنْ قَاتَلَ بِالسَّيْفِ سب سے پہلے جہاد کرنے والے بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جہاد نہیں تھا۔ قرآن میں جہاد دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (۱) جہاد بمعنی قتال، کافروں سے لڑنا (۲) اور جہاد بمعنی دعوت: وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا قرآن کی تعلیمات عام کرو اللہ نے اس کو جہاد کبیر کہا ہے۔ جیسے مکہ میں قتال نہیں تھا جہاد بمعنی دعوت، تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے جہاد بمعنی دعوت تھا اور جہاد بمعنی قتال اللہ نے ان سے شروع کرایا۔ حضرت لوط علیہ السلام سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ کافر انہیں قید کر کے لے گئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ساتھ آدمی لیکر اُن سے جہاد کیا اور اپنے لشکر کی ترتیب بنائی، ایک دستے کو آگے کیا مقدمۃ الجیش کے طور پر کہ تم آگے رہنا، بعض ساتھیوں کو میمنہ یعنی دائیں طرف منتخب کیا اور بعض ساتھیوں کو میسرہ یعنی بائیں طرف مقرر کیا۔ اسی طرح فرمایا کہ یہ دستہ قلب (درمیان) میں لڑے گا اور یہ حصہ لشکر کا پیچھے ساقہ میں ہوگا۔

آپ ﷺ کے زمانے میں بھی لشکر کی یہی ترتیب رہی، حضور ﷺ نے میدانِ جہاد میں مورچہ بندی کی وہ ترتیب قائم کی کہ بعد میں آنے والوں نے وہاں سے سبق لیا۔ بہر حال سیدنا ابراہیم علیہ السلام کافروں

---

[۱] تفسیر الدر المنثور ج ۱ ص ۲۱۹ ط: بیروت

سے جہاد کر کے حضرت لوط علیہ السلام کو چھڑا کر لے آئے۔

۹۔ سب سے پہلے تیر کمان بنانے والے:

سب سے پہلے تیر کمان بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بنایا۔ حضور ﷺ نے تیراندازی کی ترغیب دی ہے۔ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہود سے دبابہ (توپ) اور منجنیق ملی تھی۔ ہتھیاروں کا استعمال توکل کے منافی نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے: **اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ** جتنا تمہارے بس میں ہے اسلحہ کی تیاری کرو! **اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا هُمْ اُعَدُّوْا** نہیں فرمایا۔

میرے محترم بھائیو! یہ سُننِ ابراہیمی ہیں، یہ ایمان افروز باتیں ہیں جن سے انسان کا ایمان بڑھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کیسے عمدہ اور پیارے طریقے ہیں، اللہ نے اُنہیں ایسا روشنی کا مینار بنایا کہ اُن کی زندگی سورج کی طرح قیامت تک چمکتی رہے گی۔ جتنے انبیاء علیہم السلام آئے سب اُن کی زندگی کی تجدید کرتے رہے، حتیٰ کہ فرمایا اے محمد ﷺ! **فَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا** قربانی کی لائن میں آپ بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کریں۔ قربانی کی لائن میں وہ سب سے آگے تھے، ہراول دستہ تھے۔ یہ اُمتِ محمد یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا صدقہ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہے۔

۱۰۔ معانقے کی سنت کو جاری کرنے والے:

اللہ تعالیٰ نے معانقے کا طریقہ بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جاری کرایا۔ پیارے نبی ﷺ بھی بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے معانقہ فرماتے، چنانچہ حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کچھ مدت کے بعد ملے تو آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر مُعانقہ فرمایا۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم حبشہ سے آئے، رسولِ پاک ﷺ کی فتحِ خیبر سے آمد تھی، آپ ﷺ خوشی سے اُٹھے اور اُن سے معانقہ کیا۔ اصل تو **اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ** ہے اور سلام کے بعد مصافحہ تتمہ سلام ہے، پھر مزید محبت کے اظہار کیلئے معانقہ ہے۔ یہ طریقہ بھی اللہ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جاری کرایا۔

ایک عجیب وغریب سبق آموز واقعہ:

بعض کتبِ تاریخ میں آیا ہے کہ ایک بڑی عمر کے آدمی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ملے، وہ دُعا اور

مناجات میں لگے ہوئے تھے۔ فِراست سے معلوم کیا کہ بھلا آدمی معلوم ہورہا ہے، اُس سے پوچھا بھائی کس سے مانگ رہے ہو؟ اُس نے کہا رحمن سے مانگ رہا ہوں جو ساتوں زمین وآسمان کا مالک وخالق ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تم اُس کی عبادت کرتے ہو؟ وہ کہنے لگا جی۔ فرمایا کس طرف منہ کرتے ہو؟ کہا قبلہ کی طرف۔ فرمایا تم ان پہاڑوں میں رہتے ہو، تمہاری گزراوقات کی کیا شکل ہے؟ اُس نے کہا خودرَو گھاس ہے، اُن کے بیج ہیں، میں اُن پر گزارا کرتا ہوں۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا: رہائش کہاں رکھی ہوئی ہے؟ اُس نے کہا یہاں سے دور ایک پہاڑ کے دامن میں۔ فرمایا: اپنی جگہ دکھا سکتے ہو؟ وہ کہنے لگا راستے میں پانی کی ندی ہے، وہاں سے گزرنا پڑتا ہے، آپ کیلئے مشکل ہوجائے گا۔ فرمایا تو کیسے گزرتا ہے؟ اس نے کہا میں اللہ کے پاک نام پڑھتا ہوں، اُن کی برکت سے (بطور کرامت) میں اس سے پار ہوجاتا ہوں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا چلو تو سہی۔ اُسے کیا پتہ کہ یہ اللہ کے نبی علیہ السلام ہیں۔ اُس ندی کو پار کرلیا، عبادت گاہ میں پہنچے تو کیا دیکھا کہ واقعی عبادت گاہ کا رُخ قبلہ کی طرف ہے، بڑے خوش ہوئے کہ حقیقتاً یہ مسلمان ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: بھائی بڑا دن کونسا ہے؟ اُس نے کہا بڑا دن حشر کا دن ہے، جہاں نفسانفسی کا عالم ہوگا، مالک کے سامنے سب کی پیشی ہوگی، وہ یومِ تغابُن ہے (ہار جیت کا دن ہے) وہاں پتہ لگے گا کون جیتتا ہے اور کون ہارتا ہے۔ فرمایا دُعا کرو اللہ تعالیٰ ہمیں اُس دن کی سختی سے بچائے، وہ کہنے لگا میں ایک دُعا تین سال سے کررہا ہوں قبول نہیں ہورہی۔ فرمایا کیا؟ کہنے لگا میں یہاں سے باہر نکلا، ایک پہاڑ کے دامن میں بکریوں کے ریوڑ چررہے تھے، میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کس کی بکریاں ہیں؟ اُنہوں نے کہا اللہ نے کائنات میں اپنا ایک خلیل بنایا ہے یہ اُس کی بکریاں ہیں۔ میں تین سال سے دُعا کررہا ہوں یا اللہ! اپنے خلیل سے ملادے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: خوش ہوجاؤ! اللہ نے تمہاری دعا قبول کرلی، اللہ کا خلیل میں ابراہیم ہوں، مجھ سے مُعانقہ کرو۔

یہ پہلا مُعانقہ تھا، غالباً پہلے مُصافحہ کرتے یا سر نیچے کرتے تھے، کسی سے زیادہ محبت ہوتی تو اور سر نیچے کرلیتے۔ تحیۃ واکرام کا سجدہ ہوتا تھا، جیسے فرشتے آدم علیہ السلام کے سامنے جھکے، یوسف علیہ السلام کے

بھائی اوران کے والدین، یوسف علیہ السلام کے سامنے جھکے۔اُن کی شریعت میں یہ حلال تھا ہماری شریعت میں غیر اللہ کیلئے سجدۂ عبادت بھی حرام ہے اور سجدۂ تحیۃ بھی حرام ہے۔

سجدۂ عبادت اور سجدۂ تحیۃ:

سجدۂ عبادت یہ ہے کہ یہ میرا معبود ہے، میں نے اپنی پیشانی اس کے سامنے سرنگوں کردی، میں نے اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل ونیست کردیا تو سجدۂ عبادت غیر اللہ کیلئے جائز نہیں اور سجدۂ تحیۃ اعزاز وتکریم کا سجدہ ہوتا تھا، لیکن اُمتِ محمدیہ میں اسے بھی حرام قرار دے دیا۔کوئی آدمی کہے میں اس کے اعزاز کیلئے اور اس کے احترام واکرام کیلئے جھکا ہوں میں اسے معبود نہیں سمجھتا، تب بھی یہ حرام ہے۔سجدہ تحیۃ سے مُشرک تو نہیں ہوگا، لیکن حرام کا ارتکاب کرنے والا ہے۔ ہماری شریعت میں ہے کسی کو جھک کر نہ ملو، جھکنا اللہ کے سامنے، کسی کو رکوع نہ کرو، رکوع اللہ کے سامنے اور کسی کو سجدہ نہ کرو، سجدہ بھی اللہ کے لیے زیبا دیتا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ فِيْ نَفَرٍ مِّنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ فَجَاءَ بَعِيْرٌ فَسَجَدَلَهٗ فَقَالَ اَصْحَابُهٗ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! تَسْجُدُ لَكَ الْبَهَائِمُ وَالشَّجَرُ فَنَحْنُ اَحَقُّ اَنْ نَسْجُدَ لَكَ. فَقَالَ: اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ۔ [۱]

بعض جانور آکر رسول اللہ ﷺ کے سامنے جھک گئے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم اس کے زیادہ مُستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔آپ علیہ السلام نے فرمایا: غیر اللہ کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ایک حدیث میں آپ علیہ السلام نے فرمایا: اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا اے اللہ! میری قبر کو بُت نہ بنانا کہ لوگ یہاں آکر سجدے کریں۔

بہرکیف معانقے کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جاری کرایا۔

---

[۱] مسند احمد، مسندِ عائشہؓ رقم الحدیث: ۲۴۵۲۵، ج:۶، ص:۸۵

۱۱۔ قحط سالی میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اعزاز واکرام:

ایک مرتبہ بڑے زور کا قحط پڑا، حضرت ابراہیم علیہ السلام غلے کی تلاش میں باہر گئے، غلہ نہ ملا۔ جب واپس جارہے تھے تو فرمایا کچھ نہ کچھ تو گھر لے کر جائیں کیونکہ روایات میں آتا ہے کہ جب سفر سے واپس آؤ، گھر والوں کیلئے کوئی نہ کوئی چیز لے کر آؤ، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا یہ جو بوریاں ہیں انہیں ریت سے بھر کے سواری پر رکھ دو۔ گھر پہنچ کر اُن بوریوں کو اُتار کر رکھ دیا اور خود آرام فرمانے لگے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کمالِ قدرت سے اُس ریت کو گندم بنادیا۔ جب سو کر اُٹھے تو دیکھا کھانا تیار ہے۔ فرمایا یہ کہاں سے آیا ہے۔ گھر والوں نے کہا آج جو گندم لائے تھے اُسی گندم کو ہم نے پیسا اور اُسی سے روٹی پکائی۔ فرمایا اے اللہ! تو نے ہماری لاج رکھ لی ہے۔ ہمیں گھر والوں کے سامنے شرمندہ نہیں کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ وہ ایسی عمدہ گندم تھی کہ اگر اس کو بوئیں تو نیچے سے لیکر اوپر تک سارے خوشے ہی خوشے ہوتے تھے۔

شیروں کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں چومنا:

أُرْسِلَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَسَدَانِ مَجُوْعَانِ، فَلَحِسَاهُ وَسَجَدَالَهٗ[۱]

کافروں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے خلاف سازش کی کہ ان پر بھوکے شیر چھوڑے جائیں اور انہیں ختم کیا جائے۔ دو شیروں کو بھوکا رکھا گیا پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اوپر چھوڑ دیا گیا۔ وہ دونوں شیر آئے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کو چومنا شروع کر دیا۔

اللہ ہی ہیں جو شیروں کے دل میں پھاڑنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور اللہ ہی ہیں جو شیروں کو اپنے پیاروں کے سامنے جھکا دینے والے ہیں۔

۱۲۔ سب سے پہلے جمعہ کے دن کا غسل کرنے والے:

ایک روایت میں ہے: جمعہ کے دن غسل کا اہتمام بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۷ ص ۴۴۸ ط: امدادیہ، ملتان

السلام سے کرایا۔[۱]

كَانَ النَّاسُ مَجْهُوْدِيْنَ ،يَلْبَسُوْنَ الصُّوْفَ ،وَيَعْمَلُوْنَ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ،وَكَانَ مَسْجِدُهُمْ ضَيِّقًا مُقَارِبَ السَّقْفِ، اِنَّمَاهُوَ عَرِيْشٌ۔ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ يَوْمٍ حَارٍّ وَعَرِقَ النَّاسُ فِيْ ذٰلِكَ الصُّوْفِ حَتّٰى تَارَتْ مِنْهُمْ رِيَاحٌ ، اُذٰى بِذٰلِكَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا ۔ فَلَمَّا وَجَدَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تِلْكَ الرِّيْحَ قَالَ:اَيُّهَا النَّاسُ اِذَا كَانَ هٰذَا الْيَوْمُ فَاغْتَسِلُوْا وَلْيَمَسَّ اَحَدُكُمْ اَفْضَلَ مَا يَجِدُ مِنْ دُهْنِهٖ وَطِيْبِهٖ ۔[۲]

شروع اسلام میں مال کی قلت تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم محنت مزدوری کرتے تھے، مسجد نیچی تھی اور کپڑے بڑے موٹے تھے۔ مسجد میں پسینے کی بُو ہوتی، پھر جب اللہ تعالیٰ نے فتوحات دے دیں اور باریک کپڑے آنے لگے اور مال کی وسعت ہوگئی تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: جمعہ میں آؤ تو غسل کر کے آؤ، صاف ہو کر اور خوشبو لگا کر آؤ! آپ علیہ السلام نے خوشبو کو پسند فرمایا۔ ایسی گندی خوشبو نہ ہو کہ قریب والے کا سر پھٹنے لگے۔ اچھی اور عمدہ خوشبو لگانی چاہیے۔

اگر کپڑے گندے ہوں گے اور بدبودار ہوں گے تو اللہ کے گھر میں فرشتوں کو ایذاء (تکلیف) پہنچے گی۔ اسلئے فقہاء نے لکھا ہے کہ زَیَّاتِین (وہ لوگ جن کے کپڑوں پر تیل بہت ہے) جن کے کپڑوں پر سیاہی بہت ہے اور چمڑے کی بدبو بہت ہے اور جو جھاڑو دے کر آئیں اُن سے کہو آخری صف میں کھڑے ہوں۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک آدمی مسجد میں نماز پڑھنے آتا تھا اُسے جُذام کی بیماری تھی۔ جسم کا گوشت گرتا تھا۔ ایک خاص قسم کی بدبو ہوتی تھی۔ نمازیوں کو تکلیف ہوتی، سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم گھر میں نماز پڑھ لیا کرو، تمہیں مسجد میں آنے کی ضرورت نہیں ہے، اس سے نمازیوں کو ایذا پہنچتی ہے۔

یہ جتنے بھی طہارت کے احکامات ہیں حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پورے کرائے۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۵۶۔ ط: قدیمی، کراچی

[۲] سنن ابی داؤد باب فی الرخصۃ فی ترک الغسل یوم الجمعۃ ج ۱ ص ۵۷

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ اللہ نے جو احکامات حج کے دیئے یا طہارت کے دیئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلیٰ طریقے پر اُن کو پورا کیا اور یہی چیز پھر ساری اُمتوں میں رہی اور پھر رسولِ پاک ﷺ کی شریعت میں تا قیامت رہے گی، اس کے بانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

۱۳۔ امام الموحّدین:

هُوَاَوَّلُ اِمَامُ الْمُوَحِّدِيْنَ سارے انبیاء کرام علیہم السلام توحید کی دعوت اوّلاً اور ساری زندگی دیتے رہے، مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام سب سے اونچے مقام پر فائز تھے۔

۱۴۔ سب سے پہلے حنیف کا لقب پانے والے:

هُوَاَوَّلُ مَنْ سَمَّاهُ اللّٰهُ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے حنیف کے ساتھ ملقّب کیا وَلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا کہ سب سے کٹ کر ایک اللہ کے ہو کر رہے، مَاكَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔[۱]

۱۵۔ اَوَّلُ مَنْ لَبِسَ النَّعْلَيْنِ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جوتوں کو اہتمام سے پہنا۔ ہمارے آقا علیہ السلام نے فرمایا: جوتا بہترین سواری ہے۔ آپ ﷺ کا جوتا مبارک بشکلِ زیان تھا، ایک بالشت دو اُنگل۔ قُبالان مثنّٰی دو تسمے تھے، ایک انگوٹھے کے ساتھ اور ایک چھنگلیا کے ساتھ۔

۱۶۔ اَوَّلُ مَنْ قَسَمَ الْفَيْءَ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے قومِ عمالقہ سے جہاد کیا، دونوں جانب سے بہت سارے لوگ قتل ہوئے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کی پہچان ختنے سے کی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جو جہاد کیا، اس میں مالِ غنیمت کی تقسیم کرنے والے سب سے پہلے ہیں۔

ہماری شریعت میں یہ ہے کہ مالِ غنیمت کے چار حصے مجاہدین کے لیے اور پانچواں حصہ بیت المال میں جمع کیا جائے گا۔ اگر مالِ فیٔ ہے تو رسولِ پاک علیہ السلام کو تقسیم کا اختیار تھا۔ مالِ غنیمت حلال کمائی میں

---

[۱] آل عمران: ۶۷

بہترین مال ہے۔

۱۷۔ اَوَّلُ مَنِ اتَّخَذَ سَرَاوِیْلَ:

شلوار سب سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے استعمال کی۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر وحی کی کہ تم زمین میں میرے نزدیک سب سے زیادہ کریم ہو، شلوار کو استعمال کرو۔ ہمارے نبی علیہ السلام نے اس لباس کی تعریف کی ہے۔ خود آقا ﷺ نے پاجامہ خریدا ہے، مگر پہننا آپ سے ثابت نہیں۔

۱۸۔ اَوَّلُ مَنْ قَالَ اَرِنَا مَنَاسِکَنَا:

سب سے پہلے حج کے احکامات، عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں انہوں نے ادا کئے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو ساتھ لیکر سارے احکامات بتائے اور حدودِ حرم کی تعیین کی۔

۱۹۔ هُوَ اَوَّلُ مَنْ ضَحّٰی:

سب سے اوّل قربانی کا طریقہ جاری کیا، ذوالحجہ کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بجائے دنبہ اتارا گیا اور اُس کو ذبح کیا گیا۔

۲۰۔ هُوَ اَوَّلُ مَنْ بَوَّاهُ مَکَانَ الْبَیْتِ:

طوفانِ نوح علیہ السلام کے بعد بیت اللہ کی دیواریں گر گئی تھیں، فرشتوں کے ذریعہ نشاندہی کی گئی اور بیت اللہ کو باپ بیٹے نے مل کر ذوالقعدہ کے مہینے میں بنایا۔ مقامِ ابراہیم نے لِفٹ کا کام دیا، تجلیاتِ الٰہیہ کا مرکز تقریباً ۴۴ فٹ چوڑا اور ۵۰ فٹ سے زیادہ اونچا بنایا۔

۲۱۔ هُوَ اَوَّلُ نَبِیٍّ اَحْیَی اللّٰهُ لَهُ الْمَوْتٰی:

سب سے پہلے ان کے لیے احیاء موتی کا معجزہ ظاہر کیا گیا، تاکہ اطمینانِ قلبی کے بعد علم الیقین سے عین الیقین حاصل ہو جائے۔ قرآن شریف کے شروع کے تین پاروں میں تقریباً پانچ دفعہ احیاءِ موتی کا قصہ بیان ہوا ہے۔

۲۲۔ سب سے پہلے اِن کے لئے پردے ہٹا دیے گئے:

جب سارہ علیہا السلام پر ظالم بادشاہ حملہ کرنے لگا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے خاسر اور ناکام بنا دیا اور سیدنا

ابراہیم علیہ السلام کو پردے ہٹا کر یہ منظر دکھادیا۔

۲۳۔ اوّل سُفید جوڑا پہنایا جائے گا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام جب قبر سے اُٹھیں گے تو کپڑوں سمیت اُٹھیں گے، اس لئے کہ نمرود نے کپڑے اتار کر آگ میں پھینکا تھا اور عرش رحمٰن کے دائیں طرف منبر پر تشریف فرما ہوں گے۔

۲۴۔ اولادِ مسلمین کے پہلے کفیل:

جو بچے نابالغی کے زمانہ میں فوت ہوگئے، اُنہیں بیت العزت کا سہارا لئے تعلیمِ کتابِ الٰہی دے رہے ہیں۔ مختار قول علماء کا یہی ہے کہ جو بچہ نابالغی کے زمانے میں مرے گا ان شاء اللہ جنّت میں جائے گا۔

۲۵۔ اَوَّلُ مَنْ قَلَّمَ اَظْفَارَہٗ

سیدنا ابراہیم علیہ السلام ناخنوں کے کترنے کا اہتمام کرنے میں پہلے شخص ہیں۔ ہمیں بھی شریعت نے ترغیب دی ہے کہ ہر ہفتہ یا کم از کم پندرہ دن میں ناخن کتر دیے جائیں۔ ناخن بڑھا کر رکھنا، حبشیوں کا طریقہ ہے۔

۲۶۔ اَوَّلُ مَنِ اسْتَحَدَّ وَاَوَّلُ مَنْ نَتَفَ الْاِبِطَ

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے اوّل زیرِ ناف بال صاف کرنے کا اہتمام کیا اور بغل کے بال اُکھیڑے یعنی اہتمام کیا۔ یاد رہے اس قسم کی صفائی میں چالیس دن سے زیادہ تاخیر کی تو گناہِ کبیرہ ہے۔ نیز بغل کے بال اُکھیڑنا، مونڈنے سے افضل ہے مگر جب کہ شروع سے یہ عمل کرے، ورنہ تکلیف ہوگی۔ آپ علیہ السلام کے بغل مبارک معجزے کے طور پر سُفید تھے۔

۲۷۔ مونچھوں کو مبالغے کے ساتھ کترنا:

مونچھوں کو مبالغے کے ساتھ کترنے کا اہتمام بھی اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کرایا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ بھی مبالغے کے ساتھ کترتے تھے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی مونچھیں بڑی تھیں جب وہ آئے تو اللہ کے نبی ﷺ نے مسواک رکھ کر اگلی لبیں ساری صاف کردیں، فرمایا یہ مُنہ میں نہیں آنی چاہیں۔ اس کا اہتمام بھی اللہ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کرایا۔ شریعت مطہرہ نے ہمیں حکم

دیا کہ: اَعْفُوا اللُّحٰی وَقُصُّوا الشَّوَارِبَ داڑھی بڑھاؤ، مونچھیں کتراؤ۔

۲۸۔ اَوَّلُ مَنِ اسْتَاکَ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اوّل مسواک کرنے کا پورا اہتمام کیا، یہ منہ کی پاکی کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ مسواک کا سب انبیاء علیہم السلام نے اہتمام کیا ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَازَالَ جِبْرِیْلُ یُوْصِیْنِیْ بِالسِّوَاکِ حَتّٰی خِفْتُ عَلٰی اَضْرَاسِیْ۔[۱]

اِنِّیْ لَاَسْتَاکُ حَتّٰی اَنِّیْ لَقَدْ خَشِیْتُ اَنْ اُحْفِیْ مَقَادِمَ فِیَّ۔[۲]

مجھے مسواک کا حکم دیا گیا اور اِتنا اہتمام کرایا گیا کہ قریب تھا کہ کہیں میں اپنے مسوڑھے نہ چھیل ڈالوں۔ آپ علیہ السلام نے کئی جگہوں پر مسواک کو مستحب قرار دیا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے، اپنے اہلِ خانہ کے پاس جانے سے پہلے۔ سوکر اُٹھنے کے بعد مسواک کرے۔ قرآن کی تلاوت کرنے سے پہلے۔ وضو پہلے سے ہے لیکن منہ کے اندر رطوبت اور بدبو آرہی ہے تو مسواک کرے اور اسی طرح دانت زرد ہورہے ہیں تو بھی مسواک کرے۔

آپ علیہ السلام نے فرمایا: اے میری اُمت! بنی اسرائیل کے مرد اپنے منہ گندے رکھتے تھے، بدبودار رکھتے تھے، اُن کی عورتیں اُن سے نفرت کرنے لگیں۔ تم اپنے منہ کو صاف رکھو۔ جب آدمی اپنے منہ کو صاف کرکے تہجد میں قرآن پڑھتا ہے تو فرشتہ اُس کے منہ پر مُنہ رکھتا ہے اور قرآن لیتا ہے۔ ملائکہ قرآن پڑھتے نہیں ہیں وہ ذکرِ الٰہی کرتے ہیں تو جب آدمی تہجد میں قرآن پڑھ رہا ہو تو فرشتے اُس قرآن کو لیتے ہیں۔ اگر منہ میں بدبو ہوگی تو ملائکہ اس سے دور رہیں گے ورنہ اس کے منہ پر منہ رکھتے ہیں اور یہ قرآن اُن کی خوراک بنتا ہے۔

۲۹۔ اَوَّلُ مَنْ فَرَقَ شَعْرَہٗ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے سر کے بالوں کی مانگ نکالی۔ ہمارے نبی علیہ السلام اوّلاً

---

[۱] الدر المنثور، ج:۱، ص: ۲۱۳

[۲] سنن ابن ماجہ باب السواک، ص ۲۵، تفسیر الدر المنثور، ج:۱، ص: ۲۱۳

سدل کرتے کہ بالوں کو اپنے حال میں چھوڑ دیتے، بعد میں آپ علیہ السلام فرق یعنی مانگ نکالتے تھے۔

۳۰۔اَوَّلُ مَنْ تَمَضْمَضَ وَاَوَّلُ مَنِ اسْتَنْشَقَ:

سب سے پہلے کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کا اہتمام فرمایا۔ جب بھی انسان نیند سے اُٹھے، اُس وقت کلی کا اہتمام اور ناک صاف کرنا چاہئے کیونکہ شیطان غفلت کے موقع پر ناک میں بسیرا کرتا ہے۔

۳۱۔ اَوَّلُ مَنِ اسْتَنْجٰی بِالْمَاءِ :

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے پانی سے استنجاء کا اہتمام کیا۔ ڈھیلے سے بھی استنجاء ہو جاتا ہے مگر بعد میں پانی سے کرنا افضل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اہلِ قباء کی طہارت کی تعریف کی ہے: فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ۔[۱]

۳۲۔اَوَّلُ مَنْ هَاجَرَ لِلّٰهِ :

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ کے راستہ میں بیوی سمیت ہجرت کرنے میں اللہ تعالیٰ کے پہلے نبی ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان اور حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہما کی تعریف کی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی۔

۳۳۔وَجَعَلَ مَقَامَهٗ قِبْلَةً:

وہ پتھر جس پر کھڑے ہو کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُس مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بنا دیا کہ اس کے پاس اور پیچھے طواف کے نفل ادا کرو۔

۳۴۔اِمَامًا لِّلنَّاسِ :

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو رہتی دُنیا تک مذہبی اُمم کا امام بنا دیا۔ یہود سے پوچھو تو وہ کہتے ہیں ہم ملتِ ابراہیم پر ہیں، اسی طرح نصاریٰ بھی اپنے آپ کو ابراہیمی کہتے ہیں، ہندو اپنے آپ کو ابراہام کا ماننے والا بتاتے ہیں، مشرکینِ مکہ کے دلوں میں اُن کا بڑا احترام تھا اور مسلمان تو حقیقۃً دل سے اُنہیں اپنا امام مانتے ہیں: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ حتیٰ کہ حضور علیہ السلام کو اوّلاً اور تبعاً اُمتِ محمدیہ

---

[۱] التوبہ:۱۰۸

کوقربانی کی لائن میں ان کے اتباع کا حکم دیا ہے اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا۔[۱]

۳۵۔ اللہ نے اوّلاً ان کا نام حلیم، مُنیب، اور اوّاہ رکھا:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ: ''حلیم'' وہ ہوتا ہے جسے غصہ کے وقت نفس پر پورا قبضہ ہو، اور ''اَوَّاہ'' وہ ہوتا ہے جو ذنوب پر یا خلافِ اولیٰ کے صادر ہونے پر اُوہ کرے، گڑگڑائے، اس لئے ایک روایت میں ہے:

يَا اِبْرَاهِيْمُ! اِنَّكَ لَمَّا سَلَّمْتَ مَالَكَ اِلٰى ضَيْفَانٍ وَابْنَكَ اِلَى الْقُرْبَانِ وَنَفْسَكَ اِلَى النِّيْرَانِ وَقَلْبَكَ اِلَى الرَّحْمٰنِ، اِتَّخَذْنَاكَ خَلِيْلًا۔

اے ابراہیم! جب آپ نے اپنا مال مہمانوں کے سپرد کردیا، اپنے بیٹے کو قربان گاہ کی طرف ذبح کرنے کیلئے لے گئے، اپنی جان کو آگ کے سپرد کردیا اور اپنا دل رحمن کے حوالے کردیا تو ہم نے آپکو اپنا خلیل بنالیا۔

۳۶۔ اِنَّهٗ دَعَا اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْ يَّجْعَلَ النُّبُوَّةَ فِيْ نَسْلِهٖ فَاسْتَجَابَ لَهٗ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اے اللہ میری اولاد در اولاد میں نبوت رکھ دے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی، چنانچہ روایات میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی نسل میں آٹھ ہزار انبیاء کرام علیہم السلام بھیجے۔

۳۷۔ انہوں نے دعا مانگی ''وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ''[۲] اے اللہ! آنے والی نسلوں میں میرا ذکرِ خیر باقی رکھ۔ چنانچہ تمام اُمم میں اُن کی برتری وفضیلت کے چرچے رہے، ہر آفاقی مذہب اپنا سلسلہ اُنہیں سے جوڑنے پر فخر کرتا ہے۔

۳۸۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُمّت قانت سے پکارا ہے، ''اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ''[۳]

---

[۱] النحل: ۱۲۳

[۲] الشعراء: ۸۴

[۳] النحل: ۱۲۰

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُمّت کے معنی مُعَلِّمُ النَّاسِ الْخَيْرَ کے اور قانت کے معنی مطیع کے کئے ہیں۔ یعنی سب انواعِ خیر سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں جمع تھیں، ''لَيْسَ عَلَى اللّٰهِ بِمُسْتَنْكِرٍ اَنْ يَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِيْ وَاحِدٍ''۔

۳۹۔ بلوغ سے قبل رُشد عطا کئے گئے، ''وَلَقَدْ آتَيْنَا اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ''[۱]

۴۰۔ حضور ﷺ اور آپ کی امت کو قربانی کی لائن میں اُن کے اتباع کا حکم دیا گیا، '' ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا''۔[۲]

(هٰذَا كُلُّهٗ مِنْ قَصَصِ الْاَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ مِنْ كُتُبِ التَّوَارِيْخِ خُصُوْصًا عَرَائِسُ الْمَجَالِسِ)

قربانیوں کا صلہ اور جزاء:

حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کی بے انتہا قربانیوں کی وجہ سے اِن کی تمام سُنن ومبارک طرق کو اُمم آتیہ میں اور بعد کے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام میں جاری رکھا ہے، بارش کے قطرات اور ریت کے ذرّات سے زیادہ، ساری کائنات اور ہماری طرف سے اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی اور اپنے حبیب علیہ السلام کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

---

[۱] الانبیاء: ۵۱

[۲] النحل: ۱۲۳

''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ''۔(الانعام:۷۹)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا

بُت پرستی وکواکب پرستی کی تردید کرنا

بُت پرستی وکواکب پرستی کی تردید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ [۱]

ترجمہ:

اور اُس وقت کا ذکر سنو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کہ: ''کیا آپ بتوں کو خدا بنائے بیٹھے ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ اور آپ کی قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں''۔ اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظارہ کراتے تھے، اور مقصد یہ تھا کہ وہ مکمل یقین رکھنے والوں میں شامل ہوں۔ چنانچہ جب اُن پر رات چھائی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگے: ''یہ میرا رب ہے''۔ پھر جب وہ ڈوب گیا تو انہوں نے کہا: ''میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے دیکھا تو کہا کہ: ''یہ میرا ربّ ہے''۔ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہنے لگے: ''اگر میرا ربّ مجھے ہدایت نہ دے تو میں یقیناً گمراہ لوگوں میں شامل ہوجاؤں''۔ پھر جب انہوں نے سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا: ''یہ میرا ربّ ہے، یہ زیادہ بڑا ہے''۔ پھر جب وہ غروب ہوا تو

[۱] سورۃ الانعام: ۷۴ تا ۷۹

انہوں نے کہا: ''اے میری قوم! جن جن چیزوں کو تم اللہ کی خدائی میں شریک قرار دیتے ہو میں اُن سب سے بیزار ہوں، میں نے تو پوری طرح یکسو ہوکر اپنا رُخ اُس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شاہکار شخصیت:

میرے محترم بھائیو، دوستو اور بزرگو! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت تمام مذہبوں اور تمام فرقوں میں مسلّم تھی اور سب اُن کو عقیدت، محبت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مسلّم شخصیت ہونے کی وجہ سے ہر فرقہ اپنی نسبت اور تعلق ان کے ساتھ جوڑتا تھا۔ چنانچہ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے، عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے اور مشرکینِ مکہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ ہم میں سے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تیسرے پارے میں ان سب کی تردید فرمائی، بڑے صاف الفاظ میں فرمایا:

''مَاكَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَانَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَّمَاكَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ''۔[1]

''ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھے، نہ عیسائی تھے لیکن وہ ایک طرف ہوکر رہنے والے مسلمان تھے، اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے''۔

اور ایک مقام پر صائبین کا لفظ بھی آیا ہے۔

''صابی'' کی تعریف وتحقیق:

صابی فرقہ پیغمبروں پر ایمان رکھتا تھا، قیامت کو بھی مانتا تھا، نماز اور روزہ کا بھی قائل تھا اور جنت ودوخ کو بھی مانتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی میں مبتلا تھا کہ ستاروں میں خدائی کرشمے مانتا تھا، مثلاً فلاں ستارے کو یہ اختیار ہے اور فلاں کو یہ اختیار ہے۔

---

[1] آل عمران: ٦٧

سیاروں، ستاروں میں تاثیر کا ہونا:

یہاں آپ حضرات ایک بات ذہن نشین کرلیں کہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں میں تاثیر رکھی ہے، اس کا انکار نہیں لیکن وہ اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو کام میں لگایا ہوا ہے، وہ اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوسکتے، ان میں خدائی اختیارات نہیں، جس طرح سورج اور چاند میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر رکھی ہے۔ علمِ نباتات والے بتاتے ہیں کہ سورج کی حرارت اور تپش کا فصلوں پر اثر پڑتا ہے، اور چاند ستاروں کی روشنی بھی پھلوں میں مؤثر ہے کہ اس سے پھلوں میں رس اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ یہ تاثیر ان میں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے، اس کا انکار نہیں ہے، سورج کی حرارت اور تپش کا کون انکار کرسکتا ہے، لیکن خدائی اختیارات کسی میں نہیں ہیں، نہ سورج میں اور نہ چاند، ستاروں میں۔

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاند، سورج اور ستاروں میں کچھ ایسی خاصیتیں رکھی ہیں جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض خاصیات ایسی ہیں جن کا ہر شخص مشاہدہ کرسکتا ہے، مثلاً سورج کے قرب وبعد سے گرمی اور سردی کا پیدا ہونا، چاند کے اُتار چڑھاؤ سے سمندر کے مدّوجزر وغیرہ، اسی طرح انسانی خون پر چاند کا اثر پڑتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ۱۷، ۱۹، ۲۱ کو پچھنے لگواؤ۔

ستاروں کو مؤثرِ حقیقی ماننے کا عقیدہ:

جو لوگ ستاروں کو مؤثرِ حقیقی مانتے ہیں، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انقلابات اور واقعات ستاروں ہی کے مرہونِ منّت ہیں، ستارے ہی دنیا کے تمام واقعات کے فیصلے کرتے ہیں، تو بلا شبہ ان کا خیال غلط اور باطل ہے، اور یہ عقیدہ انسان کو شرک کی حد تک پہنچادیتا ہے۔ اہلِ عرب بارش کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک خاص ستارہ (جسے ''نوء'' کہا جاتا تھا) بارش لے کر آتا ہے، اور وہ بارش کے لئے مؤثرِ حقیقی کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عقیدے کی تردید فرمائی ہے جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔

ستاروں میں خواص محض سبب کا درجہ رکھتے ہیں:

رہے وہ لوگ جو دنیوی واقعات میں مؤثرِ حقیقی تو اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس بات

کے بھی قائل ہیں کہ اللہ نے ستاروں کو ایسے خواص عطا فرمائے ہیں جو سبب کے درجہ میں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس طرح بارش برسانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس کا ظاہری سبب بادل ہیں، اسی طرح تمام کامیابیوں اور ناکامیوں کا اصل سرچشمہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی ہے لیکن یہ ستارے ان کامیابیوں اور ناکامیوں کا سبب بن جاتے ہیں، سو یہ خیال شرک نہیں ہے۔

علمِ نجوم کی تحصیل میں کہاں تک لگ سکتے ہیں؟

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا ذُکِرَ الْقَدَرُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَتِ النُّجُوْمُ فَاَمْسِکُوْا وَاِذَا ذُکِرَ اَصْحَابِیْ فَاَمْسِکُوْا[۱]

''جب تقدیر کا ذکر چھڑے تو رک جاؤ، (یعنی اس میں زیادہ غور وخوض اور بحث ومباحثہ نہ کرو) اور جب ستاروں کا ذکر چھڑے تو رک جاؤ، اور جب میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کا (یعنی اُن کے باہمی اختلافات وغیرہ کا) ذکر چھڑے تو رُک جاؤ۔''

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

تَعَلَّمُوْا مِنَ النُّجُوْمِ مَاتَهْتَدُوْنَ بِهٖ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ثُمَّ اَمْسِکُوْا[۲]

''ستاروں کے علم سے اتنا حاصل کرو جس کے ذریعہ تم خشکی اور سمندر میں راستے جان سکو، اس کے بعد رُک جاؤ۔

اس ممانعت سے ستاروں کے خواص وآثار کا انکار لازم نہیں آتا، لیکن ان خواص وآثار کے پیچھے پڑنے اور ان کی جستجو میں قیمتی اوقات برباد کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں اس پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس ممانعت کی متعدد حکمتیں بتائی ہیں۔

---

[۱] احیاء العلوم للعراقی بحوالہ طبرانی ؒ وھو حدیث حسنہ العراقی

[۲] احیاء علوم الدین للغزالی ؒ

علمِ نجوم کے ممنوع ومذموم ہونے کی پہلی حکمت:

جب اس علم میں انسان کا انہماک بڑھتا ہے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ ستاروں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور یہ چیز اُسے کشاں کشاں ستاروں کے مؤثرِ حقیقی ہونے کے مشرکانہ عقیدے کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسری حکمت:

یہ ہے کہ اگر ستاروں میں اللہ تعالیٰ نے کچھ خواص وآثار رکھے بھی ہوں تو ان کے یقینی علم کا ہمارے پاس سوائے وحی کے کوئی راستہ نہیں ہے، حضرت ادریس علیہ السلام کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا کوئی علم عطا فرمایا تھا لیکن اب وہ علم جس کی بنیاد وحی الٰہی پر تھی، دنیا سے مٹ چکا ہے، اب علمِ نجوم کے ماہرین کے پاس جو کچھ ہے وہ محض قیاسات، اندازے اور تخمینے ہیں، جن سے کوئی یقینی علم حاصل نہیں کیا جاسکتا، یہی وجہ ہے کہ نجومیوں کی بے شمار پیشین گوئیاں آئے دن غلط ثابت ہوتی رہتی ہیں۔ کسی نے اس علم کے بارے میں بہترین تبصرہ کیا ہے کہ:

مُفِيْدُهٗ غَيْرُ مَعْلُوْمٍ وَ مَعْلُوْمُهٗ غَيْرُ مُفِيْدٍ ''یعنی اس علم کا جو حصہ مفید ہوسکتا ہے وہ کسی کو معلوم نہیں اور جو لوگوں کو معلوم ہے وہ فائدہ مند نہیں''۔

جن بڑے بڑے لوگوں نے اس علم کی تحصیل میں اپنی عمریں کھپائی ہیں وہ آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اس علم کا انجام قیاس وتخمین سے آگے کچھ نہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کو دعوتِ حق دینا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام جس قوم کی طرف مبعوث ہوئے اُن میں دو قسم کے مرض تھے: بُت پرستی اور کواکب پرستی۔ بُت پرستی اپنے عروج پر تھی، خود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد آزر صرف بُت پرست ہی نہیں بلکہ بُت فروش بھی تھے، ساری قوم شرک کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعوت کا آغاز اپنے گھر سے کیا، موحّدِ اعظم نے اپنے باپ کے ضمیر ووِجدان کو جھنجھوڑتے ہوئے اس سے کہا: اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً[1] ''کیا آپ نے خود اپنے ہاتھوں کے گھڑے ہوئے بتوں

---

[1] الانعام: ۷۴

کومعبود بناڈالا ہے؟ اِنِّیۡۤ اَرٰىكَ وَقَوۡمَكَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ[۱] ''یہ تو ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں آپ بھی مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی۔

دوسری جگہ اس کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

اَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ[۲] ''کیا تم لوگ ان چیزوں کی پوجا کرتے ہو جن کو تم خود اپنے ہاتھوں سے گھڑتے ہو؟''

یعنی تمہاری عقلوں کو کیا ہو گیا جو تم اس طرح کی حماقتوں کا ارتکاب کرتے ہو؟ اور تمہاری عقل آخر کہاں اور کیسے ماردی گئی کہ تم لوگ خود اپنے ہاتھوں کی گھڑی ہوئی ان بے جان اور بے حس وحرکت مورتیوں کو اپنا خدا مان کر اُنکے آگے جھکتے اور اپنی تحقیر وتذلیل اور ہلاکت وتباہی کا سامان خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہو؟

صنم کی تحقیق وتفسیر:

اس آیت کی تشریح میں تفسیر ابن جریر، طبری اور تفسیر خازن میں لکھا ہے کہ صنم کہتے ہیں:

''اَلَّذِیۡ یُتَّخَذُ مِنَ الذَّهَبِ وَالۡفِضَّةِ وَالۡخَشَبِ وَالۡحَجَرِ وَالۡمَدَرِ عَلٰی صُوۡرَةِ الۡاِنۡسَانِ هُوَ الۡوَثَنُ اَیۡضًا جو بنایا جائے سونے، چاندی، لکڑی، پتھر اور مٹی سے انسانی شکل پر، اور ''وثن'' بھی یہی ہے۔''

اور اگر انسان کی شکل پر نہ ہو تو اس کو کبھی تو ہیکل اور کبھی تمثال کہتے ہیں، اور کبھی کسی اور لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بُت پرست تھی، اپنے بتوں کے فوٹو اور تصویریں بنا کر اُن کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، اصل عقیدت تو ان بزرگوں کے ساتھ تھی جن کی شکلوں پر یہ بت بنائے ہوئے تھے اور انہی کی پوجا کرتے تھے، کیونکہ محض پتھر اور لکڑی کی پوجا تو کبھی کسی نے نہیں کی۔

---

[۱] الانعام: ۷۴

[۲] الصافات: ۹۵

ہندوؤں کا پتھروں کو تراشنا اور بُت بنانا:

یہ جو پرانے بزرگ ہیں انہوں نے ہندوؤں کو دیکھا ہوگا کہ وہ رام چندر، کرشن اور بدھ کی پوجا کرتے تھے، اس طرح کہ ایک مَن کا پتھر لے کر اس کو کرشن کی شکل پر تراشتے، تراشتے جب وہ پانچ سیر کا رہ جاتا اور کرشن کی شکل بن جاتی، یا رام چندر کی شکل بن جاتی، یا بدھ کی شکل بن جاتی تو اس کو پوجنا شروع کر دیتے تھے، وہ پتھر جب ایک مَن کا تھا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی، اس کی کسی نے پوجا نہیں کی اور جب وہ پانچ سیر کا رہ گیا تو اب اس کی پوجا شروع ہوگئی، کیونکہ اب وہ کسی کی شکل اختیار کر گیا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ پوجا پتھر کی نہیں بلکہ اس ذات کی ہے جس کی شکل پر اس کو تراشا گیا ہے۔ اسی طرح وہ بیس سیر کی لکڑی میں کوئی کرشمہ نہیں مانتے تھے، مگر جب اس کو تراش کر بدھ، کرشن اور رام چندر کی شکل بنا دیتے تو اس کی پوجا کرتے، لہٰذا اصل پوجا تو اس کی ہوئی جس کی شکل پر اس کو تراشا گیا، لکڑی، پتھر تو محض بطورِ علامت اور نشانی کے ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ[۱] بے شک میں دیکھتا ہوں تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں، بتوں کی پوجا کھلی گمراہی ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ'' ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کے عجائبات دکھائے۔ جو ربّ اس بات پر قادر ہے کہ نگاہ ایک میل تک پہنچا دے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ نگاہ ایک ارب میل تک پہنچا دے۔ اللہ نے زمین میں کیا ذخائر رکھے ہیں، آسمانوں میں کیا کیا کمالات اور خوبیاں رکھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے سارے پردے ہٹا کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا ہماری کائنات کو دیکھئے، نیچے زمین اور اُس کے خزانے بھی دیکھئے اور اوپر آسمان اور اُن کی خوبیاں اور عجائبات بھی دیکھئے، ہم نے سارے پردے آپ کے لئے کھول دیئے ہیں۔

---

[۱] الانعام: ۷۴

ملکوت: ''ملک'' سے مشتق ہے، واؤاور تاء مبالغہ کا ہے، مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کی بڑی قدرت و بڑا ملک دکھایا، یعنی ابراہیم علیہ السلام کوآسمان وزمین میں قدرت قاہرہ، باہرہ کی نشانیاں دکھلاتے رہے تاکہ علمِ یقینی بالمشاہدہ حاصل ہوجائے۔

واقعہ یوں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کوایک پتھر پر کھڑا کیا گیا، وہاں سے تمام عالَم کے پردے اُٹھا دیے گئے، تمام آسمان، زمین، عرش بریں اوراسفل السافلین سب کا مشاہدہ کرایا گیا، یہاں تک کہ جنّت میں اپنی جگہ دیکھ لی۔ ''وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً'' کا ایک مطلب یہی ہے۔

دورانِ مشاہدہ ایک مرد وعورت کو گناہ کرتے دیکھا، بددعا کی ہلاک ہوگئے، پھر دوسرے جوڑے کو ایسے دیکھا، بددعا کی وہ بھی ہلاک ہوگئے، پھر تیسرے کو ایسے دیکھا جونہی بددعا کا ارادہ کیا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابراہیم! تم مقبول الدعوات ہو، میرے بندوں کے لئے بددعائیں نہ کرو، میرا بندوں سے تین طرح کا تعلق ہے:

(۱) جوتوبہ کرے قبول کرلیتا ہوں۔

(۲) یااس کی نسل سے نیک اولاد پیدا کروں گا۔

(۳) یاجب آخرت میں میرے پاس آئے گا معاف کردوں گا یاسزادوں گا۔[۱]

عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس طرح ہم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بُت پرستی کی گمراہی، اہلِ ہوی کی جہالت اور حماقت دکھلائی اسی طرح ہم ابراہیم علیہ السلام کوآسمانوں اورزمین کی سلطنت اور عجائب قدرت دکھلائے، یعنی ساتوں آسمانوں اورساتوں زمینیں اُن کی نظروں کے سامنے کردی گئیں، چاند، سورج، ستاروں، درختوں، پہاڑوں اورسمندروں کے عجائبات ان پر منکشف کردیئے گئے، حتی کہ نظر فرش سے لے کرعرش تک پہنچ گئی، اوپر سے لے کر نیچے تک تمام اشیاء کے حقائق اور بواطن اُن کو دکھلا دیے گئے، تاکہ تمام مخلوقات سماوی اورارضی کی عاجزی اورلاچارگی اوران کی ذلّت، خاکساری اوران کے امکان وحدوث کا

---

[۱] تفسیر مظہری

اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیں کہ یہ کل کائنات کی چیزیں محتاجِ محض ہیں۔

اس سے وجودِ باری پر استدلال کریں اور اُن کے شرک کا بطلان ظاہر کریں اور تا کہ وہ ہماری خالقیت اور وحدانیت پر کامل یقین کرنے والوں میں سے ہوجائیں کہ جہاں کسی شبہ اور تردد کا خیال اور غلط ادراک کا کوئی احتمال ہی باقی نہیں رہتا، کیونکہ مشاہدہ کے بعد شک اور تردد کی گنجائش نہیں رہتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بچشمِ سَرْ اور بچشمِ سِرّ (دل) دکھلا دیا گیا کہ آسمان وزمین، شمس وقمر اور کواکب ونجوم سب خداوند ذوالجلال کے حکم کے سامنے مسخر اور رام ہیں، جس طرح چاہتا ہے وہ اِن اَجْرام اور اَجْسام کو چلا رہا ہے اور اپنی قدرت کا کرشمہ دنیا کو دکھلا رہا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز الٰہ نہیں ہوسکتی۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ملکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرادیا، ان کی نگاہ کروڑوں، اربوں میل تک کی تمام چیزیں دیکھ رہی تھی، آسمان اور زمین کے تمام حقائق اور بواطن اُن کو آنکھوں سے دکھلا دیئے جس کو دیکھ کر اُن کو عین الیقین ہوگیا کہ یہ تمام کارخانۂ عالم خود بخود نہیں چل رہا ہے بلکہ کسی واحد قہار کے ارادہ اور حکم سے چل رہا ہے۔ یہ عجیب وغریب نظام محض اتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے اور بہرے مادہ سے نہیں چل رہا ہے، غرض یہ کہ اس ملکوت السموات والارض کے مشاہدہ اور معاینہ سے بت پرستی کی طرح کواکب پرستی کی جہالت، ضلالت اور حماقت نظروں کے سامنے آگئی اور اوپر سے لے کر نیچے تک حدوثِ عالم کا آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا تا کہ قوم کو وجود باری اور وحدانیت، دلیل اور برہان سے سمجھا سکیں۔

کائنات کو دیکھنے کا صحیح اور درست طریقہ:

کائنات کو دیکھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر اس کے خالق ومالک اور اس کی معرفت تک رسائی حاصل کی جائے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ [۱] ''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت کا نظارہ کراتے

---

[۱] الانعام: ۷۵

تھے، اور مقصد یہ تھا کہ وہ مکمل یقین رکھنے والوں میں شامل ہوں۔''

تاکہ اس طرح آپ حکمتوں بھری اس کائنات سے اس کے خالق ومالک کی وحدانیت ویکتائی اور اس کی عظمتِ شان پر استدلال کرسکیں، اور اہلِ شرک وباطل پر حجت قائم کرسکیں، نہ کہ ظاہر پرست دنیاداروں کی طرح کہ ان کی نگاہیں اس دنیا کی ظاہری چمک دمک ہی میں رک اور اٹک جاتی ہیں۔ وہ اس کی گوناگوں نعمتوں سے طرح طرح سے فائدہ تو اُٹھاتے ہیں، مگر وہ اپنے خالق ومالک کی معرفت کے نور سے منور نہیں ہوسکتے، اس کی عبادت وبندگی کے شرف سے محروم رہتے ہیں، اِس محرومی کے نتیجے میں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ اس سے بالکل غافل اور بے فکر ہوکر محض حیوانوں کی سی زندگی گزارتے ہیں یا پھر اسی کائنات کے مختلف مظاہر میں اُلجھ کر طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس طرح ایسے لوگ اپنی تذلیل وتحقیر کا سامان خود کرتے ہیں، سو کوئی چاند، سورج اور گنگا جمنا کی پوجا کرتا ہے اور کوئی گائے بیل جیسے کسی بے عقل جانور کی، کوئی لکڑی پتھر کے کسی بے جان بُت اور من گھڑت مورتی کی، کوئی کسی ننگ دھڑنگ ملنگ کی اور کوئی اندام نہانی تک کی پوجا کرتا ہے۔ ''وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس سب کے برعکس کائنات کے انہی مختلف مظاہر اور نفع بخش اشیاء سے معبودِ حقیقی اور ان اشیاء کے خالق ومالک کی قدرت اور وحدانیت پر استدلال کیا، اور اہلِ شرک وباطل پر حجت قائم کردی۔ سو یہ ہے اللہ پاک کی وہ اراءت وتوفیقِ حق جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس واہبِ مطلق کی طرف سے بطورِ خاص نوازا گیا تھا۔

بہرکیف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب آسمان وزمین کے نظام میں صحیح طریقے سے غور کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق وعنایت سے آپ پر معرفت وحکمت کے وہ اسرار ورموز کھولے جن سے انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے خلاف حجت قائم کی اور عقیدۂ توحید کو ان کے سامنے پوری طرح نکھار کر رکھ دیا اور اس طور پر کہ ان لوگوں کے لئے گریز وفرار کی کوئی راہ ممکن نہیں تھی سوائے عناد وہٹ دھرمی کے۔ سو کائنات کو صحیح زاویے سے دیکھنا بڑا اہم اور بنیادی مطلب ہے۔ ''وَبِاللّٰہِ التَّوْفِیْقُ لِمَا یُحِبُّ وَیُرِیْدُ''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کو دعوتِ حق دینا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ کواکب پرست یعنی ستارہ پرست بھی تھی، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ موت وحیات، سعادت ونحوست، فتح وظفر اور شکست وہزیمت یہ تمام تغیراتِ عالم، تاثیر کواکب کا نتیجہ ہیں، اس لیے ان کی خوشنودی کیلئے ان کی پرستش ضروری ہے۔

مثلاً سورج کے سامنے کھڑے ہوکر ہاتھ جوڑ دینا کہ اے سورج! میرا یہ کام کردے، اے چاند میرا یہ کام کردے، اے زہرہ! میرا یہ کام کردے۔ وہ ستاروں کو مؤثرِ حقیقی سمجھتے تھے، ویسے تو ربُّ العالمین نے چیزوں میں تاثیر رکھی ہے، جیسے بارش میں برودت اور ٹھنڈک کی تاثیر ہے، سورج میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ ساری دنیا میں تپش (گرمی) پھیلا رہا ہے، اس کے اردگرد ستائیس ملین سے زیادہ تپش ہے۔ ایسے ربُّ العالمین نے چاند میں بھی تاثیر رکھی ہے، سمندر پر آپ کھڑے ہوں تو دیکھیں پہلے پندرہ دن اس کی موجیں پہاڑوں کی طرح اُٹھتی ہیں، آخری دنوں میں کیسے تھم جاتی ہیں۔ خود ہمارے پاک نبی ﷺ نے فرمایا: چاند کی سترہ، انیس اور اکیس کو جسم سے خون نکلواؤ، یعنی پچھنے لگواؤ، ان دنوں میں ضرر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاند کا کنکشن انسان کے جسم سے بھی رکھا ہے، مستورات کو جو ماہواری آتی ہے اللہ نے اُس کا ربط بھی چاند سے جوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کا تعلق فصلوں، نباتات اور پھلوں سے جوڑا ہے، چاند ستاروں کی وجہ سے پھلوں میں مٹھاس آتی ہے۔

ربُّ العالمین نے چیزوں میں تاثیرات رکھی ہیں، چیزوں میں تاثیرات کا انکار نہیں ہے، ستاروں کی تاثیر کا قائل بن جانا اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن ستاروں کو ربُّ العالمین سمجھ لینا، مشکل کشا سمجھنا، ستاروں میں ربانی صفات سمجھ لینا غلط، ناجائز اور حرام ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں یہ مرض تھا کہ وہ ستاروں کو مؤثرِ حقیقی سمجھتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مناظرے اور مکالمے:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پہلا مکالمہ اپنے باپ کے ساتھ ہوا، جس کا ذکر سورۂ مریم میں کیا گیا ہے۔

۲۔ دوسرا مکالمہ اس مقام پر ذکر فرمایا جس کی اس وقت تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

۳۔ تیسرا مناظرہ اپنے زمانے کے بادشاہ نمرود کے ساتھ فرمایا، جس کا ذکر تیسرے پارہ کے شروع میں ہے جو ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهِیْمَ'' [۱] کے تحت مذکور ہے۔

۴۔ چوتھا مناظرہ کہ بتوں کو توڑ کر پھاوڑا بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا، جس کا ذکر سورۂ انبیاء میں ہے ''فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِیْرًا لَّهُمْ'' [۲] کہ جو چیز خود تمہاری تراشیدہ ہو اور بازار میں فروخت ہوسکتی ہو، اس کی گردن میں رسّی باندھی جاسکتی ہو اور بسولہ سے اس کو توڑا جاسکتا ہو وہ الٰہ کیسے ہوسکتی ہے؟ تم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی مورت کو خدا بنالیا ہے، کیا بندہ بھی خدا کو بنایا کرتا ہے؟

کواکب پرستی کی تردید:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بچپن ہی سے رشد وہدایت سے نوازا تھا، قوم میں بیٹھے ہوئے تھے، رات کا وقت تھا مجلس لگی ہوئی تھی: فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا جب رات کی تاریکی اُن پر چھا گئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ستارہ دیکھ کر فرمایا: هٰذَا رَبِّیْ ''یہ میرا ربّ ہے''۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے اسلوب بڑے عمدہ ہوتے ہیں، سمجھانے کی خاطر فرمارہے ہیں: ''هٰذَا رَبِّیْ'' تمہارے عقیدے کے مطابق یہ میرا ربّ ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کونسا ستارہ دیکھا:

بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ ستارہ مشتری تھا، بعض حضرات کہتے ہیں کہ زحل تھا اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ زہرہ تھا۔ بہرحال کوئی ستارہ آسمان پر دیکھ کر فرمایا هٰذَا رَبِّیْ۔

دعوت وتبلیغ میں حکمت وتدبر سے کام لینا سنّتِ انبیاء علیہم السلام ہے:

میرے محترم بھائیو! قَالَ هٰذَا رَبِّیْ میں ''هٰذَا رَبِّیْ'' استفہام ہے، معنی یہ بنے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اے ستاروں کو ربّ ماننے والو! کیا یہ میرا ربّ ہے؟ (یعنی تمہارے خیالات

---

[۱] البقرۃ:۲۵۸

[۲] الانبیاء:۵۸

اور عقائد کی رو سے) ورنہ حقیقت میں ستارے کو ربّ نہیں کہا۔

''فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' جب وہ ستارہ غائب ہوگیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں غائب ہوجانے والوں کو پسند نہیں کرتا، جو اپنی جگہ کھڑا نہیں ہوسکتا میں اس کو ربّ بنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ جو چیز تغیر پذیر ہو، طلوع وغروب ہو، وہ دوسرے کے تابع ہوتی ہے، اللہ کی ہر صفت ازلی وابدی ہے، کوئی صفت تغیر پذیر نہیں، تغیرات عالَم میں آتے ہیں، کبھی رات چھوٹی ہوگئی دن بڑا ہوگیا اور کبھی دن چھوٹا ہوگیا اور رات بڑی ہوگئی، کبھی سردی آگئی، کبھی گرمی آگئی، کبھی صحت تو کبھی بیماری۔ یہ تو مخلوق کی صفات ہیں، ان میں خالق کی کونسی صفت پائی جارہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو بڑی حکمت اور تدبر کے ساتھ سمجھایا کہ تم محض ستارے کی چمک دیکھ کر اسے معبود بناتے ہو حالانکہ یہ تو غائب ہوجانے والی چیز ہے، اور جس چیز پر زوال آجائے وہ الٰہ نہیں ہوسکتی۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا پھر اُسی شب یا دوسری شب میں چاند کو دیکھا کہ وہ تو ستارے سے بھی زیادہ چمکنے والا ہے تو فرمایا: ''هٰذَا رَبِّیْ'' یہ میرا ربّ ہے؟ کیا میں اس کو ربّ بنالوں؟ ''فَلَمَّآ اَفَلَ'' جب وہ بھی غائب ہوگیا تو فرمایا: لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ اگر میرا پروردگار مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں بھی گمراہ لوگوں میں سے ہوجاتا۔'' اللہ کا شکر ہے کہ میں چاند پرست نہیں ہوں۔

جب دن شروع ہوا، سورج طلوع ہوا: ''فَلَمَّا رَاَی الشَّمْسَ بَازِغَةً'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سورج کو دیکھا کہ وہ تو چاند سے بھی زیادہ روشن ومنور ہے تو فرمایا: ''هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ'' یہ میرا ربّ ہے، یہ بڑا ہے۔ یعنی یہ اتنا بڑا سورج جس کی پرستش میں تم لگے ہوئے ہو اور یہ قدرے بڑا بھی ہے تو کیا میں اس کو ربّ بنالوں؟

''فَلَمَّآ اَفَلَتْ'' پس جب وہ بھی غروب ہوگیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ''[۱] اے میری قوم! بے شک میں بیزار ہوں ان سے جن کو تم شریک بناتے ہو،

---

[۱] سورۃ الانعام: ۷۴ تا ۷۹

میں تمہاری بت پرستی سے بھی بیزار ہوں اور کواکب میں جو تم خدائی کرشمے مانتے ہو اس سے بھی بیزار ہوں یعنی میں ان کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو چیز اپنے عروج وزوال، طلوع وغروب کے تغیّرات میں گھری ہوئی ہو وہ ربّ نہیں ہوسکتی۔

عِلوی معبودوں کی تردید:

غرض یہ کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں سے کوئی بتوں اور مورتیوں کو پوجتا تھا اور کوئی ستاروں کو اپنا رب ٹھہرائے ہوئے تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح ان کے سفلی معبودوں کی تردید کی اسی طرح ان کے علوی معبودوں کا بھی رد فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جن بتوں اور مورتیوں کو تم نے خود تراش کر بنایا ہے وہ کیسے معبود ہو سکتے ہیں؟ **كَمَا قَالَ تَعَالٰى: أَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ**[۱] کیا تم ان بتوں کو پوجتے ہو جنہیں خود تراشتے ہو، حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم بناتے ہو ان کو بھی۔ اور باپ کو بھی توحید کی دعوت دی **كَمَا قَالَ تَعَالٰى: يَآ أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا**[۲] ابّا جان! آپ ایسی چیزوں کی کیوں عبادت کرتے ہو جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام کرسکتی ہیں۔

اور ستاروں کی خدائی کو بھی باطل کیا اور یہ بتلایا کہ جس طرح تمہاری خود تراشیدہ مورتیں قابل پرستش نہیں اسی طرح یہ ستارے بھی قابل پرستش نہیں، یہ ستارے اُفول، غروب، تغیر اور انقلاب کی وجہ سے خدائی کے لائق نہیں، اس لئے کہ ان کا یہ تغیر اور انقلاب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب فانی اور حادث ہیں اور سب کے سب کسی خاص نظام میں جکڑے ہوئے ہیں، اور کسی کے حکم کے سامنے مسخر ہیں۔ اُس نے ان کی چال، رفتار، سمت، جہت اور مسافت معین کردی ہے کہ یہ ذرہ برابر اس سے باہر نہیں جاسکتے، جو ان کی کمزوری اور لاچارگی پر دلالت کرتا ہے۔ اور اُن میں یہ تغیرات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ کسی عزیز مقتدر کے ارادہ اور مشیت کے محکوم ہیں اور اس کے سامنے مجبور اور مقہور ہیں جو انہیں چکّر کھلا رہا ہے، لہٰذا کواکب اور سیارات کو

---

[۱] الصّافات: ۹۵، ۹۶

[۲] مریم: ۴۲

مدبرِ عالم اور مربّی کائنات سمجھنا غلط ہے۔

ڈوبنے والے الٰہ نہیں ہوسکتے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' میں ڈوبنے والوں سے محبت نہیں کرتا اور ان کو الٰہ نہیں بنا سکتا کہ خود ڈوب جانے والے ربّ نہیں ہوسکتے، ''ڈوب گئے مقدر اُن کے جن کے ربّ ڈوب گئے'' کیونکہ ڈوبنا عیب ہے، کسی عیب دار کے ربّ ہونے کا سوال ہی کیا پیدا ہوسکتا ہے؟ اور دوسری بات یہ کہ کسی کا ڈوبنا اور طلوع ہونا اس بات کا ثبوت اور اس کی دلیل ہے کہ وہ کسی اور کا محکوم اور اس کے حکم وفرمان کا تابع ہے، اور جو محکوم اور کسی اور کے حکم وفرمان کا تابع ہو وہ معبود اور خدا کیسے ہوسکتا ہے؟

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر حجت قائم کردی اور ان کی حماقت وجہالت کو آشکارا کردیا اور بتایا کہ یہ کواکب وسیارات معبود ومسجود نہیں بلکہ معبود ومسجود وہ ذاتِ اقدس واعلیٰ ہے جو ان کواکب وسیارات کو اس طرح چلا رہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم پر واضح کردیا کہ یہ تمام چیزیں جن کو یہ لوگ اپنا معبود سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ خود اپنے وجود سے گواہی دے رہی ہیں کہ وہ ملکوتِ الٰہی کے تابع اور اس کے احکام وقوانین کے تحت اس کی گوناگوں مخلوق کی خدمت کیلئے مسخر ہیں۔ مجال نہیں کہ وہ سرِ مو اِن سے اِنحراف کرسکیں، سو اپنے ایسے خادموں کی پوجا کرنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ ''وَالْعِیَاذُ بِاللّٰہِ''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہیں ربّ نہیں مانا:

میرے بھائیو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہ ستارے کو نہ چاند کو اور نہ ہی سورج کو ربّ مانا۔ قوم کے ساتھ مکالمہ تھا اور ان کی تردید کررہے تھے کہ میں ان زوال پذیر چیزوں کو ربّ بنالوں جو اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ سکتے؟ اگر میرے ربّ نے مجھے ہدایت نہ دی ہوتی تو میں تمہارے جیسا گمراہ ہوتا، میں تمہاری بت پرستی اور کواکب پرستی سے برأت کا اعلان کرتا ہوں۔ حاشا وکلا ثم حاشا وکلا کسی پیغمبر نے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی کبھی شرک نہیں کیا نہ نبوت سے پہلے اور نہ نبوت کے بعد وہ تو ہر لحظہ اور ہر آن شرک کی تردید کرنے والے ہیں۔

قابل غور اور اہم بات:

جو چیز تغیّر پذیر ہو، جس کے حالات ادلتے بدلتے رہتے ہوں، جس کے حرکات وسکنات کسی دوسری چیز کے تابع ہوں وہ الٰہ اور رب نہیں ہوسکتی۔ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کا طرزِ استدلال بدیہی اور سادہ ہوتا ہے جو ہر سطح کا آدمی سمجھ سکے، ستاروں کا غروب سب پر واضح تھا، ان کی بے بسی کو ثابت کرنے کے لئے بجائے طلوع اور دوسرے تغیّرات کے، غروب کو پیش کیا ہے تاکہ کم فہم کی سمجھ میں بات اُتر جائے۔

دُعاۃ الی اللہ اور مبلغین کے لئے راہ نما اصول:

۱۔ دعوت دینے کے لئے حکمت وبصیرت کی بڑی ضرورت ہے۔ بُت پرستی کے معاملے میں اُسلوب خلیل علیہ السلام سخت اور زوردار الفاظ میں تھا، کیونکہ یہ گمراہی عام سطح کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے، بخلاف ستاروں کی بے بسی کے، یہ قدرے دقیق بات تھی اس لئے خلیل علیہ السلام نے ان کی بے اختیاری کو دلیل سے واضح کرکے سمجھایا، الفاظ قدرے نرم استعمال فرمائے بجائے شدت کے۔

۲۔ مصلح اور مبلغ کو چاہئے کہ اندازِ خطاب حکیمانہ اختیار کرے، اپنے آپ کو بھی شامل کرے تاکہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کریں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں ان طلوع وغروب ہونے والی چیزوں کو ربّ نہیں کہہ سکتا، یعنی تمہیں بھی ایسے ہی کرنا چاہیے بجائے بت پرستی کے، تم بتوں کو کیوں پوجتے ہو؟ ہمیں بھی ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرتے ہوئے ایسے کرنا چاہیے، اس لئے کہ اندازِ تواضع زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

۳۔ دعوت ایمان وعمل اپنے گھر اور خاندان سے شروع کریں، جیسے خلیل اللہ علیہ السلام نے کیا اور جیسا کہ ہمارے آقا علیہ السلام نے کوہ صفا پر چڑھ کر فرمایا میرے رب کا حکم ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[۱] اے پیغمبر! تم اپنے قریب ترین خاندان کو خبردار کرو

۴۔ سنّتِ انبیاء کرام علیہم السلام دعوت میں یہ ہے کہ اپنے واجب الاحترام بزرگ اور والدین اگر صحیح راستے پر نہ ہوں تو راہِ مستقیم کی دعوت دینا خلافِ احترام نہیں، بلکہ ہمدردی اور خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اپنے

---

[۱] الشعراء: ۲۱۴

بڑوں اور گھر والوں سے دعوت شروع کرے، اور اندازِ دعوت انتہائی نرم اور ادب ملحوظ ہو، ڈانٹ اور سختی کا انداز نہ ہو۔

قوم کے زعمِ باطل کی تردید:

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے زعم کو باطل کرنے کے لئے ایک رات ایک ستارہ زہرہ یا مشتری کو دیکھا کہ چمک رہا ہے، اُسے دیکھ کر اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہا اے قوم! کیا تمہارے زعم کے مطابق یہ ستارہ میرا اور تمہارا ربّ ہے، یعنی یہ ستارہ میرا اور تمہارا مربی اور مدبّر ہے، اور میرے احوال میں متصرف ہے، اچھا ذرا ٹھہرو، تھوڑی دیر میں اس کی ربوبیت کی حقیقت تم پر کھل جائے گی۔ پس جب وہ ستارہ چھپ گیا تو الزاماً کہا کہ میں چھپنے والوں کو اور ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہونے والوں کو اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متغیر ہونے والوں کو اور حجاب اور پردہ میں مستور ہو جانے والوں کو دوست بھی نہیں رکھتا چہ جائیکہ اُن کو الٰہ مانوں، اس لئے کہ اُفول اور غروب ایک قسم کی دَنَاءت اور پستی ہے اور ایک قسم کا سقوط اور انحطاط ہے اور ایک قسم کا عیب ہے، ایسی چیز تو قابلِ محبت نہیں چہ جائیکہ لائقِ الوہیت اور مستحقِ عبادت ہو، کیونکہ تغیر اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال پروردگار کیلئے محال ہے، یہ شان تو حادث کی ہے۔

فائدہ:

اٰفلین: بصیغہ جمع لانے میں اشارہ اس طرف ہے کہ اُفول اور غروب اس کوکب کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہزار ہا اور لاکھوں غروب ہونے والے کواکب میں سے ایک کوکب یہ بھی ہے، اس کوکب کو دوسرے کواکب پر خاص فضیلت اور برتری نہیں جو اس کو معبود بنایا جائے۔[۱]

قوت وتاثیر کا فنا ہونا ربوبیّت کے منافی ہے:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

[۱] تفسیر البحر المحیط، ج: ۴، ص: ۶۷۔

ستارہ پرستوں کا عقیدہ یہ ہے کہ طلوع کے وقت کواکب کی تاثیر قوی ہوتی ہے، جبکہ اُفول و غروب سے ستارہ کی تاثیر زائل یا کم از کم ضعیف اور مضمحل ضرور ہوجاتی ہے، بلکہ زوال کے بعد سے ستاروں کی تاثیر گھٹنی شروع ہوجاتی ہے حتی کہ غروب سے ان کی روشنی بھی ختم ہو جاتی ہے اور ان کی تاثیر بھی ختم ہوجاتی ہے۔ پس ''لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ستارہ ربّ ہوتا تو طلوع اور اشراق سے اُفول اور غروب کی طرف اور قوت سے ضعف کی طرف منتقل نہ ہوتا اور نہ اُس کی تاثیر زائل ہوتی اور نہ ضعیف اور کمزور پڑتی، اس لئے کہ ضعف واضمحلال اور قوت وتاثیر کا فنا اور زوال اُلوہیت اور ربوبیت کے منافی ہے۔

ستاروں میں تغیر اُن کے مخلوق ہونے کی دلیل ہے:

کواکب کے یہ تغیرات اس امر کی دلیل ہیں کہ یہ سب کسی قادر، قاہر کے مقدور اور مقہور ہیں اور کسی حاکمِ اعلی کے محکوم اور مجبور ہیں، لہٰذا ربّ نہیں ہوسکتے کیونکہ الٰہ محکوم، مقدور، مقہور اور مجبور نہیں ہوسکتا، ایک مجبور قیدی اور لاچار بے گاری کو ربّ بنانا حماقت ہے۔

دلیلِ ثانی:

جس طرح ضعفِ بصارت اس امر کی دلیل ہے کہ نورِ چشم اُس کا ذاتی نہیں بلکہ کسی بصیر قدیم کا عطیہ ہے اسی طرح کواکب اور سیارات کے نور کا ضعف اور اضمحلال اس امر کی دلیل ہے کہ آفتاب اور ماہتاب میں جو نور ہے وہ اُن کا ذاتی نہیں بلکہ وہ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا عطیہ ہے اور اس کے جمال بے مثال کا ایک عکس اور پرَتو ہے ورنہ اگر یہ نور آفتاب اور ماہتاب کا ذاتی ہوتا تو ان کو کسوف اور خسوف لاحق نہ ہوتا، چاند اور سورج کو کبھی گرہن نہ لگتا۔

پس جو ذات شمس اور قمر کے نور اور ان کی حرکت کی مالک ہے وہی الٰہ، برحق اور ربُّ العالمین ہے کہ جس نے اپنی حکمت بالغہ سے شمس اور قمر کو علیحدہ علیحدہ نور کی ایک خاص مقدار اور خاص کیفیت عطا کی اور ان کی حرکت کے لئے ایک خاص مقدار اور خاص مسافت معین کردی جس سے وہ باہر نہیں نکل سکتے۔

پس کواکب کا یہ اُفول وغروب اُن کی فقیری اور دستگیری اور کمزوری اور لاچارگی پر دلالت کرتا ہے اور

ظاہر ہے کہ کمزوری اور لاچاری الوہیت اور ربوبیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

جو چیز پردہ میں چھپ گئی وہ محجوب اور مستور ہوگئی اور جو مستور ہوا وہ محصور ہوا، اور جو محصور ہوا وہ مغلوب اور مقہور ہوا، اور جو مغلوب ومقہور ہوا وہ لاچار اور مجبور ہوا، لاچار اور مجبور الٰہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ الٰہ حقیقی وہ ہے جو ہر چیز کیلئے ساتر اور حاصر ہو، سب پر غالب اور جبّار وقاہر ہو: ''وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ، وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ''۔

پس جب یہ ستارہ غروب ہوگیا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسی شب میں یا کسی دوسری شب میں اس سے اعلیٰ اور برتر نور کے طلوع کا انتظار کیا، پس جب چاند کو طلوع ہوتے دیکھا تو پہلے کی طرح کہا کیا تمہارے زعم کے مطابق یہ میرا اور ساری قوم کا ربّ ہے؟ اچھا تھوڑی دیر اس کا بھی انتظار کرو، اس کی حقیقت اور کیفیت بھی تم پر واضح ہو جائے گی، پس جب وہ غائب ہوگیا تو بولا کہ اگرچہ چاند عظمت اور نورانیت میں ستارہ سے بلند ہے مگر اس کی عظمت بھی قاصر ہے، کیونکہ الوہیت اور ربوبیت کے لئے عظمت مطلقہ اور کاملہ چاہیے، عظمت قاصرہ وناقصہ ربوبیت کے لئے کافی نہیں۔

اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہوں میں سے ہوجاؤں کہ کسی چیز میں قاصر، ناقص اور ناتمام عظمت دیکھ کر اُس کو ربّ مان لوں، یعنی یہ الٰہ کا فضل ہے کہ میں اپنی قوم سے مخالف ہوں اور خالص توحید پر ہوں، اگر اُس کی ہدایت اور توفیق نہ ہوتی تو میں بھی اُن گمراہوں کی طرح کواکب کی الوہیت کا قائل ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت کا حصول بھی پروردگار کی طرف سے ہے اور اس کا بقا اور ہدایت پر ثابت وقائم رہنا یہ بھی پروردگار کی توفیق اور اعانت سے ہے۔

پھر اس کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک اور نور کے ظہور کا کہ جو اس عالم کَون وفساد میں سب سے زیادہ عظیم نور ہے یعنی طلوعِ آفتاب کا انتظار کیا تاکہ اس کی ربوبیت کا بطلان ظاہر فرمائیں۔ پس جب سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تو قوم سے کہا کیا تمہارے زعم اور خیال کے مطابق میرا اور تمہارا یہ ربّ ہے؟ ہمارے احوال کا مدبر اور ان میں یہ متصرف ہے، یہ تو بظاہر چاند اور ستاروں سے بہت بڑا ہے ممکن ہے کہ یہ کوکب اپنی عظمت کی وجہ سے الٰہ ہوسکے۔

پس جب وہ بھی غروب ہوگیا تو معلوم ہوگیا کہ یہ بھی علی الاطلاق اکبر نہیں اور اس کو کب کی بھی کبریائی مطلقہ، قاہرہ اور دائمہ نہیں، لہٰذا اس کو بھی خداوند ذوالجلال اور کبیرِ متعال کا شریک نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی، عظمت اور جلال کو کبھی فنا اور زوال نہیں اور نہ اس میں کسی قسم کے اختلال یا اضمحلال کا ذرہ برابر کوئی احتمال ہے، پس ثابت ہوگیا کہ ستارے اور شمس وقمر کسی طرح الٰہ نہیں ہوسکتے۔

برأت اور بیزاری کا اعلان:

جب یہ بات واضح ہوگئی تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ'' اے میری قوم کے لوگو! کان کھول کر سن لو کہ میں بلاشبہ بری اور بیزار ہوں اُن تمام چیزوں سے جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ یہ تو سب اللہ کے مزدور ہیں اور اس کے حکم کے سامنے مقہور اور مجبور ہیں جو وقت ان کی حاضری، روانگی، طلوع اور غروب کا اُس نے متعین کر دیا ہے اس میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں کر سکتے، پھر اُن کو ربّ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟۔

اس برأت اور بیزاری کے اعلان کے بعد فرمایا:

اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ[۱]

تحقیق میں ظاہراً اور باطناً اُس ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ یعنی جو تمام علویات اور سفلیات کا خالق ومالک ہے اور اُس نے اس قصرِ دنیا کی زینت کے لئے شمس وقمر اور نجوم کو پیدا کیا، یہ تمام ستارے اس دار دنیا کے لئے بمنزلہ لال ٹینوں اور قندیلوں کے ہیں، سب اس کے کارخانہ قدرت کے بنے ہوئے ہیں لہٰذا جو اِن لال ٹینوں اور قندیلوں کو اپنا ربّ سمجھے وہ بڑا ہی نادان ہے، میں سب سے قطع تعلق کر کے صرف ایک اللہ کی طرف مائل ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔

---

[۱] سورۃ الانعام: ۷۴ تا ۷۹

فائدہ جلیلہ:

بعض علماء فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا:

۱۔ ایک گروہ وہ تھا جو زُہرہ ستارے کو پوجتا تھا۔

۲۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو چاند کو پوجتا تھا۔

۳۔ تیسرا گروہ وہ تھا جو آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔

اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتدریج تینوں فرقوں کی گمراہی کو واضح کیا اور یہ ثابت کیا کہ غروب ہونے والی چیز حادث اور فانی ہے، اُس کا معبود ہونا محال ہے، الٰہ کیلئے بقا اور دوام ضروری ہے، فنا، زوال، تغیر اور تبدل الوہیت کے منافی ہے اور جب چاند اور سورج معبود نہیں ہو سکتے تو پتھر کے خود تراشیدہ بُت بدرجہ اولیٰ معبود نہیں ہو سکتے۔

فائدہ عظیمہ:

عارف رومی قدس سرہٗ ملکہ سبا یعنی ملکہ بلقیس کے قصّہ میں فرماتے ہیں جس کی قوم شمس وقمر اور ستاروں کی پرستش کرتی تھی، ان کی تردید میں فرماتے ہیں:

آفتاب از اَمرِ حق طبّاخ ماست اَبلہی باشد کہ گویم او خدا ست

سورج اللہ کے حکم سے ہمارا باورچی ہے جو ہماری کھیتیوں کو پکاتا ہے اور حکمِ الٰہی کا تابع ہے وہ الٰہ کیسے ہوسکتا ہے؟ باورچی کو ربّ کہنا صاف بے وقوفی ہے۔

آفتاب گر بگیر دچوں کئی آں سیاہی زو تو چوں بیروں کنی

تیرا یہ معبود سورج اگر اس کو گہن لگ جائے تو بتلا کہ تو اس سے اس گہن کی سیاہی کو کس طرح دور کریگا، اس سیاہی کو دور کرنا تیری قدرت میں نہیں، ذرا غور تو کر کیا الٰہ کو بھی سیاہی لگ جاتی ہے۔

بے بس مخلوق کیسے الٰہ ہوسکتی ہے، الٰہ وہ ہے جو نور اور ظلمت کا مالک ہو اور جب چاہے آفتاب اور ماہتاب کی روشنی کو چھین لے، اور جب چاہے اُسے واپس کردے۔

گر کشندت نیم شب خورشید کو تا بنالی یا امان یابی ازد

''اگر آدھی رات تجھ پر قاتلانہ وار کیا جائے جب کہ سورج غائب ہوتا ہے تو پھر کون ہے کہ جس کے حضور میں تو نالہ وفریاد کرے یا اُس سے امان پائے''۔

حادثات اغلب بشب واقع شود واں زمان معبود تو غائب بود

''قتل اور چوری کے حادثات اکثر رات کے وقت میں ہوتے ہیں اور اس وقت تیرا معبود غائب ہوتا ہے، اُس کو کچھ خبر نہیں کہ تجھ پر کیا گذر رہی ہے لہٰذا ایسا معبود اختیار کرو جو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر وناظر ہے''۔

روز دیدی طلعت خورشید خوب مرگ اورا یاد کن وقت غروب

''دن میں تو نے آفتاب کے طلوع کا بہت عمدہ جلوہ دیکھا ہے، غروب کے وقت اس کی موت کا بھی تو کرشمہ دیکھ کہ آفتاب کے حسن وجمال پر کس طرح موت آتی ہے، آفتاب کی اس حالت سے تجھ کو عبرت پکڑنی چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ آفتاب کا یہ نور اُس کا ذاتی نہیں بلکہ نور السموات والارض کا عطیہ اور ادنیٰ سا پرتو ہے''۔

بدر رادیدی بریں خوش چار طاق حسرتش راہم ببیں وقت مِحَاق

''تو نے آسمان کے خوبصورت خیمہ پر چودھویں رات کا چاند تو دیکھ لیا اب اس کے بعد اس کے مِحَاق یعنی اُس کے گھٹنے اور بتدریج بے نور ہونے کے وقت اس کی حسرت کو بھی دیکھ کہ کس طرح بتدریج اس کے حسن وجمال کو زوال آیا''۔

کودکے از حُسن شد ملائے خلق بعدِ فرد اشد عَرِف رسوائے خلق

''ایک نوعمر لڑکا اپنے حسن وجمال کی وجہ سے مخلوق کا سردار بن جاتا ہے، اور بڑھاپے میں قابل نفرت ہوجاتا ہے''۔

گرتنِ سیمیں براں کردت شکار بعد پیری بیں تنے چوں پنبہ زار

''اگر کسی سیمین بدن کے حسن وجمال نے تیرا شکار کرلیا ہے تو بڑھاپے میں اس کا بدن دیکھ

کہ سفید داڑھی، سفید مونچھوں اور سفید بالوں سے روئی کے کھیت کے مشابہ ہوگیا ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک انسان کے حسن و جمال کا اختلال اور اُس کا زوال اس امر کی دلیل ہے کہ وہ معبود بنانے کے قابل نہیں اسی طرح آفتاب اور ماہتاب کے حسن و جمال کا اختلال اور اس کا زوال اس امر کی دلیل ہے کہ شمس وقمر معبود نہیں ہو سکتے۔[۱]

''فَطَرَ'' کی تحقیق:

''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ'' بے شک میں نے اپنا چہرہ متوجہ کرلیا اُس ذات کی طرف جس نے آسمانوں اور زمین کو بغیر نمونے کے پیدا کیا۔ ''فطور'' کا معنی ہے بغیر مثال اور نمونے کے کسی شئی کو پیدا کرنا، پہلے نہ تو آسمان کا کوئی نمونہ تھا اور نہ زمین کا، نمونہ سامنے رکھ کر بنانا آسان ہوتا ہے۔

اللہ کی صفت ہے خالق اور فاطر، خلق کا معنی عدم سے وجود میں لانا، جیسے انسان نہیں تھے پیدا کردیے، جانور نہیں تھے پیدا کردیے، پرندے نہیں تھے اُن کو پیدا کردیا اور بغیر نمونے کے پیدا کرنا، جس کی پہلے نہ کوئی نظیر ہو نہ کوئی خاکہ ہو، اس کو فاطر کہتے ہیں۔ یہ دونوں اللہ ربُّ العزت کی صفات ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں نے اپنا رخ ساری مخلوق سے ہٹا کر ایک اللہ کی طرف کردیا، جو زمین وآسمان کا خالق ہے۔ اے اللہ! میری دوڑ اس مخلوق کی طرف نہیں ہے میں تو تیری ذات کو راضی کرنے کے لئے، دنیا میں تیرا پیغام پہنچانے کے لئے، انسانیت کو تیرے سامنے جھکانے کے لئے اور تیرا تعارف کرانے کے لئے دنیا میں آیا ہوں، مجھے اِن محتاجوں کی ضرورت نہیں ہے، اے ربّ! مجھے تیری ضرورت ہے، میں تیرے بغیر چل نہیں سکتا، تو ہی میرا سہارا ہے، میرے اور مخلوق کے کام براہِ راست بنا، یا مخلوق کے واسطے سے بنا میری دوڑ تیری طرف ہے۔

''حَنِیْفًا'' کی تفسیر:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''حَنِیْفًا'' میں ایک طرف ہونے والا ہوں''۔ یعنی میں نے اپنا

---

[۱] مثنوی مولانا رومؒ

چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو بغیر نمونے کے پیدا فرمایا، میں ایک طرف ہونے والا ہوں، سب سے کٹ کر ایک اللہ کی طرف رخ کرنے والا ہوں، میں نہ تو بتوں کا پجاری ہوں نہ ستاروں اور چاند سورج کا۔ اے میری برادری! سن لو:

وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔[۱] ''اور نہیں ہوں میں شرک کرنے والوں میں سے''۔

یہ کیسا ربّ ہے جس کی مخلوق اس سے زیادہ خوبصورت ہے؟

مولانا عبدالحق حقانی دہلویؒ اپنی تفسیر کے خلاصہ میں لکھتے ہیں کہ ایک معتبر تفسیر میں لکھا ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام شہر میں تشریف لائے تو نمرود کی ملاقات کے لئے آپ کے گھر والے اُس ناپاک ظالم کے دربار میں لے گئے، نمرود ایک بہت بڑا کریہہ المنظر شخص تھا، آپ علیہ السلام نے اس کے دربار میں جا کر دیکھا کہ تخت پر ایک نہایت بدصورت شخص بیٹھا ہے اور بہت سی حسین وخوبصورت لونڈیاں اُس کے تخت کے آگے صف بستہ کھڑی ہیں، اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے یہ کون شخص ہے جس کی ملاقات کے لئے مجھے لائی ہو؟ ماں بولی ابراہیم! یہ سب کا خدا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اچھا یہ تخت کے اردگرد جو صف باندھے کھڑے ہیں کون لوگ ہیں؟ کہا اس کی مخلوق ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے اے ماں! تعجب کی بات ہے کہ تمہارے اس خدا نے اپنی صورت تو ایسی بھونڈی اور کریہہ بنائی اور اپنی مخلوق کو اپنے سے اچھا اور خوبصورت پیدا کیا، چاہیے تو یہ تھا کہ وہ خود مخلوق سے بہتر اور خوبصورت ہوتا۔[۲]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مکالمہ:

جوانی کے زمانے میں ایک یہ واقعہ پیش آیا کہ غلہ نمرود کے دربار سے دیا جاتا تھا، لوگ وفد در وفد غلہ لینے کے لئے آرہے تھے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام بھی اس کے پاس چلے گئے۔

اِنَّ النَّمْرُوْدَ كَانَ عِنْدَهٗ طَعَامٌ وَكَانَ النَّاسُ يَفِدُوْنَ اِلَيْهِ لِلْمِيْرَةِ فَوَفَدَ

---

[۱] سورۃ الانعام: ۷۴ تا ۷۹

[۲] مقتبس من معارف القرآن حضرت مفتی شفیع عثمانیؒ

اِبْرَاهِيْمُ فِيْ جُمْلَةِ مَنْ وَفَدَ لِلْمِيْرَةِ فَكَانَ بَيْنَهُمَا هٰذِهِ الْمُنَاظَرَةُ۔[۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام وہاں پہنچے، اسے پہلے ہی پتہ تھا کہ یہ بتوں کے خلاف ہے، بتوں کے سامنے سجدہ کرنے اور انہیں الٰہ ماننے سے انکاری ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسے اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کی دعوت دی، کہ میرا رب وہ ہے جو متصرفِ حقیقی ہے اور مدبرِ حقیقی ہے، مارتا بھی ہے، جلاتا بھی ہے۔ وہ کہنے لگا یہ کونسا مشکل ہے، یہ دونوں کام تو میں بھی کرتا ہوں، میں بھی مارتا اور جلاتا ہوں۔

اُتِيَ بِالرَّجُلَيْنِ قَدْ تَحَتَّمَ قَتْلُهُمَا فَإِذَا أَمَرَ بِقَتْلِ أَحَدِهِمَا وَعَفَا عَنِ الْآخَرِ فَكَأَنَّهُ قَدْ أَحْيَا هٰذَا وَأَمَاتَ الْآخَرَ[۲]

''دو قیدی تھے جن کے بارے میں قتل کا فیصلہ ہو چکا تھا، ان میں ایک کو چھوڑ دیا کہ دیکھو میں نے زندہ کر دیا اور ایک کو مار ڈالا کہ دیکھو میں ہی مارتا ہوں''۔

نمرود نے یہ سمجھ لیا کہ اس نے بھی ایک کو زندہ کر دیا اور ایک کو مار دیا حالانکہ مارنے کے معنی روح نکالنے کے ہیں اور زندہ کرنے کے معنی روح ڈالنے کے ہیں۔ اس کے پاس تو روح ہے ہی نہیں تو نکالے گا کیا اور ڈالے گا کیا؟

انبیاء کرام علیہم السلام ایسی بات لاتے ہیں کہ ظاہری سطح کا آدمی بھی اُن دلائل کو سمجھ لے، بڑے عمیق مضامین بیان نہیں کرتے، اگرچہ ان کے پاس بے شمار باریکیاں ہوتی ہیں۔ ایک سادے انداز سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے رخ کو بدلا، فرمایا ایسی چیز بیان کروں کہ جس سے عاجز آجائے، چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تیری پیدائش سے پہلے بھی نکال رہا تھا اب بھی نکالتا ہے۔ اگر تو الٰہ ہے تو پھر مغرب سے نکال دے۔ حیران رہ گیا، ہکا بکا رہ گیا کافر جواب نہ دے سکا، ساکت ہو گیا۔

یہاں مفسرین نے بڑی عجیب بات لکھی ہے:

قَدْ أَجَابُوْا عَنْ عَدَمِ قَوْلِ اللَّعِيْنِ ذٰلِكَ بِأَنَّ الْمُحَاجَّةَ كَانَتْ بَعْدَ خَلَاصِهِ

---

[۱] البدایۃ، مناظرۃ ابراہیم والنمرود، ج۱، ص۱۰۰، ط: عمریہ، کوئٹہ

[۲] البدایۃ، مناظرۃ ابراہیم والنمرود، ج۱، ص۲۱۹، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

مِنَ النَّارِ فَعَلِمَ اَنَّ مَنْ قَدَرَ عَلٰی ذٰلِکَ قَدَرَ عَلَی الْاِتْیَانِ بِالشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا فَسَکَتَ[۱]

اگر جھوٹ موٹ سے وہ یہ کہہ دیتا کہ اے ابراہیم! میں سورج مشرق سے نکالتا ہوں، اپنے رب سے کہو وہ مغرب سے نکالے۔ یہ اس نے کیوں نہیں کہا، اس وجہ سے کہ وہ سمجھتا تھا کہ ابراہیم اللہ کا سچا نبی ہے، میں الوہیت میں جھوٹا ہوں اور اس کا رب سب کچھ کرسکتا ہے۔ اِسے کہنے کی دیر ہے یہ اللہ سے دعا کرے گا سورج مغرب سے طلوع ہوجائے گا۔ ساری رعایا میرے ہاتھ سے نکل جائے گی، لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اسلئے حیران رہ گیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ کہنے لگا میں آپ کو غلہ نہیں دیتا، یہاں سے چلے جاؤ۔

ریت کے تھیلوں کا غلے میں تبدیل ہونا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام خالی ہاتھ گھر آرہے تھے، گھر والوں کو وقتی پریشانی سے بچانے کے لیے دو تھیلے ریت کے بھر لیے، دور سے دیکھیں گے سکون ہوجائے گا، بعد میں سمجھا دیا جائے گا۔ ریت کے بورے گھر میں رکھ دیے، تھکے ہوئے تھے، ٹیک لگائی، نیند آگئی۔

حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو خیال آیا کہ یہ غلہ لائے ہیں میں آٹا پیس کر روٹی پکاؤں اور انہیں کھانا کھلاؤں۔ اٹھی تھیلے کھولے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کمالِ قدرت کے ساتھ بہترین غلہ بنا دیا۔ اللہ قادر ہیں گندم کے دانوں کو کہہ دیں ریت بن جاؤ، وہ ریت بن جائیں گے اور ریت کو کہیں گندم بن جا تو وہ اللہ کی قدرت سے گندم بن جائے گی۔ معجزے کے معنی یہی ہیں کہ جو انسانی عقل میں نہ آئے اللہ جو چاہے کرے۔

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا سبق آموز واقعہ:

تبع تابعین کے زمانے میں ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، بڑے زاہد اور اللہ والے تھے۔ کراماتِ اولیاء بھی برحق ہیں اور معجزاتِ انبیاء کرام علیہم السلام بھی برحق ہیں۔ معجزہ اللہ کا فعل ہے، اسی طرح کرامت، اللہ کا فعل ہے، اللہ کیلئے کرنا کیا مشکل ہے؟ مشکل تو تب ہی ہو جب انسان کرے۔

ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا مانگی اے اللہ! مجھے قدرت دیدے، جب چاہوں کھانا کھاؤں، جب

---

[۱] روح المعانی: الجزء الثالث، ص ۱۸

چاہوں نہ کھاؤں۔ بعض دفعہ پندرہ پندرہ دن ایسے رہ جاتے، اللہ تعالیٰ ان کی بھوک دور کردیتے اور جب چاہتے کھالیتے۔ انہوں نے دعا مانگی اے اللہ! تو نے اپنے خلیل ابراہیم کے لئے ریت کو گندم بنایا، میرے لئے بھی بنادے۔ کچھ ریت تھی اللہ نے اس کو گندم بنادیا۔ اس نے اپنی زمین میں بُو دیا۔ اللہ نے ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ایسے گندم پیدا کی کہ نیچے سے خوشے نکلنے شروع ہوئے اوپر تک۔

بہرحال حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے بورے کھولے تو شاندار قسم کا غلہ تھا، اسے پیسا اور پکایا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اٹھے، پیش کیا۔ پوچھا یہ کہاں سے آیا۔ کہا جو غلہ آپ لائے تھے۔ فرمایا اللہ نے ہمیں غیبی رزق دیا ہے۔

چند اہم گزارشات:

میرے محترم بھائیو! صدیاں ہوگئیں، زمانے گزر گئے، تاریخ قدیم کی جبیں پر امتدادِ زمانہ کی شکنیں ابھر آئیں، اس کے بے شمار ابواب وقت کی گرد کے نیچے دب گئے، واقعات ایک ایک کر کے دماغوں سے محو ہوتے چلے گئے، لیکن سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واقعات ہائے عبرت، دعوتِ توحید اور بُت پرستی وکواکب پرستی کی تردید ابتدا سے لے کر آج تک اپنی آب وتاب کے ساتھ برقرار ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام دن رات ربُّ العالمین کے شیدائی تھے، اللہ کی محبت اُن کے روئیں روئیں میں سمائی ہوئی تھی، جہاں جاتے، جہاں بیٹھتے، چھوٹے ہیں یا بڑے گھر کے افراد ہیں یا دوسرے، سب کو آداب کے ساتھ اللہ کی طرف بلا رہے ہیں۔ کہیں نرمی سے دعوت دی اور کہیں سختی سے قوم کو سمجھایا، جب بتوں کی بات کی تو سختی سے سمجھایا اس لئے کہ ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے معبود نہیں بن سکتے، کواکب اور ستاروں کا سمجھنا ذرا مشکل تھا اس لئے وہاں نرمی کا اسلوب اختیار کیا، بڑی حکمت اور بصیرت کے ساتھ قوم کو سمجھایا۔

میرے بھائیو! اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، اللہ نے یہ ذمہ داری ہمیں سونپی ہے کہ ہم جہاں بھی رہیں، نرمی سے حق کی بات کرتے رہیں، تاکہ ہمارا مسلمان بھائی توبہ پر آجائے اور ناجائز زندگی چھوڑ دے۔ جتنے گناہ چھوٹیں گے پریشانیاں کم ہوں گی۔ ہر محلہ پریشانیوں سے بھرا ہوا ہے، ہر جگہ آگ جل

رہی ہے۔اس کا ایک ہی راستہ ہے اللہ کو راضی کرنا، ربُ العالمین کو خوش کرنا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اور ساری اُمتِ مسلمہ کی پریشانیاں دور کرے، ہمیں کامل تائب بنائے، زندگی کے ہر شعبے میں اپنے حبیب محمد ﷺ کا دامن پکڑنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ''(الانبیاء:۶۹)

آتشِ نمرود اور استقلالِ ابراہیم علیہ السلام

سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اللہ جل جلالہٗ پر کمالِ توکل واعتماد اور ربّ ذوالجلال کی نصرتِ عظیمہ وکمالِ قدرت کا ظہور

آتشِ نمرود اور استقلالِ ابراہیم علیہ السلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ. اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ. قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ. قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ. قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ. قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۔[1]

میرے محترم بھائیو، دوستو! حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات اور ان کی زندگی کا ہر پہلو ہماری بے شمار مسائل میں رہبری اور راہنمائی کرتا ہے۔ کیسے ان حضرات کے ساتھ اللہ کی مدد ونصرت تھی؟ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے ان کے مقابلے میں غلط منصوبے بنانے والوں اور غلط تدبیریں کرنے والوں کو کیسے خاسرونا کام کیا؟ اور انجام کے اعتبار سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی سچی تدبیریں کیسے کامیاب ہوئیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے انتہائی جلیل القدر اور مقرب نبی تھے، آپ کو خلیل اللہ کا لقب عطا ہوا، تمام مذاہب میں انکو یکساں طور پر عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وجاہت، شخصیت، ہدایت اور امامت کا عرب کے بیشتر گروہوں کو اعتراف تھا، یہودی، عیسائی اور بت پرست سب ہی اپنے مذہب کو ابراہیمی مذہب کہتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظمتِ شان کے پیش نظر جو دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان انکو حاصل ہے قرآن کریم نے انکے واقعات کو مختلف اسلوب میں کسی جگہ اختصار اور کسی جگہ تفصیل کے ساتھ موقع کی مناسبت سے متعدد جگہ بیان فرمایا ہے۔

---

[1] سورۃ الانبیاء: ۵۱ تا ۵۶

رشد وہدایت میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خاص مرتبہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کلام میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۔[۱]

''ہم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ان کی شان کے لائق رشد وہدایت سے نوازا تھا''۔

یعنی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کن کن صلاحیتوں اور قابلیتوں کے مالک ہیں، اور کیا کیا مکارم ومحاسن ان کے وجودِ باجود کے اندر مخفی ومستور ہیں، اور وہ ہماری کن کن عنایتوں اور نوازشوں کے اہل اور مستحق ہیں، کیونکہ خالق سے مخلوق کی کوئی بھی حالت وکیفیت مخفی ومستور نہیں رہ سکتی۔ ہدایت ومعرفت کے درجات ومراتب مختلف ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو بھی اس میں سے کوئی حصہ عطا فرماتا ہے وہ اس کی صلاحیتوں کو جانچ کر اس کے درجہ ومرتبہ کے مطابق عطا فرماتا ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا اپنی مشرک قوم سے خطاب:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے غیرتِ ایمانی سے بھرپور خطاب میں اپنی مشرک قوم سے فرمایا:

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ[۲]

یہ بے جان مورتیاں کیا چیز ہیں جن کی پوجا میں تم لگے ہوئے ہو؟

یعنی عقل وفکر کی دولت رکھتے ہوئے بھی ان بے جان اور بے حس وحرکت خود ساختہ مورتیوں کے آگے جھکنا کس قدر حماقت اور کتنی بڑی جہالت ہے؟ تمہاری یہ خود ساختہ مورتیاں اور من گھڑت و بے جان بُت جن کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ حیثیت، یہ نہ کسی نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے، نہ ان میں کوئی احساس ہے نہ شعور تو پھر تمہاری مت آخر کہاں اور کیوں ماردی گئی کہ تم لوگ ان کے آگے جھکتے اور ان سے چپکے بیٹھے ہو، اور ان کی پوجا پاٹ کر کے اپنے لئے دارین کی ہلاکت وتباہی کا سامان کرتے ہو، ''وَالْعِيَاذُ بِاللّٰهِ''۔

---

[۱] الانبیاء: ۵۱

[۲] الانبیاء: ۵۲

قوم کا جواب:

''قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ''[۱] سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے کہا ہم سب کچھ محض باپ دادا کی اندھی تقلید میں کرتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے کرتے پایا تو ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں، اس کے سوا ہمارے پاس کوئی دلیل ہے اور نہ حجت و برہان۔ میرے بھائیو! باپ دادا کی اندھی تقلید کا یہی مرض اُن کے لئے ہلاکت اور محرومی کا باعث بنا، کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ڈنکے کی چوٹ پر صاف اعلان فرمادیا:

''قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ''[۲] یقیناً تم بھی اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے، تم بھی اِن من گھڑت اور خود ساختہ مورتیوں کی پوجا پاٹ پر چپکے بیٹھے ہو۔ مشرک قوم بوکھلا اُٹھی اور حیرت زدہ ہوکر پوچھنے لگے اے ابراہیم! ''اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ''[۳] تم سچ مچ اور سنجیدگی سے یہ بات کہتے ہو یا یونہی دل لگی کر رہے ہو؟ کیونکہ باطل معبودوں کی تردید ان کے لیے بڑی عجیب تھی، اس کو ماننے اور تسلیم کرنے میں ان کو سخت اچنبھا ہو رہا تھا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ[۴] تم سب کا ربّ وہی ہے جو کہ آسمانوں اور زمین کا ربّ ہے، جو معبودِ حقیقی ہے اور ہر قسم کی عبادت کا حق دار ہے۔ میں تم سے کوئی مذاق نہیں کر رہا بلکہ سراسر حق اور صدق بیان کرتا ہوں کہ معبودِ برحق صرف ایک اور صرف ایک ہے، تمہارا رب وہی ہے جس نے تم سب کو وجود بخشا، اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے اِس عظیم الشان کائنات کو پیدا فرمایا، جب ان سب چیزوں کی تخلیق میں کوئی اس کا شریک نہیں تو پھر اس وحدہ لاشریک کی عبادت و بندگی میں کوئی اس کا سہیم و شریک کیسے اور کیونکر ہوسکتا ہے۔

---

[۱] الانبیاء: ۵۳

[۲] الانبیاء: ۵۴

[۳] الانبیاء: ۵۵

[۴] الانبیاء: ۵۶

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دونوں محاذوں پر محنت کی:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دونوں محاذوں پر کام کیا۔ کوکب (ستارہ) پرستی کے خلاف بھی اور بُت پرستی کے خلاف بھی۔ بعض ستاروں کی پوجا کر رہے ہیں اور بعض بتوں کی پوجا کر رہے ہیں، جب ایک رَو چل رہی ہوتی ہے تو بڑے بڑے دانا بھی اس رو میں بہہ جاتے ہیں۔ یہی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لانے سے پہلے بُت پرستی میں تھے۔ یہ تو اسلام وایمان آیا، ان کو نکھار دیا، صفائی آ گئی، گدلا پن سارا ختم ہو گیا۔ اس لئے نوجوان توحید کو جلدی قبول کرتے تھے، کیونکہ ان پر اوہام پرستی، کوکب پرستی اور بت پرستی نے پکے دھبے نہیں لگائے تھے، اسلئے توحید جلدی سمجھ آجاتی تھی۔ بوڑھا آدمی اپنے کام پر جما ہوتا ہے، وہ جتنا بھی غلط ہو، وہ سمجھتا ہے دنیا میں جتنا میں صحیح ہوں اُتنا کوئی نہیں۔ اسلئے نوجوان جا کر رات کے وقت ان کے بتوں کو اُلٹا کر دیتے تھے، اگلے دن وہ آتے ان کو سیدھا کرتے۔ کبھی کبھی ان بتوں کو اُٹھا کر کوڑا کرکٹ پر ڈال دیتے تھے، اگلے دن وہ آتے اُن کو اٹھا کر نہلاتے، صاف کرتے۔ پھر بھی ان کو سمجھ نہ آئی تو مرے ہوئے جانور اور مرے ہوئے کتے ان کے ساتھ باندھتے، شاید ان کے ذہن میں کوئی بات آجائے۔

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں تین دن اپنا بُت صاف گُرتا رہا۔ ایک دن اُلٹا ہوا پڑا ہے، ایک دن کوڑا کرکٹ پر پڑا ہے، ایک دن کُتا اُس کے ساتھ بندھا پڑا ہے۔ میں نے اسے نہلا کر صاف کیا اور کہا میرے محبوب تیرے ساتھ یہ کس نے کیا ہے۔ یہ بعد میں صحابی بن رہے ہیں۔ جب یہ لوگ ایمان لائے تو بڑے حیران ہوتے تھے کہ کیسے بتوں کو خود بنا کر ان کی پوجا کرتے رہے۔

تو میرے بھائیو! جب رو غلط چلے گی تو سب اس میں بہیں گے۔ یہ تو صرف نبی ہوتا ہے کہ ساری دنیا اندھیرے میں چل رہی ہے، لیکن نبی پر کوئی اثر نہیں۔ کیونکہ نبی کے اوپر براہِ راست توحیدِ الٰہی کے انوارات کی بارش ہو رہی ہے، وہ اللہ کے پہرے میں ہے، اس کے قلب میں اللہ کی عظمت، اس کی خشیت، اللہ کا جلال، اللہ کا دبدبہ اور اس کی جبروت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ مخلوق میں کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے قوم کو یہی سمجھایا کہ تم خود ان کو اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو، پھر ان کی پرستش

کیسے کرتے ہو؟ قوم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیونکہ بُت پرستی کا بھی زور تھا اور بُت فروشی کا بھی زور تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ابا جان مذہبی امور کے وزیر تھے۔ بتوں کو بنانا، بتوں کو بیچنا، ان کا خیال رکھنا، کہاں کہاں کس بُت کدے میں بُت کم ہو گئے، کتنے پڑے ہیں کتنے نہیں، سب کی نگہداشت ان کے ذمے تھی۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا بت کدے میں جا کر بتوں کو توڑنا:

ایک مرتبہ قومِ نمرود میلے پر جانے لگی، سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کہا آپ بھی چلیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ میری زبانی تو کوئی بات نہیں مانتے، کچھ عملی طور پر کرنا چاہیے، اس لیے ان سے کہا میری طبیعت ٹھیک نہیں، آپ چلے جائیں۔

''فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ''[۱]

''جب قوم میلے پر چلی گئی تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کلہاڑا لیا اور بت کدے میں پہنچ گئے۔ سارے بتوں کے ٹکڑے کرتے گئے، آخر میں جو بڑا بت تھا کلہاڑا اسی پر لٹکا دیا کہ شاید ان کو کچھ سمجھ آجائے''۔

وہ آئے انہوں نے دیکھا کہ ہمارے بتوں کا برا حال ہے، ہمارے کارساز اُلٹے ہوئے پڑے ہیں، ہمارے کارسازوں کے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں، ہمارے آقاؤں کے ساتھ کس نے بدتمیزی کی ہے۔ پھر کہنے لگے ایک نوجوان ہے ابراہیم، وہ ان کی برائی بیان کرتے رہتے ہیں یہ کام بھی اسی کا ہوگا۔ چنانچہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا یہ کام آپ نے کیا ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا[۲] یہ بڑا بت کھڑا ہے اسی سے پوچھو؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس موقع پر جواب کی جو صورت اختیار کی اُسے توریہ کہتے ہیں۔

ایہام اور توریہ:

ایہام اور توریہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بات کرنے میں متکلم کی مراد کچھ ہو، مخاطب کچھ سمجھے۔ ظاہری

---

[۱] الانبیاء: ۵۸

[۲] الانبیاء: ۶۳

مفہوم اور ہو، باطنی مطلب اور ہو۔ اس کو توریہ بھی کہتے ہیں، ایہام بھی کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا میلے پر چلو فرمایا: اِنِّیْ سَقِیْمٌ[۱] میں بیمار ہوں۔ سقیم ہلکے بیمار کو کہتے ہیں، تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے میری طبیعت ناساز ہے، ہر وقت بتوں کے سامنے جھک رہے ہو۔ یہاں بھی توریہ استعمال کیا، جیسے ہم کہتے ہیں کہ زمین نے گھاس اگایا، زمین تو گھاس نہیں اگاتی، گھاس تو اللہ اگاتے ہیں۔ پانی نے پیاس بجھادی، یہ مجازی نسبت ہے، اسنادِ مجازی چلتا رہتا ہے۔ سبب کی طرف نسبت کر دیتے ہیں، یہی بڑا بت کھڑا ہے اسی نے مجھے غصے میں ڈالا ہے، اسی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے، تو اسنادِ مجازی سے کام لیا۔

قوم نے کہا اے ابراہیم! ''لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ یَنْطِقُوْنَ''[۲] آپ کو تو پتہ ہے کہ یہ نہ بولتے ہیں اور نہ ہی کوئی حرکت کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

''اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَنْفَعُكُمْ شَیْئًا وَّلَا یَضُرُّكُمْ. اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ''[۳]

فرمایا کیا تم اندھے ہو؟ یہ نہ کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں، کتا پیشاب کر جائے ہٹا نہیں سکتے، اپنی مرضی سے چڑھاوے چڑھاتے ہو، پھر اتارتے ہو، یہ نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ کچھ کر سکتے ہیں، پھر بھی تم ان کے سامنے جھکتے ہو؟ کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟

اللہ کا شکر کرو کہ اس نے مسلمانوں کے گھر پیدا کیا:

میرے بھائیو! اللہ کا کرم ہوا کہ ہم مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے۔ میں سرگودھا گیا وہاں ایک ہندو تھا، ماں باپ دونوں ہندو تھے، سلطان باہو کی دربار پر وہ رہتا رہا، اس کا بیٹا مسلمان ہو گیا۔ پھر مسلمانوں میں رہا، مسلمانوں میں شادی کی، عالمِ دین بنا۔ اس نے وہاں ایک مدرسہ بھی بنایا ہوا ہے، لیکن ماں باپ دونوں ہندو، چچا نے ایم اے عربی کیا ہوا ہے، وہ بھی ہندو ہے۔

---

[۱] الصافات: ۸۹

[۲] الانبیاء: ۶۵

[۳] الانبیاء: ۶۶۔۶۷

توجہ طلب بات:

میرے بھائیو! جب تک اللہ تعالیٰ عقل صاف نہ کرے، کچھ نہیں ہوسکتا۔ ایک مرتبہ نوے سالہ بڑھیا سے توحید کی بات ہورہی تھی، وہ برداشت نہیں کررہی، اس کا منہ بن رہا ہے، ساتھیوں نے کہا وہ کہتی ہے میں سننا نہیں چاہتی۔ دو خدا تھے ایک رام تھا، ایک رحیم تھا، دونوں آپس میں بھائی تھے، تم رحیم کو مانتے ہو، ہم رام کو مانتے ہیں۔ اب وہ سچی بات سننے کو تیار نہیں، عقل سلیم نہیں ہے تو آدمی نہیں سمجھ سکتا۔

ہم ایک مرتبہ سری لنکا گئے، ائیر پورٹ میں داخل ہوں تو بڑی ایک دیوی کی شکل بنی ہوئی ہے، سارے پہلے اس کو سلامی دیتے ہیں۔ وہاں سپریم کورٹ کے ساتھ ہی بت کدہ ہے، ججز اور وکلا آکر صبح اس کو کھولتے ہیں، چڑھاوے چڑھاتے ہیں، پھر مختلف قسم کی چیزیں ڈالتے ہیں۔ وہ ہٹ جاتے ہیں تو اندر خنزیر اور کتے بہت ہیں وہ آکر کھا جاتے ہیں۔

میرے بھائیو! ہم اللہ کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں ابراہیمی لائن پر اور محمدی لائن پر پیدا کیا، ورنہ نہ جانے ہم کسی بت کدے میں ہوتے۔ دعا کریں اللہ ہمیں ابراہیمی لائن پر چلائے اور موت تک اسی پر جمائے رکھے۔ (آمین)

دنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر نمرود اور اس کی قوم کا حسد اور غیض وغضب:

ظالم ومشرکِ اعظم، دُنیا کے سب سے بڑے ڈکٹیٹر، جابر نمرود اور اس کی قوم حسد اور غیض وغضب کی آگ میں جل کر کمال دُشمنی پر اُتر آئے اور یہ کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کی بیخ کنی کرو، ان کو سرے سے ختم ہی کردو، ان کو آگ میں ڈالو تاکہ یہ جل بھُن جائے، ختم ہوجائے، یہ جو پاکیزہ توحید کی صدائیں لگا رہا ہے، ہمارے لئے یہ آواز غیر مانوس ہے۔ گویا کہ نعوذ باللہ وہ اپنے ظلمت کدے اور اندھیروں سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ گھٹاٹوپ، مُہیب قسم کے شرک کے اندر وہ غوطے لگا رہے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو زندہ جلانے کا فیصلہ:

نمرود نے جب سارے جتن کر لئے تو اُسے مشیروں نے مشورہ دیا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کیلئے کوئی سخت

سزا تجویز کرو۔ حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ [۱] انہیں جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ یہ دعوتِ توحید سے باز آنے والا نہیں ہے، دن رات اپنی قوم کو توحید کی طرف بلاتا ہے اور ہمارے معبودوں کو لچر کہتا ہے اور انکی عبادت کو بے کار بتاتا ہے۔ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ [۲] کہنے لگے اس کیلئے بڑا اچھا تیار کرو، بہت بڑی زمین کو گھیرے میں لو اور اسمیں آگ جلاؤ۔ اب ایک آدمی کو جلانے کیلئے دو چار آدمی کافی ہیں، لیکن غصہ انتہا کو پہنچا ہوا تھا بابل جو اس وقت روئے زمین کا سب سے بڑا شہر تھا، اس ظالم نے اس کے باہر چار دیواری بنوائی تھی، ہزاروں لوگ اس میں رہتے تھے، رات کے وقت دروازے بند کر دیتے تھے، اس نے مصنوعی قسم کے درخت اور پرندے بنائے ہوئے تھے جو یہ کہتے تھے کہ نمرود ہمارا ربّ ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر عزیزی میں نمرود کے عجیب وغریب واقعات بیان کئے ہیں۔

بابل شہر کے باشندوں کا خلیل اللہ کو جلانے کیلئے ایندھن اکٹھا کرنا:

سارا شہر بابل غصے میں بھرا ہوا، غلط پروپیگنڈا کیا گیا، سب کو اکسایا گیا کہ پورا شہر مل کر اس کو جلائے۔ اب ہزاروں آدمی ایندھن اکٹھا کر رہے ہیں، روایات میں آتا ہے کہ:

اَنَّ الْمَرْاَةَ مِنْهُمْ كَانَتْ اِذَا مَرِضَتْ تَنْذُرُ لَئِنْ عُوْفِيَتْ لَتَحْمِلَنَّ حَطَبًا لِحَرِيْقِ اِبْرَاهِيْمَ [۳]

''جب کوئی عورت بیمار ہوتی تو وہ یہ کہتی تھی کہ مجھے شفا مل گئی تو میں بھی ابراہیم کو جلانے کے لئے ایندھن ڈالوں گی''۔

ابن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: كَانُوْا يَجْتَمِعُوْنَ الْحَطَبَ شَهْرًا وہ بدبخت ایک ماہ تک ایندھن جمع کرتے رہے۔ جب ایندھن کثیر مقدار میں جمع ہو گیا تو اَشْعَلُوا النَّارَ فِيْ كُلِّ نَاحِيَةٍ بِالْحَطَبِ ہر طرف سے لکڑیوں کو جلانا شروع کیا اور آگ بھڑکنے لگی، اِنْ

---

[۱] الانبیاء: ۶۸

[۲] الصّٰفّٰت: ۹۷

[۳] البدایۃ: ج ۱، ص ۹۸۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۴، ص ۳۷۲

كَانَ الطَّيْرُ لَيَمُرُّ بِهَا فَيَحْتَرِقُ مِنْ شِدَّةِ وَهَجِهَا وَحَرِّهَا آگ کے شعلے اس قدر بھڑک رہے تھے کہ اگر کوئی پرندہ بھی اڑتا ہوا اوپر سے گزرتا تو جل جاتا تھا۔ آگ کے اتنے شعلے بڑھکے کہ اتنے آج تک نہ دیکھے گئے۔ ثُمَّ عَمَدُوْا اِلٰى جَوْبَةٍ عَظِيْمَةٍ ''ایک گہرائی والی جگہ ایندھن جمع کیا گیا۔''[۱]

منجنیق کے ذریعے خلیل اللہ کو آگ میں ڈالنے کا منصوبہ:

ثُمَّ عَمَدُوْا اِلٰى اِبْرٰهِيْمَ عليه السلام فَرَفَعُوْهُ عَلٰى رَأْسِ الْبُنْيَانِ وَقَيَّدُوْهُ

پھر ان کے ناپاک عزائم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے، آپ علیہ السلام کو بلند عمارت پر لے گئے اور رسیوں سے جکڑ دیا لیکن آگ کے شعلے اس قدر بلند اور تیز تھے کہ وہ آپ علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے آگ میں ڈالنے سے عاجز ہو گئے۔

ثُمَّ اتَّخَذُوْا مِنْجَنِيْقًا بِاِشَارَةِ اِبْلِيْسَ لَعَنَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى، حَيْثُ لَمْ يَتَمَكَّنُوْا مِنْ اِلْقَائِهٖ فِي النَّارِ مِنْ شِدَّةِ حَرِّهَا فَاتَّخَذُوا الْمِنْجَنِيْقَ، وَوَضَعُوْهُ فِيْهِ مُقَيَّدًا مَغْلُوْلًا ابلیس لعین نے مشورہ دیا کہ منجنیق تیار کرو اور اس میں ابراہیم علیہ السلام کو رکھ کر آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ ان ظالموں نے ایسا ہی کیا۔ یہ بنانے والا ایک کُردی شخص تھا، ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے اس کا نام ھیزن بتایا ہے۔ بعض اہلِ تاریخ نے اور نام بھی ذکر کئے ہیں۔ جب وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو باندھ رہے تھے تو آپ علیہ السلام یہ کلمات پڑھ رہے تھے: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الْمُلْكُ لَا شَرِيْكَ لَكَ''[۲]

دس بارہ آدمی مل کر منجنیق کو گھماتے تھے اور پتھر کو ایک یا دو کلومیٹر دور پھینکتے تھے۔ سب سے پہلے منجنیق اُس کُردی نے بنائی، فَخَسَفَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهِ الْاَرْضَ وَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِيْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ بعد میں وہ زمین میں دھنسا، قیامت تک وہ زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔[۳]

---

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۸

[۲] عرائس المجالس، ص: ۷۹

[۳] تفسیر ابن کثیر: ج ۴، ص ۷۲ ۳۔ البدایۃ: ج ۱، ص ۲۱۶، رشیدیہ، کوئٹہ

سیدنا ابراہیمؑ کو آگ میں گرتا دیکھ کر زمین وآسمان کی مخلوقات میں کہرام:

فَضَجَّتِ السَّمَاوَاتُ وَالْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَمَنْ فِيهَا مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَجَمِيعِ الْخَلْقِ اِلَّا الثَّقَلَيْنِ ضَجَّةً وَّاحِدَةً جب ان ظالموں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو زمین، آسمان، پہاڑ، ملائکہ اور جن وانس کے علاوہ تمام مخلوقات کی چیخیں نکل گئیں اور کہنے لگے: اَیْ رَبَّنَا اِبْرَاهِيمُ لَيْسَ فِي اَرْضِكَ اَحَدٌ يَعْبُدُكَ غَيْرَهٗ يُحْرَقُ فِي النَّارِ اے ہمارے پروردگار! ابراہیم علیہ السلام کے علاوہ اس روئے زمین پر آپ کی عبادت کرنے والا کون ہے؟ اس ایک ہستی کو بھی آگ میں جلایا جارہا ہے۔ اے پروردگار! آپ ہمیں اجازت دیں ہم ان کی مدد کیلئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر وہ تمہیں مدد کیلئے پکارتے ہیں اور تم سے مدد لینا چاہتے ہیں تو جاؤ ان کی مدد کرو، میری طرف سے تمہیں اجازت ہے اور اگر ابراہیم علیہ السلام نے میرے علاوہ کسی سے مدد نہ لی اور میں جانتا ہوں کہ وہ کسی سے مدد نہیں مانگیں گے تو پھر اس کا معاملہ میرے حوالے کردو، میں ہی اسے کافی ہوں۔[1]

آگ میں ڈالتے وقت فرشتوں کی آمد:

جب انہوں نے آگ میں ڈالنے کا ارادہ کیا تو اَتَاهُ مَلَكُ الْمِيَاهِ پانی کا فرشتہ آیا اور کہنے لگا: اے ابراہیم! اِنْ اَرَدْتَ اَخْمَدْتُّ النَّارَ كَانَ خَزَائِنُ الْمِيَاهِ وَالْاَمْطَارِ بِيَدِيْ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس آگ کو بجھادوں گا اس لئے کہ اللہ پاک نے پانی اور بارشوں کے خزانے پر مجھے نگران بنایا ہے۔ وَاَتَاهُ خَازِنُ الرِّيحِ اور ہوا کا فرشتہ حاضر ہوا اور کہنے لگا: اِنْ شِئْتَ طَيَّرْتُ النَّارَ فِي الْهَوَاءِ اگر آپ چاہیں تو میں یہ آگ ہوا میں اڑا کر ختم کردوں گا، لیکن موحدِ اعظم سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: لَاحَاجَةَ لِيْ اِلَيْكُمْ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں، میرے لئے وہ ذات کافی ہے جس کا قرب حاصل کرنے کیلئے میں یہ سب کچھ برداشت کررہا ہوں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں:

ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ اِلَى السَّمَآءِ ابراہیم علیہ السلام تمام مخلوقات سے منہ موڑ کر وحدہ

---

[1] عرائس المجالس، ص: ۷۹

لاشریک ذات کی طرف متوجہ ہوئے اور اللہ پاک کے حضور یہ دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ فِی السَّمَاءِ وَاحِدٌ اے اللہ! تو آسمانوں میں اکیلا معبود ہے وَاَنَا فِی الْاَرْضِ وَاحِدٌ اَعْبُدُکَ اور میں زمین پر تیرا اکیلا عبادت گزار ہوں۔[۱]

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جہاں اور دعائیں مانگیں، وہاں ایک دعا یہ بھی تھی:

حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ میرا اللہ مجھے کافی ہے، وہ بہترین کارساز ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ .لکَ الْحَمْدُ وَلکَ الْمُلکُ. لَا شَرِیْکَ لکَ میرا معبود وہی ہے، اگر وہ مجھے جلانا چاہتا ہے تو میں جلنے کو تیار ہوں۔[۲]

گویا موت سامنے ہے تب بھی اللہ کی توحید وتقدیس کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ کامل الایمان موحد کی شان ہی یہ ہے کہ وہ اپنی حاجات قاضی الحاجات ذات سے پوری کرائے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ، عِلْمُہٗ بِحَالِیْ، حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ میرا مالک مجھے کافی ہے، زبان کی بجائے خود میرا حال ہی سُوال ہے۔ وہ ذات کافی ہے جو میرے احوال سے بخوبی واقف ہے، مجھے میرا اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب احد میں خبر ملی کہ حمراء الاسد میں دشمن حملہ کے لئے واپس آرہے ہیں، ڈرانے والوں نے خوب ڈرایا مگر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان بڑھ گیا اور کہا: ''حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ''۔

مشکلات کے حل کیلئے اکسیرِ اعظم:

عارفین نے لکھا ہے کہ مشکلات میں اِن کلمات کا ورد اکسیرِ اعظم ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ پاک نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اسی قول حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ کی وجہ سے نجات دی۔

---

[۱] البدایۃ والنھایۃ: کتاب قصص الانبیاء، ج ۱، ص ۹۸

[۲] البدایۃ والنھایۃ: ج ۱، ص ۹۸۔ تفسیر ابن کثیر: ج ۴، ص ۳۷۳

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ربّ پر کامل بھروسہ اور ربّ کا براہِ راست مدد کرنا:

مَلَکُ الجبال بھی آئے، وہ فرشتہ جو بادلوں کا ہے کہ شاید مجھے حکم ملے اور میں بارش برساؤں، لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ کی طرف متوجہ رہے، اللہ کا حکم ملائکہ سے اَسْرَع ہے، زیادہ تیز ہے۔ ربُّ العالمین نے براہِ راست حکم دیا:

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا ہم نے آگ سے براہِ راست کہا کہ تو ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی ہو جا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کی تفسیر کرتے ہیں: **اَیْ لَا تَضُرِّیْهِ** میرے ابراہیم کو ذرہ بھی ضرر نہ پہنچا۔[۱]

آگ کو ٹھنڈا ہونے اور سلامتی کا حکم:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابو العالیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: اگر اللہ پاک **سَلَامًا** نہ فرماتے تو اس کی ٹھنڈ سے ہی آپ علیہ السلام کی وفات ہو جاتی۔ جب آگ کو یہ حکم ہوا کہ **كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ** تو دنیا میں ہر جگہ جلنے والی آگ بجھ گئی۔

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قتادہؒ اور زہریؒ نے روایت کیا ہے کہ جس وقت آگ کو حکم مذکور ہوا تو پوری دنیا کی آگ میں اتنی ٹھنڈ پیدا ہو گئی کہ آگ سے کوئی نفع حاصل نہ کر سکا۔ آگ نے صرف ان رسیوں کو جلایا جن سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو باندھا گیا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھے اور آپ کے چہرہ انور سے پسینہ پونچھ رہے تھے۔

اور فرمایا: اس وقت دنیا میں رہنے والا ہر جاندار آگ بجھانے میں مصروف **تھا اِلَّا الْوَزَغُ** سوائے چھپکلی کے کہ یہ آگ جلانے میں مصروف تھی اسی وجہ سے آقا علیہ السلام نے فرمایا: یہ وزغ یعنی چھپکلی فویسق ہے، اس کے قتل کرنے میں اجر وثواب ہے، جو پہلی ضرب میں مارے گا سو نیکیاں ملیں گی۔

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: سورۃ الانبیاء، ج ۴، ص ۳۷۳

بدنصیب جانور:

عَنْ سَائِبَةَ مَوْلَاةٍ لِلْفَاكِهِ بْنِ الْمُغِيْرَةَ :اِنَّهَادَخَلَتْ عَلٰى عَائِشَةَ فَرَأَيْتُ فِيْ بَيْتِهَا رُمْحًا مَوْضُوْعًا، فَقَالَتْ يَاأُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ مَاتَصْنَعِيْنَ بِهٰذَاالرُّمْحِ؟ قَالَتْ: نَقْتُلُ بِهِ الْاَوْزَاغَ فَاِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَخْبَرَنَا اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ حِيْنَ اُلْقِيَ فِي النَّارِ لَمْ تَكُنْ دَابَّةٌ اِلَّا تُطْفِئُ النَّارَ عَنْهُ غَيْرَ الْوَزَغِ، فَاِنَّهٗ يَنْفُخُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاَمَرَ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِقَتْلِهٖ۔[۱]

ایک عورت کہتی ہے میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر گئی، میں نے دیکھا ایک نیزہ پڑا ہوا ہے، میں نے کہا یہ کیوں رکھا ہوا ہے؟ فرمایا: چھپکلی کو مارنے کے لئے۔ یہ واحد جانور تھا جو آگ کو جلانے میں لگا ہوا تھا، اس کے مارنے میں اللہ کے نبی ﷺ نے اجر بتایا ہے، اس لئے میں اسے گھر میں دیکھتی ہوں تو مار دیتی ہوں۔

خوش قسمت جانور:

حضرت مولانا سرفراز صفدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

کالی کات یعنی کال کڑچھی چونچ میں پانی لے کر آگ پر ڈال رہی تھی، اور پرندوں نے کہا اِس سے کیا ہوگا؟ اُس نے کہا: تاکہ میرا شمار سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے محبین میں ہو جائے۔

توجہ طلب بات:

میرے بھائیو! ساری مخلوق مالک کی ہے، ہمارے اعتبار سے تو گونگی، بہری ہے، لیکن وہ اللہ کا ہر اَمر دیکھ، سن اور مان رہی ہے۔ ہوا کا جھونکا، سورج کی کرنیں، رات کا اندھیرا، آگ کی تپش، پانی کی روش اور اس کا بہاؤ، زمین اور اس کا ذرہ ذرہ ہر آن ہر گھڑی مالک کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ ساری مخلوق اللہ کی اطاعت میں لگی ہوئی ہے۔ اللہ نے براہِ راست آگ کو حکم دیا کہ ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجا! کعب احبار

---

[۱] مسند احمد، ج:۶، ص: ۱۲۳، ابن ماجہ

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

لَمْ يَنْتَفِعْ اَهْلُ الْاَرْضِ يَوْمَئِذٍ بِنَارٍ وَلَمْ يَحْرُقْ مِنْهُ سِوٰى وِثَاقِهٖ اللہ کے اَمر کا اثر صرف اسی چھے پر نہیں پڑا، بلکہ روئے زمین کی جتنی آگ تھی ساری بجھ گئی۔[۱]

آگ کا گلزار بننا:

امام سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فَاَخَذَتِ الْمَلَائِكَةُ بِضَبْعَيْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَاَقْعَدَتْهُ عَلَى الْاَرْضِ جب ان ظالموں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا تو فوراً فرشتے حاضر ہوئے اور انہوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو پہلو سے پکڑ کر زمین پر بٹھا دیا۔ فَاِذَا عَيْنُ مَاءٍ وَوَرْدٌ اَحْمَرُ وَنَرْجِسٌ اور اللہ کے امر سے وہیں آگ میں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا اور گلاب اور نرگس کے پھول کھل اُٹھے۔

اِبْرٰهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ جَوْفِهٖ حَوْلَهٗ نَارٌ وَهُوَ فِيْ رَوْضَةِ الْخَضْرَاءِ وَالنَّاسُ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ وَلَا يَقْدِرُوْنَ عَلَى الْوُصُوْلِ اِلَيْهِ سیدنا ابراہیم علیہ السلام درمیان میں جا کر بیٹھ گئے، اردگرد آگ تھی اور وہ سبز باغ میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن آپ تک پہنچ نہیں سکتے تھے۔

فَاَقَامَ اِبْرَاهِيْمُ فِي النَّارِ سَبْعَةَ اَيَّامٍ سیدنا ابراہیم علیہ السلام تقریباً سات دن آگ میں رہے۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ عَنِ الْمِنْهَالِ قَالَ: اُخْبِرْتُ اَنَّ اِبْرٰهِيْمَ مَكَثَ هُنَاكَ اِمَّا اَرْبَعِيْنَ اَيَّامًا وَاِمَّا خَمْسِيْنَ چالیس یا پچاس دن آگ میں رہے۔[۲]

منہال بن عمرو فرماتے ہیں، سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

مَا كُنْتُ اَيَّامًا قَطُّ اَنْعَمَ مِنِّيْ عَيْشًا فِي الْاَيَّامِ الَّتِيْ كُنْتُ فِيْهَا فِي النَّارِ میری زندگی کے بہترین دن وہی گزرے ہیں جو میں نے آگ میں گزارے۔ وَدِدْتُ اَنَّ عَيْشِيْ وَحَيَاتِيْ كُلَّهَا مِثْلُ

---

[۱] البدایۃ: ج۱، ص۲۱۷، رشیدیہ کوئٹہ۔ تفسیر ابن کثیر: ج۴، ص۳۷۳

[۲] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۲۱۷، رشیدیہ کوئٹہ

إِذَا كُنْتُ فِيهَا کاش میری ساری زندگی ایسی ہوتی جیسے مزید ار آگ میں تھی۔''[۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ کا آگ میں تشریف لانا:

ایک روایت میں ہے:

إِنَّ أُمَّ إِبْرَاهِيمَ نَظَرَتْ إِلَى ابْنِهَا عَلَيْهِ السَّلَامُ فَنَادَتْهُ يَا بُنَيَّ! إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَجِيءَ إِلَيْكَ فَادْعُ اللّٰهَ أَنْ يُنْجِيَنِي مِنْ حَرِّ النَّارِ حَوْلَكَ، فَقَالَ نَعَمْ! فَأَقْبَلَتْ إِلَيْهِ لَا يَمَسُّهَا شَيْءٌ مِنْ حَرِّ النَّارِ فَلَمَّا وَصَلَتْ إِلَيْهِ اعْتَنَقَتْهُ وَقَبَّلَتْهُ ثُمَّ عَادَتْ[۲]

''حضرت ابراہیم علیہ السلام کی والدہ نے بھی یہ منظر دیکھا۔ اللہ نے ماں کی آواز سیدنا ابراہیم علیہ السلام تک پہنچائی: اے ابراہیم! کیا میں تیرے پاس آسکتی ہوں؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی اے میرے اللہ! جیسے میرے لئے آپ نے آگ کو گلزار بنایا ایسے میری ماں کے لئے بھی گلزار بنادے، چنانچہ ماں اس چخے میں چلتی ہوئی سیدھی آئی اور اپنے بیٹے کو چمٹ گئی اور اسے بوسہ دیا۔''

ہرجانورا پنی بساط کے مطابق اس ایندھن کو بجھانے کے لئے پھونکیں مار رہا تھا۔ قوم جلانے میں لگی ہوئی تھی اور اللہ کی دیگر مخلوق بجھانے میں لگی ہوئی تھی۔

فرشتے کا نزول اُنس کی خاطر:

ابن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی صورت میں ایک فرشتہ بھیجا جو آپ علیہ السلام کے پہلو میں بیٹھ گیا اور آپ علیہ السلام کو اپنے ساتھ مانوس کرنے لگا تا کہ آپ علیہ السلام کو وحشت نہ ہو۔

---

[۱] عرائس المجالس، ص: ۷۹

[۲] البدایۃ والنہایۃ: ج ۱، ص ۲۱۷، رشیدیہ کوئٹہ

فَاَتَاهُ جِبْرَائِيْلُ بِقَمِيْصٍ مِنْ حَرِيْرٍ اسی دوران جبرائیل علیہ السلام خدمت میں حاضر ہوئے اور ریشم کی ایک قمیص پیش کی اور کہا: يَا اِبْرَاهِيْمُ! اِنَّ رَبَّكَ يَقُوْلُ: اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ النَّارَ لَا تَضُرُّ اَحْبَابِيْ؟ وَاَلْبَسَهُ الْقَمِيْصَ آپ یہ قمیص پہن لیں اور یقین کرلیں کہ یہ آگ ہمارے پیاروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

نمرود کا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ربّ کی عظمت کا اقرار کرنا:

کچھ دیر گزرنے کے بعد نمرود نے یہ سمجھا کہ اب سیدنا ابراہیم علیہ السلام (العیاذ باللہ) آگ کے اندر جل گئے ہونگے۔ چنانچہ یہ دیکھنے کیلئے نمرود اپنی بنائی ہوئی بلند عمارت پر چڑھا اور یہ دیکھ کر حیران ہوگیا کہ رَاٰهُ جَالِسًا فِيْ رَوْضَةٍ ابراہیم تو گویا کسی باغ میں جلوہ نشین ہیں۔ وَرَاَى الْمَلَكَ قَاعِدًا اِلٰى جَنْبِهٖ وَحَوْلَهٗ نَارٌ تَحْتَرِقُ مَا جَمَعُوْا مِنَ الْحَطَبِ اور ایک فرشتہ ان کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور چاروں طرف ان کی جلائی ہوئی آگ بھڑک رہی ہے۔ نمرود یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ پکار اُٹھا: يَا اِبْرَاهِيْمُ! عَظِيْمٌ اِلٰهُكَ الَّذِيْ بَلَغَتْ قُدْرَتُهٗ وَعِزَّتُهٗ اَنْ حَالَ بَيْنَكَ وَبَيْنَ النَّارِ حَتّٰى لَمْ تَضُرَّكَ اے ابراہیم! آپ کا رب واقعی بہت بڑا ہے جس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے آپ کو ایسی خطرناک آگ سے ذرہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ نمرود یہ کہہ رہا تھا: نِعْمَ الرَّبُّ رَبُّكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ ''اے ابراہیم! آپ کا ربّ بہت خوب ربّ ہے''!!۔

پھر کہنے لگا کیا آپ اس آگ سے نکل کر باہر آسکتے ہیں؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، میں بلا کسی خوف وخطر آگ سے نکل کر باہر آسکتا ہوں۔ تو نمرود کہنے لگا: قُمْ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَقَامَ اِبْرَاهِيْمُ عليه السلام يَمْشِيْ فِيْهِ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهَا اچھا پھر آپ باہر آجائیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اور سب کے سامنے چلتے ہوئے آگ سے باہر آگئے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا مکالمہ:

آپ علیہ السلام باہر تشریف لائے تو نمرود نے پوچھا وہ شخص جو آگ میں آپ کے ساتھ بیٹھا تھا وہ کون

تھا؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: مَلَکُ الظِّلِّ وہ سایے کا فرشتہ تھا اللہ پاک نے اسے میرا دِل بہلانے کیلئے اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ نمرود کہنے لگا:

يَاإِبْرَاهِيمُ! إِنِّيْ مُقَرِّبٌ إِلٰى إِلٰهِكَ قُرْبَانًا لِمَارَأَيْتُ مِنْ قُدْرَتِهٖ وَعِزَّتِهٖ فِيْمَا صَنَعَ بِكَ حِيْنَ أَبَيْتَ إِلَّا عِبَادَتَهٗ وَتَوْحِيْدَهٗ وَإِنِّيْ ذَابِحٌ لَهٗ أَرْبَعَةَ آلَافِ بَقَرَةٍ

''اے ابراہیم! میں آپ کے اس رب کا قرب حاصل کرنے کیلئے، جس نے اپنی بڑی قدرت کے ذریعے آپ کو ہماری تدبیروں سے محفوظ رکھا، قربانی پیش کروں گا، لیکن میں اس کی وحدانیت کا اقرار نہیں کرسکتا اور نہ ہی اپنے آپ کو اس کی عبادت کیلئے پیش کرسکتا ہوں۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

لَايَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْكَ شَيْئًا مَا كُنْتَ عَلٰى دِيْنِكَ هٰذَا حَتّٰى تُفَارِقَهٗ إِلٰى دِيْنِيْ

''جب تک تو اپنے جھوٹے دِین کو چھوڑ کر میرا سچا دین اختیار نہیں کرے گا، اس وقت تک اللہ تعالیٰ تیری کوئی نیکی قبول نہیں کریں گے۔''

نمرود کہنے لگا:

يَاإِبْرَاهِيمُ! لَااَسْتَطِيْعُ تَرْكَ مُلْكِيْ، وَلٰكِنْ سَوْفَ أَذْبَحُهَا لَهٗ فَذَبَحَهَا وَقَرَّبَهَا وَمَنَعَ الْعَذَابَ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ [1]

''اے ابراہیم! میں اپنی بادشاہت تو نہیں چھوڑ سکتا، لیکن آپ کے رب کے حضور قربانی ضرور کروں گا، اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مزید اذیت پہنچانے سے باز آ گیا۔''

چنانچہ اس نے چار ہزار گائیں ذبح کیں اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے راستے میں رکاوٹ بننے سے بھی باز آ گیا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگا: نِعْمَ الرَّبُّ رَبُّكَ يَاإِبْرَاهِيْمُ اے ابراہیم! آپ کا رب بہت خوب ہے۔ اور ایک روایت میں ہے:

---

[1] عرائس المجالس، ص: ۷۹

اِنَّ اَحْسَنَ شَیْئٍ قَالَ اَبُوْ اِبْرَاهِیْمَ وَهُوَ فِی النَّارِ نِعْمَ الرَّبُّ رَبُّکَ یَااِبْرَاهِیْمُ

''سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کے منہ سے ایک بہترین کلمہ نکلا کہ اے ابراہیم! آپ کا ربّ تو بہت ہی عظیم رب ہے۔''

امام شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اس وقت آپ علیہ السلام کی عمر ۱۶ سال تھی۔

سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر ایمان لانے والے:

ابن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اِسْتَجَابَ لِاِبْرَاهِیْمَ علیہ السلام رِجَالٌ مِّنْ قَوْمِهٖ، جب نمرود اور اس کی قوم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر رحمتِ الٰہی کی عجیب وغریب بارش دیکھی تو چند لوگ آپ علیہ السلام پر ایمان لائے ان میں ایک لوط بن ھاران بھی تھے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دو بھائی تھے۔ ایک کا نام ھاران دوسرے کا نام ناحور تھا۔ ھاران کے بیٹے کا نام لوط تھا، ناحور کے بیٹے کا نام تنویل تھا اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے اسحٰق علیہ السلام تھے، پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تنویل کا ایک بیٹا تھا جس کا نام لابان تھا اور ایک بیٹی تھی جس کا نام رَفُقا تھا بعد میں اسی رَفقا کا نکاح اسحٰق علیہ السلام سے ہوا۔ انہیں سے یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ لابان کی دو بیٹیاں تھیں لَیّا اور راحیل، یہ دونوں یکے بعد دیگرے یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں آئیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ایک چچا کا نام بھی ھاران تھا، ان کی بیٹی سارہ بنت ھاران جو آپ علیہ السلام کی چچازاد تھی یہ بھی آپ علیہ السلام پر ایمان لائی تھی۔

اتمامِ حجت:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو اس کے دربار سے چلے گئے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بَعَثَ اللّٰهُ اِلٰی ذٰلِکَ الْمَلِکِ الْجَبَّارِ مَلَکًا یَأْمُرُهٗ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ فَاَبٰی عَلَیْهِ

ثُمَّ دَعَاهُ الثَّانِيَةَ فَأَبٰى عَلَيْهِ ثُمَّ الثَّالِثَةَ فَأَبٰى عَلَيْهِ وَقَالَ اِجْمَعْ جُمُوْعَكَ وَاَجْمَعُ جُمُوْعِيْ فَجَمَعَ النِّمْرُوْدَ جَيْشَهٗ وَجُنُوْدَهٗ وَقْتَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ[۱]

اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا، آخری حجت پوری کرنے کے لئے، تین دن وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شکل میں آتا رہا۔ توحید کی دعوت دی کہ توبہ کرلو۔ نمرود کے دماغ میں کیڑا تھا، کہنے لگا میں اپنی فوجیں اکٹھی کر رہا ہوں، تمہاری کوئی طاقت ہے تو تم بھی اپنی طاقت ظاہر کرو۔ حدِ نگاہ تک اس کی فوج ہی فوج تھی۔

مچھروں کے ذریعہ نمرودی فوج کی تباہی:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی اے اللہ! اب معاملہ انتہاء کو پہنچ چکا ہے، یہاں تک سمجھانا تھا سمجھا دیا۔ اے پروردگار! اب غیبی خزانے سے اپنی فوج اتار۔ اللہ نے مچھروں کا خزانہ کھولا، جھنڈ کے جھنڈ مچھر بھیجے۔ اتنے زیادہ تھے کہ حافظ عماد الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سورج کی روشنی نیچے نہیں آسکتی تھی۔ نمرودی فوج پر ٹوٹ پڑے، ان کا لہو اور گوشت کھا گئے، ہڈیوں کے ڈھانچے باقی رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھائی، ایک مچھر اس کے ناک کے نتھنے میں گھسا۔ چھینک آئے مچھر باہر آجاتا ہے، لیکن اللہ نے کہا تو نے آگے جانا ہے، تیری پرورش کا انتظام یہی ہے۔

نمرود کا مخلد فی النار ہونا:

حافظ عماد الدین ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

اِنَّ نَمْرُوْدَ هٰذَا اِسْتَمَرَّ فِيْ مُلْكِهٖ اَرْبَعَةَ مِأَةِ سَنَةٍ۔[۲]

''اس نے چار سو سال حکومت کی۔''

ہمارے حکمران پانچ دس سال بیٹھتے ہیں ان کے دماغ میں کیا کچھ پیدا ہوجاتا ہے، جو چار صدیاں بیٹھا اس کے دماغ میں الوہیت کا کیڑا پیدا ہونا ہی تھا۔ پھر اللہ نے اس مچھر کو چار سو سال اس کے دماغ میں

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ: ج۱، ص: ۲۲۱، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

[۲] البدایۃ النہایۃ: ج۱، ص: ۲۱۹، ط: رشیدیہ، کوئٹہ

رکھا۔ جو بھی حال پوچھنے آتا وہ اس کو جوتے اور ہتھوڑے مارتا، اس سے مچھر کو کچھ سکون ہوتا وہ ٹھہرتا۔ قیامت تک آنے والے سارے باطل اور فراعنہ قسم کے لوگوں کو اللہ نے ہتھوڑا مارا کہ تمہاری بڑی سے بڑی طاقت ہمارے ایک مچھر کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ بالآخر ایک ہتھوڑا ایسا لگا کہ اسی سے مخلد فی النار ہوگیا، سدا کے لئے آگ میں گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سچی دعوت کی طاقت دکھائی کہ جب اللہ کسی کے ساتھ ہو تو پھر ربُّ العالمین ہی کی تدبیر چلتی ہے، دشمنوں کی ساری تدبیریں اللہ تعالیٰ انجام کے اعتبار سے فیل کردیتے ہیں۔

اختتامی کلمات:

میرے محترم بھائیو! مخلوقات کے خالق وفاطر صرف اللہ تعالیٰ ہیں، مدبر ومتصرف وہی ہے، اشیاء میں نفع وضرر کے خواص اُسی نے رکھے ہیں، چیزیں جیسے مالک کی گرفت میں ہیں ایسے ہی اشیاء کے اوصاف کا ظہور وعدمِ ظہور بھی صرف ربُّ العالمین کے قبضہ میں ہے۔ کبھی تو وہ ذات جلیلہ اپنی قدرت کو بغیر اسباب کے ظاہر کرتی ہے، کبھی اظہارِ قدرت اسباب کے موافق اور کبھی ظہورِ قدرت اسباب کے مخالف، ہلاکت کے اسباب میں راحت وسکون اور راحت وسکون کے اسباب میں ہلاکت ظاہر فرماتے ہیں، ساری نمرودی قوت کو کیسے فیل کرکے رکھ دیا، اس کا ناپاک منصوبہ ملیامیٹ کردیا: ''وَمَاذَالِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ''۔

پلک جھپکنے کی دیر جو اللہ تعالیٰ کو چمٹا اللہ نے کبھی اس کو ناراض نہیں کیا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے قدم قدم لمحہ بہ لمحہ ربُّ العالمین کو راضی کیا، حق تعالیٰ شانہٗ نے انجام کے اعتبار سے کسم پرس، اسبابِ راحت نہ ہونے کے باوجود بھی کیسے حفاظت کی اور اپنے خلیل علیہ السلام کو رہتی دنیا تک کے لئے روشنی کا مینار بنادیا۔ اللہ کی کروڑہا رحمتیں ہوں خلیل اللہ علیہ السلام پر۔ آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ)

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى
وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ (سورۃ البقرۃ:۲۶۰)

احیائے موتی

احیائے موتی

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اَمَّابَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، وَاِذْقَالَ اِبْرَاھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ط قَالَ فَخُذْاَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ[۱]

اوراس وقت کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے؟ ارشاد فرمایا: کیا تم یقین نہیں لائے؟ انہوں نے عرض کیا یقین کیوں نہ لاتا لیکن (اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ) میرے قلب کو سکون ہوجائے۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلالو یعنی مانوس کرلو، پھر ہر پہاڑ پر ان میں ایک ایک کا حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس سب دوڑے دوڑے چلے آئیں گے اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔

حیات بعد الموت کا مشاہدہ:

میرے عزیز بھائیو! آج کے خطبہ میں احیائے موتی یعنی حیات بعد الموت کے متعلق بیان ہوگا۔ سیدنا ابراہیم علیہ خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حق تعالیٰ شانہٗ سے یہ درخواست کی کہ مجھے اس کا مشاہدہ کرا دیجئے کہ آپ مُردوں کو کس طرح زندہ کریں گے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اے ابراہیم! اس درخواست کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو ہماری قدرتِ کاملہ پر یقین نہیں کہ وہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ

---

[۱] البقرۃ: ۲۶۰

والسلام نے عرض کیا: بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ یقین کیوں نہ ہو لیکن اس غرض سے یہ درخواست کی ہے کہ میرے دل کو زندہ کرنے کی معیّن صورت کا مشاہدہ کرنے سے اطمینان حاصل ہو جائے۔

علماء نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی متعدد وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔ اس وجہ سے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ نمرود مردود کے سامنے بھی یہی دلیل پیش کی تھی، اور فرمایا تھا:

رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ[1] یعنی میرا ربّ وہ ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے۔

اس لئے آپ علیہ السلام نے چاہا کہ علم الیقین سے ترقی کرتے ہوئے عین الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے یعنی اس بات کا علم تو ہے لیکن مشاہدہ بھی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ عرض کیا: رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى پروردگار! مجھ کو دکھلا بھی دیجئے کہ آپ مردوں کو کس کیفیت سے زندہ کریں گے۔

۲۔ دوسرا اس وجہ سے کہ انسانی فطرت ہے کہ جس کام کا مشاہدہ نہ ہو خواہ وہ کتنا ہی یقینی ہو اس میں اس کے خیالات منتشر رہتے ہیں کہ یہ کیسے اور کس طرح ہوگا؟ یہ ذہنی انتشار سکونِ قلب اور اطمینان میں خلل انداز ہوتا ہے۔ اس لئے مشاہدہ کی درخواست کی گئی کہ احیاءِ موتیٰ کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں میں ذہنی انتشار واقع نہ ہو اور قلب کو سکون واطمینان حاصل ہو جائے۔

اس سوال وجواب کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ بات صاف کردی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ فرمائش خدانخواستہ کسی شک کی وجہ سے نہیں تھی، انہیں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر پورا یقین تھا، لیکن آنکھوں سے دیکھنے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے اس سے نہ صرف مزید اطمینان حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کے بعد انسان دوسروں سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں دلائل سے اس کا علم حاصل کرنے کے علاوہ آنکھوں سے دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ'' کہ چار پرندے اپنے پاس جمع کرلیں، پھر اُن کو اپنے پاس رکھ کر

---

[1] البقرۃ:۲۵۸

مانوس کرلیں، وہ ایسے مانوس ہوجائیں کہ آپ کے بُلانے سے آجایا کریں۔

مفسرین کرام کے ان چار پرندوں کے بارے میں اقوال مختلف ہیں کہ وہ کون کون سے تھے؟ اگرچہ ان کی تعیین میں بظاہر کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اگر ان پرندوں کے نام علی التعیین معلوم ہونے میں کوئی فائدہ ہوتا تو قرآن اس کو ضرور بیان کرتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، وہ پرندے کلنگ، مور، مرغ اور کبوتر تھے۔ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مرغابی، سیمرغ کا بچہ، مرغ اور مور لئے۔ حضرت مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وہ پرندے کبوتر، مرغ، مور اور کوا تھے۔

آگے ارشاد فرمایا: ''ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا'' یعنی ان پرندوں کو ذبح کر کے ان کا ایک ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ۔ وہ چاروں تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔

چنانچہ آپ علیہ السلام نے چار پرندے لئے، ان کو ذبح کیا، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کئے، ان کے پَر اُکھاڑے، ان کو الگ الگ کیا، پھر ان کو ایک دوسرے میں ملا دیا، اس کے بعد ان کے اجزاء بنائے اور ہر پہاڑ پر ایک ایک جزء رکھ دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ چار پہاڑ تھے اور بعض کہتے ہیں کہ سات پہاڑ تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ان پرندوں کے سر اپنے ہاتھ میں رکھے، پھر ان کو بحکمِ الٰہی بلانے لگے۔ چنانچہ حکمِ الٰہی کے مطابق ان کو بلایا تو آپ علیہ السلام نے دیکھا کہ جس پرندے کو آواز دیتے ہیں اس کے بکھرے ہوئے پَر اِدھر اُدھر سے اُڑتے ہیں، خون خون کے ساتھ، گوشت گوشت کے ساتھ ملتا جاتا ہے، ہر پرندے کے اجزاء ایک دوسرے سے جڑتے جاتے ہیں، اور وہ چلتے ہوئے آپ علیہ السلام کے پاس آتے تاکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اپنا اپنا سر لے لیں۔ آپ علیہ السلام اسے اگر دوسرے پرندہ کا سر دیتے ہیں تو وہ قبول نہ کرتا، لیکن جب خود اس کا سر دیتے ہیں تو فوراً اپنے باقی جسم کے ساتھ پانی کی قوت سے جڑ جاتا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس مشاہدہ کا سوال کیا تھا اس کو خوب اچھے طریقہ سے دیکھ لیں۔ اسی لئے اس کے بعد فرمایا:

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی غالب ہے کہ کوئی چیز اس کو عاجز نہیں کرسکتی۔ جو کام وہ کرنا چاہیے اس کو کوئی روکنے والا نہیں، کیونکہ وہی ہر چیز پر غالب ہے اور وہ ذات اپنے تمام اقوال وافعال اور حکم وقدرت میں حکیم ہے۔

فوائدِ جلیلہ:

۱۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ پر ختم فرمایا اس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اے ابراہیم! تم نے ہم سے رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کی درخواست کی، ہم نے اسے منظور کیا۔ اے ابراہیم! ایک وقت آنے والا ہے کہ ہم تم سے یہ کہیں گے کہ عَبْدِيْ اَرِنِيْ كَيْفَ تُمِيْتُ الْاَحْيَاءَ اے میرے بندے! تو مجھ کو یہ دکھلا کہ تو میرے لئے زندہ کو کس طرح موت دیتا ہے یعنی زندہ بیٹے کو کس طرح میرے لئے قربان کرتا ہے۔[۱]

۲۔ وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میرے نزدیک قرآنِ کریم کی یہ آیتِ مبارکہ سب سے زیادہ اُمید والی ہے۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسرے سے پوچھا: آپ کے نزدیک کتاب اللہ میں اس اُمت کے لئے کون سی آیت زیادہ اُمید والی ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جواب دیا یہ آیت مبارکہ زیادہ اُمید والی ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا[۲] یعنی آپ فرمادیں میرے ان بندوں سے جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے کہ تم اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمانے والا ہے۔

---

[۱] روح المعانی: ج ۳، ص ۲۷

[۲] سورۃ الزمر: ۵۳

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: اگر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک یہ آیت مبارکہ پر اُمید ہے تو میرے نزدیک اس اُمت کے لئے زیادہ اُمید افزا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ عرض کرنا ہے:

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ

یعنی اے میرے پروردگار! آپ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟ فرمایا: کیا تو ایمان نہیں لایا؟ عرض کیا کیوں نہیں، لیکن اس لئے تا کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے۔

حدیثِ نبوی ﷺ:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّکِّ مِنْ اِبْرَاهِیْمَ اِذْ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ، وَیَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا لَقَدْ کَانَ یَاْوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ، وَلَوْلَبِثْتُ فِی السِّجْنِ طُوْلَ مَالَبِثَ یُوْسُفُ لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہ نسبت شک کے زیادہ حق دار ہیں، جب انہوں نے عرض کیا تھا: پروردگار! مجھے دکھلا دیجئے کہ آپ کس کیفیت سے مردوں کو زندہ کریں گے۔ فرمایا: کیا تو ایمان نہیں لایا؟ عرض کیا کیوں نہیں، لیکن اس لئے تا کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے، انہوں نے کہا کہ کاش! اگر میرا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا تو میری مدد کرتا۔ اور اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی جگہ میں ہوتا تو اتنی درازی مدتِ قید کے پیشِ نظر میں اُس داعی وقاصد کا پیغامِ رہائی قبول کر لیتا۔

مقصودِ نبوی ﷺ:

اس حدیث کے تین متناسب جملوں سے آنحضرت ﷺ کا مقصود تین انبیاء حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت یوسف علیہم السلام کے متعلق اُن تین مطاعن کا دفعیہ وازالہ کرنا ہے جن سے بظاہر اُن کے

---

[1] الصحیح البخاری: ج ۱، ص ۴۷۷، ط: قدیمی، کراچی

نقصِ شان کا ایہام وشبہ ہوتا ہے۔

حدیث مذکور میں یکجائی طور پر تین نبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی عیانہ اخوت دوسرے نبیوں کی عزت واحترام بیان کرنے اور اپنی فروتنی کے اظہار کے لئے گویا بہانہ کی متلاشی رہا کرتی تھی، اگر کہیں اپنے جدِ بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذرا ذکر آ گیا تو عظمت و برتری کے جتنے زوردار کلمات ہو سکتے تھے وہ سب اُن کے حق میں اور عجز و نیاز کے جتنے کلمات ممکن تھے وہ تمام اپنے حق میں ادا ہونے لگے اور جب کہیں اپنے دوسرے علاتی بھائیوں کی یاد تازہ ہوگئی تو فوراً آپ کے تلطّف وترحّم کے سمندر موجزن ہو گئے اور رحمت ورافت سے لبریز دُعائیں ان کے لئے زبان سے نکلنے لگیں، پھر یہ سب کچھ محض شاعرانہ مبالغہ آمیزی کے طور پر نہیں بلکہ ٹھیک حقیقت پر مبنی ہے۔[۱]

توضیح جملہ اولیٰ نَحْنُ اَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ اِبْرٰهِيْمَ:

اس جملہ سے مقصود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شانِ عالی کا بیان کرنا اور شک سے آپ کی براءت کا اعلان کرنا ہے، کیونکہ بعض روایات کی رُو سے جب رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى والی آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''شَكَّ اِبْرَاهِيْمُ وَلَمْ يَشُكَّ نَبِيُّنَا''، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کے سوالِ ابراہیمی کا باعث ومنشا معاذ اللہ شک وتردّد نہ تھا، ورنہ اگر بالفرض ان سے یہ سوال کسی شک کی بنا پر سرزد ہوتا تو ہم احیاء موتی کے متعلق اِس شک کے ان سے زیادہ حقدار ہوتے، کیونکہ بعض فروعات عملیہ ونیز ملتِ ابراہیمیہ یعنی اطاعتِ حق میں ابراہیم علیہ السلام متبوع اور ہم ان کے تابع ہیں، كَمَا قَالَ تَعَالٰى: قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا[۲]. فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا[۳]- اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا[۴]- مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ [۵]-

---

[۱] ترجمان السنۃ: ص ۲۲۸، ج ۳

[۲] البقرۃ: ۱۳۵

[۳] آلِ عمران: ۹۵

[۴] النحل: ۱۲۳

[۵] الحج: ۷۸

لیکن جب ہم تابعین کو کوئی شک وتردّد لاحق نہیں ہوا تو پھر بھلا متبوع اور اس مُوَحِّدُ اعظم کو شک وتردّد کیوں کر لاحق ہوسکتا ہے۔ غرض یہ کہ آپ کا مقصد اظہارِ شک قطعاً نہ تھا بلکہ کیفیت واحوال احیاءِ موتیٰ کا مشاہدہ ومعائنہ کرنا تھا (تاکہ علم الیقین کے ساتھ عین الیقین بھی حاصل ہوجائے) جیسا کہ لفظ کَیْفَ سے معلوم ہوتا ہے، تو شوق کے سوال اور شک کے سوال میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ ذوق وشوق عینِ تقاضائے یقین ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے احیاء پر یقین نہ ہوتو حقیقت احیاء کے مشاہدہ کا شوق ہی کیسے پیدا ہو؟

قرآن وعقل دونوں ہی کی رُو سے انبیاء علیہم السلام کا معصوم وبے گناہ ہونا ضروری ہے، اس لئے احیاء موتیٰ کے بارہ میں اُن سے کسی قسم کے شک وتردّد کا صادر ہونا قطعی ممکن نہیں۔ لہٰذا اس حدیث کا ظاہر مقصود نہیں کہ چونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو شک لاحق ہوا اس لئے میں اس کا زیادہ حقدار ہوں، بلکہ اپنے شک کے انتفاء سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شک کے انتفاء پر استدلال کرنا مقصود ہے تو اس حدیث سے آنحضرت ﷺ کے متعلق صدورِ شک کا تو قطعی کوئی امکان ثابت نہیں ہوتا۔

احیاءِ موتیٰ کی قدرت کا یقین تو ایمان کا جزو لاینفک ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تو پہلے ہی سے حاصل تھا، اسی لئے آپ نے نمرود کے ساتھ مناظرہ میں فرمایا: رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ لیکن آپ کے دل میں احیاءِ موتیٰ کی کیفیت کے متعلق مختلف احتمالات آتے تھے (کہ نہ معلوم اللہ تعالیٰ احیاءِ موتیٰ کے وقت کون سی صورت اختیار فرمائیں گے؟ جیسا کہ انسانی فطرت ہے کہ غیر مُشاہَدْ چیز کی کیفیات کی کھوج لگانے میں اُس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے) اور آپ کا دل چاہتا تھا کہ اُس کیفیت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اور اس کے متعلق علم شہودی وبدیہی حاصل کیا جائے، جس کی دو اغراض تھیں:

۱۔ تسکینِ اشتیاقِ قلبی ورفعِ انتشارِ ذہنی:

یعنی مختلف کیفیاتِ احیاء میں جو دل کو تردّد حاصل ہے وہ دور ہوجائے اور ایک متعین کیفیت کے مشاہدہ کا جو طبیعت میں اشتیاق وتقاضا ہے وہ پورا ہوجائے، جیسا کہ کوئی شخص مکہ اور مدینہ کی تعریفات سُنے تو اسے اُن کی زیارت کا شوق وداعیہ پیدا ہوجاتا ہے اور دل میں طرح طرح کے نقوش وتصورات آتے ہیں اور پھر زیارت کے بعد ایک نقشہ متعین اور دلی اشتیاق ساکن ہوجاتا ہے۔

۲۔ حصولِ مقامِ اخص واکمل للیقین:

یعنی تعیّنِ کیفیت اور مشاہدہ احوال وکیفیات تفصیلیہ کے ذریعہ وہ مخصوص وکامل ترین سکون واطمینانِ قلبی حاصل ہوجائے جو خاص خاص اولوالعزم حضرات انبیاء علیہم السلام ہی کو بصورتِ مشاہدہ ہی عطا کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں جنت ودوزخ ودیگر آیاتِ قدرت کا اور عزیر علیہ السلام کو آبادیِ بستی واحیاءِ حمار کا مخصوص ترین یقین بذریعہ مشاہدہ بخشا گیا۔

حکمت ومصلحت:

پھر اس زیادتی تیقّن کی درخواست میں غالباً حکمت ومصلحت یہ تھی کہ نمرود سے مناظرہ میں احیاءِ موتیٰ کا تذکرہ آیا اور اس نے اپنی حماقت وجہالت کی بناء پر ایک واجب القتل شخص کی رہائی کو بھی احیاء کی حقیقت میں داخل سمجھا۔ اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تفصیلی حالات کا مشاہدہ چاہا تاکہ آئندہ اگر کبھی ایسا موقع آئے تو اِس پوری کیفیتِ احیاء کا مطالبہ کرکے مخاطب کو بالکلیہ ساکت ومبہوت کیا جاسکے۔

فرق بین الایمان والاطمینان:

ایمان اُس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو محض مخبرِ صادق کے اعتماد کی بنا پر کسی امر غیبی کے متعلق حاصل ہوجائے، اور اطمینان سکونِ قلب کا نام ہے، بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقینِ کامل تو ہوتا ہے مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا اور یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الممات پر تو کامل ایمان ویقین تھا مگر سوال صرف کیفیات اور احوال احیاء کے متعلق تھا۔

حاصل یہ کہ ایک اذعان وتصدیق کا وہ درجہ ہے جس کے بعد شک وتردّد کا درجہ آجاتا ہے، یہ تو درجۂ ایمان ہے اور ایک درجہ اس یقین سے اوپر قوتِ یقین کا ہے جس کو طمانیتِ قلب اور زیادتیِ ایمان وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ درجہ اطمینان ہے، پھر اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں:

۱۔ ایک وہ نظر اور علمی اطمینان قلبی جو اولیاء وصدیقین کو حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا اس سے اعلیٰ یقین اور اطمینان جو عام انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا اس سے بھی مافوق جو خاص خاص اولوالعزم حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو بصورتِ مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے اس طرح کہ طبیعت میں جو ایک معیّن وعجیب کیفیت کے مشاہدہ کا اشتیاق وداعیہ ہوتا ہے، اس کی تسکین ہوجاتی ہے اور مختلف کیفیات کے مابین جو ذہنی انتشار اور دماغی الجھاؤ ہوتا ہے وہ دور ہوجاتا ہے۔

توضیح جملہ ثانیہ مع ازالۂ ایہام قدح شان قولہ: وَيَرْحَمُ اللّٰهُ لُوْطًا ۔۔۔۔الخ:

اس جملہ سے مقصود تنقید نہیں بلکہ یہ جملہ لوط علیہ السلام کی سخت پریشانی واضطراب کے پیش نظر ترحم و اظہارِ شفقت وثناء کے لئے ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے بصورتِ مہمان پہنچے اور بدکردار لوگوں نے اُنہیں تنگ کرنا شروع کیا تو اس وقت لوط علیہ السلام دل میں تو ذاتِ باری سے ملتجی تھے جو رکن شدید اور مضبوط قلعہ کے بمنزلہ ہے مگر ظاہر میں مہمانوں سے معذرت کے لئے عاجزانہ انداز میں یہ جملہ فرمایا کہ کاش! اگر میرا کوئی کنبہ قبیلہ ہوتا تو میری مدد کرتا اور لوط علیہ السلام کا یہ فرمان یا تو شدتِ اضطراب کے پیشِ نظر باقتضاءِ طبعی تھا کیونکہ آپ علیہ السلام کو بتقاضائے بشریت نصرت وحمایت الٰہیہ سے ذُہول ونسیان ہوگیا یا حفاظتِ الٰہیہ پر اعتماد کے باوجود مہمانوں کی حفاظت کے پیشِ نظر اسبابِ ظاہریہ کا اختیار کرنا بلاشبہ جائز تھا۔

اندازہ فرمایئے کہ قوم کے سارے ناہنجار افراد ایک طرف اور حضرت لوط علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی آبرو کا معاملہ ایک طرف، نہ خود اپنے دست وبازو میں ان کی مدافعت کی طاقت نہ قبیلہ اس موقع پر ان کی مدد کرسکے، اس حیرت ومجبوری وبے چارگی کا نقشہ جب آنحضرت ﷺ کی نبیانہ اخوت کے سامنے آیا تو آپ پر اس گذشتہ مصیبت کی ایک تازہ واقعہ کی طرح چوٹ لگی اور بڑے درد کے انداز میں فرمایا: الٰہی میرے بھائی لوط علیہ السلام پر بڑی رحمتیں نازل فرما کہ قوم کی نالائقیوں اور ایذاؤں سے تنگ آکر انہیں ان کلمات کے کہنے کی نوبت آگئی جو فطرتِ بشری سے بدرجۂ مجبوری نکلا کرتے ہیں۔[۱]

رُكْنٍ شَدِيْدٍ کا مفہوم:

رکن شدید سے مراد دفاعی جتھہ، حمایتی، جماعت، قرابتدار، مضبوط کنبہ وقبیلہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ لوط علیہ

---

[۱] ترجمان السنۃ: ج ۴، ص ۲۲۹

السلام پر رحم فرمائیں کہ وہ کسی مضبوط جماعت وقبیلہ کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور جامع ترمذی میں اس کے ساتھ یہ جملہ بھی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کا کنبہ قبیلہ اس کا حمایتی نہ ہو۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے منقول ہے کہ اس واقعہ میں جب قومِ لوط اُن کے گھر پر چڑھ آئی تو لوط علیہ السلام نے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا، ان لوگوں نے دیوار پھاند کر اندر گھسنے کا اور دروازہ توڑنے کا ارادہ کیا، اس پر حضرت لوط علیہ السلام کی زبان پر یہ کلمات آ گئے۔

توضیح جملہ ثالثہ: وَلَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ۔۔۔۔الخ:

علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سات سال، سات ماہ، سات روز اور سات گھنٹے جیل میں رہے۔ جب بادشاہ کا قاصد وداعی رہائی کا پروانہ لے کر اُن کے پاس پہنچا تو اس قدر درازیٔ مدت کے باوجود آپ نے رہائی سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پہلے میری براءت کا اعلان کیا جائے۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ تبلیغ میں وہ الزام رکاوٹ نہ بنے تو آنحضرت ﷺ نے یوسف علیہ السلام کے کمال صبر و استقلال اور عُلُوِّ ہمت کی تعریف فرمائی ہے۔ انسان کا خاصہ ہے کہ جب وہ طرح طرح کی ایذاؤں اور مصائب کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے صبر کے لئے اس قسم کے گزشتہ واقعات کا تصور بڑا تسلی بخش ہوتا ہے۔ اس لئے جب آپ بھی مصائب و آلام کے اسی دور سے گزر رہے تھے تو یہ جملے ارشاد فرمائے۔ انبیاء علیہم السلام کے مصائب کا نقشہ بار بار آپ کے سامنے آنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ قرآن کریم نے خاص طور پر آپ سے خطاب فرمایا تھا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ پس چونکہ قرآن کریم ہی نے آپ کے صبر کیلئے انبیاء سابقین کا تصور آپ ﷺ کے سامنے رکھا تھا، اسلئے ہر صبر آزما موقع پر آپ ﷺ صبر فرماتے اور سابق انبیاء علیہم السلام کا اسوہ صبر سامنے رکھتے تھے اور جب یہ صورتحال اتفاقاً بیان میں آجاتی تو ہر جگہ یوں معلوم

---

[۱] کذا فی تفسیر القرطبی

ہوتا گویا آپ کی نظروں میں صبر کا پلہ اُن ہی کا بھاری ہے۔[۱]

لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ کا مفہوم:

آنحضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی جگہ میں ہوتا تو اتنی درازی مدت قید کے پیشِ نظر میں اُس داعی وقاصد کا پیغامِ رہائی قبول کر لیتا اور فوراً جیل خانہ سے نکل جانا منظور کر لیتا مگر یہ یوسف علیہ السلام ہی کا عزم و ہمت اور صبر و استقلال تھا کہ آپ نے ایسے موقع پر نہایت پامردی اور استقامت وپختگی کا مظاہرہ فرمایا۔

لَاَجَبْتُ الدَّاعِیَ سے یوسف علیہ السلام کی افضلیت وفوقیت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ ایک افضل مقام کی طرف اشارہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ فائز تھے اور وہ مقام کمالِ عبدیت اور رضاء وتسلیم کا ہے کہ آقا جو صورت تجویز فرمادے بندہ فوراً اُسے قبول کر لے، خواہ قید ہو خواہ رہائی۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے طریقِ کار میں ان کے صبر وتحمل اور مکارمِ اخلاق کا عظیم الشان ثبوت ہے جو اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے، لیکن رسولِ کریم ﷺ نے جس طریق کار کو اپنی طرف منسوب فرمایا، تعلیم اُمت اور خیر خواہیِ عوام کے لئے وہی مناسب وافضل ہے، کیونکہ بادشاہوں کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، ایسے موقع پر شرطیں لگانا یا دیر کرنا عام لوگوں کے لئے مناسب نہیں ہوتا، احتمال ہے کہ بادشاہ کی رائے تبدیل ہو جائے اور پھر یہ جیل کی مصیبت بدستور قائم رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو تو بوجہ رسولِ خدا ہونے کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم بھی ہو سکتا ہے کہ اس تاخیر سے کچھ نقصان نہیں ہوگا لیکن دوسروں کو تو یہ درجہ حاصل نہیں۔ رحمۃ للعالمین کے مزاج میں عامہ خلائق کی بہبود کی اہمیت زیادہ تھی، اس لئے فرمایا کہ مجھے یہ موقع ملتا تو دیر نہ کرتا۔[۲]

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ)

---

[۱] ترجمان السنۃ: ج ۴، ص ۲۳۰، ۲۳۲

[۲] معارف القرآن: ج: ۵

"یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" (البقرۃ:۴۷)

اولادِ ابراہیم علیہ السلام

اور

اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام

کا مختصر تذکرہ

اولادِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ [1]

خاندانِ ابراہیمی:

مشہور و نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی (۲۱۶۰ یا ۱۹۸۵ ق۔م) سے مشہور و نامور دو نسلیں چلیں، ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصری کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی اور آگے چل کر قریش اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی، ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہ علیہا السلام عراقی کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت یعقوب عُرف اسرائیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ مُلک نہ تھا شام ہی کا جزو تھا۔ ایک تیسری نسل تیسری بیوی حضرت قنطورا بنت یقطن الکنعانیہ سے چلی اور بنی قنطورا بنت یقطن الکنعانیہ کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔

اُم المسلمین سیدہ ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے القاب:

۱۔ کبیرۂ مصر

۲۔ زوجۂ خلیل الرحمن ابراہیم صلوٰۃ اللہ علیہما والسلام

۳۔ مُحَدَّثہ ملائک (مُحَدَّث بفتح دال اُسے کہتے ہیں جس سے فرشتے باتیں کریں۔ حضرت ہاجرہؓ کے پاس ملائکہ کا آنا، باتیں کرنا، توراۃ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اس لئے ان کو محدَّثہ کہا گیا ہے)

---

[1] البقرۃ: ۴۷

۴۔ والدہ اسماعیل علیہما السلام

۵۔ ام العرب المستعربہ

۶۔ بانیہ بلدۃ الامین مکہ معظمہ

۷۔ جدۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نام کی وجہ:

۱۔ ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ''ہاغار'' ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔[۱]

ان کا وطن چونکہ مصر تھا اس لئے یہ نام پڑ گیا، لیکن اسی اصول کے پیشِ نظر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ''ہاغار'' کے معنی ''جدا ہونے والے'' کے ہیں اور عربی میں ''ہاجر'' کے معنی بھی یہی ہیں، یہ چونکہ اپنے وطن مصر سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شیریکِ حیات اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی خدمت گذار بنیں، اس لئے ہاجرہ کہلائیں۔

۲۔ جب فرعونِ مصر نے سیدہ سارہ کی کرامت کو دیکھ کر ہاجرہ کو سارہ کے ساتھ کر دیا تھا تب ان کا نام آجر ٹھہرا، یعنی یہ اس مصیبت کا اَجر ہیں جو سارہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بادشاہ کے ظلم سے اُٹھانی پڑی۔ پھر جب انہوں نے ہجرت الی اللہ کی اور آ کر مکہ میں اس لئے آباد ہوئیں کہ ان کی اولاد بیت اللہ الحرام کی آبادی اور توحید کی منادی کرے، تب ان کا نام ہاجرہ ٹھہرا۔

فرشتے نے بیٹے کی بشارت دی اور نام بھی تجویز کیا:

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دیا تھا۔ وہ نکاح کے پہلے ہی سال میں بارور ہوئیں۔ یہ مولود مسعود شکم مادر ہی میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے سامنے آ کر سیدہ ہاجرہؓ کو بشارت دی کہ وہ بیٹا جنے گی اور اس کا نام اسماعیل علیہ السلام رکھنا۔

ہجرت:

ربُّ العالمین کو منظور یہ تھا کہ بنو اسماعیل کو ایک مستقل شاندار قوم بنائے، اللہ تعالیٰ کو بنو اسماعیل سے

---

[۱] ارض القرآن، ج: ۲، ص: ۴۰

اپنے گھر کی خدمت لینا منظور تھا۔ یہ مصلحت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو وحی ربانی نے سمجھادی اور اُنہوں نے خوشی خوشی اکلوتے بیٹے اور پیاری بیوی کو اس سنسان بیابان میں آباد کیا، جہاں اب مکہ معظمہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ[۱]

اے رب! میں اپنے کنبہ کا ایک حصہ اس وادی میں جہاں کوئی روئیدگی نہیں آباد کرتا ہوں کہ یہ تیرے حرمت والے گھر کے پاس رہیں اور (یہ میں نے اس لئے کیا) تاکہ یہ نماز کو قائم کریں۔

صحیح بخاری میں ہے: لَیْسَ یَوْمَئِذٍ بِمَکَّۃَ اَحَدٌ وَلَیْسَ بِھَا مَآءٌ ''مکہ میں اس وقت نہ کوئی جاندار تھا اور نہ پانی تھا''۔[۲]

میاں بیوی میں مکالمہ:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ہاجرہ کو یہاں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو بیوی اور شوہر میں باتیں ہوئیں۔ بیوی نے پوچھا: اِلٰی مَنْ تَتْرُکُنَا ہم کو کس کے پاس چھوڑ چلے؟ قَالَ اِلَی اللّٰہِ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے پاس۔ قَالَتْ رَضِیْتُ بِاللّٰہِ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے کہا میں اللہ تعالیٰ پر راضی ہوں۔[۳]

آبِ زم زم کا ظہور:

توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے کہ جب ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی ختم ہوگیا اور اسماعیل علیہ السلام پیاس سے مرنے کے قریب ہوگئے، تب اللہ کا فرشتہ پھر ہاجرہ خاتون سے ہم کلام ہوا اور ان کو

---

[۱] ابراہیم: ۳۷

[۲] صحیح بخاری: ج ۱، ص ۴۷۴، قدیمی کتب خانہ، کراچی

[۳] صحیح بخاری: ج ۱، ص ۴۷۶، قدیمی کتب خانہ، کراچی

اسماعیل علیہ السلام کی نسل کی کثرت وعظمت کی بشارت سنائی اور ان کے لئے ایک کنواں بھی ظاہر ہوگیا۔

صحیح بخاری میں ہے:

فَاِذَا هِيَ بِصَوْتٍ فَقَالَتْ اَغِثْ اِنْ كَانَ عِنْدَكَ خَيْرٌ فَاِذَا جِبْرِيْلُ قَالَ فَقَالَ بِعَقِبِهٖ هٰكَذَا وَغَمَزَ عَقِبَهٗ عَلَى الْاَرْضِ قَالَ فَانْبَثَقَ الْمَآءُ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے ایک آواز سُنی تو انہوں نے کہا کہ اگر تجھ سے کچھ فائدہ ہوسکتا ہے تو سامنے آؤ، حضرت جبرائیل علیہ السلام آ گئے، انہوں نے زمین پر ایڑی کو مارا تو زمین سے پانی پھوٹ پڑا۔[۱]

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا مقام ومرتبہ:

صحیح بخاری اور توراۃ کی ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کس قدر بلند تھا کہ کبھی فرشتہ سامنے آ کر اُن سے بات کرتا ہے اور کبھی آسمان سے پکار کر ان کو خطاب کرتا ہے، نیز ان کی کرامت کے لئے کنواں غیب سے ظاہر ہوگیا۔

افسوس ہے کہ اہل کتاب ان فضائل سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے درجہ کو گھٹانے کے لئے کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ لونڈی تھیں۔ مسلمان یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ اس امر میں متفق ہیں کہ فرعونِ مصر نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کے لئے دیا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: هَاجَرَ اِبْرَاهِيْمُ بِسَارَةَ فَاَعْطَوْهَا هَاجَرَ فَرَجَعَتْ فَقَالَتْ اَشَعَرْتَ اَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ كَبَتَ الْكَافِرَ وَاَخْدَمَ وَلِيْدَةً

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابراہیم وسارہ ہجرت کر کے گئے تھے، وہاں سارہ کو ہاجرہ ہبہ میں ملی تو سارہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے

---

[۱] صحیح بخاری: ج۱، ص۴۷۶، قدیمی کتب خانہ، کراچی

آ کر کہا: آپ کو خبر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر کو ذلیل کیا اور ہم کو ایک لڑکی خدمت کیلئے دی۔

وَقَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَخْدَمَهَا هَاجَرَ ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے اُنہوں نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ شاہِ مصر نے ہاجرہؓ کو خدمت کے لئے دیا تھا۔

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا شاہِ مصر کی دُختر تھیں:

یہودیوں کے زبردست مفسّر توراۃ ربی شلوموا سحٰق نے باب ۱۶ کتاب پیدائش کی تفسیر میں حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی بابت مندرجہ ذیل الفاظ تحریر کئے ہیں:

وہ فرعون کی بیٹی تھی جب اس نے کرامات کو دیکھا جو بوجہ سارہ واقع ہوئی تھیں تو کہا کہ میری بیٹی کا اس کے گھر میں خادمہ ہوکر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہوکر رہنے سے بہتر ہے۔

اس شہادت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ہاجرہؓ شاہِ مصر کی دختر تھیں اور شاہِ مصر پر حضرت سارہؓ کی عظمت اس قدر طاری ہوگئی تھی کہ اس نے اپنی بیٹی کو بطورِ خادمہ اُن کے ساتھ کر دینا اپنے اور اپنے خاندان کے لئے فخر وعزت کا باعث سمجھا۔ مبارک ہے سارہ خاتون جس کی خدمت کو بادشاہ کی بیٹی نے اپنی عزت جانا۔ مبارک ہے ہاجرہ خاتون جس کی تربیت ابتدائے عمر ہی سے خلیل الرحمن علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گھر میں ہوئی۔

جولوگ عربی روایات کو پڑھتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ عربی زبان میں ولیدہ، جاریہ، امتہ کے الفاظ دختر کے لئے بھی مستعمل ہوتے ہیں اور لونڈی کے لئے بھی، اور اس کی اصلیت یہ ہے کہ اسلام لونڈیوں کو انہیں الفاظ سے مخاطب کرتا ہے جو لڑکیوں اور دخترو ں کے لئے اصل لغت میں وضع ہوئے ہیں، اس لئے کسی ایسے لفظ کو اگر ہاجرہ خاتون کے لئے مستعمل شدہ دیکھیں تو یہ نہیں خیال کر لینا چاہئے کہ اس سے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا فی الواقع لونڈی ہونا ثابت ہوتا ہے، بلکہ ان کو صحیح بخاری کے الفاظ جو نبی ﷺ کی زبان مبارک کے الفاظ ہیں یاد رکھنے چاہیں، اور وہ الفاظ **فَاَخْدَمَهَا** ہیں۔ خدمت کرنے سے کوئی کسی کا غلام نہیں ہوجاتا، حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دس سال تک نبی ﷺ کی خدمت کی تھی لیکن کوئی شخص بھی ان کو غلام نہیں جانتا۔

سیدنا اسماعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام

اسماعیل ''اسمع'' اور ''ایل'' دولفظوں سے مرکب ہے، عبرانی میں ''ایل'' اللہ کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنی ہیں ''سُن'' چونکہ اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سُن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی، اس لئے اُن کا یہ نام رکھا گیا، عبرانی میں اس کا تلفظ ''شماع ایل'' ہے۔

آپ خلیل الرحمن ابراہیم علیہ السلام کے پہلے فرزند ہیں، جو ہاجرہ خاتون کے بطن اطہر سے پیدا ہوئے، باپ نے ان کا نام اسماعیل رکھا، جو سمیع اللہ کا ہم معنی ہے۔ یہ معنی تورات کی کتاب پیدائش میں بھی اسی طرح بیان کئے گئے ہیں: ''اس لڑکے کی آواز جہاں وہ پڑا ہے اللہ تعالیٰ نے سنی''۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ آباد کیا تھا جہاں اب شہر مکہ بستا ہے، پھر حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام ہی نے خانہ کعبہ کی عمارت تیار کی تھی۔ قرآن مجید میں ہے: وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ[1] (جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادوں کو بلند کر رہے تھے)۔

شادی:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی قبیلہ بنو جرہم کے سردار مسمی مضاض کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ بنو جرہم عرب کا قدیم حکمران قبیلہ تھا اور مضاض اپنے علاقے کا واحد فرماں روا تھا، ایسے اعلیٰ خاندان کی بیٹی کا رشتہ مل جانے کی وجہ صرف سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی ذاتی کرامت اور خاندانی فضیلت تھی، جو عرب جیسی تجارت پیشہ قوم سے جو ہر سال موسمِ سرما میں مصر جایا کرتے تھے مخفی نہ رہ سکتی تھی۔

عربِ مستعربہ:

عرب کی ایک شاخ عربِ مستعربہ ہے، ان کے جدّ اعلیٰ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اصلاً عراق کے ایک شہر اُور کے باشندے تھے۔ یہ شہر دریائے فرات کے مغربی ساحل پر کوفے کے قریب واقع تھا۔ اس کی کھدائی

---

[1] سورۃ البقرۃ: ۱۲۷

کے دوران جو کتبات برآمد ہوئے ہیں، ان سے اس شہر کے متعلق بہت سی تفصیلات منظر عام پر آئی ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خاندان کی بعض تفصیلات اور باشندگانِ ملک کے دینی اور اجتماعی حالات سے بھی پردہ ہٹا ہے۔

قحطانی عرب کو عرب عارَبہ کہتے ہیں، جو عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں اُنہیں عرب مُستعربہ اور عدنانی عرب کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مضاض کی صاحبزادی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بارہ بیٹے عطا فرمائے، جن کے نام یہ ہیں: نابت یا نبایوط، قیدار، ادبائیل، مبشام، مشماع، دوما، میشا، حدد، تیما، یطور، نفیس، قیدمان۔ ان بارہ بیٹوں سے بارہ قبیلے وجود میں آئے اور سب نے مکہ ہی میں بود و باش اختیار کی۔ ان کی معیشت کا دارومدار زیادہ تر یمن اور مصر و شام کی تجارت پر تھا۔ بعد میں یہ قبائل جزیرۃ العرب کے مختلف اطراف میں (بلکہ بیرون عرب بھی) پھیل گئے اور ان کے حالات زمانے کی دبیز تاریکیوں میں دَب کر رہ گئے، صرف نابِت اور قیدار کی اولاد اس گمنامی سے مستثنیٰ ہیں۔

قیدار بن اسماعیل کی نسل مکہ ہی میں پھلتی پھولتی رہی، یہاں تک کہ عَدنان اور پھر ان کے بیٹے مَعَدّ کا زمانہ آ گیا۔ عدنانی عرب کا سلسلہ نسب صحیح طور پر یہیں تک محفوظ ہے۔

عدنان: نبی ﷺ کے سلسلہ نسب میں اکیسویں (۲۱) پشت پر پڑتے ہیں۔ بعض روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ جب اپنا سلسلہ نسب ذکر فرماتے تو عدنان پر پہنچ کر رُک جاتے اور آگے نہ بڑھتے۔ علماء کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ عدنان سے آگے بھی نسب بیان کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق عدنان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان چالیس پشتیں ہیں۔

بہر حال مَعَدّ کے بیٹے نِزار سے (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ مَعَدّ کی کوئی اولاد نہ تھی) کئی خاندان وجود میں آئے۔ درحقیقت نزار کے چار بیٹے تھے اور ہر بیٹا ایک بڑے قبیلے کی بنیاد ثابت ہوا، چاروں کے نام یہ ہیں: اِیَاد، اَنمار، رَبیعَہ اور مُضَر، ان میں سے مؤخر الذکر دو قبیلوں کی شاخیں اور شاخوں کی شاخیں بہت زیادہ ہوئیں۔ چنانچہ رَبیعَہ سے اسد بن ربیعہ، عنزہ، عبدالقیس، وائل، بکر، تَغلب اور بنو حَنِیفَہ

وغیرہ وجود میں آئے۔

مُضَر کی اولاد دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوئی: (۱) قیس عیلان بن مضر (۲) الیاس بن مضر

الیاس بن مضر سے تمیم بن مرہ، ہُذَیل بن مدرکہ، بنو اسد بن خُزَیمہ اور کنانہ بن خزیمہ کے قبائل وجود میں آئے۔ پھر کِنَانَہ سے قُریش کا قبیلہ وجود میں آیا۔ یہ قبیلہ فِہر بن مالک بن نضر بن کِنَانَہ کی اولاد ہے۔

پھر قریش بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوئے۔ مشہور قُریشی شاخوں کے نام یہ ہیں:

جمح، سہم، عَدِی، مخزوم، تَیم، زُہرہ، قُصَیّ بن کلاب کے خاندان۔ یعنی عبدالدار، اسد بن عبدالعزی اور عبد مناف، یہ تینوں قُصَی کے بیٹے تھے۔ ان میں سے عبد مناف کے چار بیٹے ہوئے، جن سے چار ذیلی قبیلے وجود میں آئے: یعنی عَبدُ شَمس، نَوفَل، مُطَّلِب اور ہَاشِم۔ انہیں ہاشم کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے حضور ﷺ کا انتخاب فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کا انتخاب فرمایا، پھر اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ کی نسل سے قریش کو چنا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کا انتخاب کیا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب کیا۔[۱]

---

[۱] صحیح مسلم: ۲/۲۴۵، جامع ترمذی: ۲/۲۰۱

ابتدائے نبوّت کے زمانے کا عرب

ابتدائے نبوّت کے زمانے کا عرب

خط کشیدہ الفاظ مقامات کے نام ہیں۔
باقی قبائل کے نام ہیں۔

ہمارے محبوب حضرت محمد ﷺ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام میں مشابہت:

قرآنِ مجید حضرت اسماعیل علیہ السلام کی صفت میں فرماتا ہے:

كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ''وہ وعدہ کا سچا تھا''۔[۱]

جناب نبی کریم ﷺ کے وعدوں کے پورا ہونے کا ذکر اللہ تعالیٰ نے مومنین کی زبان سے فرمایا ہے:

قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ''یہ تو وہی ہے جس کا وعدہ اللہ اور رسول نے ہم سے کیا تھا اور اللہ اور رسول ﷺ نے سچ فرمایا تھا''۔[۲]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی صفت میں فرمایا گیا ہے:

كَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ''اپنے کنبہ کو صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم دیا کرتا تھا''

اس آیت میں سکھایا گیا ہے کہ اصلاح اوّل کُنبہ سے شروع ہونی چاہیے۔[۳]

نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ''اپنے کنبہ کو نماز کا حکم دے اور اُسی پر قائم رہ''[۴]

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ''اپنے کنبہ کے زیادہ تر نزدیکیوں کو (خصوصیت سے) ڈرادے''۔[۵]

ہر دو آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے اہلِ خانہ کے علاوہ اقارب کو بھی خاص اہتمام سے تبلیغ رسالت فرمائی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَعَهِدْنَا اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ

---

[۱] مریم: ۵۷

[۲] الاحزاب: ۲۲

[۳] مریم: ۵۵

[۴] طٰہٰ: ۱۳۲

[۵] شعراء: ۲۱۴

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ [۱]

''ہم نے ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے پاک کرو''۔

یہ ظاہر ہے کہ اس عہد میں حضرت اسحٰق علیہ السلام اور ان کی شاخ داخل نہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فخرِ دوزمان فرزند یعنی نبی ﷺ نے دُنیا کو یہ حکم سُنایا۔ اس حکم سے ظاہر ہے کہ نبی ﷺ ہی نے بتایا کہ کعبہ ہی تمام مساجدِ دُنیا کا قبلہ ہے۔

فرزندِ عہد:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ اسی روز کیا گیا جس روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا ختنہ بھی کیا تھا کیونکہ اُسی روز یہ حکم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ تُو اور تیرے بعد تیری نسل پُشت در پُشت میرے عہد کو جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے، اسے تم یاد رکھو! سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزندِ نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ پس اسماعیل علیہ السلام وہ فرزند ہیں جو عہد کا حکم نازل ہونے کے بعد پہلے ہی روز خدائے برتر کے عہد میں داخل ہوئے۔

حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام:

حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی وہ بزرگ ہیں جن کو ذبیح اللہ کا لقب حاصل ہوا۔ اہل کتاب کا دعویٰ ہے کہ ذبیح حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں اور جمہور مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ مسلمانوں کا حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبیح ہونے سے انکار معاذ اللہ اس بنیاد پر نہیں جس بنیاد پر اہل کتاب کا ہے، اہل کتاب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ہر ایک فضیلت سے انکار کرنے کو لازمہ مذہب سمجھتے ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام وحضرت اسحاق علیہ السلام دونوں برابر ہیں۔ چچا کو صِنوِ اَبْ حدیث ہی میں فرمایا گیا ہے، اس سے بھی عام تر یہ بات ہے کہ ہم ہر ایک نبی پر ایمان لانا ایسا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیسا کہ خود اپنے نبی ﷺ پر۔ اس لئے یہ کسی مسلمان سے کیوں کر ہوسکتا ہے کہ کسی

---

[۱] البقرۃ:۱۲۵

نبی اللہ کی فضیلت کا انکار محض حسد وعناد سے کرے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذَالِکَ

چنانچہ جن معدودے چند مسلمان عالموں کے نزدیک حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذبیح ہونا ثابت ہوتا تھا انہوں نے آزادی سے اپنے مذہب کا اظہار کیا ہے اور متاخرین نے ان کے اقوال نقل کئے ہیں اور بایں ہمہ ایسے علماء کی ذات پر کسی نے کسی توہین آمیز لفظ کا استعمال نہیں کیا۔

جمہور اُمت کا مسلک:

کچھ لوگوں کے نزدیک ذبیح اللہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں لیکن دوسرے تمام حضرات اور جمہور امت کے نزدیک بھی اصل بات یہی ہے کہ ذبیح اللہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اسی قول کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، ابوطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب رحمہ اللہ، امام شعبی رحمہ اللہ، یوسف بن مہران رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ اور امام شعبی رحمہ اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے مینڈھے کے دونوں قرنوں (سینگوں) کو کعبۃ اللہ سے لٹکے ہوئے دیکھا ہے۔

اور عمر بن عبید رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹوں میں سے جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں اور یہی روایت حضرت عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ قربان ہونے والے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور یہود جو یہ گمان کرتے ہیں کہ ذبیح اللہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ، محمد بن کعب القرظی رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے بیٹوں میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا اور ہم نے کتاب اللہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سچے قصے میں یہی بات دیکھی ہے کہ جس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں۔

اور کتاب اللہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ جب اللہ رب العزت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ'' کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق کی بشارت دی جو کہ نیکوکار نبی ہے۔ نیز فرمایا کہ ''فَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ'' تو ان

آیات میں بیٹے اور بیٹے کے بیٹے کے ذکر کو بیان کیا لیکن حضرت اسحاق علیہ السلام کے ذبح کا حکم نہیں دیا، اور اس میں اللہ ربّ العزت کی جانب سے اسی موعود کا بیان ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا اور وہ یہی ہے کہ اللہ رب العزت نے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا تھا (نہ کہ اسحاق علیہ السلام کا)۔

عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی رائے:

محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سارا قصہ اس وقت کے خلیفہ حضرت امیر المومنین عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا جس وقت میں ان کے ساتھ شام میں تھا، تو عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے جواب میں فرمایا کہ اس بارے میں تو میری بھی کوئی اور رائے نہیں ہے، میرے نزدیک بھی وہی رائے ہے جو تم نے مجھے بتایا ہے (یا جو تمہاری رائے ہے)۔

یہودی عالم کی گواہی:

محمد بن کعب قرظی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پاس سے ایک شخص کو میری طرف بھیجا جو ملک شام کا رہنے والا تھا، وہ یہودی تھا، بعد میں وہ اسلام لے آیا اور بہت عمدہ طریقے سے اسلام کی تعلیمات پر عمل کرتا تھا اور وہ دیکھنے میں یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ یہود کے علماء میں سے ہے۔ تو جب میں عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہی موجود تھا تو انہوں نے اس سے سوال کیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے کس کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو۔

پھر اس شخص نے کہا کہ اے امیر المومنین! اللہ کی قسم! یہود اس بات کو جانتے ہیں لیکن وہ آپ سمیت تمام عرب والوں سے اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ ان کے باپ یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اور انہوں نے اللہ ﷻ کے اس حکم پر سر تسلیم خم بھی کر دیا تھا۔ پس وہ یہود اس بات پر جھگڑتے ہیں اور یہی گمان کرتے ہیں کہ ذبیح اللہ حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں کیونکہ وہ یہود خود حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خصوصیات:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے عرب، حجاز، یمن وحضرموت کے لئے نبی مبعوث فرمایا تھا اور ان کا وجود مسعود مختلف قوموں اور ملکوں کے اتحاد کا ذریعہ تھا۔ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹے فرزند ہیں جو عراق میں پیدا ہوئے اور شام میں سکونت فرمائی، وہ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے اکلوتے بیٹے ہیں جو مصر میں پیدا ہوئیں اور شوہر کے ساتھ فلسطین اور شام رہ کر عرب میں آباد ہوئیں، وہ بنو جرہم کے داماد ہیں جو عرب کا حکمران قبیلہ تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مسکن ایسی جگہ ہے جس کے ایک طرف مصر ہے جہاں ان کے ننھیال ہیں، ایک طرف عراق ہے جہاں ان کے ددھیال ہیں، ایک طرف شام ہے جہاں ان کا بھائی اسحاق علیہ السلام رونق افروز ہے اور ایک طرف یمن ہے جہاں ان کے بھائی ابناءِ قنطورا پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مادری زبان قبطی ہے اور پدری زبان عبرانی ہے، ان کے سسرال خالص عربی زبان کے مالک ہیں، انہی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عربی میں کمال پیدا کرلیا تھا۔

ان سب ملکوں میں ان سب زبانوں کے اندر تبلیغِ دین اور اشاعتِ توحید کے جو مواقع قدرت ربانیہ نے ان کو عطا کئے تھے، یہ بتا رہے ہیں کہ یہی وہ بزرگ ہیں جن کا نام بردار فرزند یعنی حضور ﷺ کو کل عالم کی ہدایت کے لئے چُنا جائے اور اللہ کے کلام اور پھر انسان کی زبان سے اس کا لقب ''رحمۃ للعالمین'' مُسَلَّمْ ہوا۔

تورات اور حدیث میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تیرانداز تھے۔ بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ بنانے کے ارادے سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس مکہ میں پہنچے تو اس وقت تیر کی نبل یعنی لوہے کی مکھیا بنا رہے تھے، جس سے ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام صنعتِ حدادی کے بھی ماہر تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی بہوز وجہ اسماعیل علیہ السلام نے بتایا تھا طَعَامُنَا اللَّحْمُ وَشَرَابُنَا الْمَآءُ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام نے اپنی زیست کو صرف گوشت اور پانی پر پورا کر دیا تھا۔

قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف اس طرح فرمائی گئی ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا، وَكَانَ يَأْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا [۱]

ذکر کر کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا، وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول و نبی تھا۔ وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ صدقہ یا پاکیزگی کا حکم دیا کرتا تھا اور وہ اپنے ربّ کا پسندیدہ تھا۔

آیت بالا میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو وعدہ کا سچا بتلایا گیا ہے، ہم کو دوسری آیت سے اس وعدہ کا پتہ لگتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ [۲]

ہم نے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام سے عہد کر لیا ہے کہ میرا گھر طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنیوالوں اور رکوع وسجود کرنے والوں کے لئے پاک کرو۔

پس دونوں آیتوں سے یہ حاصل ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جو عہد حضرت اسماعیل علیہ السلام سے لیا تھا اُسے انہوں نے پورا کیا اور عبادتِ الٰہی کرنے والوں کو اعتقادِ صحیح، اعمالِ صالحہ، ارکانِ محکمہ، شرعِ روشن اور ہدیٰ واضح کی تعلیم فرمائی اور امثال وتفہیم وتبلیغ کے ایسے ایسے نمونے قائم کئے اور باقی چھوڑے جو انہی کی شانِ عالیہ کے شایان تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں کمالِ تاثیر:

توراۃ میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ۱۳۷ سال کی عمر پائی اور تاریخ مکہ میں ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی والدہ کے پہلو میں مطاف کعبہ کے اندر مدفون ہوئے۔ اللہ اکبر! حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا: رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ''اے اللہ! میں نے اپنے کنبے کو تیرے عزت والے گھر کے پاس بسایا ہے'') کی تاثیر کہاں تک پہنچی

---

[۱] مریم: ۵۴، ۵۵

[۲] البقرۃ: ۱۲۵

ہے کہ مر کر بھی ان نفوسِ قُدسیہ نے جوار بیت اللہ یعنی ہمسائیگی خانہ خدا کو ترک نہیں کیا۔

بنی اسرائیل

بنی اسرائیل کا عروج:

بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا، توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی، انبیاء ومرسلین ان کے درمیان ہوتے رہے، بڑے بڑے عابد وزاہد ان میں پیدا ہوئے، حکمران، سلاطین اور فوجی جنرل بھی ان میں بڑے بڑے پیدا ہوتے رہے، نزولِ قرآن کے وقت ان کا دنیوی اقتدار بڑی مدت سے رخصت ہو چکا تھا، اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ اطراف وجوانب میں پھیل چکے تھے اور ان کے بعض قبیلے حجاز واطرافِ حجاز، خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد میں مدینۃ النبی پڑا) اور حوالی یثرب میں آباد ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل کی مذہبی حیثیت:

''بنی اسرائیل'' تو ایک قومی ونسلی اصطلاح ہے، مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے، اہل کتاب تھے، سلسلہ وحی ونبوت اور عقیدہ جزاء وسزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے، علومِ انبیاء ومعارفِ اولیاء کے حامل تھے، مالدار تھے، ساتھ ہی ساتھ سفلی عملیات، سحر وکہانت، نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے، حجاز کی آبادی میں اس دینی ودنیوی تفوق کی بناء پر انہیں اس وقت اچھی خاصی اہمیت حاصل تھی۔

ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بُت پرستوں کی تھی، وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم وفضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے، اور دوسری طرف اکثر ان کے قرض دار بھی رہا کرتے تھے، گویا دینی ودنیوی اکثر حاجتوں میں انہیں کو مشکل کُشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظّم وقاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظّم قومیں مرعوب ومتاثر ہو جاتی ہیں، مشرکینِ عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے، اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنا اُستاد جانتے تھے۔ ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلیوں کی مقدس زبانی روایتوں، دونوں میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی اور یہ لوگ اس نبی موعود کے منتظر رہتے تھے، ان اسباب عام وخاص دونوں کی بناء پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو اور خوب مفصّل ہو۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک مسلم شخصیت:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو وہ بزرگ تھے جن سے علاوہ مشرکین عرب کے، یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے، توریت میں آپ کا نام ابرام اور ابراہیم دونوں طرح سے آیا ہے۔ توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہوا ہے یعنی آپ ان کی گیارھویں پشت میں تھے۔ سال ولادت ۲۱۶۰ ق۔م میں ہے اور عمر شریف توریت میں ایک سو پچھتر سال درج ہے، سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ ق۔م ٹھہرتا ہے۔

والد کا نام تارخ تھا یا عربی تلفظ میں آزر، نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے، مسلمانوں کے لئے قرآنی لفظ آزر کافی ہے، وطن آبائی ملک بابل یا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) تھا، جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں، جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی، اس کا نام توریت میں اُوْر آیا ہے، مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب تھا، اب از سر نو نمودار ہو گیا ہے، یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے۔

ابراہیمی و اسماعیلی شخصیت:

نسلِ اسرائیلی اور نسلِ اسمٰعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آرہی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں سلسلوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اللہ کی نعمت خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھن کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کے لئے عام ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ابراہیمی شخصیت (اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت) کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے۔

لفظِ ابراہیم کے سُریانی زبان میں جو بھی معنی ہوں عربی اہلِ لغت نے اپنی زبان میں اَبٌ رَحِیْمٌ کے معنی میں لیا ہے، اس لئے کہ آپ کی شفقت اولاد کے ساتھ مسلّم و معروف ہے۔ حدیث نبوی میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچوں کی بعد وفات قیامت تک کفالت و تربیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذمہ رہے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا اعلان:

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ''ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں''۔

فقیہ جصاص رازی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ:

فَالْاَنْبِیَاءُ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ فِیْ اَعْلٰی مَرْتَبَةِ الْاِمَامَةِ ثُمَّ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُوْنَ بَعْدَ ذٰلِکَ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ وَالْقُضَاةُ الْعُدُوْلُ وَمَنْ اَلْزَمَ اللّٰهُ بِاِقْتِدَاءِ هِمْ ثُمَّ الْاِمَامَةُ فِی الصَّلٰوةِ وَنَحْوِهَا۔[۱]

امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر تو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام فائز ہوتے ہیں، ان سے اُتر کر خلفائے راشدین ہیں، پھر علماء اور عادل قضاۃ ہیں اور وہ جن کی پیروی اللہ نے لازم کردی ہے، پھر امامتِ نماز ہے وغیرہا۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ حضرت ابراہیم علیہ السلام بولے اور میری نسل سے بھی (امام ہوتے رہیں گے)۔ عالم کی پیشوائی، سرداری و امامت کی بشارت پا کر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہوگیا اور اس جوشِ مسرت میں سوال کر بیٹھے کہ اس انعام میں میری نسل اور میری اولاد بھی شریک ہے نا؟

ذُرِّیَّة کے معنی ہیں اولاد اور اولاد در اولاد، اس میں سارا سلسلہ نسل آ گیا اور یہ سلسلہ ابراہیمی شاخِ اسرائیلی اور شاخ اسمٰعیلی دونوں کو شامل ہے، اسرائیلیوں کا جو دعویٰ تخصیص تھا اس کی جڑ یہی سے کٹ گئی۔

قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ''ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا''۔ یعنی برکت و فضل کا سلسلہ تمہاری نسل میں بھی ضرور رہے گا لیکن اس کے تحقق کے لئے محض اِرث، نسب اور نسل کافی نہیں بلکہ ایمان و عملِ صالح بھی حاصل کرنا ہوگا، گویا دعائے ابراہیمی اولادِ صالح کے حق میں قبول ہوگئی۔[۲]

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خبر دے دی گئی کہ آپ کی نسل میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے، کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم اور نافرمان، صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی اور ظالم اس سے محروم کردیئے گئے۔

---

[۱] احکام القرآن

[۲] جلالین

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ اے اللہ! اُمّت مسلمہ پیدا فرما اور اس میں عظیم الشان نبی بھیج، جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، اور انہیں کتابِ الٰہی اور دانائی کی تعلیم دے اور انہیں پاک (وصاف) کرے۔[۱]

ذرا سا غور کرنے سے نظر آجائے گا کہ رسول اعظم ﷺ کے جملہ فرائض کمال ایجاز کے ساتھ ان چند فقروں میں آگئے ہیں:

۱۔ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ رسول کا پہلا کام اپنی اُمّت کے سامنے تلاوت آیات ہوتا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا، گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلغ اعظم کی ہوتی ہے۔

۲۔ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہوجاتا، اس کا کام کتابِ الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے، اس تعلیم کے اندر کتاب کی شرح، ترجمانی، تعیم میں تخصیص، تخصیص میں تعیم سب کچھ آگیا اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہوگئی جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں، گویا رسول ﷺ کی دوسری حیثیت معلّمِ اعظم کی ہوئی۔

۳۔ وَالْحِكْمَةَ پھر رسول ﷺ تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی اُمّت کو کریں گے، احکام و مسائل، دین کے قاعدے اور آداب، عوام و خواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کی رہنمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے، گویا رسول ﷺ کی تیسری حیثیت مُرشدِ اعظم کی ہوئی۔

۴۔ يُزَكِّيهِمْ تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے، رسول کا کام محض الفاظ اور احکامِ ظاہر کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے، گویا رسول ﷺ کی یہ چوتھی حیثیت مُصلحِ اعظم کی ہوئی۔

---

[۱] البقرۃ:۱۲۹

حبیب الرحمٰن ﷺ اور خلیل الرحمٰن ابراہیم علیہ السلام میں مشابہت کلی:

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نبی کریم ﷺ کو نہایت قرب اور مشاکلت کلی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی نے دعا مانگی تھی کہ حضور ﷺ مکہ میں ہوں، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو فرمایا: ''وَاتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا''۔ اس لئے واقعات ذیل خاص غور کے لائق ہیں:

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

يَانَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ ''اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی بن جا''۔[۱]

نبی ﷺ کی بابت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ''وہ جب جنگ کے لئے آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے''۔[۲]

۲۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنایا:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ [۳]

''جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادوں کو بلند کرتے تھے''۔

نبی ﷺ نے اس کعبہ کو قبلہ بنانے کے لئے منتخب کرلیا اور ربّ العالمین نے حضور ﷺ کے میلان قلب کو دیکھ کر اسی کے موافق حکم نازل فرمایا:

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا [۴]

(اے پیغمبر!) ہم تمہارے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اُٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ تمہارا رُخ ضرور اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جو تمہیں پسند ہے۔

---

[۱] انبیاء: ۶۹

[۲] المائدہ: ۶۴

[۳] البقرۃ: ۱۲۷

[۴] البقرۃ: ۱۴۴

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بُت خانہ کے بتوں کو توڑا:

فَجَعَلَهُمْ جُذَاذًا ''پس انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا''۔[۱]

نبی ﷺ نے کعبہ کے ۳۶۰ بتوں کو باہر نکلوا کر دائمی حکم، بطلانِ صنم پرستی کا صادر فرمایا:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا[۲]

''حق آ گیا، باطل چلا گیا، باطل تو جاتے رہنے والا ہی ہے''۔

۴۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے منکر وجودِ باری تعالیٰ کے ساتھ جو مناظرہ کیا تھا وہ قرآن مجید میں مذکور ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ[۳]

''اللہ تعالیٰ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے''۔

نبی ﷺ نے بھی منکر حشرِ اجساد پر جو دلائل قائم کئے ہیں وہ کتابِ حکیم میں درج ہیں:

قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۙ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ[۴]

کہہ دے مُردہ کو وہی زندہ کرے گا جس نے اسے بار اوّل پیدا کیا تھا، وہ ہر پیدائش کی حالت کا خوب علم رکھتا ہے، وہ جس نے سبز درخت سے آگ کو نکالا، جس سے تم روشنی لیا کرتے ہو۔

ہر دو واقعات میں مشابہت کُلی اس طرح بھی قائم ہو جاتی ہے کہ دلائلِ ابراہیمی بھی تعلیم من اللہ کا نتیجہ تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا: تِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ اور براہینِ محمدی بھی وحی من اللہ ہیں، اسی آیت کے آغاز میں لفظ قُلْ اس راز کا انکشاف کر رہا

---

[۱] سورۃ الانبیاء: ۵۸

[۲] بنی اسرائیل: ۸۱

[۳] البقرۃ: ۲۵۸

[۴] سورۂ یٰسین: ۷۹: ۸۰

ہے۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ابتدائی عمر میں ایک بیوی پر اکتفا کر کے پھر آخر عمر میں متعدد نکاح کئے، نبی ﷺ نے بھی اسی سُنّت ابراہیمی پر عمل فرمایا۔

۶۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں میں حج کا اعلان کیا:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ''لوگوں میں حج کا اعلان کردے''۔[۱]

نبی ﷺ نے فرضیت حج کا حکم مع شرائطِ استطاعت سنایا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا [۲] اور لوگوں میں سے جو لوگ اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اللہ کے لئے اس گھر کا حج کرنا فرض ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اَلْبُغْضُ لِلّٰهِ کی صفتِ جلیلہ میں دُنیا کے سامنے نمونہ بنایا:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ [۳]

تمہارے لئے عُمدہ نمونہ ہے ابراہیم علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے بھی بیزار ہیں اور جن کی عبادت اللہ کے سوا کرتے ہو اُن سے بھی بیزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سرورِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تمام دُنیا کے لئے اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ کی صفتِ جمیلہ میں بہترین نمونہ ٹھہرایا اور ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ

---

[۱] الحج: ۲۷

[۲] آل عمران: ۹۷

[۳] الممتحنہ: ۴

الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا [۱]

اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے ان سب کے لئے جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کثیر کیا کرتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ یہی ہر دو صفات ہیں جن سے ایمان باللہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان صفات میں ہی پدرِ اعظم اور سید وُلدِ آدم علیہم السلام تمام عالم کے لئے اُسوہ قرار دیئے گئے ہیں۔ دُنیا کو ضرورت ہے کہ ان بہترین و اکمل ترین سیرت اور افعال سے بخوبی واقف ہو، تاکہ ہر قول، ہر فعل، ہر عمل اسی نمونہ کے مطابق کیا جائے جو منظور شدہ بارگاہِ سرمدی ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے خُلق کی تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ''ابراہیم (علیہ السلام) بہت نرم دِل اور بُردبار تھا'' [۲]

نبی ﷺ کے خلق کی بھی کلامِ مبین میں صفت فرمائی گئی، فرمایا:

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ''تو بزرگ ترین اخلاق پر متصرف ہے''۔ [۳]

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ [۴]

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ تجھے نرم خُو بنایا، اگر تو درشت طبع، سخت دِل ہوتا تو لوگ تیرے پاس سے بھاگ جاتے۔

وہ حبیب اللہ ہے اور اس تقرب کا مالک ہے جس کا ذکر حدیث صحیح میں بندہ عابد و ساجد کے لئے ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے:

''فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ وَلِسَانَهُ الَّذِىْ يَنْطِقُ بِهٖ''۔ (الحدیث)

---

[۱] الاحزاب: ۲۱

[۲] التوبہ: ۱۱۴

[۳] القلم: ۴

[۴] آل عمران: ۱۵۹

وہ حلیم ہے، حلیم، حلم، بالضم سے بھی ہے اور یہ لفظ وفورِ دانش اور کمالِ عقل پر دال ہے۔ دوسرا معنیٰ پتھر کھانے والا اور جواہر لُٹانے والا، سخت باتیں سن کر دعائیں کرنے والا ہے۔

محبت کے دس مراتب:

اہلِ عرب کے نزدیک محبت کے دَس مراتب ہیں:

۱) علاقہ: دِل کا ذرا سا اٹکاؤ۔

۲) ارادہ: وہ میلان جو علاقہ کے بعد نمودار ہو۔

۳) صبابت: صَبَا یصباءُ پانی کا نشیبی زمین پر بہہ نکلنا، اور اس جگہ بے اختیاری شوق کا نام ہے۔

۴) غرام: غرام قرض یا تاوان کو کہتے ہیں اور یہاں اس محبت لازم کا نام ہے جو قرض ہو کر چمٹ جاتی ہے اور کسی وقت بھی علیحدہ ہی نہیں ہوتی۔

۵) وداد: خلوصِ محبت اور مغزِ محبت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا نام بھی ودود بتلایا ہے۔

۶) شَغف: شغاف پردہ دل اور شغف وہ محبت جو قعرِ دل تک جا پہنچے۔

۷) عشق: یہ عشقہ سے بنایا گیا ہے، یہ ایک زرد رنگ کی بیل ہوتی ہے، جس درخت سے لپٹ جاتی ہے اُسے خشک کر دیتی ہے اور عشق کی تاثیر بھی عاشق کے حق میں یہی ہے۔

۸) التیم: انکسار اور عجز تمام کو کہتے ہیں، یتیم کا نام یتیم بھی اسی لئے ہوا کہ وہ انکسار اور عجزِ تام کا مورد ہوتا ہے۔

۹) التعبد: جب کہ محب جملہ دعاوی تملیک نفس و مال و عزت سے دستبردار ہو کر سارے دل و جان سے دوسرے کا غلام بن جائے۔

۱۰) خلت: جب کہ دل وسوسہ غیر سے اور عقل تعقل غیر سے اور نیت و عزم تعبد و تشوقِ غیر سے کُلیۃً خالی ہو جاتا ہے۔ اس مرتبہ کی تکمیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ ہی نے فرمائی ہے۔

عوام میں مشہور یہ ہے کہ درجہ خلّت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہے اور وہ خلیل الرحمن ہیں اور

درجہ محبت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے ہے اور وہ حبیب اللہ ہیں، لیکن دو احادیث صحیحہ میں نبی ﷺ کا خلیل الرحمن ہونا بھی ظاہر فرمایا گیا ہے:

۱۔ ''اِنَّ اللّٰہَ اِتَّخَذَنِیْ خَلِیْلًا کَمَا اتَّخَذَ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا''۔

۲۔ ''لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا مِّنْ اَھْلِ الْاَرْضِ خَلِیْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلًا وَّلٰکِنَّ صَاحِبَکُمْ خَلِیْلُ الرَّحْمٰنِ''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آٹھ صاحبزادے تھے:

(۱) حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے۔

(۲) حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت سارہ عراقی کے بطن سے۔

(۳) زُمران (۴) یقسان (۵) مدان (۶) مدیان (۷) اَسیاق (۸) سُوخ۔

یہ سب حضرت قنطورا کے بطن سے تھے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام:

حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے پوتے اور حضرت اسحاق علیہ السلام نبی کے صاحبزادہ تھے اور نبی زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے، اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے، توریت میں ہے:

''اور خدا نے اُسے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے، تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا، سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا''۔

عمر حسب روایت توریت ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال کی پائی، زمانہ غالباً ۱۸۵۳ء تا ۲۰۰۰ق۔م ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی۔ ۱۸۷۰ق۔م میں اپنے نامور فرزند حضرت یوسف علیہ السلام نبی کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے، وفات یہیں ہوئی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد:

چار ازواج طاہرات سے آپ کے بارہ فرزند تھے، ان کے نام حسب تصریح توریت حسب ذیل ہیں:

روبن، شمعون، لادی، یہودہ، اشکار، زبلون، یوسف، بنیامین، دان، نفتالی، جد، آشر۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ ''اے یعقوب کے بیٹو! میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا''۔[۱]

تفسیرِ عزیزی میں ہے:

اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام ہے، عبرانی زبان میں اسرا کے معنی بندہ کے ہیں اور ئیل بمعنی اللہ، پس اس کلمہ کے معنی ''عبداللہ'' ہوئے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا اصل نام یعقوب ہی تھا:

عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ نے ابوحجاز سے روایت کی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اصلی نام جو حضرت اسحاق علیہ السلام نے رکھا تھا ''یعقوب'' تھا۔ اس وجہ سے کہ حضرت یعقوب اور حضرت عیص دونوں ایک حمل سے پیدا ہوئے تھے، حضرت عیص پہلے پیدا ہوئے اور حضرت یعقوب پیچھے یعنی بعد میں پیدا ہوئے، اس لئے حضرت اسحاق علیہ السلام نے ان کا نام یعقوب رکھا کہ عیص کے عقب میں پیدا ہوئے۔ عبرانی زبان میں یعقوب کا معنی پیچھے آنے والا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام اسرائیل رکھنے کی وجہ:

حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہی نام جوانی تک رہا، یہاں تک کہ ایک دن حضرت اسحاق علیہ السلام خلوت خانے میں تھے، حضرت یعقوب علیہ السلام کو دروازے پر بٹھا دیا، تاکہ کوئی خاص وقت میں اندر نہ جائے، اور مناجاتِ الٰہی میں تشویش نہ ڈالے۔ دفعتاً ایک مقرب فرشتوں میں سے ایک فرشتہ آدمی کی شکل وصورت میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی زیارت کے لئے آیا اور چاہا کہ خلوت خانہ میں جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے زبردستی اس کو روکا اور اندر نہ جانے دیا، یہاں تک کہ حضرت اسحاق علیہ السلام باہر تشریف لائے، آپ نے جب یہ حال دیکھا کہ وہ فرشتہ سے مقابلہ کر رہے ہیں تو انہوں نے فرشتہ سے

---

[۱] البقرۃ: ۴۰

عذر کیا۔ اُس فرشتہ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت سراہا اور آفرین کی کہ خدمت کا حق ایسے ہی بجالانا چاہئے۔ اور حضرت اسحاق علیہ السلام سے کہا کہ تمہارے اس فرزند کا کیا نام ہے؟ انہوں نے فرمایا: یعقوب۔ فرشتہ نے کہا کہ میری طرف سے اس فرزند کا نام اسرائیل رکھو، اس لئے کہ ہماری زبان میں اسرا کے معنی برگزیدہ کے ہیں اور ئیل بمعنی خدا، اور تمہارا یہ فرزند بندۂ خدا ہے کہ ہرگز کسی کا پاس نہیں کرتا ہے۔ اس وقت سے ان کا نام اسرائیل مشہور ہوا، اسی وجہ سے ان کا نام فرشتوں کے نام کے ساتھ ملتا ہے جیسا کہ جبرائیل، میکائیل۔

اندازِ خطاب میں بنی اسرائیل کہنے کی حکمت:

خطاب کے وقت اس طرح نہیں فرمایا کہ اے اولادِ یعقوب! تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ اے بنی اسرائیل تم بیٹے اس مردِ خدا کے ہو جو اللہ کا مقبول تھا اور اپنے باپ کی فرمانبرداری کے واسطے کسی کی پرواہ نہیں کی اور نہ ہی کسی کا پاس کیا۔ تمہیں بھی چاہئے کہ اَلْوَلَدُ سر لِاَبِیْہِ کے موافق اللہ کے عہد اور اس کے حکم کو پورا کرنے میں دنیا کے چلے جانے کی پرواہ نہ کرو، زوالِ مرتبہ اور ریاست کے چلے جانے سے نہ ڈرو۔ اگر اس کام میں قصور کرو گے تو اپنے باپ کے راستہ کی مخالفت کرو گے اور اپنے صحتِ نسب میں خلل ڈالو گے۔

حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جو انبیاء ذکر کرنے میں آتے ہیں اور مشہور ہیں تمام بنی اسرائیل میں سے ہیں، مگر دس پیغمبر حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد:

حضرت یعقوب علیہ السلام کے باپ حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت لوط علیہ السلام کی لڑکی سے نکاح کیا تھا، اُس بی بی سے دو بیٹے ایک حمل سے پیدا ہوئے حضرت عیص اور حضرت یعقوب علیہ السلام۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کا اپنے بیٹوں کے لئے دعا کرنا:

حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت عیص کو بہت چاہتے تھے اور اُن کی بیوی حضرت یعقوب سے بہت

پیار کرتی تھیں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام نے اپنی آخری عمر میں حضرت عیص سے ایک دن فرمایا کہ کسی خاص وقت میں میرے پاس حاضر ہونا تا کہ میں تیرے واسطے دعا کروں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے لئے نبوّت کی دعا:

یہ بات اُن کی بیوی نے سُن لی اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت عیص کا لباس پہنا کر بھیجا اور کہا کہ اپنی آواز عیص کی آواز سے مشابہ کر کے پکارنا کہ میں حاضر ہوں جو دعا کا وعدہ میرے واسطے کیا ہے پورا کریں۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کو اخیر عمر میں ضعفِ بصارت ہو گیا تھا جبکہ حضرت یعقوب علیہ السلام اُسی شکل اور لباس میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے روبرو گئے، چنانچہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے اُن کے واسطے دعا کی: دعا کا مضمون یہ تھا کہ حق تعالیٰ تیری اولاد میں نبوت جاری رکھے۔

حضرت عیص کے لئے بادشاہت کی دعا:

کچھ دیر کے بعد حضرت عیص آئے اور انہوں نے دعا کروانی چاہی تو حضرت اسحاق علیہ السلام نے فرمایا کہ کچھ دیر پہلے اس خاص وقت میں تو آپ آئے تھے اور میں نے دعا کر دی ہے۔ حضرت عیص نے کہا مجھے تو خبر نہیں ہے، تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام آ کر برکت کی دعا لے گئے ہیں۔ چنانچہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے حضرت عیص کے لئے دوسری دعا فرمائی کہ حق تعالیٰ تیری نسل سے بادشاہ کرتا رہے گا۔

جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات قریب پہنچی تو دونوں بیٹوں کو وصیتیں فرمائیں، لیکن مسجد اور سجادہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے حوالے کیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی وفات کے بعد تمام مال پر حضرت عیص متصرف ہوئے اور لوگوں کا رجوع انہیں کی طرف ہو گیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام فقیر اور بے مایہ رہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے ماموں لایان کے پاس جانا:

حضرت یعقوب علیہ السلام کی والدہ نے جب یہ حال دیکھا تو حضرت یعقوب علیہ السلام کو کہا اس جگہ تمہاری بود و باش مناسب نہیں ہے، میرے بھائی لایان کے پاس چلے جاؤ، اُس کے گھر میں کئی لڑکیاں ہیں اور وہ مالدار آدمی ہے، ایک لڑکی کا نکاح تمہارے ساتھ کر دے گا اور تم کو معاش کی طرف سے بھی فراغت

حاصل ہوگی۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کا نکاح:

جب حضرت یعقوب علیہ السلام لایان یعنی اپنے ماموں کے پاس پہنچے تو وہ اُن کے آنے سے بہت خوش ہوا، اُن کی والدہ اور اُن کے بھائی کا حال دریافت کیا، اور کہا کہ تو میرا بیٹا ہے، یہ کہہ کر اپنے گھر کے تمام اموران کے حوالے کر دیئے اور اپنی بڑی بیٹی سے اُن کی شادی کر دی۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُس بیوی سے چار بیٹے پیدا ہوئے: (۱) روئیل (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہودا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بیوی فوت ہوگئی تو لایان نے اپنی دوسری بیٹی کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ ان سے بھی دو بیٹے پیدا ہوئے اور یہ بھی مر گئیں۔ لایان نے تیسری لڑکی کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ دو بیٹے اور ایک لڑکی اُن سے پیدا ہوئی اور وہ بھی مر گئیں تو لایان نے اپنی چوتھی لڑکی راحیل کا نکاح اُن کے ساتھ کر دیا۔ اسی راحیل سے حضرت یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔

اعلانِ نبوت اور کنعان کی طرف کوچ:

جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو وحی آئی کہ ہم نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے۔ اب آپ سرزمین کنعان کی طرف جائیں اور وہاں کے لوگوں کو اپنے آباء واجداد کا دین تلقین کریں۔ جب یہ واقعہ لایان سے بیان کیا تو وہ سجدہ شکر بجالایا اور کہا کہ ہر چند کہ تیری اور اپنی بیٹی کی جدائی میرے اوپر شاق ہے لیکن میری رضامندی کے اوپر اللہ کی رضامندی مقدم ہے۔ میرے مال میں سے جو کچھ آپ کو چاہئے آپ لے لیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے مال کی کوئی حاجت نہیں لیکن میرے اہل وعیال کو میرے ساتھ بھیج دیں۔

لایان کی فراخ دلی:

چنانچہ لایان نے اپنی بیٹی کو مع فرزندوں کے رخصت کیا اور پانچ سو بکریاں، پانچ سو بیل، پانچ سو اونٹ، پانچ سو خچر اور بہت سے غلام جانوروں کی خدمت اور حفاظت کے لئے ہمراہ کر دیے، بہت سی نقدی اور پوشاک بھی ان کو دی۔

حضرت عیص کا حضرت یعقوب علیہ السلام سے دُعا کی درخواست کرنا:

حضرت یعقوب علیہ السلام جب کنعان پہنچے اور یہ خبر عیص کو پہنچی تو انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملاقات کی اور کمالِ ادب سے اُن سے درخواست کی کہ حق تعالیٰ نے تم کو میرے اوپر بزرگی دی ہے، میرے واسطے دعا کرو کہ میری نسل سے بھی پیغمبر پیدا ہوں، حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری پشت سے ایوب پیغمبر پیدا ہوگا اور ذوالقرنین بادشاہ جو مشرق ومغرب کا مالک ہوگا۔

راحیل کی وفات اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پرورش:

حضرت یعقوب علیہ السلام شہر کنعان میں ہی تھے کہ راحیل سے حضرت یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے، حضرت یوسف علیہ السلام دو برس کے تھے کہ راحیل فوت ہوگئیں۔ لایان نے جب یہ ماجرا سنا تو اپنی پانچویں لڑکی جو کہ سب سے چھوٹی تھی، بہت سارے جہیز کے ساتھ ان کے پاس بھیج دی۔ چنانچہ اسی نے حضرت یوسف علیہ السلام کی پرورش کی۔

نعمتیں دیکھ کر یادِ الٰہی بجالائیں:

حضرت یعقوب علیہ السلام کے تمام فرزند حضرت یوسف علیہ السلام سمیت بارہ ہیں، ہر ایک بیٹے سے بہت سی نسل چلی اور تمام بنی اسرائیل بارہ قبیلے ہیں، اس خطاب میں اُن سب کو شریک کر کے فرماتے ہیں کہ اے یعقوب کی اولاد! اپنے آباء واجداد کی کمالِ تابعداری کا تقاضا یہ ہے کہ تم کوئی لحظہ میری یاد سے غافل نہ رہو۔ اگر تمہاری استعداد اس حد کو نہ پہنچے کہ تم بلاواسطہ مجھے یاد کرو، تو کم از کم اس قدر تو ضرور یاد کرو کہ اُذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ یعنی تم میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اپنے احکامات کی تابعداری اور انعاماتِ الٰہی کی شکرگزاری کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (سورۃ الصّٰفّٰت:۹۹)

ہجرت کی فضیلت وبرکت

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی عراق سے فلسطین کی طرف اور سیدہ ھاجرہ وحضرت اسماعیل علیہما السلام کی مکہ کی طرف ہجرت کا مختصر تذکرہ

ہجرت کی فضیلت وبرکت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ۔[۱] وَقَالَ تَعَالٰى: وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔[۲]

وَقَالَ تَعَالٰى: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔[۳]

ہجرۃ ایک عظیم الشان عمل ہے:

اللہ تعالیٰ کی رضا اور حفاظتِ دین کے لئے ہجرت کرنا بڑے اونچے اعمال میں سے ہے، قرآن کریم میں ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ۔[۴]

''جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور انہوں نے اللہ کے راستے میں ہجرت کی ہے، اور اپنے مال اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ہے، وہ اللہ کے نزدیک درجے میں کہیں زیادہ ہیں اور وہی

---

[۱] سورۃ التوبۃ: ۲۰

[۲] سورۃ التوبۃ: ۲۰

لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔''

حضرت خالد بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی، راستے میں سانپ نے ڈس لیا، ان کی موت واقع ہوگئی اُس پر یہ آیت اتری:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔[۱]

''جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکلے، پھر اسے موت آ پکڑے تب بھی اس کا ثواب اللہ کے پاس طے ہو چکا، اور اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

اَلْهِجْرَةُ تَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَهَا:

ہجرت کی برکات میں سے ہے کہ جو مظلوم اللہ کے راستے میں ہجرت کریں اللہ تعالیٰ اُن کے سابقہ گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور انہیں دُنیا اور آخرت، دونوں جہانوں میں اچھا ٹھکانہ عطا فرماتے ہیں۔

ہجرت کی برکات:

سورۂ نحل کی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۔[۲]

''جن لوگوں نے اللہ کے لئے ہجرت کی بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا، ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور آخرت کا ثواب تو بہت بڑا ہے، کاش یہ لوگ سمجھ لیتے۔''

اسی طرح سورۂ نساء کی ایک آیت میں بھی یہی مضمون موجود ہے، جس میں ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً

---

[۱] سورۃ النساء: ۱۰۰

[۲] سورۃ النحل: ۴۱

''جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ پائے گا زمین میں جگہ بہت اور کشائش۔''

آیت کا لفظ **مُرَاغَمٌ** مصدر ہے جس کے معنی ہیں ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف منتقل ہونا اور منتقل ہونے کی جگہ کو بھی مراغم کہہ دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کے لئے ہجرت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا میں راہیں کھول دیتے ہیں اور اس کو دنیا میں بھی اچھا ٹھکانا دیتے ہیں اور آخرت کے ثواب و درجات تو وہم و گمان سے بالاتر ہیں۔

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً:

اچھے ٹھکانے کی تفسیر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے رزق حلال سے اور حسن بصریؒ نے عمدہ مکان سے اور بعض دوسرے مفسرین نے مخالفین پر غلبہ اور عزت وشرف سے کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آیت کے مفہوم میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ چنانچہ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی نے اللہ کے لئے وطن چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو وطن کے مکان سے بہتر مکان، وطن کی عزت وشرف سے زیادہ عزت، وطن کے آرام سے زیادہ آرام عطا کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آبائی وطن عراق کو چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے سب چیزیں ان کو نصیب فرمائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل نے اللہ کے لئے اپنے وطن مصر کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے بہتر وطن ملک شام عطا فرمایا اور پھر مصر بھی ان کو مل گیا۔ ہمارے آقا حضرت خاتم الانبیاء ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ و رسول ﷺ کے لئے مکہ کو چھوڑا تو مہاجرین کو مکہ سے بہترین ٹھکانا مدینہ میں نصیب ہوا۔ ہر طرح کی عزت و غلبہ اور راحت وثروت عطا ہوئی، ہجرت کے ابتدائی دَور میں چند روزہ تکلیف ومشقت کا اعتبار نہیں، اس عبوری دَور کے بعد جو نعمتیں حق تعالیٰ کی ان حضرات کو عطا ہوئیں اور انکی کئی نسلوں میں جاری رہیں اسکا اعتبار ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایک صوبہ کے والی بنا دیئے گئے تو بڑے لطف سے اپنی سابقہ زندگی کا نقشہ اتارا کرتے تھے اور اپنے نفس کو خطاب کر کے فرمایا کرتے تھے:

''اے ابوہریرہؓ! تو وہی ہے کہ فلاں قبیلہ کا نوکر تھا، اور تیری تنخواہ صرف پیٹ بھرائی روٹی تھی، اور تیری ڈیوٹی یہ تھی کہ جب وہ لوگ سفر میں جائیں تو تُو پیدل اُن کے ساتھ چلے، اور جب وہ کسی منزل پر اتریں تو تُو ان کے لئے جلانے کی لکڑیاں چُن کر لائے، آج اسلام کی بدولت تو کہاں سے کہاں پہنچا، تجھ کو امام اور امیر المؤمنین کہا جاتا ہے۔''

حقیقی مہاجر:

صحیح بخاری اور مسلم شریف کی ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهَى اللّٰهُ عَنْهُ وَرَسُوْلُهٗ

''مہاجر وہ ہے جو اُن تمام چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔''

سو اس کا مطلب اسی حدیث کے پہلے جملے سے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں یہ ارشاد ہے:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیف سے سب مسلمان محفوظ اور سلامت رہتے ہوں۔''

مراد اس کی ظاہر ہے کہ سچا اور پکا مسلمان وہی ہے جو دوسروں کو ایذاء نہ پہنچائے۔ اسی طرح سچا اور کامیاب مہاجر وہی ہے جو صرف ترکِ وطن کر کے فارغ نہ ہو جائے بلکہ جتنی چیزیں شریعت نے حرام و ناجائز قرار دی ہیں ان سب کو بھی چھوڑ دے۔

ہجرت کے وقت دو قسم کے خطرات:

میرے محترم بھائیو! وطن سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ جانے میں دو قسم کے خطرات انسان کو عادۃً پیش آیا کرتے ہیں جو اس کو ہجرت سے روکتے ہیں:

پہلا خطرہ:

پہلا خطرہ اپنی جان کا ہے کہ جب اس وطن کو چھوڑ کر کہیں جائیں گے تو یہاں کے کفار اور ظالم لوگ راہ

میں حائل ہوں گے اور مقابلہ ومقاتلہ کے لئے آمادہ ہوں گے۔ نیز راستہ میں ممکن ہے کہ دوسرے کفار سے بھی مقابلہ کرنا پڑے جس میں جان کا خطرہ ہے۔ اس کا جواب اس آیت میں یہ دیا گیا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ[۱] ''ہر ایک جان چکھنے والی ہے مزہ موت کا۔''

جس سے کسی کو کسی جگہ کسی حال میں راہِ فرار نہیں۔ اس لئے موت سے خوف اور گھبراہٹ مومن کا کام نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو ہر شخص کو، ہر حال میں پیش آئیگی۔ اور مومن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت نہیں آسکتی، اس لئے اپنی جگہ رہنے یا ہجرت کر کے دوسری جگہ جانے میں موت کا خوف حائل نہ ہونا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ احکامِ الٰہیہ کی اطاعت کرتے ہوئے موت آجانا دائمی راحتوں اور نعمتوں کا ذریعہ ہے جو ان کو آخرت میں ملیں گی جس کا ذکر ان دو آیات میں فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ[۲]

جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن کو ہم ضرور جنّت کے ایسے بالاخانوں میں آباد کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بہترین اجر ہے ان عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر سے کام لیا اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔

دوسرا خطرہ:

دوسرا خطرہ ہجرت کی راہ میں یہ پیش آتا ہے کہ دوسرے وطن اور دوسرے ملک میں جا کر رزق کا کیا سامان ہوگا؟ اپنی جگہ تو کچھ آبائی میراث سے، کچھ کمائی سے، آدمی کوئی زمین جائیداد یا صنعت وحرفت و تجارت وغیرہ کے سامان کئے رہتا ہے۔ ہجرت کے وقت یہ سب تو یہیں چھوٹ جائیں گے، آگے گزارہ کس

---

[۱] آل عمران: ۱۸۵

[۲] العنکبوت: ۵۸-۵۹

طرح ہوگا؟ اس کا جواب بعد کی تین آیتوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ تم ان حاصل کردہ سامانوں کو رزق کی علت اور کافی سبب قرار دیتے ہو یہ تمہاری بھول ہے، رزق دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے، وہ جب چاہتا ہے تو بغیر کسی ظاہری سامان کے بھی رزق پہنچا دیتا ہے اور وہ نہ چاہے تو سب سامان واسباب کے ہوتے ہوئے بھی انسان رزق سے محروم ہوسکتا ہے۔ اس کے بیان کے لئے پہلے تو یہ فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا، اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ز وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ [1]

یعنی اس پر غور کرو کہ زمین پر چلنے والے کتنے ہزاروں قسم کے جانور ہیں جو اپنے رزق جمع کرنے اور رکھنے کا کوئی انتظام نہیں کرتے نہ تحصیلِ رزق کے اسباب جمع کرنے کی کوئی فکر کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ ان کو روزانہ اپنے فضل سے رزق مہیا کرتے ہیں۔

علماء نے فرمایا ہے کہ عام جانور ایسے ہی ہیں۔ ان میں صرف چیونٹی اور چوہا تو ایسے جانور ہیں جو اپنی غذا کیلئے اپنے بلوں میں جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ چیونٹی سردی کے موسم میں باہر نہیں آتی۔ اس لئے گرمی کے ایام میں کھانے کا سامان اپنی بل میں جمع کرتی ہے۔ اور مشہور ہے کہ پرندہ جانوروں میں سے عقعق (کوّا) بھی اپنی غذا اپنے گھونسلہ میں جمع کرتا ہے مگر وہ رکھ کر بھول جاتا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام جانور جن کی انواع واصناف کا شمار بھی انسان سے مشکل ہے وہ بیشتر وہی ہیں جو آج اپنی غذا حاصل کرنے کے بعد کل کے لئے نہ غذا مہیا کرتے ہیں نہ اس کے اسباب ان کے پاس ہوتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ یہ پرندے، جانور صبح کو اپنے گھونسلوں سے بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے واپس ہوتے ہیں۔ نہ اُن کی کوئی کھیتی باڑی ہے نہ کوئی جائیداد وزمین، نہ یہ کسی کارخانے یا دفتر کے ملازم ہیں جہاں سے اپنا رزق حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ کی کھلی زمین میں نکلتے ہیں اور سب کو پیٹ بھرائی رزق ملتا ہے اور یہ ایک دن کا معاملہ نہیں، جب تک وہ زندہ ہیں یہی سلسلہ جاری ہے۔

---

[1] العنکبوت: ۶۰

رسول اللہ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

اَلْبِلَادُ بِلَادُاللّٰهِ وَالْعِبَادُ عِبَادُ اللّٰهِ حَيْثُمَا اَصَبْتَ خَيْرًا فَاَقِمْ[۱]

''سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسبابِ خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو۔''

اور ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جس شہر میں معاصی اور فواحش عام ہوں اس کو چھوڑ دو اور امام تفسیر حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تمہیں کسی شہر میں معاصی کے لئے مجبور کیا جائے تو وہاں سے بھاگ کھڑے ہو۔[۲]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت:

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ واقعہ احراق (آگ میں ڈالے جانے) کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے امر سے عراق کے علاقے ''کوثی'' سے ہجرت کر کے ''حرّان'' آ گئے۔ ''خَرَجَ مَعَهُ لُوْطٌ وَسَارَةُ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ'' اس ہجرت میں لوط علیہ السلام اور سارہ علیہا السلام بھی آپ علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

حرّان میں اللہ تعالیٰ کے امر سے جتنا عرصہ رہنا تھا، رہے، پھر وہاں سے ہجرت کر کے مصر آ گئے، پھر مصر سے ہجرت کر کے شام آ گئے۔ شام پہنچنے کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو شام کی ایک بستی فلسطین کے علاقہ ''سبع'' میں رک گئے اور سیدنا لوط علیہ السلام ''سبع'' سے ایک دن اور رات کی مسافت پر ایک بستی ہے مؤتفکہ وہاں چلے گئے، اللہ تعالیٰ نے اُنہیں منصبِ نبوت پر فائز فرمایا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا لوط علیہ السلام کی شام کی طرف ہجرت کا واقعہ قرآن پاک میں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ[۳]

---

[۱] ابن کثیر

[۲] ابن جریر طبری فی التفسیر

[۳] سورۃ الانبیاء: ۷۱

''ہم نے ابراہیم اور لوط علیہما السلام کو نمرود اور اس کی قوم کی تکلیفوں سے نجات دے کر ایسی جگہ پہنچادیا جس میں عالمین کے لئے برکتیں ہیں''۔

اس لئے کہ ارضِ شام وہ مقدس مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اکثر انبیاء کرام علیہم السلام کو اس جگہ مبعوث فرمایا، ارضِ شام ہی ارضِ محشر اور منشر ہے، اسی میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، شام میں ہی ایک علاقہ ہے بابِ لُدّ (جو آج کل اسرائیل کے اندر ہے) جو انتہائی سرسبز وشاداب ہے، انعاماتِ خداوندی کی فراوانی ہے، وہاں رہنے والا ہر امیر غریب تقریباً خوشحال ہے، اسی بابِ لُدّ میں دجال کو سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں سے ہلاک کیا جائے گا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کی تفصیل:

''لَمَّا نَجَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى خَلِيْلَهٗ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ'' جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان سے اس امتحان میں پاس ہوگئے تو ''اٰمَنَ بِهٖ مَنْ اٰمَنَ'' چند لوگ آپ علیہ السلام پر ایمان لائے، ''وَتَابَعُوْهُ عَلٰى فِرَاقِ قَوْمِهِمْ وَاِظْهَارِ الْبَرَاءَةِ مِنْهُمْ'' اور وہ اپنی قوم کو چھوڑ کر آپ علیہ السلام کی کامل اتباع کیلئے تیار ہوگئے، اور اپنی قوم اور ان کے بتوں سے برأت کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے یہ اعلان کیا کہ ''اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ (اى اَيُّهَا الْمَعْبُوْدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ) وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ (اى اَيُّهَا الْعَابِدُوْنَ) اے ہماری قوم کے باشندو! ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جنکی تم عبادت کرتے ہو، کامل طور پر لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں اور تمہیں بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک تم ان معبودوں کو چھوڑ کر اللہ وحدہٗ لاشریک کے سامنے اپنی پیشانی نہیں جھکاؤ گے اس وقت تک ہمارے اور تمہارے درمیان دشمنی اور عداوت کی سرحد ختم نہیں ہوگی۔

یہاں کچھ عرصہ ٹھہرے، پھر وہاں سے ہجرت کر کے مصر آگئے (شام میں قحط آگیا تھا اس لئے مصر کا سفر کیا)۔ وہاں پہلے فرعونوں میں ایک فرعون رہتا تھا، علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا نام عمرو بتایا ہے، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے صادوف بتایا ہے۔ کافی لمبی عمر پائی اس نے اور اس کا واقعہ بڑا مشہور ہے۔

جبّار ظالم کا واقعہ:

حضرت سارۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس وقت کی حسین ترین عورتوں میں تھیں: ''وَكَانَتْ لَاتَعْصِيْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامَ فِيْ شَيْءٍ وَبِذَالِكَ اَكْرَمَهَا اللّٰهُ تَعَالٰى'' سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بڑی فرمانبردار بیوی تھیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں بے شمار انعامات سے نوازا تھا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا ''ھاران'' کی بیٹی تھیں، بعضوں نے ان کے والد کا نام ''توابل'' بتایا ہے۔

اس جبار ظالم کا ایک خاص آدمی اس کے پاس آیا اور اس کے سامنے حضرت سارۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حسن وجمال بیان کیا اور کہا یہ عورت فلاں آدمی کے ساتھ آپ کے علاقے میں آئی ہوئی ہے۔

''ذٰلِكَ الرَّجُلُ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَشْتَرِيْ مِنْهُ الْقَمْحَ فَنَمَّ عَلَى الْمَلِكِ، اِنِّيْ رَاَيْتُهَا تَطْحَنُ''۔[۱]

ایک دفعہ حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا غلہ پیس رہی تھیں، اس کمینے آدمی نے کسی طرح حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیکھ لیا۔

جبّار ظالم نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ پوچھ کر آؤ یہ عورت کون ہے؟ چنانچہ قاصد نے آپ سے آکر پوچھا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا ''هِيَ اُخْتِيْ'' یہ میری بہن ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دِل میں طبعی طور پر یہ خوف پیدا ہوا کہ اگر میں نے یہ کہا کہ یہ میری بیوی ہے تو کہیں یہ مجھے قتل نہ کر دے۔ بعض اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اگر خاوند والی عورت ہوتی تو خاوند کو قتل کرا دیتا، اس کے دین میں ایسے تھا، اور اگر اور رشتہ دار ہوتا تو دست درازی نہ کرتا۔[۲]

توریہ اور تعریض کا بیان:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ وہ میری بہن ہے، از قبیل تعریض وتوریہ ہے، جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہجرت کے موقع پر فرمایا: رَجُلٌ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ

---

[۱] کتاب التیجان

[۲] فتح الباری

اس جابر ظالم نے کہا کہ اس عورت کو میرے پاس بھیجو! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارۃ علیہا السلام سے فرمایا کہ میں نے اس ظالم کو کہا ہے کہ یہ عورت میری بہن ہے اور یقیناً تو میری دینی بہن ہے اور چچازاد بہن بھی ہے، اور اس وقت روئے زمین پر ہم دونوں کے علاوہ کوئی مسلمان نہیں ہے لہٰذا تو اس کے سامنے جا کر میری اس بات کی تکذیب مت کرنا۔

مشکلات کا عمل:

''ثُمَّ اَقْبَلَتْ سَارَةُ اِلَى الْجَبَّارِ'' حضرت سارۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس جبار ظالم کے پاس گئی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حضور نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ تمام مشکلات میں حضرات انبیاء علیہم السلام نماز میں لگ جاتے تھے۔ ہمارے نبی علیہ السلام کا فرمان ہے: ''انبیاء کرام علیہم السلام کو جب کوئی پریشانی لاحق ہوتی فوراً نماز میں لگ جاتے''۔

اس جبار ظالم کے عزائم چونکہ ناپاک تھے، جب اس کی حضرت سارۃ علیہا السلام پر نظر پڑی تو اس نے ان کی طرف اپنے ناپاک ہاتھ بڑھائے ''فَبَسَطَتْ يَدَهٗ اِلٰى صَدْرِهٖ'' اس کے ہاتھ سینے کی طرف سکڑ گئے، ''فَلَمَّا رَاَى الْجَبَّارُ ذَالِكَ اَعْظَمَ اَمْرَهَا وَقَالَ لَهَا: سَلِيْ رَبَّكِ اَنْ يُّطْلِقَ يَدَيَّ فَوَاللّٰهِ لَا اُذَيْتُكِ'' اس نے اپنی یہ حالت دیکھی تو اس کی آنکھیں کھل گئی اور اسے یقین ہو گیا کہ واقعی یہ کوئی عظیم المرتبہ عورت ہے، اس نے حضرت سارۃ سے کہا آپ اپنے ربّ سے میرے لئے عافیت کی دعا مانگو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

بخاری شریف میں ہے حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وضو کر کے نماز میں لگ گئی اور یہ کہا:

اَللّٰهُمَّ اِنْ كُنْتُ اٰمَنْتُ بِكَ وَبِرَسُوْلِكَ وَاَحْصَنْتُ فَرْجِيْ اِلَّا عَلٰى زَوْجِيْ فَلَا تُسَلِّطْ عَلَيَّ الْكَافِرَ، فَغُطَّ حَتّٰى رَكَضَ بِرِجْلِهٖ[1]

اے اللہ! میں آپ پر اور آپ کے رسول پر ایمان لا چکی ہوں، آپ میری عزت کی حفاظت فرمایئے، اس ظالم کو میرے اوپر مسلط نہ ہونے دیں، چنانچہ فَغُطَّ یعنی وہ کافر

[1] صحیح بخاری

ظالم اپنی جگہ گھٹ گیا، مرگی جیسا دورہ پڑ گیا۔

دونوں باتیں صحیح ہیں ہاتھ بھی سکڑ گئے اور دورہ بھی پڑ گیا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ اس ظالم نے تین مرتبہ یہ ناپاک ارادہ کیا اللہ پاک نے ہر مرتبہ اسے پکڑا، اس کے ہاتھ سکڑ گئے، اسے دورہ پڑا اور زمین پر گر پڑا، اور کہنے لگا: ''اُدْعِی اللّٰهَ لِیْ وَلَا اَضُرُّكِ'' اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں، مجھے ٹھیک کر دے، میں تجھے نقصان نہ پہنچاؤں گا۔

حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا:

''اَللّٰهُمَّ اِنْ یَّمُتْ یُقَلْ هِیَ قَتَلَتْهُ. قَالَ: فَاُرْسِلَ''[۱]

اے اللہ! اگر یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے کہ اسی نے قتل کیا ہے، (لہٰذا اس کو چھوڑ دے) راوی کہتے ہیں کہ اس کو چھوڑ دیا گیا۔

''فَلَمَّا رَاٰی ذَالِکَ رَدَّهَا اِلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَوَهَبَ لَهَا هَاجَرَ'' جب اسے حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کی عظمت کا مشاہدہ ہوا تو اس نے انہیں واپس ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور انہیں ایک باندی ھاجرہ بھی ھبہ میں دی۔ ''هٰذَا هُوَ السَّبَبُ فِیْ اِعْطَاءِ الْمَلِکِ لَهَا هَاجَرَ فِیْ آخِرِ الْاَمْرِ''

وہ کہنے لگا یہ عظیم خاتون ہے خود کام کرنا مناسب نہیں، میری بیٹی اس کی خدمت کرے گی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ قبطی باندی تھی لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس کی بیٹی تھی۔

محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب یہ حدیث آپ ﷺ سے لوگوں کو بیان فرماتے تو کہا کرتے تھے ''فَتِلْکَ اُمُّکُمْ یَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ'' اے آسمان والے پانی کے بیٹو! یہ ہاجرہ تمہاری ماں ہیں۔[۲]

فَتِلْکَ اُمُّکُمْ یَا بَنِیْ مَاءِ السَّمَاءِ کا مطلب:

عربوں کو آسمان کے پانی والے کہنا یا تو اس سے مراد زم زم ہے کیونکہ زم زم ماں بیٹے کے لئے حیات کا

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۲۲۲

[۲] البدایہ والنہایہ، ج:۱، ص:۲۲۲، صحیح بخاری: ج۱، ص ۴۷۴، ط: قدیمی، کراچی

سبب بنا اور عرب انہیں کی اولاد ہیں، ابنِ حبان نے اپنی صحیح میں کہا کہ اولادِ اسماعیل کو ماء السماء کہتے ہیں۔ یا یہ مقصد ہے کہ پانی کی طرح تمہارا نسب بھی خالص ہے، خالص اور صفائی میں ماء السماء سے تشبیہ دی۔ یا اس وجہ سے کہا کہ عرب اکثر جنگلوں میں حوضوں کا جمع شدہ پانی اپنے لئے اور جانوروں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ آسمان کے پانی پر ہی ان کا گزر بسر ہوتا ہے اسی وجہ سے انہیں بنی ماء اسماء کہا جاتا ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اس سے مراد انصار ہیں، کیونکہ ان کے جدِ اعلیٰ کا نام عامر ماء السما بن حارثہ ہے، یہ اوس اور خزرج دونوں کے جدِ اعلیٰ ہیں''۔

تمام حجابات اُٹھا دیئے گئے:

بعض روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارۃ علیہا السلام کے درمیان سے تمام حجابات اُٹھا دیئے، اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو خوش کرنے کیلئے حضرت سارہ علیہا السلام کی تمام کرامات انہیں دکھائیں یعنی جو معاملہ جبار ظالم اور سیدہ سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے درمیان ہوا سیدنا ابراہیم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے حضرت خلیل علیہ السلام کا نکاح:

حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عمر رسیدہ ہو چکی تھیں اور ان کی اولاد نہیں تھی، حضرت سارہؓ نے دیکھا کہ ہاجرہ وجیہہ اور خوبصورت خاتون ہیں۔ بعض نسخوں میں آجر ہے، یہ سریانی نام ہے، مصر کی بستی خفن سے تعلق ہے۔ تو انہوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں ہاجرہ پیش کر دی اور عرض کیا ''خُذْهَا لَعَلَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَنْ يَّرْزُقَكَ مِنْهَا وَلَدًا'' آپ ان سے نکاح کر لیں ہماری اولاد نہیں ہے شاید اللہ پاک ان سے آپ کو اولاد دے دیں۔ چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کر لیا، ''فَوَلَدَتْ لَهٗ اِسْمَاعِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ'' اللہ پاک نے انہیں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام دیئے۔

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مکہ کی طرف ہجرت:

فَاَوْحَى اللّٰهُ تَعَالٰى اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اَنْ يَّاْتِيَ بِهَاجَرَ وَابْنِهَا مَكَّةَ فَذَهَبَ بِهِمَا حَتّٰى قَدِمَ مَكَّةَ، وَهِيَ اِذْ ذَاكَ عِضَاهٌ وَسَلَمٌ وَسَمُرٌ

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ ھاجرہ رضی اللہ عنہ اور اسماعیل علیہ السلام کو مکہ چھوڑ آؤ، چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام بحکمِ الٰہی انہیں مکہ لے آئے۔ اس وقت سرزمین مکہ میں کانٹے دار درخت اور کیکر کے درخت تھے اور مکہ کے اِردگرد جو لوگ رہتے تھے انہیں عمالیق کہا جاتا تھا اور بیت اللہ کی جگہ ''رَبْوَةٌ حَمْرَاءُ'' ایک بلند سُرخ رنگ کا ٹیلہ نظر آتا تھا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''هٰهُنَا أُمِرْتُ أَنْ تَضَعَهَا؟ قَالَ نَعَمْ'' کیا اسی جگہ پر مجھے اپنے بیوی اور بچے کو چھوڑنے اور ٹھہرانے کا حکم دیا گیا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا جی ہاں!

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہیں مقام حجر میں ٹھہرا دیا اور حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ یہاں ایک جھونپڑی بنالیں۔ اس کے بعد سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حضور دُعا کیلئے ہاتھ بلند کئے اور یہ دعا مانگی:

رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ[1]

''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو آپ کے حرمت والے گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں لا بسایا ہے جس میں کوئی کھیتی نہیں ہوتی۔ ہمارے پروردگار! (یہ میں نے اس لئے کیا) تاکہ یہ نماز قائم کریں، لہٰذا لوگوں کے دِلوں میں ان کے لئے کشش پیدا کردیجئے، اور ان کو پھلوں کا رزق عطا فرمایئے، تاکہ وہ شکرگزار بنیں''۔

دعا سے فارغ ہونے کے بعد جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام واپس لوٹنے لگے تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''إِلٰى مَنْ تَكِلُنَا'' آپ ہمیں کس کے سہارے پر چھوڑ کر جارہے ہیں''؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا، پھر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''آللّٰهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا'' کیا اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے''؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جی ہاں! ''فَقَالَتْ إِذَنْ لَا يُضَيِّعُنَا'' پھر

---

[1] سورۃ النحل: ۳۷

حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو تسلی ہوئی کہ اگر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا ہے تو ٹھیک ہے، وہ ہمارا ربّ ہے، ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔[۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام انہیں کچھ کھجوریں اور تھوڑا سا پانی دے کر مکہ میں چھوڑ کر واپس شام آ گئے۔ جنگل بیابان میں پانی کی ایک مشک سے کیا بننا تھا، چنانچہ: **فَنَفِدَ الْمَاءُ فَعَطِشَتْ وَعَطِشَ الصَّبِيُّ** ''پانی ختم ہو گیا اور ماں بیٹے کا امتحان شروع ہوا، دونوں پیاس کی شدت سے نڈھال ہو گئے''۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑانے لگیں اور پانی کی تلاش میں صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں تا کہ وہاں جا کر اِدھر اُدھر کان لگائیں شاید کسی کی آواز سنائی دے یا کوئی انسان نظر آ جائے، لیکن وہاں نہ تو کچھ سنائی دیا اور نہ ہی کوئی انسان نظر آیا۔ اسی دوران وادی کے درندوں کی آوازیں آنے لگیں تو اس خوف سے کہ کہیں بچے کو نقصان نہ پہنچا دیں، تیزی سے واپس بچے کی طرف دوڑیں اور شفقت بھرا ہاتھ اس پر رکھا۔

ثُمَّ سَمِعَتْ صَوْتًا نَحْوَ الْمَرْوَةِ پھر مروہ کی طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا مروہ پہاڑی کی طرف دوڑ پڑیں کہ شاید وہاں سے پانی مل جائے۔ **فَهِيَ أَوَّلُ مَنْ سَعٰى بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ** ''حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہ ہی پہلی عورت ہیں جس نے صفا مروہ کے درمیان سعی کی''، اسی طرح حضرت ھاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صفا مروہ کے درمیان سات چکر لگائے، صفا پر جاتیں تو مروہ کی طرف سے انسانوں کی آوازیں سنائی دیتیں، لیکن جب وہاں پہنچتیں تو کچھ نظر نہ آتا، اسی طرح مروہ سے صفا اور صفا سے مروہ چکر لگانا شروع کر دیتیں، آخر تھک کر دعا مانگنا شروع کی:

''اے اللہ! تُو میری آواز کو سُن رہا ہے، **فَأَغِثْنِيْ** میری فریاد رسی فرما، **فَقَدْ هَلَكْتُ وَهَلَكَ مَنْ مَّعِيَ** میں اور میرا معصوم بچہ پیاس کی شدت سے ہلاک ہونے کو ہیں۔''

حضرت جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور پوچھا: **مَنْ أَنْتِ** آپ کون ہیں؟ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا: **سُرِّيَّةُ إِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ تَرَكَنِيْ وَابْنِيْ هٰهُنَا** ''میں سیدنا ابراہیم علیہ

---

[۱] صحیح بخاری: ج ۱، ص ۴۷۴، قدیمی کتب خانہ، کراچی

السلام کی بیوی ہوں، وہ مجھے اور میرے بیٹے کو یہاں چھوڑ گئے ہیں''۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پوچھا: اِلٰی مَنْ وَکَّلَکُمَا ''وہ تمہیں کس کے سہارے پر چھوڑ کر گئے ہیں''، قَالَتْ وَکَّلَنَا اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا وہ تو ہمیں اللہ تعالیٰ کے سہارے پر چھوڑ کر گئے ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام نے کہا: لَقَدْ وَکَّلَکُمَا اِلٰی کَرِیْمٍ کَافٍ ''یقیناً وہ تمہاری نگہداشت ایسی کریم ذات کے حوالے کر کے گئے ہیں جو تمہیں کافی ہے''۔ پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام ان کے ساتھ آئے اور دیکھا تو ان کا راشن بالکل ختم ہو چکا تھا۔ جبرائیل علیہ السلام انہیں زم زم والی جگہ پر لائے اور اپنا قدم مارا فَفَارَتْ عَیْنٌ تو وہاں ایک چشمہ پھوٹ پڑا، اسی وجہ سے زم زم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جبرائیل علیہ السلام کی ایڑی مارنے کا اثر ہے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پانی دیکھ کر جلدی سے مشک اُٹھائی تا کہ مشکل وقت میں استعمال کیلئے پانی اس میں بھر کر رکھ دیں تو جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا اِنَّهَا رِمٌّ یہ آپ کو سیراب کرنے کیلئے کافی ہے، پانی جمع کر کے رکھنے کی ضرورت نہیں۔ جَعَلَتْ اُمُّ اِسْمَاعِیْلَ تَحْبِسُهَا حَبْسًا ''حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پانی کا بہاؤ دیکھا تو اسے ہر طرف روکنا شروع کر دیا''۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

یَرْحَمُ اللّٰهُ اُمَّ اِسْمَاعِیْلَ لَوْلَا اَنَّهَا عَجِلَتْ لَکَانَتْ زَمْزَمُ عَیْنًا مَّعِیْنًا ''اللہ تعالیٰ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ (سیدہ ھاجرہؓ) پر رحم کرے، اگر حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہا پانی روکنے میں جلدی نہ کرتیں تو یہ زم زم چشمے کی طرح اُبلتا رہتا''۔[1]

حضرت جبرائیل علیہ السلام کا سیدہ ھاجرہ رضی اللہ عنہا سے کلام کرنا:

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے سیدہ ھاجرہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

''لَاتَخَافِی الظَّمْأَ عَلٰی اَهْلِ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ، فَاِنَّهَا عَیْنٌ یَشْرَبُ مِنْهَا ضَیْفَانُ اللّٰهِ تَعَالٰی یعنی یہ پانی اس شہر والوں کی ضرورت کو پورا کر دے گا، اب آپ کو پیاس

---

[1] صحیح بخاری: ج ۱، ص ۴۷۴، قدیمی کتب خانہ، کراچی

وغیرہ کا خوف نہیں کرنا چاہئے، یہ زم زم ایسا چشمہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کے مہمان پانی پیتے رہیں گے۔ اور فرمایا: اِنَّ اَبَا هٰذَا الْغُلَامِ سَيَجِيْئُ اس بچے کے والد بھی عنقریب آپ کے پاس آجائیں گے اور یہ دونوں باپ بیٹا مل کر یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر بنائیں گے"۔

قبیلہ بنی جرھم کی آمد:

مورخین لکھتے ہیں:

"قبیلہ بنو جرھم کے چند لوگ شام جاتے ہوئے یہاں سے گزرے تو انہیں پہاڑوں پر پرندے نظر آئے، وہ کہنے لگے: اِنَّ هٰذَاالطَّيْرَ لَحَائِمٌ عَلٰى مَاءٍ یہاں پرندے اُترے ہوئے ہیں یقیناً یہاں پانی ہوگا، فَاَشْرَفُوْافَاِذَاهُمْ بِالْمَاءِ "انہوں نے قریب آکر دیکھا تو وہاں واقعی پانی تھا۔"

قبیلہ بنو جرھم کے لوگ حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور ان سے کہا اگر آپ ہمیں اجازت دے دیں تو ہم یہاں آپ کے پڑوس میں رہ جاتے ہیں "وَالْمَاءُ مَاءُكِ" پانی پر ملکیت تمہاری ہی رہے گی۔ حضرت ھاجرہ رضی اللہ عنہا نے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ مکہ میں آباد ہونے والے سب سے پہلے یہی لوگ تھے۔

حضور علیہ السلام کی وصیت:

حضرت کعب بن مالک الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اِفْتَتَحْتُمْ مِصْرَ فَاسْتَوْصُوْا بِاَهْلِهَا خَيْرًا فَاِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَرَحِمًا

"جب تم مصر کو فتح کرلو تو اہل مصر کو بھلائی کی وصیت کرنا، اس لئے کہ اہل مصر کے لئے امن کا عہد و پیمان اور رشتہ داری ہے۔"

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں میں نے امام زہری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ وہ رحم اور رشتہ داری کیا ہے جس کا آقا علیہ السلام نے ذکر فرمایا ہے؟ تو وہ کہنے لگے كَانَتْ هَاجَرُ اُمُّ اِسْمَاعِيْلَ مِنْهُمْ سیدنا اسماعیل

علیہ السلام کی والدہ سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا انہیں اہل مصر میں سے تھیں، یہی اہل مصر سے رشتہ داری ہے۔

مقامِ سَبُع میں حضرت خلیل علیہ السلام کی سکونت:

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام مصر سے شام آئے تھے تو فلسطین میں ''سبع'' نامی جگہ پر رہنے لگے تھے۔ (فلسطین شام ہی کا حصہ ہے) ''اِحْتَفَرَ بِهَا بِئْرًا وَاتَّخَذَ بِهَا مَسْجِدًا'' آپ علیہ السلام نے وہاں ایک کنواں کھودا، اس کا پانی چشمے کی طرح بہتا تھا اور آپ علیہ السلام نے اس کنویں کے قریب مسجد بنائی، اس میں عبادت کرتے اور کنویں سے اپنی بکریوں کو پانی پلاتے۔ آپ علیہ السلام ''سَبُع'' نامی جگہ میں کافی عرصہ ٹھہرے رہے لیکن وہاں کے لوگوں نے آپ کو وہاں رہنے نہ دیا تو پھر وہاں سے فلسطین ہی کی ایک بستی ''قَطَة'' میں منتقل ہو گئے، یہ بستی رملہ اور ایلیا کے درمیان ہے۔

عجیب قصہ:

فَلَمَّا خَرَجَ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِهِمْ نَضَبَ مَاءُ تِلْكَ الْعَيْنِ وَذَهَبَ ''جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام مقام سبع چھوڑ کر قطۃ آئے تو وہ چشمہ بھی خشک ہو گیا'' پھر اہل سبع کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور وہ ایک دوسرے سے کہنے لگے: اَخْرَجْنَا مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا رَجُلًا صَالِحًا ''ہم نے ایک نیک آدمی کو اپنے یہاں سے نکال دیا ہے''، فَاتَّبَعُوْا اَثَرَهٗ حَتّٰى اَدْرَكُوْهُ وَسَاَلُوْهُ اَنْ يَّرْجِعَ ''چنانچہ وہ تلاش کرتے کرتے آپ علیہ السلام سے جا ملے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ علیہ السلام واپس مقام سبع چلیں''، آپ نے فرمایا! مجھے جس علاقے سے نکال دیا گیا ہے میں وہاں واپس نہیں جاؤں گا۔ انہوں نے کہا: اِنَّ الْمَاءَ الَّذِیْ كُنْتَ تَشْرَبُ وَنَشْرَبُ مَعَكَ قَدْ نَضَبَ وَذَهَبَ ''جس کنویں سے ہم لوگ آپ کی برکت سے پانی پیا کرتے تھے وہ آپ کے جانے کے بعد خشک ہو گیا ہے''۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ کا بیان:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہیں سات بکریاں دیں اور فرمایا ان کو اپنے ساتھ لے جاؤ! جب تم انہیں کنویں پر لے جاؤ گے تو وہ پہلے کی طرح چشمے کی مانند اُبلنے لگے گا۔ چنانچہ وہ بکریاں لے کر کنویں پر پہنچے تو اللہ پاک نے پانی ظاہر کر دیا اور کنواں چشمے کی طرح اُبلنے لگا ''وَهِیَ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ'' اور کافی عرصہ

تک ایسے ہی چلتا رہا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا ضیافت کرنا:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام وہیں مقام قَطَّة میں رہے، اللہ پاک نے بہت وسعت عطا فرمائی، رزق، مال اور خدام میں برکت ہوگئی۔ كَانَ يُضِيْفُ مَنْ نَزَلَ بِهٖ ''آپ علیہ السلام ہر آنے والے مہمان کی خوب ضیافت کرتے''۔

حضرت خلیل علیہ السلام کے پاس ملائکہ کی آمد:

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے قومِ لوط کو ہلاک کرنے کا ارادہ فرمالیا تو لوط علیہ السلام کی طرف اپنے فرشتے بھیجے کہ اپنی قوم کو چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں۔ وَاَمَرَهُمْ اَنْ يَّبْدَؤُوْا بِاِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَيُبَشِّرُوْهُ وَسَارَةَ بِاِسْحَاقَ وَمِنْ وَّرَاءِ اِسْحَاقَ يَعْقُوْبَ ''اور فرشتوں کو حکم دیا کہ لوط علیہ السلام کے پاس جاتے ہوئے پہلے ابراہیم علیہ السلام سے مل کر جائیں اور ابراہیم علیہ السلام اور سارۃ علیہا السلام دونوں کو خوشخبری دیں کہ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوگا جس کا نام اسحٰق ہوگا اور یہ اسحٰق بڑے ہوں گے ان کی شادی ہوگی پھر ان کے یہاں یعقوب علیہ السلام پیدا ہونگے۔

فرشتوں کی مہمانی کا قصہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی عادت تھی: لَا يَاْكُلُ اِلَّا مَعَ ضَيْفٍ مَا اَمْكَنَهٗ ''مہمان کے ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے''، پندرہ دن گزر چکے تھے ان کے پاس کوئی مہمان نہیں آیا تھا، جب یہ فرشتے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے تو انسانی شکل وصورت میں تھے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ایسے وجیہ مہمانوں کی ضیافت کا موقع کبھی نہیں ملا۔ آپ علیہ السلام خود جلدی سے ایک تازہ بچھڑا لائے جو پتھروں پر رکھ کر بھُنا ہوا تھا ''فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ'' آپ نے ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لئے، آپ علیہ السلام نے فرمایا ''اَلَا تَاْكُلُوْنَ'' تم کیوں نہیں کھاتے؟ سورۃ ہود میں ہے: ''فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً[1]'' جب سیدنا

---

[1] سورۃ ہود: ۷۰۔

ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ اپنے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھا رہے تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اوپرا محسوس کیا اور ان کے دِل میں خوف پیدا ہو گیا''، فرشتوں نے کہا اے ابراہیم! **لَا نَاْكُلُ طَعَامًا اِلَّا بِثَمَنٍ** ''ہم تو ثمن اور قیمت کے بغیر کھانا نہیں کھاتے''، تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: **اِنَّ لِهٰذَا ثَمَنًا** ''اس کا بھی ثمن ہے''، فرشتوں نے پوچھا: **وَمَا ثَمَنُهٗ** ''اس کا ثمن کیا ہے''؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: **تَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَلٰى اَوَّلِهٖ وَتَحْمِدُوْنَهٗ عَلٰى اٰخِرِهٖ** ''تم شروع میں اللہ کا نام لیتے ہو اور کھانے کے آخر میں اس کی حمد بیان کرتے ہو یہی اس کا ثمن اور قیمت ہے''۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات سُن کر جبرائیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام کی طرف دیکھ کر کہنے لگے: **يَحِقُّ لِهٰذَا اَنْ يَّتَّخِذَهٗ رَبُّهٗ خَلِيْلًا** ''واقعی یہ اس بات کے حقدار تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنا خلیل بناتا (جیسا کہ اُس نے بنایا ہے)''۔

پھر فرشتوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بتا دیا: **لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ** ''آپ خوف نہ کریں ہم انسان نہیں ہیں ہم فرشتے ہیں، ہمیں لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجا گیا ہے، لیکن ہم آپ کو اسحاق اور یعقوب کی خوشخبری دینے کیلئے آئے ہیں۔ **وَامْرَاَتُهٗ سَارَةُ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ** ''سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ رضی اللہ عنہا ان مہمانوں کی خدمت کیلئے کھڑی تھیں'' اور ان کی باتیں سُن رہی تھیں جب فرشتوں نے بیٹے کی خوشخبری دی **فَضَحِكَتْ سَارَةُ** حضرت سارۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہنس پڑیں۔

حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کا مسکرانا:

علماء نے حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کے مسکرانے کی مختلف وجوہات بیان کی ہیں:

۱۔ حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا اس وجہ سے مسکرائیں کہ انہوں نے ہمارے ہاں کھانا نہیں کھایا:

يَا عَجَبًا لِّاَضْيَافِنَا هٰؤُلَآءِ اِنَّا نَخْدِمُهُمْ بِاَنْفُسِنَا تَكْرِمَةً لَّهُمْ وَهُمْ لَا يَاْكُلُوْنَ طَعَامَنَا ''ہمیں ان مہمانوں پر تعجب ہے کہ ہم نے ان کا اکرام کیا اور یہ ہمارے ہاں کھانا ہی نہیں کھاتے۔''

۲۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا اس وجہ سے مسکرائیں کہ قومِ لوط کتنی بڑی غفلت میں ڈوبی ہوئی ہے حالانکہ ان کی ہلاکت ان کے قریب پہنچ چکی ہے۔

۳۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کو فرشتوں کی زبانی بیٹے کی خوشخبری سُن کر تعجب ہوا کہ ہم تو دونوں عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، ہمارے ہاں اولاد کیسے ہوگی، اس پر وہ مسکرائیں۔ لکھا ہے کہ اس وقت حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا کی عمر ۹۰ برس اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۱۲۰ برس ہو چکی تھی۔

امام سدّی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب جبرائیل علیہ السلام نے انہیں بڑی عمر میں بیٹا ہونے کی خوشخبری دی تو حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: **مَآ اٰيَةُ ذَالِكَ** اس کی کوئی نشانی بتاؤ، **فَاَخَذَ بِيَدِهٖ عُوْدًا يَابِسًا فَلَوَّاهُ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ فَاهْتَزَّ اَخْضَرَ** ''جبرائیل علیہ السلام نے خشک لکڑی انگلیوں میں لی تو وہ سرسبز ہوگئی۔

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں:

ضَحِكَتْ کا معنی ہے **حَاضَتْ فِي الْوَقْتِ** یعنی حضرت سارۃ رضی اللہ عنہا عمر رسیدہ ہونے کے باوجود حائضہ ہوگئیں، یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب حاملہ ہونا بھی ممکن ہے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے اہل خانہ کی ہجرت کا مختصر تذکرہ آپ حضرات کے سامنے آچکا ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی کامل اتباع نصیب فرمائے، اور ہمارے گھر والوں کو بھی خاندانِ ابراہیمی والے جذبات و احساسات عطا فرمائے اور اپنے نام پر مرمٹنے والا بنائے۔ (آمین)

درسِ حدیث بعد از جمعۃ المبارک

حدیثِ نبوی ﷺ:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمْ یَکْذِبْ اِبْرٰهِیْمُ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِلَّا ثَلٰثَ کَذَبَاتٍ، ثِنْتَیْنِ مِنْهُنَّ فِیْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ قَوْلُهٗ ''اِنِّیْ سَقِیْمٌ'' وَقَوْلُهٗ ''بَلْ فَعَلَهٗ کَبِیْرُهُمْ هٰذَا''۔ وَقَالَ: بَیْنَا هُوَ ذَاتَ یَوْمٍ وَسَارَةُ اِذْ اَتٰی عَلٰی جَبَّارٍ مِّنَ الْجَبَابِرَةِ فَقِیْلَ لَهٗ اِنَّ هٰهُنَا رَجُلًا مَعَهٗ اِمْرَاَةٌ مِنْ اَحْسَنِ النَّاسِ۔ فَاَرْسَلَ اِلَیْهِ فَسَاَلَهٗ عَنْهَا قَالَ مَنْ هٰذِهٖ؟ قَالَ اُخْتِیْ، فَاَتٰی سَارَةَ فَقَالَ یَاسَارَةُ لَیْسَ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ مُؤْمِنٌ غَیْرِیْ وَغَیْرِکِ وَ اَنَّ هٰذَا سَاَلَنِیْ فَاَخْبَرْتُهٗ اَنَّکِ اُخْتِیْ فَلَا تُکَذِّبِیْنِیْ فَاَرْسَلَ اِلَیْهَا۔

فَلَمَّا دَخَلَتْ عَلَیْهِ وَذَهَبَ یَتَنَاوَلُهَا بِیَدِهٖ فَاُخِذَ فَقَالَ: اُدْعِی اللّٰهَ لِیْ وَلَا اَضُرُّکِ فَدَعَتِ اللّٰهَ فَاُطْلِقَ، ثُمَّ تَنَاوَلَهَا ثَانِیَةً فَاُخِذَ مِثْلَهَا اَوْ اَشَدَّ فَقَالَ: اُدْعِی اللّٰهَ لِیْ وَلَا اَضُرُّکِ فَدَعَتْ فَاُطْلِقَ فَدَعَا بَعْضَ حَجَبَتِهٖ فَقَالَ: اِنَّکَ لَمْ تَاْتِنِیْ بِاِنْسَانٍ اِنَّمَا اَتَیْتَنِیْ بِشَیْطَانٍ فَاَخْدَمَهَا هَاجَرَ، فَاَتَتْهُ وَهُوَ قَائِمٌ یُصَلِّیْ فَاَوْمَاَ بِیَدِهٖ مَهْیَا قَالَتْ رَدَّ اللّٰهُ کَیْدَ الْکَافِرِ اَوِالْفَاجِرِ فِیْ نَحْرِهٖ وَاَخْدَمَ هَاجَرَ ۔ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ: فَتِلْکَ اُمُّکُمْ یَابَنِیْ مَآءِ السَّمَآءِ ۔[1]

سیدہ سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ظالم فرعون کا واقعہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام عراق سے ہجرت کر کے بیت المقدس تشریف لے گئے، حضرت سارہ رضی اللہ عنہا بھی آپ کے ساتھ تھی۔ ایک جابر ظالم کے علاقے سے گزرے، بعض حضرات کہتے ہیں اس کا نام صابون تھا، یہ پہلا فرعون تھا اس نے لمبی زندگی گزاری، اس کو کسی نے بتایا کہ اس آدمی کے ساتھ ایک عورت ہے جو کائنات کی حسین ترین عورت

---

[1] صحیح البخاری ج:۱، ص: ۴۷۴، قدیمی کتب خانہ، کراچی

ہے، حضرت سارہ رضی اللہ عنہا ''ھاران'' کی بیٹی تھیں اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کے والد کا نام ''توابل'' تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اگر اس جابر ظالم کو پتہ لگ گیا کہ ''اِنَّکِ اِمْرَأَتِیْ یَغْلِبُنِیْ وَیَقْتُلُنِیْ'' تو میری بیوی ہے تو وہ میرے اوپر غالب آئے گا اور مجھے قتل کر دے گا، اس کی یہ عادت ہے کہ عورت کو لینا چاہتا ہے تو خاوند کو قتل کر دیتا ہے، اگر تجھ سے پوچھے تو اس سے کہہ دینا کہ میں ان کی بہن ہوں، کیونکہ مذہب کے اعتبار سے تُو میری بہن ہے، اس وقت روئے زمین پر صرف ہم دو ہی مسلمان ہیں۔

جب اُس جابر کے علاقے سے گزرے تو اس کے کسی کارندے نے دیکھ لیا، اُس نے جا کر بادشاہ کو خبر دی کہ یہاں ایک آدمی آیا ہوا ہے اس کے ساتھ ایک خوبصورت عورت ہے جو آپ کے مناسب ہے۔ اُس نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو بلوایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے، جب حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اُس ظالم بادشاہ کے ہاں پہنچیں، اللہ نے اُسے قدرت نہ دی کہ وہ اپنا ہاتھ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو لگا سکے، ''فَقُبِضَتْ یَدُہٗ قَبْضَۃً شَدِیْدَۃً'' اس کے ہاتھ کو جھٹکے لگے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ وہ گر پڑا اور پاؤں مارنے لگا، بیہوشی طاری ہوگئی۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نماز پڑھنے کھڑی ہوئی اور یہ دعا مانگی اے اللہ! میں تیرے اوپر اور تیرے رسول پر ایمان لا چکی ہوں، میری شرمگاہ میرے خاوند کے علاوہ کسی کے لئے حلال نہیں، اے اللہ! اس کو سب پر حرام رکھ۔ تو اللہ نے اُس ظالم کے ہاتھ کو روک دیا، تین مرتبہ اس کو جھٹکا لگا، ہر مرتبہ کہتا رہا کہ آپ میرے لئے دعا کرو میں دوبارہ یہ حرکت نہیں کروں گا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا اس خوف سے کہ یہ مر گیا تو لوگ کہیں گے اسی نے مارا ہے اس لئے وہ دعا کر دیتی، اُس کا ہاتھ چھوٹ جاتا۔ تیسری مرتبہ اُس نے کہا اللہ سے دعا کرو میرا ہاتھ ٹھیک کر دے، میں قسم کھاتا ہوں تجھے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔

انہوں نے دعا مانگی اللہ نے اُسے شفا دیدی۔

وہ اپنے خدمت گاروں سے کہنے لگا تم میرے پاس کسی جن کو لائے ہو، وہ لوگ عجیب و غریب باتوں کو جنات کی طرف منسوب کرتے تھے۔ حضرت سارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا آپ میرے علاقے سے عزت ووقار کے ساتھ چلی جائیں اور خدمت کے لئے ہاجرہ دی۔

جب حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو دیکھا وہ نماز پڑھ رہے ہیں انہوں نے (نماز ہی میں) ہاتھ کے اشارہ سے پوچھا کیا بنا؟ کہا اللہ نے بہتری فرمائی اور اُس ظالم کا ہاتھ روک دیا، اور خدمت کے لئے ربُّ العالمین نے ہمیں ہاجرہ رضی اللہ عنہا دی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے ''تِلْكَ أُمُّكُمْ يَا بَنِيْ مَآءِ السَّمَآءِ'' اے عربو! آسمان کے پانی کی اولاد، یہ تمہاری ماں ہے۔ کیونکہ عرب زیادہ تر جنگلات میں خانہ بدوش تھے، جنگلات کے تالابوں میں آسمان کا جو پانی جمع ہوتا تھا اُسی پر گزارہ تھا اس وجہ سے کہا آسمان کے پانی کی اولاد۔

ہر مسئلے کا حل اللہ کے پاس ہے:

میرے محترم بھائیو! ان واقعات سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ کوئی بھی مسئلہ یا کوئی پریشانی آجائے تو انسان اللہ کی طرف رُخ کرے۔ ہر انسان کا دل، آنکھیں اور اعضاء سب اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ نیک ارادہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے اعضاء کو اس کی طرف پھیر دیں گے، برائی کا ارادہ کرے گا، اللہ چاہیں گے تو اپنے ارادے میں کامیاب ہو جائے گا، اللہ نہیں چاہیں گے تو اس کو اس کے ارادے میں فیل کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ بڑی قدرت والے ہیں، حدیث میں آتا ہے جو عفت کا طالب ہے اللہ تعالیٰ اُسے عفت دیتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدہ سارہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ سے معلوم ہوا کہ مشکل وقت میں آدمی فوراً نماز میں لگ جائے، کیونکہ سر سے لے کر پاؤں تک سارے اعضاء اللہ کی تعریف، تقدیس، تسبیح وتہلیل میں

لگ جاتے ہیں، جسم کا رُواں رُواں اور خون کا قطرہ قطرہ اللہ سے فریاد کررہا ہے۔ کوئی پریشانی آئے فوراً آدمی اللہ کی رحمت کی طرف متوجہ ہو، جتنی گھٹن ہو اللہ تعالیٰ ختم کردیں گے۔

حجاج بن یوسف اور حضرت مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ:

حجاج بن یوسف کے پاس سینکڑوں قسم کے گھوڑے تھے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں آئے، حجاج نے کہا میرے گھوڑے دیکھے ہیں، فرمایا گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں: (۱) اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لئے، ان میں اجر ہے (۲) اپنی ضروریات کے لئے، ان میں بھی اللہ تعالیٰ نے اجر رکھا ہے، (۳) تکبر اور فخر ومباہات کے لئے کہ فلاں کے گھوڑے ایسے ہیں، یہ قیامت کے دن مالک کے لئے وبالِ جان بنیں گے، ہنہناتے ہوئے مالک کے اوپر چڑھیں گے اور ان کے سُم چھریوں کی طرح کردیے جائیں گے، اس کو سزا دیں گے۔

حجاج کہنے لگا اگر آپ رسولِ پاک ﷺ کے خادمِ خاص نہ ہوتے تو میں آپ کو قتل کردیتا، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو مجھے قتل نہیں کرسکتا۔ ترمذی شریف میں ہے کہ حجاج نے ایک لاکھ انسان جبراً قتل کرائے۔ اب حجاج کے سامنے یہ بات کہنا کوئی معمولی نہیں تھا، وہ ڈر گیا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا اللہ کے نبی ﷺ نے مجھے ایک دعا بتائی ہے کہ ایمان ویقین کے ساتھ جب وہ پڑھ لی جائے تو اللہ پاک ظالم کے حملے کی قوت کھینچ لیتے ہیں، وہ میں نے پڑھ لی ہے تیری جرأت ہے تو قتل کرکے دکھا، وہ اور بھی خوف زدہ ہوگیا۔

اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ نمرود نے دو شیر بھوکے رکھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوپر چھوڑے تو دونوں گئے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کو محبت سے چاٹنے لگے۔

سب سے بڑا وظیفہ:

میرے بھائیو! نفرت اور محبت کے فیصلے اوپر سے ہوتے ہیں، زمین پر نافذ ہوتے ہیں، اس لئے بار بار اللہ کی طرف رخ کرنا چاہیے۔ جس سے پوچھو وہ کہتا ہے مسائل میں گھرا ہوا ہوں، یاد رکھنا! سب سے بڑا

وظیفہ اعلیٰ درجے کی توبہ ہے، اس کے برابر کوئی وظیفہ نہیں۔ اگر باپ کی ساری مہربانیاں لینی ہیں تو باپ کی کامل درجے کی اطاعت کرے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سارے دروازے کھلوانے ہیں تو اللہ کو چمٹ جائے اور ناراضگی والے کاموں سے کامل توبہ کرلے۔

یہاں لوگ آتے ہیں کوئی کہتا ہے میرا کاروبار بند ہے، کوئی کہتا ہے جنات ہیں، کوئی کہتا ہے جادو ہے، ''ہوگا'' میں ان چیزوں کا انکار نہیں کررہا، لیکن جنات کس کے قبضے میں ہیں؟ جادو کو کون توڑتا ہے؟ ہمارے نبی ﷺ نے ہر مسئلے کا علاج بتایا ہے، آپ ﷺ جو چابی لے کر آئے ہیں وہ سارے مسائل کے حل کی چابی ہے، اسی لئے فرمایا: ''فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ'' اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ، اللہ کو چمٹ جاؤ، اللہ کو راضی کرلو، اللہ کو منالو۔ اگر اللہ راضی ہوگئے، اللہ نے معاف کردیا، رخ بدل گیا تو سارے مسئلے آہستہ آہستہ ٹھیک ہوجائیں گے۔

چند اہم گزارشات:

میرے بھائیو! محنت وکوشش کریں کہ ہمارا اپنا رخ بھی اللہ کی طرف ہو اور مخلوق کا رُخ بھی مالک کی طرف ہو، ہر مسلمان کو یہ باتیں سمجھائیں۔ ہر گھر میں لڑائی ہے، ہر گھر میں جھگڑے ہیں، عجیب عجیب داستانیں ہیں، دلوں میں آگ لگ رہی ہے، بچوں سے پریشان، بچیوں سے پریشان، پھر غلط قسم کے عاملین کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں، وہ کہتے ہیں تیرے اوپر تیس ہزار جن چڑھے ہوئے ہیں۔

میرے بھائیو! اللہ کو چمٹ جائیں کیونکہ سارے خبیث جنات اللہ کے قبضے میں ہیں۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ! میں رات کو تہجد پڑھتا ہوں تو ہولناک چیزیں نظر آتی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا یہ دعا پڑھا کرو:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَعِقَابِکَ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِکَ وَمِنْ ھَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنَ، وَاَعُوْذُبِکَ اَنْ یَّحْضُرُوْنَ''۔

دعا پڑھنی شروع کردی، چند دن کے بعد کہنے لگے یارسول اللہ! وہ ساری چیزیں بھاگ گئیں اور اتنی بہادری میرے اندر آگئی کہ اب میں شیر کی کچھار (غار) میں داخل ہوجاؤں تو ڈر نہیں لگتا۔

میرے بھائیو! کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اللہ کی طرف لوٹنا، اللہ کو خوش کرنا، وہ منبع خیر ہے، وہاں ہی سے خیر آئے گی، وہی سے فیصلے ہوں گے، ساری دنیا کے بادشاہ، ساری دنیا کے وزیر اور سارے کارخانے والے ہمارے دوست بن جائیں ہمارا مسئلہ حل نہیں کر سکتے، ایک آدمی دل کا بیمار ہے اس کے پاس ایک ارب روپیہ ہے تو کیا ایک ارب روپے سے دل کی بیماری دور ہو جائے گی؟ اللہ دور نہ کرنا چاہے تو کیا کر سکے گا؟ اگر مال اور چیزوں سے پریشانی ختم ہوتی تو سارے مالدار بڑے خوش ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بڑے بڑے بادشاہ اور مالداروں کا ذکر کیا ہے، خدائی کا دعوی کرنے والا فرعون، لیکن ابھی موسیٰ علیہ السلام پیدا ہی نہیں ہوئے کہ اُس کی نیند اُڑ گئی، نہ رات کو آرام نہ دن میں سکون۔

اللہ پاک ہم سب کو اپنی ذات کی طرف لوٹنے والا بنائے، اس کے لئے قرآن کریم کی روزانہ تلاوت، روزانہ ذکر، استغفار روزانہ، غیبت چغلی سے اجتناب، ماں باپ کا ادب، بڑوں کا احترام، حسد اور کینہ سے اپنی حفاظت، روزانہ مسلمانوں سے ملاقات کرنا اور انہیں یہ بتانا کہ ہر مسئلے کا حل اللہ کے پاس ہے۔

۱۹۹۲ء میں ہم انگلینڈ گئے، (تبلیغی جماعت کے ساتھ) ملتان کا ایک ڈاکٹر وہاں پی ایچ ڈی کر رہا تھا، وہ ہر تین چار دن کے بعد آتا کہ میرے لئے دعا کرو میں بہت پریشان ہوں، میں نے کہا لوگ تو یہاں ڈگریاں لینے آتے ہیں خوش ہوتے ہیں، کہنے لگا میرے لئے دعا کرو میں اس آگ سے نکل جاؤں، میں تو آگ میں پھنسا ہوا ہوں۔ وہاں لوگ اپنی اولاد کیلئے دھاڑیں مار کر روتے تھے کہ ہماری اولاد ڈوب گئی۔

ایک آدمی آیا، کہنے لگا میری بیوی ہندو کے ساتھ چلی گئی۔ ایک اور آیا کہنے لگا میری بیٹی انگریز کے ساتھ چلی گئی۔

ہم ایک جگہ گئے تو ایک آدمی بات نہیں کر رہا تھا، ہم نے کہا یہ کیوں بات نہیں کر رہا؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ پریشان ہے، اس کی دونوں بیٹیاں غیر مسلموں کے ہاں شادی کرنا چاہتی تھیں۔ باپ سمجھاتا رہا وہ نہیں سمجھیں، تو باپ نے مسلمانوں سے جبری نکاح کر دیا۔ پہلی رات جب خاوند کے پاس آنا تھا تو وہاں سے غیر مسلموں کے پاس چلی گئیں، ایک سکھ کے ساتھ بھاگ گئی اور ایک عیسائی کے ساتھ۔ انہوں نے کہا کیا مذہب مذہب لگا رکھا ہے، چھوڑو مذہب میں کیا رکھا ہے، کھاؤ، پیو اور عیش کرو۔

میرے بھائیو! اللہ کی طرف لوٹنا، مالک کے سامنے گڑگڑانا، باہر آگ لگی ہوئی ہے، اللہ کے پیغام اور نبی ﷺ کے طریقوں کو پہنچانا اِس آگ کو بجھانا ہے، اللہ ہمیں ذریعے کے طور پر قبول فرمائے۔ آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ)

وَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ (رواہ الطبرانی، من حدیث کعب بن سعد)

صدقِ نیّت کی اہمیت

اور

ایک عمل میں متعدد نیّتیں

صدقِ نیت کی اہمیت اور ایک عمل میں متعدد نیتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ، وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا[۱]

وَقَالَ تَعَالٰى: وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ، وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ [۲]

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰى دُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِ امْرَاَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ۔[۳]

وَقَالَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ [۴]

میرے محترم بھائیو، دوستو اور بزرگو! گزشتہ بیان میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے خاندان کی ہجرت کا تذکرہ ہوا تھا، ہجرت کرتے وقت ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی نیت اور غرض ضرور ہوتی ہے جس کے لئے وہ اپنے وطن کو چھوڑ رہا ہوتا ہے جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن عراق کو چھوڑتے وقت فرمایا تھا: اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ[۵] ''میں اپنے ربّ کے پاس جارہا ہوں، وہی میری رہنمائی کرے گا''۔ یعنی میرے ہجرت کرنے کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اللہ کے دین کی سربلندی وسرفرازی ہے،

---

[۱] سورۃ النساء: ۱۰۰

[۲] سورۃ النحل: ۴۱

[۳] بخاری ومسلم

[۴] رواہ الطبرانی، من حدیث سہل بن سعدؓ

[۵] الصّٰفات: ۹۹

اس لئے آج ''صدقِ نیت کی اہمیت اور ایک عمل میں متعدد نیتیں کرنا'' کے متعلق بیان ہوگا۔

میرے عزیزو! اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، ہجرت کرتے وقت بھی آدمی جس چیز کی نیت کرے گا اس کو اسی کا اجر ملے گا۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِیءٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِامْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ۔[1]

''حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے (یعنی عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے) لہٰذا جس شخص نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کیلئے (بہ نیت خالص) ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسول ہی کیلئے ہوگی اور جس شخص نے دنیا حاصل کرنے کیلئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کیلئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کیلئے ہوگی جس کا اس نے ارادہ کیا ہے''۔

اس حدیث کا شانِ ورود اور شانِ ظہور یہ ہے کہ ایک شخص جو بعد میں صحابی ہوئے، انہوں نے ایک مسلمان عورت سے جن کا نام ''ام قیس'' تھا نکاح کا ارادہ کیا اور ان کو پیغام بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ میں تم سے کس طرح نکاح کرسکتی ہوں تم کافر ہو اور میں غیر مسلم سے نکاح نہیں کرسکتی، ہاں البتہ اگر اسلام لے آؤ اور ہجرت کرو تو ممکن ہے۔ چنانچہ یہ شخص ایمان لے آئے اور مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی اور ام قیس سے نکاح کرلیا۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہجرت کرے تو اس کی ہجرت اسی غرض کیلئے سمجھی جائے گی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہے۔''

اس جگہ ایک ضروری اور اہم بات سمجھ لینے کے قابل ہے اور وہ یہ کہ اس حدیث میں غور کرنے سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس جگہ نہ کسی ثواب کا ذکر فرمایا ہے نہ عقاب کا۔ یعنی یہ نہیں فرمایا

---

[1] بخاری ومسلم

کہ اگر کوئی شخص اللہ اور رسول کے واسطے اور اخلاصِ نیت کے ساتھ ہجرت کرے گا تو اس کو یہ ثواب ہوگا اور اگر کوئی دنیا کے واسطے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کرے گا تو اس کو ایسا ایسا عذاب ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی مراد یہ ہے کہ اگر کسی عبادت کے ساتھ کسی دوسری چیز کا شائبہ ہوگیا تو اگر وہ چیز کوئی معصیت ہے پھر تو گناہ ہوگا اور اگر وہ کوئی امر مباح ہے تو نہ کوئی ثواب ہوگا نہ عقاب ہوگا۔ اس حدیث میں ان صحابی نے نکاح کرنے کی خاطر ہجرت کی، چونکہ نکاح کرنا ایک امر جائز ہے اس لئے یہ نہیں فرمایا کہ گناہ گار ہوگا، بلکہ جس درجہ کی ہجرت ہے اسی درجہ کا اس کا ثواب ہوگا۔

آج کل کے ان لوگوں کا حکم بھی معلوم ہوگیا جو شہیدِ قوم اور شہیدِ وطن وغیرہ کے خطابات سے یاد کئے جاتے ہیں۔ شریعت میں شہیدِ قوم اور شہیدِ وطن کا کوئی مرتبہ اور کوئی حیثیت نہیں۔ شریعت میں شہید وہی ہے جو اللہ کی راہ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اپنی جان دے اور جو لوگ بلا لحاظ اسلام، وطن اور قوم کے لئے اپنی جان دیتے ہیں ان کو اجر کی اُمید بھی وطن اور قوم ہی سے رکھنی چاہیے، اللہ کو اُن کی کوئی ضرورت نہیں، جن کو اللہ کے دین سے واسطہ نہیں اللہ کو ان سے کیا واسطہ۔

نیت کی خرابی کا ثمرہ:

اَخْرَجَ ابْنُ اِسْحَاقَ عَنْ عَاصِمِ بْنِ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ فِيْنَا رَجُلٌ اَتِيٌّ، لَايُدْرٰى مَنْ هُوَ، يُقَالُ لَهٗ قُزْمَانُ، فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَاذُكِرَ: اِنَّهٗ لَمِنْ اَهْلِ النَّارِ، قَالَ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ اُحُدٍ قَاتَلَ قِتَالًا شَدِيْدًا فَقَتَلَ هُوَ وَحْدَهٗ ثَمَانِيَةً اَوْ سَبْعَةً مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ، فَكَانَ ذَا بَأْسٍ، فَاَثْبَتَتْهُ الْجِرَاحَةُ فَاحْتُمِلَ اِلٰى دَارِ بَنِيْ ظَفَرَ، قَالَ: فَجَعَلَ رِجَالٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَهٗ : وَاللّٰهِ لَقَدْ اَبْلَيْتَ الْيَوْمَ يَاقُزْمَانُ! فَاَبْشِرْ قَالَ: بِمَا ذَا اُبْشِرُ؟ فَوَاللّٰهِ اِنْ قَاتَلْتُ اِلَّاعَنْ اَحْسَابِ قَوْمِيْ، وَلَوْلَا ذٰلِكَ مَاقَاتَلْتُ، قَالَ: فَلَمَّااشْتَدَّتْ عَلَيْهِ جِرَاحَتُهٗ اَخَذَسَهْمًا مِّنْ كِنَانَتِهٖ فَقَتَلَ بِهٖ نَفْسَهٗ۔[1]

---

[1] حیاۃ الصحابۃ، ج:۱، ص:۶۲۶، ط: فیضی، لاہور

ترجمہ:

حضرت عاصم بن عمر بن قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں میں ایک پردیسی آدمی رہتا تھا اسے کوئی جانتا نہیں تھا کہ وہ کون ہے؟ لوگ اسے قُزمان کہتے تھے۔ جب بھی اس کا تذکرہ ہوتا تو حضور ﷺ فرماتے کہ یہ تو دوزخ والوں میں سے ہے۔ جنگ اُحد کے دن اس نے خوب زور شور سے لڑائی کی اور اس نے اکیلے ہی سات آٹھ مشرکوں کو قتل کر ڈالا اور وہ بڑا جنگ جُو اور بہادر تھا۔ آخر وہ زخموں سے نڈھال ہو گیا تو اسے بنوظفر کے محلہ میں اُٹھا کر لایا گیا، بہت سے مسلمان اسے کہنے لگے اے قُزمان! آج تو تم بڑی بہادری سے لڑے ہو، تمہیں خوشخبری ہو۔ اس نے کہا مجھے کس چیز کی خوشخبری ہو؟ اللہ کی قسم! میں نے تو صرف اپنی قوم کی ناموری کے لئے یہ لڑائی لڑی ہے، اگر میرا مقصد یہ نہ ہوتا تو مَیں ہرگز نہ لڑتا۔ چنانچہ جب اس کے زخموں کی تکلیف بڑھ گئی تو اس نے اپنی ترکش میں سے ایک تیر نکالا اور اس سے خودکشی کر لی۔

نیک نیتی کا ثمرہ:

اَخْرَجَ ابْنُ اِسْحَاقَ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ: حَدِّثُوْنِیْ عَنْ رَجُلٍ دَخَلَ الْجَنَّةَ لَمْ يُصَلِّ قَطُّ، فَاِذَا لَمْ يَعْرِفِ النَّاسُ، سَأَلُوْهُ مَنْ هُوَ؟ فَيَقُوْلُ اُصَيْرِمُ بَنِیْ عَبْدِالْاَشْهَلِ: عَمْرُوبْنُ ثَابِتِ بْنِ وَقْشٍ، قَالَ الْحُصَيْنُ: فَقُلْتُ لِمَحْمُوْدِ بْنِ لَبِيْدٍ: كَيْفَ كَانَ شَأْنُ الْاُصَيْرِمِ؟ قَالَ: كَانَ يَأْبَى الْاِسْلَامَ عَلٰى قَوْمِهٖ، فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ اُحُدٍ بَدَا لَهٗ فَاَسْلَمَ، ثُمَّ اَخَذَ سَيْفَهٗ فَغَدَا حَتّٰى دَخَلَ فِیْ عُرْضِ النَّاسِ فَقَاتَلَ حَتّٰى اَثْبَتَتْهُ الْجِرَاحَةُ، قَالَ: فَبَيْنَمَا رِجَالٌ مِّنْ بَنِیْ عَبْدِ الْاَشْهَلِ يَلْتَمِسُوْنَ قَتْلَاهُمْ فِی الْمَعْرَكَةِ اِذَا هُمْ بِهٖ، فَقَالُوْا وَاللّٰهِ! اِنَّ هٰذَا الْاُصَيْرِمُ مَا جَاءَ بِهٖ؟ لَقَدْ تَرَكْنَاهُ وَاِنَّهٗ لَمُنْكِرٌ لِّهٰذَا الْحَدِيْثِ فَسَاَلُوْهُ فَقَالُوْا: مَا جَاءَبِكَ يَا عَمْرُو؟ اَحَدْبٌ عَلٰى قَوْمِكَ اَمْ رَغْبَةٌ فِی الْاِسْلَامِ؟ فَقَالَ: بَلْ رَغْبَةٌ فِی الْاِسْلَامِ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ

وَبِرَسُوْلِهٖ، وَاَسْلَمْتُ ثُمَّ اَخَذْتُ سَيْفِيْ وَغَدَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَاتَلْتُ حَتّٰى اَصَابَنِيْ مَااَصَابَنِيْ ،فَلَمْ يَلْبَثْ اَنْ مَاتَ فِيْ اَيْدِيْهِمْ، فَذَكَرُوْهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ،فَقَالَ اِنَّهٗ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔[1]

ترجمہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایسا آدمی بتاؤ جو جنّت میں تو جائے گا لیکن اس نے نماز کوئی نہیں پڑھی؟ جب لوگ اس کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتے تو اُن سے پوچھتے کہ وہ کون ہے؟ تو وہ فرماتے کہ وہ بنو عبدالاشہل کے اصیرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جن کا نام عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔ حضرت حصین فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت محمود بن لبید سے پوچھا کہ حضرت اصیرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کیا قصہ ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ ان کی قوم ان کو اسلام کی دعوت دیا کرتی تھی لیکن یہ ہمیشہ انکار کر دیتے۔ جنگ اُحد کے دِن ایک دم ان کے دِل میں اسلام لانے کا خیال پیدا ہوا اور وہ مسلمان ہو گئے اور اپنی تلوار لے کر چل پڑے اور ایک کنارے سے مجمع میں جا کر لڑائی شروع کر دی، یہاں تک کہ زخموں سے نڈھال ہو کر گر پڑے۔ (لڑائی کے بعد) قبیلہ بنو عبدالاشہل کے لوگ میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے اپنے ساتھیوں کو تلاش کرنے لگے تو ان کی نگاہ حضرت اُصیرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر پڑی تو وہ کہنے لگے اللہ کی قسم! یہ تو اصیرم ہیں، یہ یہاں کیسے آ گئے؟ ہم تو ان کو (مدینہ میں) چھوڑ کر آئے تھے اور یہ تو ہمیشہ (اسلام کی) اس بات کا انکار کیا کرتے تھے تو ان لوگوں نے حضرت اصیرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا اے عمرو! آپ یہاں کیسے آئے؟ اپنی قوم کی ہمدردی میں یا اسلام کے شوق میں؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، اسلام کے شوق میں۔ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور مسلمان ہو گیا، پھر میں اپنی تلوار پکڑ کر حضور ﷺ کے ساتھ چل پڑا اور میں نے لڑنا

[1] حیاۃ الصحابۃ، ج:۱، ص:۶۲۶، ط: فیضی، لاہور

شروع کر دیا، یہاں تک کہ میں اتنا زخمی ہو گیا۔ اتنا کہنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ان کے ہاتھوں میں حضرت اصیرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ ان لوگوں نے جا کر حضور ﷺ سے ان کا سارا واقعہ ذکر کیا، حضور ﷺ نے فرمایا وہ جنّت والوں میں سے ہیں (لہٰذا انہیں اسلام لانے کے بعد ایک نماز پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملا)۔

شیطان پر سب سے زیادہ گراں اور شاق "اخلاص" ہے:

امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"شیطان پر اخلاص سے زیادہ کوئی چیز گراں اور شاق نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اخلاص کی وجہ سے شیطان کو اس عمل میں سے کوئی حصہ نہیں ملتا، اس لئے اسکی گرانی کا سبب ہوتا ہے۔ شیطان سے خلاصی کا ذریعہ صرف اخلاص ہے۔

نیت کی اہمیّت:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ [1] "مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔"

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک تو ایسا شخص ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی عطا فرمایا ہے اور علم بھی، اب وہ اپنے مال کو اپنے علم کے مطابق صحیح جگہوں میں خرچ کرتا ہے یعنی جہاں پر خرچ کرنے کا حکم ہے وہاں تو خرچ کرتا ہے اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت ہے وہاں خرچ کرنے سے رُک جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شخص ایسا ہے کہ اُس کو اجر اور ثواب بہت ملے گا کیونکہ جہاں جہاں اُس کو خرچ کرنے کی ضرورت محسوس ہو گی دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، اور ایک دوسرا شخص ہے کہ اُس کے پاس نہ مال ہے اور نہ ہی علم ہے۔ وہ اُس کو دیکھ دیکھ کر حسرت کھاتا اور رشک کرتا ہے کہ کاش! اللہ تعالیٰ مجھ کو بھی اسی طرح مال دیتا اور میں اس کو اللہ کی راہ میں اس شخص کی طرح خرچ کرتا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

هُمَا فِي الْاَجْرِ سَوَاءٌ "یہ دونوں اجر اور ثواب میں برابر ہیں۔"

---

[1] رواہ الطبرانی، من حدیث سہل بن سعدؓ

دو عجیب نعمتیں:

بعض اولیاء کرام کے کلام میں دیکھا کہ دو چیزیں عجیب وغریب ہیں۔ ایک توبہ اور دوسری نیت۔ اور یہ دونوں عجیب وغریب اس لئے ہیں کہ نیت کا کام ہے کہ معدوم چیز کو موجود بنا دینا۔ مثلاً ہم نے کوئی عمل نہیں کیا۔ مگر نیت نے اس کو موجود کر دیا اور دوسری چیز توبہ ہے کہ جو موجود کو معدوم کر دیتی ہے۔ کیونکہ انسان خواہ ستر برس تک گناہ کرتا رہے بلکہ شرک وکفر میں مبتلا رہے۔ جب بارگاہِ الٰہی میں ایک سجدہ کیا اور معافی مانگی سب یک قلم معاف اور گناہوں کا ایک بے شمار ذخیرہ جو موجود تھا اس کو ایک مخلصانہ توبہ نے معدوم کر ڈالا۔ یہ دو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو عطا کی ہیں۔ عجیب نعمتیں ہیں۔ ''فَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيْرًا۔''

احسان کر کے بدلہ نہ چاہنا:

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اعزہ کو صدقہ دینے کے بارے میں ایک اصول اور ضابطہ بنا رکھا تھا، وہ یہ کہ بعض رشتہ دار تو انسان سے کسی وجہ سے ناخوش رہتے ہیں اور بعض خوش اور راضی ہوتے ہیں تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رشتہ داروں کو دینا پسند کرتے تھے جو ناخوش رہتے ہیں اور قرآن مجید میں عباد مخلصین کے متعلق ارشاد ہے کہ ان کا مسلک یہ ہے:

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْرًا[1]

''ہم صدقہ دے کر تم سے بدلہ اور شکر گزاری کے طلب گار نہیں ہیں۔''

تو چونکہ شکریہ کا طلب کرنا بھی ایک طرح کا بدلہ چاہنا ہے اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ رُوٹھے ہوئے رشتہ داروں سے شکر گزاری کی توقع نہیں ہوتی اس لئے میں ان کو دینا پسند کرتا ہوں۔

جلالتِ شان کے باوجود تواضع:

اَخْرَجَ الْمَرْوَزِيُّ فِي الْعِيدَيْنِ عَنْ زِرٍّ قَالَ: رَاَيْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَمْشِي اِلَى الْعِيْدِ حَافِيًا۔ كَذَافِي الْمُنْتَخَبِ اَخْرَجَ الدِّيْنَوَرِيُّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عُمَرَ الْمَخْزُوْمِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ: نَادٰى عُمَرُ بْنُ

---

[1] سورۃ الدھر: ۸

الْخَطَّابِ: اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ. فَلَمَّا اجْتَمَعَ النَّاسُ وَكَثُرُوْا، صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ وَصَلّٰى عَلٰى نَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ قَالَ: اَيُّهَا النَّاسُ! لَقَدْ رَاَيْتُنِيْ اَرْعٰى عَلٰى خَالَاتٍ لِيْ مِنْ بَنِيْ مَخْزُوْمٍ، فَيَقْبِضْنَ لِيَ الْقَبْضَةَ مِنَ التَّمْرِ وَالزَّبِيْبِ، فَاَظَلُّ يَوْمِيْ وَاَنَا يَوْمٍ! ثُمَّ نَزَلَ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ! مَازِدْتَّ عَلٰى اَنْ قَمَأْتَ نَفْسَكَ يَعْنِيْ عِبْتَ، فَقَالَ: وَيْحَكَ يَا ابْنَ عَوْفٍ! اِنِّيْ خَلَوْتُ فَحَدَّثَتْنِيْ نَفْسِيْ، فَقَالَتْ: اَنْتَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ، فَمَنْ ذَا اَفْضَلُ مِنْكَ! فَاَرَدْتُّ اَنْ اُعَرِّفَهَا نَفْسَهَا كَذَا فِي الْمُنْتَخَبِ، ج:۴، ص:۴۱۷۔[۱]

وَاَخْرَجَهُ ابْنُ سَعْدٍ عَنْ اَبِيْ عُمَيْرٍ الْحَارِثِ بْنِ عُمَيْرٍ عَنْ رَجُلٍ بِمَعْنَاهُ وَفِيْ رِوَايَتِهٖ: اَيُّهَا النَّاسُ! لَقَدْ رَاَيْتُنِيْ وَمَالِيْ مِنْ اَكَالٍ يَاْكُلُهُ النَّاسُ اِلَّا اَنَّ لِيْ خَالَاتٍ مِنْ بَنِيْ مَخْزُوْمٍ، فَكُنْتُ اَسْتَعْذِبُ لَهُنَّ الْمَاءَ، فَيَقْبِضْنَ لِيَ الْقَبَضَاتِ مِنْ زَبِيْبٍ، وَفِيْ آخِرِهٖ: اِنِّيْ وَجَدْتُّ فِيْ نَفْسِيْ شَيْئًا فَاَرَدْتُّ اَنْ اُعَاتِبَهَا۔[۲]

حضرت زر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ عیدگاہ ننگے پاؤں جارہے ہیں۔

حضرت عمر مخزومی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعلان کروایا: اَلصَّلَاةُ جَامِعَةٌ سب نماز میں جمع ہو جائیں، ضروری بات کرنی ہے۔ جب لوگ کثرت سے جمع ہو گئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اللہ کی حمد وثنا اور درود وسلام کے بعد فرمایا: اے لوگو! میری چند خالائیں تھیں جو قبیلہ بنو مخزوم کی تھیں، میں ان کے جانور چرایا کرتا تھا وہ مجھے مٹھی بھر کشمش اور کھجور دے دیا کرتی تھیں،

---

[۱] حیاۃ الصحابۃ، ج:۲، ص:۷۴۷، فیضی، لاہور

[۲] حیاۃ الصحابۃ، ج:۲، ص:۷۴۷، فیضی، لاہور

میں اس پر سارا دن گزارا کرتا تھا اور وہ بہت ہی اچھا دِن ہوتا تھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ منبر سے نیچے تشریف لے آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: اے امیر المؤمنین! آپ نے اور تو کوئی خاص بات کہی نہیں بس اپنا عیب ہی بیان کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: اے ابن عوف! تیرا بھلا ہو! میں تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا، میرے نفس نے مجھ سے کہا تُو امیر المؤمنین ہے، تجھ سے افضل کون ہوسکتا ہے؟ تو میں نے چاہا کہ اپنے نفس کو اس کی حیثیت بتادوں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے لوگو! میں نے اپنا یہ حال دیکھا ہے کہ میرے پاس کھانے کی کوئی چیز نہیں ہوتی تھی، میں اپنے قبیلہ بنومخزوم کی خالاؤں کو میٹھا پانی لاکر دیا کرتا تھا وہ مجھے کشمش کی چند مٹھیاں دے دیا کرتی تھیں، بس یہ کشمش ہی کھانے کی چیز ہوتی تھی۔ آخر میں یہ بھی فرمایا: مجھے اپنے نفس میں کچھ بڑائی محسوس ہوئی تو میں نے چاہا کہ اسے کچھ نیچے جھکاؤں۔

محدود عمل کی سزا اور جزا دائمی ہونے کی وجہ:

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''قیامت کے بعد جہنمی جہنم میں اور جنتی جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جس کی کوئی مدت متعین نہیں۔ حالانکہ جن لوگوں کو جہنم میں بھیجا جائے گا ان کے اعمالِ کفر محدود ہیں اور جن کو جنت میں بھیجا جائے گا اُن کے اعمالِ صالح بھی محدود ہیں تو اس محدود کی جزاء لامحدود کیوں مقرر کی گئی؟ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اس اشکال کا یہی جواب دیا ہے کہ چونکہ عمل کرنے والے کی نیت دوام کی تھی اس لئے جزاء بھی دائمی مقرر ہوئی، کافر کی نیت یہ تھی کہ اگر ایک کروڑ سال کی عمر ملے تو کفر ہی پر قائم رہوں گا، اسی طرح مومن کی بھی یہی نیت ہے کہ کتنی ہی عمر دراز کیوں نہ ہو ایمان پر قائم رہوں گا۔ نیت چونکہ دوام کی ہے اس لئے جزا بھی دائمی ہے۔''

عمل شروع کرنے سے پہلے اپنی نیت درست کرلیں:

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''آدمی کو چاہیے کہ عمل شروع کرنے سے قبل اپنی نیت درست کرلے، بعد میں اگر نیت میں کچھ خلل آئے تو پرواہ نہ کرے، شیطان اگر وسوسہ ڈالے تو التفات نہ کرے''۔

مسئلہ:

ایک شخص انگور کے رَس کی تجارت کرتا ہے جس سے شراب بنائی جاتی ہے۔ اگر اس کی نیت محض تجارت کی ہے اور اس کا مقصد اس تجارت سے یہ نہیں ہے کہ اس سے شراب بنائی جائے تو یہ تجارت صحیح ہوگی اور اگر اس کی نیت ہی یہ ہے کہ اس سے شراب بنائی جائے تو یہ تجارت حرام ہوگی۔

متعدد چیزوں کی نیّت کرنا:

۱۔ ایک شخص کا کوئی عزیز قرابتی غریب ومفلس ہے، اس غریب کی وہ مدد اس نیت سے کرتا ہے کہ غریب کی لوجہ اللہ مدد کرنا کارِ ثواب ہے تو اس کو اسی کا ثواب ملے گا، لیکن اگر وہ اس کے ساتھ ہی صلہ رحمی کی بھی نیت کرتا ہے کہ اس کی لوجہ اللہ مدد کرنا کارِ ثواب ہے ہی، مگر اس سے میرے ایک عزیز کی پریشانیاں بھی دور ہوجائیں گی تو اب محض یہ نیت کرنے سے اس کو دو ثواب ملیں گے۔

اسی طرح مسجد میں جانے کی کئی نیتیں ہوسکتی ہیں اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ ثواب ملتا ہے، مثلاً:

۲۔ ایک شخص مسجد میں جاتا ہے تو وہ نیت کرے کہ چونکہ فرمایا گیا ہے کہ مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، جہاں آنے والا گویا اللہ تعالیٰ کی زیارت کو آتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کریم ہے اور کریم کے لئے مہمان کی ضیافت ضروری ہوتی ہے لہٰذا میں بھی اس کا اُمیدوار ہوں، تو اس کو یہ ثواب حاصل ہوجائے گا۔

۳۔ اور نیت کرے جماعت کے انتظار کا، چونکہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جماعت کا انتظار کررہا ہے وہ گویا حالتِ نماز میں ہے، پس اس نیت سے اس کا ثواب مل جائے گا۔

۴۔ اور نیت کرے کہ کان، آنکھ اور تمام اعضاء جو بازار وسڑک میں گناہ میں گرفتار ہوتے ہیں وہ یہاں مسجد میں آکر محفوظ ہوجائیں گے۔

۵۔ مسجد میں آتے ہی اعتکاف کی نیت کرلے، کیونکہ علماء نے لکھا ہے کہ جب مسجد میں داخل ہوتو چاہئے کہ اعتکاف کی نیت کرلیا کرے تو یہ ثواب بھی کہیں نہیں گیا۔

مسجد میں دخول کے وقت اعتکاف کی نیت کرنا اور پھر اس پر ثواب ملنا درحقیقت خداوند قدوس کی جانب سے مسلمانوں کے لئے ایک نعمت ہے کہ جو بغیر محنت کئے ہوئے حاصل ہوتی ہے مگر افسوس کہ مسلمان اس سے غافل ہیں۔

۶۔ مسجد میں آتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت مسنون دعائیں پڑھنا یا نبی کریم ﷺ پر صلوٰۃ وسلام بھیجنا سعادت کا باعث ہے، تو اگر دخولِ مسجد کے وقت اسکی بھی نیت کرلے تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔

۷۔ اور نیت کرے کہ مسجد میں تنہائی اور سکون نصیب ہوتا ہے جہاں ذکر اللہ، تلاوت قرآن یا وعظ ونصیحت باطمینان کیا جاسکتا ہے، تو اس کا ثواب بھی ملے گا۔

کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص صبح مسجد میں ذکر ووعظ کے لئے جاتا ہے تو گویا وہ مجاہد فی سبیل اللہ کے مرتبہ کو پاتا ہے یا کوئی جماعت مسجد میں بیٹھ کر تلاوت قرآن میں مشغول ہو اور آپس میں تذکیر ونصیحت کرتے رہیں (اس انداز میں کہ نمازیوں کی عبادت میں حرج نہ ہو) تو اس جماعت کو ملائکہ ڈھانک لیتے ہیں اور رحمت خداوندی کا ان پر سایہ ہوتا ہے۔

۸۔ اسی طرح نیت کرے کہ وضو کرکے مسجد میں نماز کیلئے جانے سے حج اور عمرہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

۹۔ اور نیت کرے کہ مسجد میں لوگوں کے اجتماع سے افادہ واستفادہ بالعلم اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے مواقع میسر آتے ہیں۔

۱۰۔ نیت کرے وہاں (مسجد میں) مسلمان بھائیوں سے ملاقات کی اور ان پر سلام ورحمت پہنچانے کی۔

۱۱۔ اور نیت کرے محاسبہ نفس اور تفکر فی الآخرت اور اپنے گناہوں سے استغفار کی کیونکہ مسجد میں سکون اور دِل جمعی سے یہ کام ہوسکتا ہے جو دوسری جگہ مشکل ہے۔

۱۲۔ اگر کسی نے یہ بھی نیت کرلی کہ میں تو روسیاہ اور گنہگار ہوں اور وہاں پر اللہ کے مقبول اور برگزیدہ بندے بھی ہوں گے اس لئے میری روسیاہی اور گناہگاری ان کی برکت سے ڈھل جائے گی تو اس

نیت کا ثواب بھی بڑھ جائے گا۔

بہر حال مسجد میں آنے کا عمل ایک ہے لیکن چونکہ نیتیں الگ الگ ہو کر بہت زیادہ ہیں، اس لئے ثواب ان سب نیتوں کا ملے گا، گویا عمل ایک اور بہ سبب نیت ثواب اتنا زیادہ۔

اور پھر مسجد تو عبادت کی جگہ ہے اور ان امور کا تعلق بھی عبادت اور آخرت سے ہے، لہٰذا ان پر ثواب تو ملتا ہی ہے لیکن اگر اُن چیزوں میں بھی نیک نیت کر لے جن کا تعلق زینت جسمانی یا دنیاوی امور سے ہے تو اللہ کی بے پایاں رحمت سے وہاں بھی ثواب ملتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جمعہ کو یا عام طور پر خوشبو لگائے گا اور اس کے ساتھ یہ بھی نیت کر لے کہ چونکہ نبی کریم ﷺ خوشبو کو بہت پسند فرماتے تھے اس لئے میں بھی خوشبو لگاتا ہوں۔

۲۔ اور نیت کرے اس خوشبو کے لگانے سے کہ اس سے مسجد کی تعظیم بھی ہوگی۔

۳۔ اور نیت کرے کہ جو شخص میرے پاس بیٹھے گا خوشبو پا کر خوش ہوگا۔

۴۔ اور نیت کرے کہ کوئی شخص محض میرے خوشبو نہ لگانے کے سبب بدبُو کی وجہ سے میری غیبت کرے گا اور میں خوشبو لگا کر اس کو غیبت کے گناہ سے باز رکھتا ہوں۔

۵۔ اور نیت کرے کہ تازہ خوشبو سے دماغ کے معالجہ کی کہ خوشبو سے میرا دماغ تر و تازہ ہوگا اور میں جس مجلس وعظ و نصیحت میں بیٹھوں گا اس کی وجہ سے کام کی باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہوں گی۔

میرے محترم بھائیو! یہاں بھی خوشبو لگانے کا عمل ایک ہی ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ یہ تمام نیک نیتیں کر لی جائیں تو ان پر بھی الگ الگ ثواب ملے گا، اسی طرح ہر عمل میں مختلف نیتیں ہو سکتی ہیں۔

تنبیہ:

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ترجمہ مشکوٰۃ میں فرمایا ہے:

"علماء اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ نماز میں نیت کا پکار کر کہنا مشروع نہیں ہے۔ نیز حضرت شیخ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محدثین نے کہا ہے کہ حدیث کی کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ نے نیت زبان سے کہی ہو۔

لہٰذا آنحضرت ﷺ کی سنت کا اتباع اسی میں ہے کہ نیت دِل سے کرے اور اسی پر اکتفاء کرے، کیونکہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے کئے ہوئے فعل کا اتباع کرنا اطاعتِ رسول ہے اسی طرح یہ بھی نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے کہ جس فعل کو نبی کریم ﷺ نے کبھی نہ کیا ہو اس پر عمل نہ کیا جائے، اور چاہئے کہ اس پر دوام واصرار نہ کیا جائے جو شارع سے ثابت نہیں ہے۔

اللہ پاک ہمیں پاک نبی ﷺ کی کامل اتباع نصیب فرمائے اور آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے اور خلوصِ دل کے ساتھ دین کا کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

''خَیْرُ مَاءٍ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ''۔ (معجم کبیر طبرانی وابن حبان)

شرابُ الابرار

یعنی ماءِ زم زم کا سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ایڑیوں سے نکلنا، اُس کی تفصیلات اور فضائل کا بیان

شرابُ الابرار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

آج کے خطبہ میں ماءزم زم کا بیان ہوگا ان شاءاللہ۔

زم زم شریف کی وجہ تسمیہ:

یعنی زمزم کو زمزم کیوں کہتے ہیں؟ اس کی متعدد وجوہات ہیں:

پہلی وجہ: زمزم کے معنی لغت عرب میں کثیر یعنی بہت زیادہ کے آتے ہیں، بہت زیادہ پانی کو زمزم کہتے ہیں اور چونکہ زمزم کا پانی بھی بہت زیادہ ہے اس لئے اس کا نام زمزم ہوا۔

دوسری وجہ: زمزم کے معنی اجتماع کے بھی آتے ہیں، چنانچہ زمزم میں بھی پانی جمع رہتا ہے اور لوگ بھی اس کے پاس جمع رہتے ہیں، اسی لئے اس کو زمزم کہتے ہیں۔

تیسری وجہ: زمزم ''زمزمہ'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں ایڑی کو زمین پر اس قدر زور سے مارنا کہ زمین میں گڑھا پڑ جائے، چونکہ ایڑی کو زمین پر مارنے کی وجہ سے زمزم وجود میں آیا اس لئے اس کو زمزم کہتے ہیں۔

چوتھی وجہ: زمزم کے معنی حرکت کے ہیں، اور زمزم کے پانی کو بہت کثرت سے کھینچا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس میں حرکت رہتی ہے، اس لئے اس کو زمزم کہتے ہیں۔

پانچویں وجہ: بعض علماء نے یہ بیان کی ہے کہ زمزم ماخوذ ہے ''زم'' سے، جس کے معنی ہوتے ہیں ''باندھنے'' اور ''رکاوٹ ڈالنے'' کے، حضرت ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی زمزم کے پانی کو دائیں بائیں پھیلنے سے بچانے کے لئے مٹی کی منڈیر لگادی تھی، اسی وجہ سے اس کو زمزم کہتے ہیں۔

چھٹی وجہ: حدیث پاک میں آیا ہے کہ جب اسماعیل علیہ السلام کے ایڑی مارنے سے چشمہ ابل رہا تھا تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے کہا زم زم یعنی ٹھہر جا، جس سے اس کا نام زم زم پڑ گیا۔

نیز:

عربی لغت میں زم زم اور زمزمہ کے معنی ہیں ''دور سے گنگناہٹ سنائی دینا، بکھری ہوئی چیز کو جمع کرنا، حفاظت کرنا''۔ایک روایت یہ ہے کہ سریانی زبان میں زم زم کے معنی ٹھہر ٹھہر کے ہیں۔

زم زم کے نام:

کسی چیز کے نام زیادہ ہونا بھی اس کے عظیم ہونے کی دلیل ہوتی ہے کیونکہ مختلف خوبیوں اور خصوصیات ہی کی وجہ سے ناموں کا اضافہ ہوتا ہے، زم زم کے بھی بے شمار نام احادیث وآثار میں سلف سے منقول ہیں، ہم یہاں صرف چند نام اور ان کے معانی بیان کرنے پر اکتفاء کریں گے۔

۱۔**زمزم:** اس کا سب سے مشہور نام تو یہی زمزم ہے، صحیح احادیث میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔

۲۔**شراب الابرار:** (نیک لوگوں کا مشروب) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہا کرتے تھے کہ تم لوگ مصلی الاخیار میں (بہترین لوگوں کے نماز پڑھنے کی جگہ) نماز پڑھو اور شراب الابرار (نیک لوگوں کے مشروب) سے پیو، ان سے دریافت کیا گیا کہ مصلی الاخیار کیا ہے؟ تو فرمایا ''**تحت المیزاب**'' (میزاب یعنی کعبۃ اللہ کے پرنالے کے نیچے) پوچھا گیا کہ شراب الابرار کیا ہے؟ تو فرمایا ''ماءزمزم'' (زمزم کا پانی)۔[۱]

۳۔**شباعۃ:** (سیراب اور آسودہ کرنے والا پانی) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی سے مروی ہے کہ ہم اس کو (یعنی زمزم کو) شباعہ کہا کرتے تھے اور ہم اسے اہل وعیال کے لئے بہترین مددگار پاتے تھے۔[۲]

۴۔**برۃ:** نیکی واحسان والا پانی، کیونکہ اس کے پینے والے کو بے شمار فوائد وبرکات حاصل ہوتے ہیں۔

۵۔**مضنونہ:** بخل کیا گیا، وہ پانی جسے روک دیا گیا اور بعض کو اس سے محروم کر دیا گیا، مومن ہی اس کو سیراب ہو کر پیتا ہے، منافق نہیں پی سکتا، یا اس نام کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قبیلہ جرہم نے اس کے پاس

---

[۱] اخبار مکۃ: ج:۱، ص ۳۱۸، بحوالہ سواکن الغرام: ۲۰۲، قال المحقق اسنادہ صحیح

[۲] مجمع الزوائد: ج ۳، ص: ۲۲۲، کتاب الحج، باب فی زمزم، رقم الحدیث: ۵۷۱۳

سکونت اختیار کی لیکن عظمت وحرمت کا پاس نہ کیا تو اس سے محروم کر دیئے گئے اور یہ نعمت ان سے چھین لی گئی۔

۶۔طعام طعم: غذا اور خوراک کی جگہ کفایت کرنے والا۔

۷۔شفاء سقم: بیماری سے شفاء۔

۸۔لاتنزح: جو کبھی نہ ختم ہوگا۔

۹۔لاتذم: جو کم نہ ہوگا۔

۱۰۔رواء: سیراب اور آسودہ کرنے والا۔

یہ سارے نام مصنف عبدالرزاق کی بعض روایات میں بیان ہوئے ہیں[۱]۔زمزم کی خصوصیات کے پیش نظر ان کے علاوہ بھی بے شمار نام زمزم کے منقول ہیں، بعض مؤرخین نے زمزم کے ساٹھ سے زیادہ نام گنوائے ہیں۔[۲]

ابتدائے زم زم:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اس واقعہ کی پوری تفصیل قلمبند کی ہے، جس کے مطابق حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا پریشانی کے عالم میں کبھی صفا کی پہاڑی پر جا کر دیکھتیں اور کبھی مروہ سے کہ شاید کہیں پانی یا آنے والا کوئی شخص نظر آجائے جس سے وہ مدد لے سکیں۔ گھبراہٹ کے اس عالم میں انہوں نے ایک آواز سنی، انہوں نے فوراً اسے مخاطب کر کے مدد کی درخواست کی، حضرت جبرائیل علیہ السلام ظاہر ہوئے اور انہوں نے اپنی ایڑی زمین پر ماری تو زمین سے پانی اُبلنے لگا، حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے گھبراہٹ میں پتھر جمع کر کے اس کے اردگرد ایک ہالہ سا بنالیا تا کہ پانی ضائع نہ ہو اور کچھ دنوں کے لئے ذخیرہ ہو جائے۔[۳]

---

[۱] مصنف عبدالرزاق، ج:۵، ص:۱۱۸۔۱۱۵، کتاب الحج، باب زمزم وذکرھا

[۲] شفاء الغرام باخبار البلد الحرام، ج:۱، ص:۴۰۴، فضل ماء زمزم

[۳] بخاری: ج۱، ص۴۷۵، قدیمی کتب خانہ، کراچی

اول متولی کون؟ اور زمزم کا بند کر دینا:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحبزادوں میں ایک قیدار بزرگ تھے، یہی حضور علیہ السلام کے اجداد میں سے ہیں، لیکن تولیت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بڑے بیٹے نابت کے سپرد ہوئی، ان کے بعد ان کے نانا مضاض نے قبضہ کرلیا۔[۱]

کچھ عرصہ مضاض کی اولاد زم زم شریف کی نگہبانی کرتی رہی، یہاں تک کہ عرب کے قبیلہ خزاعہ نے زمزم جرہم سے لے لیا، جرہم کے سردار عمرو بن حارث نے جب یہ متاعِ عزیز چھنتی دیکھی تو زم زم شریف کو بند کر کے اسے بے نام ونشان بنا دیا۔

زم زم شریف کے فضائل:

۱۔ حضور اکرم ﷺ نے آبِ زم زم شریف کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

اِنَّهَا مُبَارَكَةٌ اِنَّهَا طَعَامُ طُعْمٍ [۲]

اس میں برکت ہے اور وہ سیر کرنے والی غذا ہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُ مَاءٍ عَلَى وَجْهِ الْاَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ بہترین پانی دنیا میں آبِ زمزم ہے۔[۳]

۳۔ جامع صغیر میں ہے:

''زم زم کا پانی اور جہنم کی آگ بندے کے پیٹ میں یکجا جمع نہیں ہو سکتے''۔

مسئلہ:

فتاوی عالمگیری میں ہے کہ زم زم کا پانی خود اپنے ہاتھ سے نکالا جائے اور قبلہ کی جانب رُخ کر کے خوب سیر ہو کر پیا جائے اور ہر سانس پر نظر اُٹھا کر بیت اللہ شریف کو دیکھے اور بچا ہوا پانی منہ اور جسم پر مل لیا جائے

---

[۱] تاریخ مکہ

[۲] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل ابی ذر، ج: ۲، ص: ۲۹۶، حدیث نمبر: ۲۴۷۳، ط: قدیمی، کراچی

[۳] معجم کبیر، طبرانی وابن حبان

اور اگر ہو سکے تو کچھ اپنے جسم پر بھی ڈال لے۔

۴۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے دست مبارک سے ڈول کھینچ کر آبِ زم زم نوش فرمایا تھا، زم زم شریف پیتے وقت یہ دعا پڑھی تھی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ

''اے اللہ! مجھے فائدہ پہنچانے والا علم عطا فرما اور میرے رزق میں وسعت دے اور ہر بیماری سے مجھے شفاء عطا فرما''۔

۵۔ حضور نبی کریم ﷺ کو آبِ زم زم بہت مرغوب تھا، فتح مکہ کے بعد حضور اکرم ﷺ نے مکہ کے عالم اور نامور خطیب حضرت سہیل بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خط لکھ کر آبِ زم زم طلب فرمایا تھا، چنانچہ حضرت سہیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آبِ زم زم کی دو مشکیں اُونٹ پر لدوا کر خدمتِ اقدس میں مدینہ منورہ بھیج دیں۔

۶۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی زم زم شریف کے فوائد کا خلاصہ ان الفاظ میں مروی ہے:

مَاءُ زَمْ زَمَ لِمَا شُرِبَ لَهٗ ''زم زم کا پانی جس غرض سے بھی پیا جائے مفید ہے''۔[۱]

۷۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

یَرْحَمُ اللّٰهُ اُمَّ اِسْمَاعِیْلَ لَوْتَرَکَتْ زَمْ زَمَ اَوْقَالَ لَوْلَمْ تَغْرِفْ مِنَ الْمَاءِ لَکَانَتْ زَمْ زَمُ عَیْنًا مَعِیْنًا ''اللہ تعالیٰ اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے کہ اگر وہ زم زم کے پانی کو ویسے ہی چھوڑ دیتیں یا اس کے اردگرد دیوار یا منڈیر نہ بناتیں تو زم زم ایک زبردست جاری چشمے کی صورت اختیار کر لیتا۔[۲]

فائدہ:

نبی کریم ﷺ نے زم زم کے پانی سے نہر بننے کے جس امکان کا ذکر فرمایا ہے غالباً یہ اسی سمت اشارہ ہے کہ نہر موجود ہے، اس لئے کہ بظاہر چھوٹا سا کنواں ہے لیکن دنیا کے کونے کونے میں اس کا پانی پہنچتا ہے،

---

[۱] ابن ماجہ

[۲] بخاری: ج ۱، ص ۴۷۵، قدیمی کتب خانہ، کراچی

مکہ معظمہ کے علاوہ حرم کے متعدد مقامات پر تقسیم ہو رہا ہے، مدینہ طیبہ کے حرم میں پیا جا رہا ہے، ہر ملک کا ہر فرد اپنے علاقہ میں لے جا رہا ہے، لیکن کنواں زمزم جیسے تھا ویسے ہی ہے۔

۹۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''زم زم پر نظر ڈالنا عبادت ہے اور یہ خطاؤں کو زائل کر دیتا ہے اور اس کے فضائل میں سے یہ بھی ہے کہ جس نے آب زم زم سے اپنا سر تین بار دھولیا (تین بار پانی ڈالا) اسے ذلت کا سامنا نہ ہوگا''۔

۱۰۔ محمد بن حرب رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''میں روم گیا، وہاں کے بادشاہ سے ملا، اس نے آبِ زمزم کے بارے میں کہا کہ ہم اپنی کتابوں میں لکھا پاتے ہیں کہ جس نے اس کا پانی تین مرتبہ اپنے سر پر ڈال لیا وہ بے ہوش ہو کر نہیں گرتا''۔

۱۱۔ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے بیت اللہ کا سات چکروں سے طواف کیا اور مقامِ ابراہیم کے عقب میں دو رکعت نماز پڑھی اور زم زم کا پانی پیا تو اس کے گناہ خواہ وہ کتنے ہی تھے معاف کر دیئے گئے''۔

اس حدیث کی تخریج واحدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں کی ہے۔

ماءِ زم زم پینے کے مسنون آداب:

۱۔ علماء کرام کہتے ہیں کہ جو شخص زم زم پینے کا ارادہ کرے اس کو چاہئے کہ وہ پانی کے برتن کو دائیں ہاتھ میں لے اور یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّہٗ بَلَغَنِیْ مِنْ نَّبِیِّکَ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ: مَاءُ زَمْ زَمَ لِمَا شُرِبَ لَہٗ اَللّٰھُمَّ اَشْرَبُہٗ لِکَذَا

''الٰہی تیرے نبی ﷺ سے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ زم زم کا پانی ہر اس غرض کیلئے ہے جس

کیلئے اس کو پیا جائے' الٰہی میں اس کو اس غرض سے پیتا ہوں''،

پھر اپنی غرض بیان کرے اور بسم اللہ پڑھ کر تین سانس میں خوب سیر ہو کر پانی پیے، پھر الحمد للہ کہے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آبِ زم زم پینے کے بعد یہ دعا پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ

الٰہی میں تجھ سے علم نافع اور رزق واسع اور ہر مرض سے شفا کا طالب ہوں۔

مشہور محدث حاکم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس دعا میں یہ الفاظ شامل کر لئے جائیں تو بہتر ہے:

وَقَلْبًا خَاشِعًا وَّذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ''اور قلب خاشع اور اچھی اولاد کا طالب ہوں''۔

۳۔ قبلے کی طرف منہ کرتے ہوئے پینا۔

۴۔ تین سانسوں میں پینا (پینے والا ہر مرتبہ برتن کو اپنے منہ سے جدا کرے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آبِ زمزم پیتے وقت سانس لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ زیادہ سیراب کرنے والا ہے اور زیادہ شفاء دینے والا ہے اور زیادہ گلے میں آسانی سے اُترنے والا ہے۔

۵۔ پیتے وقت ہر مرتبہ بسم اللہ پڑھنا۔

۶۔ ہر مرتبہ سانس لیتے وقت اللہ کی تعریف کرنا، یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا۔

۷۔ داہنے ہاتھ سے پینا، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بائیں ہاتھ سے پینے سے منع فرمایا ہے، کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا پیتا ہے۔

۸۔ ''ماءِ زم زم'' کو خوب پیٹ بھر کر پینا۔

۹۔ ''ماءِ زم زم'' کے پیتے وقت دعا کرنا۔

زم زم شریف کا پانی کھڑے ہو کر پینا سنّت ہے یا بیٹھ کر؟

صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا اور مسلم شریف ہی کی دوسری حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کھڑے ہو کر ہرگز پانی نہ پیو، اگر کوئی پی

لے تو اس کو قے کر دے۔ اس کے برعکس دوسری احادیث بھی ہیں جن سے کھڑے ہو کر پانی پینا جائز اور درست معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ حضور ﷺ نے زم زم کا پانی کھڑے ہو کر پیا[۱]۔ اور وضو کا بچا ہوا پانی بھی کھڑے ہو کر پیا[۲]۔ اور حضور ﷺ نے اُم سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں اور کبشہ انصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں مشک سے منہ لگا کر کھڑے ہو کر پانی پیا۔[۳]

ان مختلف احادیث کو دیکھتے ہوئے علامہ نووی، حافظ ابن حجر اور علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہم کی رائے یہ ہے کہ پانی پینے کا سنّت طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر پیا جائے اور جن موقعوں میں آپ ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا، آپ ﷺ نے یا تو عذر کی بنا پر ایسا کیا، مثلاً وہاں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی یا بیان جواز کے لئے ایسا کیا۔ یعنی یہ بتلانے کے لئے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا ناجائز اور حرام نہیں ہے۔ ان حضرات کے نزدیک زم زم کا پانی بھی بیٹھ کر پینا سنّت ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے میں کچھ حرج نہیں اور جن احادیث میں حضور ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ اُمّت کو نقصان اور ضرر نہ پہنچے، کیونکہ کھڑے ہو کر پینے میں جسمانی تکلیف کا خطرہ ہے اور جہاں یہ خطرہ نہ ہو وہاں کچھ حرج نہیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ زمزم کا پانی اور وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے اور ان دو کے علاوہ دوسرے پانی بیٹھ کر پینا مسنون ہیں۔ ان کو بلا عذر کھڑے ہو کر پینا خلاف سنّت ہے اور ان دو پانیوں کو کھڑے ہو کر پینے میں یہ حکمت ہے کہ کھڑے ہو کر پینے سے خوب پیٹ بھر کر پیا جا سکتا ہے اور زم زم کے پانی کو خوب پیٹ بھر کر پینا مستحب ہے۔ نیز یہ حکمت بھی ہے کہ یہ پانی برکت والے ہیں، پورے بدن میں سرایت کر جائیں۔[۴]

---

[۱] بخاری

[۲] ترمذی

[۳] شمائل ترمذی ص ۱۴

[۴] جمع الوسائل ج ۱ ص ۲۵۰، فتاویٰ شامی ج اول ص ۱۲۰

ماءزم زم کو دیکھنے سے گناہ جھڑتے ہیں:

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا پانچ امور عبادت میں داخل ہیں:

۱۔ قرآن شریف کی طرف دیکھنا، عظمت وجلال کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

۲۔ کعبہ کی جانب دیکھنا، کعبہ کی جلالت کو سامنے رکھتے ہوئے۔

۳۔ والدین کے چہرے کی طرف دیکھنا، محبت بھری نگاہ سے۔

۴۔ زم زم کو دیکھنا۔

۵۔ عالم دین کے چہرے کی طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھنا۔

اس سے گناہ جھڑتے ہیں۔

امام الانبیاء ﷺ کا ہر صُبح کو ماءزم زم پینا:

حضور اکرم ﷺ کی دایہ حضرت اُم ایمن رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھوک اور پیاس کی شکایت نہیں کی، آپ ﷺ ہر روز علی الصباح جا کر زم زم پیتے تھے اور جب ہم آپ ﷺ کے سامنے کھانا پیش کرتے تو آپ ﷺ فرماتے میرا پیٹ بھرا ہوا ہے۔[۱]

ماءِزم زم کو آپ ﷺ نے نوش فرمانے کے بعد اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا:

''ماءِزم زم'' کو سر اور بدن پر ڈالنا مستحب ہے، حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے تین چکر لگائے رمل کے ساتھ، حجرِ اسود سے حجرِ اسود تک اور دو رکعتیں پڑھیں، پھر حجرِ اسود کی طرف لوٹے، پھر ''ماءزم زم'' کے پاس گئے اور ماءِزم زم نوش فرمایا اور اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔

فائدہ:

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے زم زم پینے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی کہ اے اللہ! یہ پانی اس لئے پیتا ہوں تا کہ قیامت کے دن کی پیاس سے محفوظ رہوں، اس کے بعد پانی پیا۔[۲]

---

[۱] بحر عمیق

[۲] ترغیب

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ تیراندازی کے لئے دعا کی چنانچہ وہ قبول ہوئی۔ اگر دس تیر پھینکتے تو نونشانے پر ضرور ہی لگتے۔

امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف میں کمال حاصل کرنے کی نیت سے زم زم پیا، پھر اس کی برکت سے بہترین مصنف ہوئے۔

حافظ شہاب الدین عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری فرماتے ہیں:

جب حدیث میں مشغولیت کا میرا ابتدائی دور تھا تو اس وقت میں نے زمزم کا پانی اس نیت سے پیا کہ مجھے حدیث یاد کرنے میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ جیسا حافظہ مل جائے۔ چنانچہ زمزم کی برکت سے ایسا ہی ہوا۔ بیس سال کے بعد پھر حج کی توفیق ملی تو میں نے محسوس کیا کہ بحمد اللہ حفظ حدیث میں مجھے حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اونچا مرتبہ ملا ہے۔ پھر میں نے زمزم پیتے وقت حق تعالیٰ سے اس سے بھی اونچا مرتبہ مانگا اور مجھے امید ہے کہ وہ مجھے حاصل ہو جائے گا۔

حافظ ابن الہمام رحمہ اللہ علیہ اپنے متعلق فرماتے ہیں:

زمزم پینے میں میری نیت یہ ہوتی کہ حق تعالیٰ دین پر استقامت عطا فرمائیں اور کامل ایمان پر وفات دیں۔[۱]

زم زم کے متعلق مزید روایات وفوائد:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مرقدہ نے فضائلِ حج میں لکھا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حجۃ الوداع میں زم زم کا پانی خوب پیا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ خود ڈول بھر کر پیوں مگر پھر سب لوگ خود بھرنے لگیں گے اس لئے نہیں بھرتا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے خود بھرا۔ ممکن ہے کہ کسی وقت خود بھرا ہو اور دوسرے وقت مجمع کی وجہ سے یہ عذر فرمادیا ہو۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے زم زم کا پانی طلب کیا۔ انہوں نے عرض کیا کہ اس پانی میں (جو کوئی حوض کی قسم سے پانی کے مجتمع ہونے کی جگہ تھی) سب لوگ ہاتھ ڈال

---

[۱] فتح القدیر، ج: ۲، ص: ۱۹۱

دیتے ہیں، گھر میں صاف پانی رکھا ہوا ہے اس میں سے لاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں جس میں سے سب پیتے ہیں اسی میں سے پلاؤ۔ انہوں نے پیش کیا حضور ﷺ نے پیا اور آنکھوں پر ڈالا پھر دوبارہ لے کر پیا اور اپنے اوپر دوبارہ ڈالا۔[۱]

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ڈول بھرنے کا حکم فرمایا۔ ڈول بھر کر کنویں کے کنارہ پر رکھا گیا۔ حضور ﷺ نے اس ڈول کو ہاتھ سے پکڑ کر بسم اللہ کہہ کر دیر تک پیا، پھر فرمایا الحمد للہ، اس کے بعد پھر بسم اللہ کہہ کر دیر تک پیا، پھر فرمایا الحمد للہ، پھر ارشاد فرمایا کہ ہم میں اور منافقوں میں یہی فرق ہے کہ وہ خوب سیر ہو کر اس کو نہیں پیتے۔

سیدہ اُم معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ میرے خیمہ کے پاس سے ایک غلام گزرے جن کے ساتھ دو مشکیزے پانی کے تھے۔ میں نے پوچھا یہ مشکیزے کیسے ہیں؟ انہوں نے کہا حضور اقدس ﷺ کا والا نامہ میرے سردار کے پاس پہنچا ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں زمزم کا پانی بھیجا جائے، میں بہت عجلت سے لے جانا چاہتا ہوں تا کہ راستہ میں خشک نہ ہو جائے۔[۲]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا زم زم کا پانی اپنے ساتھ لے جاتیں اور فرماتیں کہ حضور ﷺ بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے اور بیماروں پر چھڑکتے تھے اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تحنیک کے وقت ان کو دیا۔[۳]

فائدہ:

بچہ کے پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے اس کے منہ میں کچھ ڈالنے کو تحنیک کہتے ہیں۔

روئے زمین کے تمام پانیوں سے زم زم کا پانی افضل ہے:

الترغیب والترہیب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ جناب رسول

---

[۱] کنز العمال

[۲] کنز

[۳] شرح لباب

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خَيْرُمَاءٍ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ فِيْهِ طَعَامُ الطُّعْمِ وِشِفَاءُ السُّقْمِ وَشَرُّمَاءٍ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ مَاءٌ بِوَادِيْ بَرَهُوْتَ بِقُبَّةِ حَضَرَ مَوْتَ گِرْجُلِ الْجَرَادِ تُصْبِحُ تَتَدَفَّقُ وَتُمْسِيْ لَا بِلَالَ فِيْهَا[1]

''دنیا کے پانیوں میں سب سے افضل پانی زم زم کا پانی ہے۔ یہ غذا بھی ہے، بیماری سے شفا بھی ہے اور روئے زمین میں سب سے بدترین پانی حضرموت کے قبہ کے قریب وادی برھوت کا پانی ٹڈی دل کی طرح ہوتا ہے صبح کے وقت نکلتا رہتا ہے اور شام کو وہاں تری کا نشان بھی نہیں ہوتا''۔ (ٹڈی دل کے ساتھ تشبیہ کثرت میں ہے)۔

زمزم سے قلبِ نبوی کی صفائی:

صحیح احادیث سے ''شقِ صدر'' کا واقعہ ثابت ہے یعنی نبی ﷺ کے سینہ مبارک کو چاک کیا گیا اور قلب اطہر کو نکال کر زمزم کے پانی سے دھویا گیا جیسا کہ احادیث میں صراحت ہے، یہ واقعہ ایک مرتبہ بچپن میں پیش آیا، جبکہ آپ اپنی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ کے پاس ہوا کرتے تھے۔

خادم رسول حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ایک حدیث میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام آئے، آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا، سینہ چاک کیا اس میں سے دل نکالا اسے بھی چیرا پھر اس میں سے ایک ٹکڑا نکال کر پھینک دیا اور فرمایا ''یہ آپ میں شیطان کا حصہ تھا'' پھر سونے کے پیالے میں زمزم کے پانی سے (قلب مبارک کو) دھویا، پھر اس کی جگہ میں اسے رکھ کر سینہ کو سی دیا، بچے بھاگتے ہوئے ان کی رضاعی والدہ کے پاس گئے اور کہا ''محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا گیا'' گھر والے دوڑتے ہوئے آپ ﷺ کے پاس آئے تو دیکھا کہ آپ کا رنگ اُڑا ہوا

---

[1] ترغیب وترہیب، ج: ۲، ص: ۱۳۵، ط: بیروت

ہے، حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں آپ کے سینہ مبارک میں سلائی کے نشانات دیکھا کرتا تھا۔[۱]

اسی طرح دوسری مرتبہ سفر معراج کے موقع پر بھی شق صدر کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر بھی قلبِ نبوی کو زمزم کے پانی سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دھویا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

میں مکہ مکرمہ میں سویا ہوا تھا کہ میرے گھر کی چھت کھلی اور جبرائیل علیہ السلام اُترے، انہوں نے میرا سینہ کھولا پھر اسے زمزم کے پانی سے دھویا، پھر سونے کی ایک طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے بھری ہوئی تھی، اسے میرے سینہ میں انڈیل دیا، پھر سینہ کو بند کر دیا، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے آسمان کی طرف لے گئے۔[۲]

ان دونوں روایات سے زمزم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کیونکہ نبی ﷺ کے قلب مبارک کو آب زمزم سے دھویا گیا، اگر روئے زمین پر زمزم سے افضل کوئی اور پانی ہوتا تو یقیناً اس سے قلب مبارک کو دھویا جاتا۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ:

''اس میں ماءِ زمزم کی تمام پانیوں پر فضیلت ثابت ہے''۔[۳]

بلکہ اسی بنیاد پر شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

آبِ زمزم، آب کوثر (جنّت کی نہر کوثر کے پانی) سے بھی افضل ہے۔[۴] ورنہ قلب مبارک کو آبِ کوثر سے دھویا جاتا۔

ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

قلبِ مبارک کو جنّت کے پانی سے اس لئے نہیں دھویا گیا کہ اس میں (آبِ زمزم میں)

---

[۱] مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء، رقم الحدیث: ۱۶۲

[۲] بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب: ۵، رقم الحدیث: ۳۳۴۲، مسلم، رقم الحدیث: ۱۶۳

[۳] فتح الباری، ج ۷، ص: ۲۰۵، کتاب مناقب الانصار، باب المعراج، رقم الحدیث: ۳۸۸۷

[۴] العقد الثمین: ج: ۱، ص: ۹۲، بحوالہ الریاض النضرہ، ج: ۱، ص ۱۶۹

جنّت کا پانی بھی شامل ہے کیونکہ اس کی اصل اور بنیاد جنّت سے ہے، پھر دنیا میں اس کو قرار دے دیا گیا، اس طرح زمزم سے قلبِ مبارک کے دھونے میں روئے زمین پر نبی ﷺ کی برکت کا باقی رہنا بھی ہے۔[۱]

اس کے علاوہ اور بھی بعض حکمتیں اہلِ علم نے بیان کی ہیں، الغرض یہ زمزم کی فضیلت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا قلب مبارک دھونے کے لئے اسے استعمال کیا گیا۔

زمزم جنّت کی نہر:

صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ دنیا میں بعض نہریں ایسی ہیں جن کا تعلق جنّت سے ہے اور وہ جنّت کی نہریں ہیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی نقل کرتے ہیں:

سیحان، جیحان، فرات اور نیل یہ سب جنّت کی نہروں میں سے ہیں۔[۲]

اسی طرح حدیثِ معراج میں بھی یہ بات مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سدرۃ المنتہیٰ پہنچے تو اس کی اصل سے چار نہروں کو نکلتے دیکھا، دو نہریں باطنی (اندر کی طرف) اور دو نہریں ظاہری، حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ باطنی نہریں جنت کی دو نہریں ہیں اور ظاہری دو نہریں نیل اور فرات ہیں۔[۳]

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح کرتے ہوئے اس کا مطلب یوں بیان کرتے ہیں کہ:

"یہ نہریں سدرۃ المنتہیٰ کی اصل سے نکلتی ہیں، پھر جہاں جہاں سے اللہ تعالیٰ چاہے چلتی ہیں، یہاں تک کہ زمین سے نکلتی اور اس میں چلتی ہیں۔[۴]

اسی طرح بعض روایات وآثار سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ زمزم کا مرکز اور سرچشمہ بھی جنّت ہے، وہیں سے یہ چشمہ اصلاً جاری ہے (جسکی صحیح کیفیت کا علم اللہ ہی کو ہے) اس سلسلے میں اُوپر ابن ابی جمرہ رحمۃ اللہ علیہ کا

---

[۱] فتح الباری، ج:۷، ص۲۰۵، کتاب مناقب الانصار، باب المعراج، رقم الحدیث:۳۸۸۷

[۲] مسلم، کتاب الجنۃ، باب مافی الدنیا من انہار الجنۃ، رقم الحدیث:۲۸۳۹

[۳] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب المعراج، رقم الحدیث:۳۸۸۷

[۴] مسلم، بشرح النووی: ج:۲، ص:۲۲۵

یہ قول گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک کو جنّت کے پانی سے اس لئے نہیں دھویا گیا کہ خود زمزم میں وہ شامل ہے کیونکہ اسکی اصل جنّت سے ہے، اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے قول مروی ہے: زمزم کے کنویں میں رکن (حجرِ اسود) کی طرف سے ایک چشمہ ہے جو جنّت سے ہے[۱]۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''یہ (یعنی بئر زمزم میں بیت اللہ یا حجرِ اسود کی طرف سے جو چشمہ جاری ہے وہ) جنّت کے چشموں میں سے ہے''[۲]۔ اسی طرح بعض صحابہ وتابعین اور سلف صالحین سے یہ اقوال منقول ہیں کہ زمزم بھی جنّت کی ایک نہر ہے اور اس کا اصل سرچشمہ جنّت ہے۔

زمزم میں لعابِ نبوی:

آبِ زمزم نہایت بابرکت پانی ہے، ایک حدیثِ رسول ﷺ میں اس کے لئے ''اِنَّهَا مُبَارَكَةٌ'' (بے شک یہ بابرکت ہے) کے الفاظ مروی ہیں[۳]۔ اس کو روئے زمین کا سب سے بہتر پانی کہا گیا ہے، اس کی برکت وافضلیت اس چشمہ کے ظہور کے وقت ہی سے ہے کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ خاص طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اُم اسماعیل کی سیرابی کے لئے ظاہر ہوا، آبِ زمزم کی برکت اس وقت دوچند ہوگئی جب اس میں نبی کریم ﷺ کا لعابِ دہن شامل ہوگیا، وہ اس طور پر کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ زمزم کے کنویں کے پاس آئے اور فرمایا کہ مجھے ایک ڈول پانی دو، آپ کو پانی دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس میں سے پیا، پھر اسی پانی سے کلی کر کے ڈول میں ڈال دیا اور اس ڈول کے پانی کو کنویں میں انڈیل دینے کا حکم فرمایا، جب کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک روایت اس طرح بیان کرتے ہیں:

جَآءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى زَمْزَمَ فَنَزَعْنَالَهٗ دَلْوًا، فَشَرِبَ، ثُمَّ

---

[۱] تفسیر قرطبی: ج:۹، ص:۳۷۰

[۲] مصنف ابن ابی شیبۃ: ج:۱، ص:۱۸۹

[۳] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل ابی ذر، رقم الحدیث: ۲۴۷۳

مَجَّ فِيهَا، ثُمَّ أَفْرَغْنَاهَا فِي زَمْزَمَ[۱]

نبی ﷺ زمزم کے پاس آئے ہم نے آپ کے لئے ایک ڈول پانی نکالا، آپ نے پیا، پھر اس میں کلی فرمائی، پھر ہم نے اس کو زمزم میں ڈال دیا۔

اس طرح نبی ﷺ کے لعاب کی برکت ہمیشہ کے لئے زمزم میں شامل ہوگئی کیونکہ یہ بئر زمزم کی خصوصیت ہے کہ نہ وہ کبھی خشک ہوا اور نہ ہی اس کا پانی کم ہوا، زمزم کے کنویں میں لعابِ نبوی کے اس طرح شامل ہونے سے اس کی برکت ولذت اور شفائیت کے دوچند ہونے کو بیان کرتے ہوئے مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''پس رسول اللہ ﷺ اس بات پر گویا راضی نہ ہوئے کہ آپ کے بعد قیامت تک آنے والی آپ کی اُمّت آپ کے بچے ہوئے پانی کی برکت وفضیلت سے محروم رہے۔[۲]

چونکہ زمزم کا کنواں کبھی خشک نہیں ہوتا بلکہ اس کا پانی کم بھی نہیں ہوتا، جس رفتار سے پانی کنویں سے نکالا جائے اس سے زیادہ رفتار سے پانی اس میں آتا رہتا ہے، اس طرح جب تک زمزم ہے اس میں لعاب نبوی کی برکت شامل ہے۔

آبِ زمزم بہترین تحفہ:

ماءِ زم زم بہترین اور افضل ترین تحفہ اور مہمان نوازی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کو تحفہ دینے کا ارادہ فرماتے تو ماءِ زم زم اس کو پلاتے۔

آبِ زمزم کے ساتھ طہارت:

محب الطبری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ساتھ ازالہ نجاست کو حرام قرار دیا ہے۔ فاکہی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اہل مکہ جب اپنے مُردوں کو غسل دے لیتے تو ان کی نظافت کے بعد تبرکا انہیں آبِ زم زم سے دھودیتے اور کہا جاتا ہے کہ حضرت اسماء بنتِ ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر

---

[۱] مسند احمد، رقم الحدیث: ۳۵۲۷

[۲] اعلاء السنن: ج: ۱۰، ص: ۲۳۷، کتاب الحج، رقم الحدیث: ۲۸۱۰

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آبِ زم زم سے غسل دیا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ماءِ زم زم کو ہاتھوں اور چہرے پر ملتے رہے:

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے عبداللہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے والد (امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھا کہ ماءِ زم زم سے پانی پی رہے تھے اور شفاء کی دعا مانگ رہے تھے اور ''ماءِ زم زم'' کو اپنے ہاتھوں اور چہرے پر ملتے تھے۔[۱]

زمزم میں غذائیت:

پیچھے ایک حدیث گزر چکی جس میں نبی ﷺ نے زمزم کو روئے زمین کا سب سے بہتر پانی قرار دیا اور ساتھ ہی اس پانی کی یہ دو خوبیاں بیان فرمائیں کہ اس میں کھانے کی طرح غذائیت بھی ہے اور بیماری سے شفاء بھی، غذائیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی بھوک مٹا دیتا ہے اور روزانہ کی غذا اور خوراک کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے، زمزم کے سوا کوئی دوسرا پانی ایسا نہیں جس میں یہ خوبی اور خاصیت ہو، اس سلسلے میں تاریخ کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں، خود حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے لئے شروع میں اس پانی کے سوا کوئی اور غذا نہ تھی، اللہ نے اس مبارک چشمہ کے پانی کو ہی ان کے لئے غذا کے قائم مقام بنا دیا، اس حقیقت کی طرف صحیح احادیث میں اشارہ موجود ہے۔[۲]

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں تیس دن تک صرف زمزم پر گزارا کرتا رہا، میرے پیٹ میں زمزم کے سوا کوئی دوسری چیز داخل نہ ہوئی۔ لیکن پھر بھی اتنا موٹا ہو گیا کہ پیٹ پر بل پڑنے لگے اور ذرہ برابر بھی بھوک کا احساس اور کمزوری محسوس ہی نہ ہوئی۔ تیس دن کے بعد جب رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ شریف کے پاس دیکھا اور آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ کو سلام کیا، رسول اللہ ﷺ نے جواب کے بعد پوچھا کون ہو؟ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہا نے جواب دیا'' قبیلہ غفار سے تعلق ہے'' پوچھا'' یہاں کتنے دن سے ہو؟'' جواب ملا'' تیس دن رات سے''، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا'' کون کھلاتا رہا؟'' حضرت ابوذر رضی اللہ عنہا نے جواب دیا'' میرے لئے زمزم کے

---

[۱] سیر اعلام النبلاء للذہبی ص: ۲۱۲

[۲] فتح الباری: ۶/ ۴۰۳ شرح حدیث: ۳۳۶۴ نیز ملاحظہ ہو: تفسیر قرطبی: ۹/ ۳۷۰، سورہ ابراہیم: ۳۷

سوا کوئی کھانا نہیں تھا، میں اتنا موٹا ہو گیا کہ پیٹ پر بل پڑ گئے اور جگر پر بھوک کا کوئی احساس اور کمزوری نہیں''۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر زمزم کے بارے میں ارشاد فرمایا:

اِنَّهَا مُبَارَكَةٌ اِنَّهَا طَعَامُ طُعْمٍ بلا شبہ یہ (یعنی زمزم) بابرکت ہے اور بے شک اس میں غذائیت ہے (یعنی یہ خوراک بھی ہے)۔ [۱]

پیچھے زمزم کے ناموں کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول بھی گزر چکا کہ ہم اسے یعنی زمزم کو شباعہ (آسودہ کرنے والا) کہا کرتے تھے اور اسے اولاد کیلئے بہترین مددگار پاتے تھے، ''شبع'' کھانا کھا کر آسودہ ہونے کو کہتے ہیں، گویا آبِ زمزم جس طرح پیاس بجھاتا ہے اسی طرح یہ بھوک بھی مٹاتا ہے، زمزم پی کر اس طرح آسودگی نصیب ہوتی ہے جس طرح کسی نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہو۔

چنانچہ بعض روایات سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کثیر العیال اور مکہ کے فقراء زمزم ہی پر گزارا کیا کرتے تھے، اُم ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک بڑے برتن میں زمزم بھر کر مسجد میں رکھ دیا جاتا، کبھی بچے کھانا مانگتے تو انہیں یہ جواب ملتا ''جاؤ ام ہانی کے برتن کے پاس'' [۲] یہ کوئی گذشتہ ادوار کے ساتھ ہی خاص نہیں بلکہ ہر دور میں زمزم کی اس خاصیت کا مشاہدہ لوگوں نے کیا اور ایسی بے شمار مثالیں تاریخ کے صفحات پر منتشر ہیں، جس میں لوگوں نے کئی کئی ہفتوں تک صرف زمزم پر گزارہ کرنے کا اپنا تجربہ بیان کیا ہے۔

زمزم ہر بیماری سے شفاء:

زمزم کی دوسری خوبی حدیثِ رسول اللہ ﷺ میں یہ بیان ہوئی کہ اس میں بیماری سے شفا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک روایت اس طرح نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

زَمْزَمُ طَعَامُ طُعْمٍ وَشِفَاءُ سُقْمٍ [۳] زمزم غذا کی غذا ہے اور بیماری سے شفا بھی ہے

یہ لفظ عام ہے، ظاہری، باطنی، حسی اور معنوی ہر طرح کے امراض کو شامل ہے، چنانچہ بعض اہلِ علم نے یہ

---

[۱] مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل ابی ذر، ج: ۲، ص: ۲۹۶، حدیث نمبر: ۲۴۷۳، ط: قدیمی، کراچی

[۲] اخبار مکۃ للفاکھی: ۲/ ۷۴، بحوالہ علم نفسک بماء زمزم: ۱۱۷

[۳] الترغیب والترھیب، ج: ۲، ص: ۱۳۵، ط: بیروت، کتاب الحج، باب الترغیب فی شرب ماء زمزم وما جاء فی فضلہ، حدیث نمبر: ۱۸۳۹

صراحت کی ہے کہ زمزم کی برکت سے ہر طرح کی بیماریوں سے شفا ممکن ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو دعا منقول ہے اس سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے، روایت ہے کہ زمزم پیتے وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما یوں دعا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا وَّاسِعًا وَشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ۔ [۱] ''اے اللہ! میں تجھ سے فائدہ پہنچانے والا علم، کشادہ رزق اور ہر بیماری سے شفا مانگتا ہوں''۔

مشہور تابعی حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ جب مکہ مکرمہ آئے تو خوب زمزم ہی پیتے رہے اور اسی سے وضو کرتے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں میٹھا پانی نہیں پیتے؟ حضرت وہب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ''میں جب تک مکہ میں ہوں زمزم ہی پیوں گا اور اسی سے وضو کروں گا، تمہیں کیا پتہ کہ زمزم کیا ہے؟ اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ میں وہب کی جان ہے جو شخص بھی خوب سیر ہو کر زمزم پیے گا اس کی برکت حاصل کرنے کے لئے تو اس کے جسم سے بیماری نکل جائے گی اور اسے شفا نصیب ہوگی، زمزم کو دیکھنا بھی عبادت ہے اور اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں''۔[۲]

بخار کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ایک روایت اس طرح نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَھَنَّمَ فَاَبْرِدُوْھَا بِمَاءِ زَمْزَمَ [۳] ''بخار جہنم کی تپش سے ہے، پس تم اس کو آبِ زمزم سے ٹھنڈا کرو''۔

اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نقل کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ آبِ زمزم مشکیزوں میں لے جاتے، اسے بیماروں پر چھڑکتے بھی تھے اور انہیں پلاتے بھی تھے۔[۴]

زمزم میں غذائیت اور شفاء کی تاثیر یہ ایسی حقیقت ہے جس کی ہر دور میں بے شمار واقعات سے تصدیق

---

[۱] مستدرک حاکم: ۱/۶۴۶، کتاب المناسک، حدیث نمبر: ۱۷۳۹

[۲] حلیۃ الاولیاء

[۳] مسند احمد، رقم الحدیث: ۲۶۴۹

[۴] ترمذی، کتاب الحج، باب ۱۱۵، رقم الحدیث: ۹۶۳

ہوتی رہی، تاریخ میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں جنہوں نے کئی کئی دن تک صرف زمزم پر گزارہ کرنے اور کوئی معمولی امراض نہیں بلکہ پیچیدہ اور لا علاج امراض سے بھی زمزم کے ذریعہ شفاء پانے کے احوال بیان کئے، مشہور صاحبِ علم حافظ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''میں نے اور میرے علاوہ کئی لوگوں نے مختلف امراض میں آبِ زمزم پی کر شفاء پانے کے عجیب واقعات دیکھے اور میں خود مختلف بیماریوں سے آبِ زمزم کے ذریعہ اللہ کے حکم سے شفایاب ہوا، میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا جنہوں نے کئی کئی دن، آدھا مہینہ یا اس سے بھی زیادہ صرف زمزم پی کر گزارہ کیا، انہیں کوئی بھوک نہ لگتی، عام لوگوں کی طرح لوگوں کے ساتھ طواف بھی کرتے، مجھے ایک آدمی نے بتایا کہ کبھی وہ چالیس دن تک صرف زمزم پیتا پھر بھی طاقت وقوت میں کمی محسوس نہ کرتا''۔[۱]

ہر دور میں اس طرح کے عجیب واقعات کا مشاہدہ ہوتا رہا، ابھی حال ہی میں (پچیس تیس سال قبل) ایک مغربی خاتون نے زمزم سے شفاء پانے کی اپنی آپ بیتی بیان کی جسے سینہ کا کینسر ہو گیا تھا اور اتنا پھیل گیا تھا کہ یورپ کے ماہر ڈاکٹروں نے اسے نہ صرف لا علاج قرار دیا بلکہ اس خاتون سے کہا کہ تین مہینہ سے زیادہ زندہ رہنا بھی ممکن نہیں۔[۲]

زمزم ہر مقصد کیلئے:

گزشتہ حدیث میں زمزم کی جو دو اہم خوبیاں بیان ہوئیں کہ اس میں غذائیت بھی ہے اور شفاء بھی، بات صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ زمزم کے خواص میں اتنا عموم ہے کہ اسے ہر مقصد کے لئے مفید قرار دیا گیا، زمزم کی فضیلت میں ایک حدیث اس طرح مروی ہے، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ[۳] آبِ زمزم جس نیت اور مقصد کے لئے پیا جائے اسی کے

---

[۱] الطب النبوی: ۳۰۷، زاد المعاد: ج: ۴، ص: ۱۶۴۔۳۶۱

[۲] الریاض النضرۃ، ج: ۱، ص: ۱۸۰

[۳] ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الشرب، من زمزم، رقم الحدیث: ۳۰۶۲

لئے ہے (یعنی اس مقصد میں مفید ہے)۔

حدیث کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ زمزم پیتے وقت آدمی جو ارادہ کرے، جو دعا کرے اور جس چیز کے حصول کی نیت سے زمزم پیئے اسے وہ چیز حاصل ہوتی اور مقصد میں کامیابی نصیب ہوتی ہے، اس طرح اس میں یہ ترغیب بھی ہے کہ زمزم پیتے وقت نیت کا استحضار ہو اور آدمی دل میں کوئی مقصد متعین کر کے زمزم پیئے اور اللہ سے دعا بھی کرے، چاہے یہ مقصد دینی ہو یا دنیاوی، یہ حدیث مزید اضافہ کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس طرح مروی ہے کہ رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ فَإِنْ شَرِبْتَهُ تَسْتَشْفِيْ بِهِ شَفَاكَ اللّٰهُ وَإِنْ شَرِبْتَهُ مُسْتَعِيْذًا عَاذَكَ اللّٰهُ وَإِنْ شَرِبْتَهُ لِيَقْطَعَ ظَمْأَكَ قَطَعَهُ[۱]

آبِ زمزم مفید ہے جس مقصد کے لئے بھی پیا جائے، پس اگر تم اسے شفاء کی نیت سے پیو تو اللہ تم کو شفا دے گا اور اگر کسی سے پناہ کیلئے پیو تو اللہ تم کو پناہ دے گا، اور اگر پیاس بجھانے کے لئے پیو وہ پیاس بجھا دے گا۔

علامہ شوکانی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ آبِ زمزم، پینے والے کو فائدہ پہنچاتا ہے، ہر اس مقصد میں جس کے لئے وہ (آبِ زمزم) پیئے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد گرامی "لِمَا شُرِبَ لَهُ" میں لفظ "مَا" عام ہے ہر طرح کی حاجت کو شامل ہے چاہے اس (حاجت اور مقصد) کا تعلق اُمورِ دنیا سے ہو یا اُمورِ آخرت سے''۔[۲]

چنانچہ صحابہ وتابعین اور سلف صالحین میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ انہوں نے مختلف مقاصد کے حصول کیلئے زمزم پیا اور وہ اس میں کامیاب ہوئے، بعض مقاصد جو دنیاوی تھے اس کی کامیابی کا انہوں نے اور دوسروں نے بھی مشاہدہ کیا اور جو مقاصد اخروی ہیں اس میں انشاء اللہ وہ سرخرو ہوں گے۔

مشہور صاحبِ علم اور محدث ابنِ خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ ''تمہیں یہ علم

---

[۱] مستدرک حاکم، ج:۱، ص:۶۴۱، کتاب المناسک، رقم الحدیث:۱۷۳۹

[۲] نیل الاوطار، ج:۵، ص:۱۱۷، کتاب المناسک، باب ماجاء فی زمزم، رقم الحدیث:۲۰۶۰

کہاں سے ملا؟'' (یعنی آپ علم کے اس مقام پر کس طرح پہنچے؟) اس کے جواب میں فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ''آب زمزم اس مقصد کے لئے ہے جس مقصد کیلئے اسے پیا جائے'' اور میں نے جب بھی آب زمزم پیا تو اللہ سے علمِ نافع طلب کیا۔[۱]

اسی طرح سلف صالحین سے مختلف مقاصد کے لئے زمزم پینے کا اہتمام ثابت ہے، حضرت عبداللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے:

جب انہوں نے حج کیا تو زمزم کے کنویں پر آئے، اس سے پانی لیا، قبلہ رُخ ہوئے، پھر یوں کہا ''اے اللہ! ابن ابی الموالی نے ہم سے محمد بن المنکدر کے واسطہ سے بیان کیا، وہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''زمزم اس مقصد کے لئے مفید ہے جس مقصد کے لئے اسے پیا جائے'' یہ زمزم ہے میں اس کو روزِ قیامت کی پیاس بجھانے کے لئے پیتا ہوں، یہ کہہ کر (ابن المبارکؒ نے) زمزم پی لیا۔[۲]

چنانچہ علماء نے اس طرح دعا کرنے کو مستحب قرار دیا کہ آدمی زمزم پینے سے پہلے یوں کہے ''اے اللہ! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی (مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ) پس اے اللہ! میں اس کو فلاں مقصد کے لئے پیتا ہوں، تو مجھے اس میں کامیابی عطا فرما''۔[۳]

حکایت:

حمید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم حضرت سفیان ابن عیینہ رحمہ اللہ کی مجلس میں تھے، انہوں نے ہمیں یہ حدیث بیان کی: مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ یعنی زم زم کا پانی جس مقصد کے لئے پیا جائے وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ یہ حدیث سُن کر ایک شخص مجلس سے اُٹھا اور زمزم شریف کا پانی پی کر کچھ دیر کے بعد واپس آیا اور حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھنے لگا کہ زم زم کے بارے میں جو حدیث آپ نے بیان فرمائی ہے

---

[۱] سیر اعلام النبلاء، ج: ۱۴، ص ۳۷۰، ترجمہ: ابن خزیمۃ

[۲] الترغیب والترھیب: ۲۷۶، کتاب الحج، باب الترغیب فی شرب ماء زمزم، رقم الحدیث: ۱۸۴۲

[۳] کتاب الاذکار للنوویؒ، اذکار الحج: ۳۳۳

کیا وہ صحیح ہے؟ فرمایا ہاں صحیح ہے، کہنے لگا میں نے ابھی کچھ دیر پہلے زم زم کا ڈول بھر کر اس نیت سے پیا ہے کہ آپ مجھے ایک سو حدیثیں سنائیں گے۔ یہ سُن کر حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا آؤ بیٹھو اور سنو! پھر سو حدیثیں سنا دیں۔[۱]

ایک شبہ کا ازالہ:

اس کی کیا وجہ ہے کہ زمزم ہر مقصد کے لئے مفید ہے؟ یا کوئی شخص یہ سوال کر سکتا ہے کہ میں نے فلاں مقصد کیلئے زمزم پیا لیکن مجھے کامیابی نہیں ملی، یا بے شمار زمزم پینے والے لوگ بھی بیماریوں میں مبتلا ہیں، انہیں شفاء کیوں نہیں ملتی؟ اہل علم نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس شبہ کا ازالہ کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمزم سے شفاء یا دعا کی قبولیت اور مقصد میں کامیابی کا تعلق خاص طور سے اللہ پر ایمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ پر تصدیق ویقین، نیز سچی نیت اور اخلاص سے ہے، اس کی مثال قرآن پاک کی طرح ہے کہ اسے امراضِ قلب (روحانی بیماریوں) کے لئے شفاء کہا گیا۔[۲] پھر بھی بعض لوگوں کو اس سے شفاء نہیں ملتی بلکہ ان کی بیماری میں اضافہ ہی ہوتا ہے، کیونکہ ان کا ایمان ویقین مضبوط نہیں ہوتا بلکہ دلوں میں شک وشبہ اور نفاق کی بیماری ہوتی ہے۔

زمزم بھی اگر کوئی ایمان ویقین کے ساتھ پیئے تو انشاء اللہ ضرور مقصد میں کامیابی ہوگی (جس کی بے شمار مثالیں سلف صالحین میں موجود ہیں) اور اگر کوئی شک وشبہ کے ساتھ صرف تجربہ کرنے کی نیت سے پیئے یا قبولیتِ دعا کی رکاوٹوں کو دور نہ کرے، جیسے گناہوں کا ارتکاب اور اکلِ حرام وغیرہ تو پھر یہ ضروری نہیں کہ ایسے شخص کو زمزم سے فائدہ پہنچے، حدیث بالا کی شرح کرتے ہوئے زمزم کے بارے میں مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> ''آبِ زمزم تمام پانیوں کا سردار، سب سے اشرف اور قدر ومنزلت والا ہے، یہ اللہ کی طرف سے سبیل ہے، اسی کے خلیل (یعنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ) کے فرزند (حضرت

---

[۱] فتح القدیر، ج ۲، ص: ۱۹۰

[۲] یونس: ۵۷

اسماعیل علیہما السلام) کی مدد ونصرت کے لئے یہ ظاہر ہوا، لہٰذا ان کے بعد بھی اس میں مدد و نصرت کی تاثیر باقی ہے، جو کوئی بھی اسے اخلاص کے ساتھ پیئے گا اس مدد (اور تاثیر) کو پائے گا''۔[۱]

اسی طرح ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ زمزم کی غذائیت اور شفائیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''یہ تاثیر زمزم میں قیامت تک موجود ہے ہر اس شخص کے لئے جس کی نیت درست ہو، اس کی فطرت سلیم ہو، نہ وہ اس (تاثیر) کو جھٹلانے والا ہو اور نہ تجربہ کرنے کے لئے پیئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ تجربہ کرنے والوں کو رسوا کرتا ہے''۔[۲]

ایمان کی علامت، نفاق سے برأت:

شاید یہی وجہ ہے کہ آبِ زمزم خوب سیر ہوکر پینے کو حدیثِ رسول اللہ ﷺ میں ایمان کی علامت اور نفاق سے برأت قرار دیا گیا، نیز سنّت یہی ہے کہ زمزم خوب سیر ہوکر پیا جائے، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا، ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا ''کہاں سے آرہے ہو''؟ اس نے جواب دیا ''زمزم کے پاس سے'' پوچھا: ''کیا اس پانی سے پیا جیسے اسے پینا چاہئے؟'' اس شخص نے کہا ''وہ کیسے؟'' (یعنی آبِ زمزم کس طرح پینا چاہئے؟) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا:

اِذَاشَرِبْتَ مِنْهَا فَاسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَ تَنَفَّسْ ثَلَاثًا وَتَضَلَّعْ مِنْهَافَاِذَا فَرَغْتَ فَاحْمَدِ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اٰيَةَ مَابَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُنَافِقِيْنَ اَنَّهُمْ لَايَتَضَلَّعُوْنَ مِنْ زَمْزَمَ[۳]

---

[۱] فیض القدیر، ج:۵، ص:۴۰۴، بحوالہ: الریاض النضرۃ، ج:۱، ص:۱۷۱

[۲] تفسیر قرطبی، ج:۹، ص:۳۷۰، تفسیر سورۂ ابراہیم:۳۷

[۳] ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب الشرب من زمزم، رقم الحدیث:۳۰۶۱

جب تم اسے پیئو تو قبلہ رُخ ہو جاؤ، اللہ کا نام لو، تین سانس میں پیئو اور خوب سیر ہو کر پیئو، پھر جب فارغ ہو جاؤ تو اللہ کی حمد بیان کرو، پس بے شک رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ہمارے اور منافقین کے درمیان نشانی (اور فرق کرنے والی چیز) یہ ہے کہ وہ (یعنی منافقین) زمزم سیر ہو کر نہیں پیتے۔

ایک روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی سے اس طرح مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زمزم کے کنویں پر تھے، آپ نے ڈول سے پانی نکالنے کا حکم دیا، پانی نکال کر ڈول کنویں پر رکھ دیا، آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ سے بسم اللہ کہہ کر پینا شروع کیا، دیر تک پیتے رہے، پھر اپنا سر اُٹھا کر الحمد للہ کہا، دوبارہ پھر بسم اللہ کہہ کر پینا شروع کیا اور دیر تک پیتے رہے، مگر پہلی مرتبہ سے کچھ کم، پھر سر اُٹھا کر الحمد للہ کہا، تیسری مرتبہ پھر بسم اللہ کہہ کر پینا شروع کیا، دیر تک پیتے رہے مگر دوسری مرتبہ سے کچھ کم، پھر سر اُٹھا کر الحمد للہ کہا اور یہ ارشاد فرمایا:

عَلَامَةُ مَابَيْنَنَا وَبَيْنَ الْمُنَافِقِيْنَ لَمْ يَشْرَبُوْا مِنْهَا قَطُّ حَتّٰى يَتَضَلَّعُوْا[۱]

ہمارے اور منافقین کے درمیان یہی علامت ہے کہ وہ کبھی زمزم خوب سیر ہو کر نہیں پیتے۔

''تضلع'' خوب سیر ہو کر زیادہ پانی پینے کو کہتے ہیں اس طرح کہ پانی اچھی طرح رگوں میں سرایت کر جائے۔ یعنی منافقین اور اہل ایمان کے درمیان فرق کرنے والی چیز یہ ہے کہ ایمان والے زمزم خوب سیر ہو کر پیتے ہیں جب کہ منافقین اسے پیتے بھی ہیں تو خوب سیر ہو کر نہیں پیتے کیونکہ زمزم کی افادیت اور برکت پر ان کا ایمان نہیں ہوتا، اس لئے وہ عام پانیوں سے اس کا موازنہ کرتے ہیں اور ظاہری اعتبار سے زمزم کی ملاحت (کسی قدر نمکینی) اُنہیں (زمزم) خوب سیر ہو کر پینے سے روکتی ہے، سعودی عرب کے مشہور صاحب علم شیخ محمد بن صالح عثیمین اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''یہ اس لئے ہے کہ آب زمزم بہت زیادہ میٹھا اور خوشگوار نہیں بلکہ ملاحت کی طرف مائل ہے (یعنی زمزم کسی قدر کھارا پانی ہے) اور ایمان والا اس پانی کو جس میں ملاحت ہے نہیں

---

[۱] اخبار مکہ للازرقی، ج: ۲، ص: ۵۷، بحوالہ تشویق الانام: ۱۹۲-۱۹۱

پیتا، مگر اس میں جو برکت ہے اس پر ایمان ویقین کی وجہ سے، اس طرح زمزم خوب سیر ہو کر پینا ایمان کی علامت ہوا''۔[۱]

اسی طرح زمزم کے ناموں کے ضمن میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ اثر گزر چکا کہ زمزم ''شراب الابرار'' (نیک لوگوں کا مشروب) ہے کیونکہ وہی اس کی افادیت کو سمجھتے اور اس کی برکت پر یقین رکھتے ہیں، اس لئے وہی اس کو زیادہ سے زیادہ پینے کا مقدور بھر اہتمام بھی کرتے ہیں۔ صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کا عام معمول تھا کہ وہ جب حج وعمرہ کے لئے مکہ مکرمہ پہنچتے تو جب تک یہاں قیام رہتا، خوب سیر ہو کر زمزم پیتے اور جب بیت اللہ شریف سے رخصت ہوتے تب بھی زمزم پی کر رخصت ہوتے۔[۲]

سلف کا اہتمام:

زمزم کی افادیت وبرکت ہی کے پیش نظر سلف صالحین سے یہ اہتمام بھی ثابت ہے کہ وہ حج وعمرہ کے لئے مکہ مکرمہ آتے تو واپسی میں یہاں سے وہ یہ قیمتی سوغات (آب زمزم) بھی ضرور ساتھ لے جاتے تاکہ اپنے وطن میں وقتاً فوقتاً اس سے مستفید ہوتے رہیں اور دوسروں کو بھی یہ قیمتی ہدیہ پیش کر سکیں تاکہ جو لوگ حجاز مقدس نہیں پہنچ سکے وہ بھی زمزم کی برکت سے مستفید ہوں، اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بھی یہ معمول تھا اور وہ نبی ﷺ کا بھی یہی معمول نقل کرتی ہیں۔[۳]

بلکہ ایک روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ سے پہلے سہیل بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ منورہ سے پیغام بھیجا کرتے تھے کہ ہمیں زمزم کا ہدیہ ضرور بھیجا کرو، چنانچہ وہ دو بڑے مشکیزوں میں آب زمزم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیج دیتے۔[۴]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے پاس جب بھی کوئی

---

[۱] الشرح المجمع علی زاد المستقنع، ج:۷، ص:۳۷۹

[۲] الریاض النضرۃ، ج:۱، ص:۱۸۳

[۳] ترمذی، کتاب الحج، باب:۱۱۵، رقم الحدیث:۹۶۳

[۴] مصنف عبدالرزاق، ج:۵، ص۱۱۹، رقم الحدیث:۹۶۳

مہمان آتا تو اسے زمزم کا ہدیہ ضرور پیش کرتے، اسی طرح جب کسی کو کھانا کھلاتے تو زمزم ضرور پلاتے۔[۱] اسی طرح ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نقل کیا کہ جب آپ کسی کو ہدیہ دینا چاہتے تو اسے زمزم پیش کرتے۔[۲]

چاہِ زم زم کا ظہور:

تاریخ، حدیث اور دیگر بہت سی کتابوں میں چاہِ زم زم کے اولین ظہور کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اسے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام (جبکہ وہ چھوٹے سے تھے اور پیاسے تھے) کی پیاس بجھانے کیلئے ظاہر کیا۔ پھر اسے حضرت خلیل علیہ السلام نے کھودا، اور یہ واقعہ اس طرح ہے کہ اللہ عزوجل نے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کو شام سے چل کر محترم شہر (مکۃ المکرمہ) جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ براق پر سوار ہوئے اور اسماعیل علیہ السلام کو آگے بٹھایا اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو پیچھے جبکہ اسماعیل علیہ السلام ایک شیر خوار بچے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ دو سال کے تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی بیت اللہ کی نشاندہی کرنے کیلئے ان کے ہمراہ تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری زوجہ محترمہ حضرت سارہ کے مابین مناقشت پیدا ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے ہمراہ مکہ مکرمہ آ گئے، حضرت اسماعیل علیہ السلام اس وقت شیر خوار بچّہ تھے۔ والدہ اسماعیل علیہ السلام کے پاس ایک برتن میں پانی تھا جس میں سے خود پیتیں اور اپنے بچے کو پلاتیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی زاد نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے (صفا اور چاہ زم زم کے مابین اشارہ کرتے ہوئے) کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو مسجد کے بالائی حصہ میں زم زم سے اُوپر ایک لمبے درخت کی طرف لے گئے

---

[۱] اخبار مکۃ للفاکھی

[۲] اخبار مکۃ للفاکھی

اوران دونوں کواس درخت کے نیچے اُتار دیا اور خود اپنی سواری پر وہیں سے واپس چلے گئے۔ والدہ اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ آپ کے پیچھے آئیں اور آپ سے پوچھا کہ انہیں اور ان کے بچہ کو کس کے سپرد کئے جارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اللہ عزوجل کے سپرد کررہا ہوں۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے کہا کہ میں اللہ عزوجل کے سپرد کئے جانے پر راضی ہوں، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام روانہ ہو گئے اور جب پہاڑی کے پاس پہنچے اور ایک روایت کی رو سے کدٰی کے پاس پہنچے جہاں سے وہ انہیں نظر نہ آتے تھے تو انہوں نے بیت اللہ کی طرف متوجہ ہوکر ہاتھ اُٹھائے اور یہ دعا کی:

رَبَّنَآ اِنِّیۡۤ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجۡعَلۡ اَفۡئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَہۡوِیۡۤ اِلَیۡہِمۡ وَارۡزُقۡہُمۡ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّہُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ۔[1]

''پروردگار! میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں لہٰذا لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں''۔

دوسری روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اپنے بچے اسماعیل علیہ السلام کو اُٹھائے واپس آئیں اور اس درخت کے نیچے بیٹھ گئیں اور بچے کو اپنے پہلو میں لٹالیا۔ پانی والے برتن کو لٹکا دیا، اس میں سے پانی پیتیں اور بچے کو دودھ پلاتیں حتیٰ کہ برتن کا پانی ختم ہوگیا اور ان کا دودھ بھی خشک ہوگیا۔ بچے کو شدید بھوک لگی حتیٰ کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے اسے حالتِ غیر میں دیکھا، چنانچہ وہ بچے کی موت کے خوف سے غمگین ہوگئیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اُم اسماعیل علیہ السلام صفاء کی طرف گئیں اور پہاڑی پر چڑھ گئیں تا کہ وہاں سے وادی میں کسی کو اچھی طرح سے دیکھ سکیں پھر انہوں نے مروہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ کیوں نہ ہو کہ میں (بچے کی موت کے منظر سے) گریز کرتے ہوئے ان دو پہاڑیوں کے درمیان چلتی رہوں تا کہ بچہ میری نظروں سے

---

[1] ابراہیم: ۳۷

اوجھل ہی فوت ہوجائے، سامنے وہ کیفیت ناقابلِ برداشت ہوگی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ اُم اسماعیل علیہ السلام تین یا چار مرتبہ ان پہاڑیوں کے درمیان دوڑیں اور اس دوران انہوں نے بطن وادی کو دوڑ کر ہی پار کیا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ پھر ام اسماعیل علیہ السلام اپنے بیٹے کی طرف لوٹ کر آئیں تو انہوں نے اسے ہچکیوں کی حالت میں اسی طرح پایا جس طرح کہ پہلے چھوڑ کر گئیں تھیں۔ اس حالت میں دیکھ کر انہیں اور دکھ ہوا، وہ پھر صفا کی طرف لوٹیں۔

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ان دو پہاڑیوں کے درمیان انہوں نے سات چکر لگائے۔ ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسی طرح لوگ صفا ومروہ کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ پھر اُم اسماعیل علیہ السلام اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے لوٹیں مگر اسے اسی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے پایا۔ اس وقت انہوں نے ایک آواز سنی۔ انہوں نے اس آواز کی سمت پلٹ کر دیکھا مگر وہاں آواز کیساتھ کوئی نہیں تھا۔ بولیں کہ میں تیری آواز سنتی ہوں اگر تیرے پاس کوئی خیر ہے تو میری دادرسی کر۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام ان کے سامنے ظاہر ہوئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے اچانک زم زم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گئیں، اس نے اپنے پاؤں سے کنویں کی جگہ ضرب لگائی۔ ایک روایت میں ہے کہ فرشتہ نے کنویں کو گھاٹی میں سے نکالا، ایک اور روایت میں ہے کہ فرشتہ نے گھاٹی کی طرف اشارہ کیا اور ایک مزید روایت ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے کریدا، چنانچہ جہاں سے جبرائیل علیہ السلام نے کریدا وہیں سے پانی نکل پڑا، وغیرہ وغیرہ۔ (یہ ساری روایات بخاری جلد ا ص ۴۷۴ تا ۴۷۶ میں موجود ہیں)

ابن ہشام کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو مبعوث کیا اور انہوں نے زمین میں ایک گھاٹی کی طرف اشارہ کیا اور پانی نکل پڑا۔

اُم اسماعیل علیہ السلام نے درندوں کی آواز سنی وہ اپنے بیٹے کے بارے میں خوفزدہ ہوگئیں اور اس کی طرف تیزی کے ساتھ آئیں مگر اسے اپنے رخسار کے نیچے پانی میں ہاتھ مارتے اور پیتے ہوئے پایا اور سمجھ لیا

کہ بچہ ابھی زندہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول ہے کہ ابوالقاسم ﷺ نے فرمایا کہ اُم اسماعیل نے مٹی کا ایک حوض بنا کر اسے بند کر دیا، اس خوف سے کہ کہیں ان کے برتن لانے سے قبل ہی ختم نہ ہو جائے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ ام اسماعیل علیہا السلام اگر اسے اسی حال میں رہنے دیتیں تو وہ ایک چشمہ کی صورت میں جاری رہتا۔[۱]

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ام اسماعیل علیہا السلام اپنا برتن لے کر آئیں اس میں پانی بھرا، خود پانی پیا اور بچے کو پانی اور دودھ پلایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان سے کہا یہاں اللہ کا گھر ہے، یہ بچہ اور اس کا والد اس کی تعمیر کریں گے، تمہارے لئے یہاں ہلاکت کا کوئی خوف نہیں، اللہ تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کے اہل کو ضائع نہ کرے گا۔[۲]

حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کے ساتھ زم زم کے پاس مقیم رہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دن میں ایک مرتبہ براق پر سوار ہو کر ان سے ملنے کیلئے آتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے روز ایک مرتبہ آتے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہینے میں ایک مرتبہ آتے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سال میں ایک مرتبہ آتے۔ المواھب میں الحافظ نے کہا نیز سعد بن ابراہیم نے عامر بن سعد سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ خلیل علیہ السلام ہر روز شام سے براق پر سوار ہو کر ہاجرہ علیہا السلام کو ان کے ساتھ گہرے انس اور اداسی کے باعث ملنے آتے۔ (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

قبیلہ جرہم کی آمد:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام انہی حالات میں گزر اُوقات کر رہی تھیں کہ شام کی طرف سے قبیلہ جرہم کا ایک قافلہ نشیبی راہ سے گزرا، قافلے نے پانی پر ایک پرندہ دیکھا تو قافلے میں سے ایک شخص نے کہا اس وادی میں نہ تو کوئی پانی تھا اور نہ کوئی انیس، اس پر

---

[۱] بخاری: ج ۱، ص ۴۷۵، قدیمی، کراچی

[۲] بخاری: ج ۱، ص ۴۷۵، قدیمی، کراچی

انہوں نے دو ایلچی بھیجے جو ام اسماعیل علیہ السلام کے پاس آئے، ان سے کلام کیا اور حیرت زدہ اپنے قافلے کی طرف لوٹے اور قافلے والوں کو اس جگہ کی خبر دی۔ چنانچہ پورا قافلہ وہاں آیا اور حضرت ہاجرہ علیہا السلام کو سلام کہا۔ انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ قافلہ والوں نے پوچھا کہ یہ پانی کس کا ہے؟ ام اسماعیل علیہا السلام نے جواب دیا یہ میرے لئے ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا آپ اجازت دیتی ہیں کہ ہم یہاں آپ کے قریب اس پانی کے پاس سکونت اختیار کرلیں؟ ام اسماعیل علیہ السلام نے اثبات میں جواب دیا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابو القاسم ﷺ نے فرمایا ام اسماعیل علیہ السلام کو انسانی معاشرت پسند تھی جو انہیں حاصل ہوگئی، چنانچہ جرھم نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے اور اپنے اہل وعیال کو بھی بلا بھیجا۔ وہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور ان کے بیٹے کی ہمسائیگی میں لمبے درخت کے نیچے ٹھہر گئے اور اس کے جوار میں چھپر بنا لئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہو گئے۔ اس دوران میں انہوں نے قافلے والوں سے عربی زبان بھی سیکھ لی، قبیلہ جرھم نے اپنی ایک خاتون کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زوجیت میں دیدیا۔ اس کے بعد زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام فوت ہوگئیں جب کہ ان کی عمر ۹۰ سال تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی نعش انہی پتھروں کے درمیان دفن کردی، یعنی وہاں قبر بنادی۔[1]

چاہِ زمزم کا معدوم ہوجانا:

بعض مورخین نے کہا ہے کہ مکہ کے سرداروں میں سے ایک سردار مضاض بن عمرو الجرھمی اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ میں الجھا ہوا تھا جو اس کی شکست پر تمام ہوئی اور اس نے سمجھ لیا کہ اس کے دشمن جلد ہی اسے مکہ سے نکال دیں گے، تو اس نے فیصلہ کیا کہ انہیں مکہ کے اعلیٰ ترین پانی پر آنے سے روک دے۔ چنانچہ اس نے چاہ زمزم میں سونا اور بعض دیگر اشیاء چھپا دیں، اسے مٹی سے بھر دیا اور اس کے نشانات کو مٹا دیا۔ اور ان اشیاء کے چھپانے کے کام میں قدرت نے بھی اس کی امداد کی اور کنویں (کی جگہ) پر بکثرت ریت چڑھادی حتی کہ وہ محو ہوکر رہ گیا، اس کے بعد مضاض نے یمن کی طرف راہ فرار اختیار کی۔

---

[1] بخاری: ج ۱ ص ۴۷۵، قدیمی، کراچی

چاہِ زمزم کا دوبارہ ظہور، تفصیلی واقعہ:

نبی کریم ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب بن ہاشم کو خواب میں جس جگہ کنواں تھا، اس کی علامات دکھائی گئیں، چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹے حارث کو لے کر اس جگہ کو کھودنا شروع کر دیا۔ جب کھودنے کی تکلیف ان پر شدید ہوگئی تو انہوں نے نذر مانی کہ اگر ان کو دس بیٹے عطا ہو جائیں تو ان میں سے ایک قربان کریں گے۔ پھر کھودا حتی کہ وہ تلواریں انہیں مل گئیں جو زم زم میں دفن شدہ تھیں۔ جب قریش نے دیکھا کہ عبدالمطلب کو تلواریں مل گئیں ہیں تو انہوں نے کہا اے عبدالمطلب جو کچھ تمہیں ملا ہے اس میں ہمیں حصہ دار بناؤ۔ عبدالمطلب نے جواب دیا کہ وہ تو بیت اللہ کی تلواریں ہیں۔

پھر مزید کھودا تو تہہ کے نیچے سے پانی پھوٹ نکلا جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا چنانچہ عبدالمطلب نے اس پر حوض بنا دیا۔ پھر وہ اور ان کا بیٹا پانی نکالتے، حوض میں ڈالتے اور حاجیوں کو پلاتے۔ قریش کے ساتھ حسد کے باعث کچھ لوگ رات کو حوض کو توڑ دیتے، صبح کے وقت عبدالمطلب اسے ٹھیک کر دیتے۔ لیکن جب اسے زیادہ ہی بگاڑنے لگے تو عبدالمطلب نے اپنے رب سے دعا کی تو انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان سے کہا گیا کہو:

''اے اللہ! میں اس کو کسی غسل کرنے والے کیلئے حلال نہیں کرتا، لیکن پینے والے کیلئے مباح ہے''۔

عبدالمطلب خواب دیکھ کر نیند سے بیدار ہوئے، مسجد گئے، وہاں پر انہیں قریش کی طرف سے مخالفت کا سامنا ہوا، تو انہوں نے انہی الفاظ کے ساتھ دعا کی جیسا کہ خواب میں دیکھا تھا، پھر واپس لوٹے، اس کے بعد قریش میں سے کوئی بھی جب اس حوض کو خراب کرتا تو اس کے بدن کو ایک بیماری لگ جاتی۔ اس وجہ سے انہوں نے ان کے حوض اور سقایہ کو خراب کرنا ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ شانہٗ نے عجیب قدرت ظاہر فرمائی۔

اس کے بعد خواجہ عبدالمطلب نے شادی کی اور ان کے ہاں دس بیٹے پیدا ہوئے تو انہوں نے دعا کی:

''اے اللہ تعالیٰ! میں نے نذر مانی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو قربان کروں گا، پس میں ان کے درمیان قرعہ ڈالتا ہوں جو تجھے پسند ہو اس پر قرعہ ڈال دے، یعنی اس کے حق میں قرعہ

نکال دے''۔

چنانچہ انہوں نے قرعہ ڈالا تو قرعہ عبداللہ بن عبدالمطلب کے نام نکل آیا اور وہی بیٹا عبدالمطلب کو سب سے زیادہ محبوب تھا، دعا کی کہ اے اللہ! تجھے عبداللہ کی قربانی پسند ہے یا سو اُونٹوں کی، اس کے بعد عبداللہ اور سو اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا تو سو اُونٹوں کے نام نکلا، لہٰذا عبدالمطلب نے سو اُونٹ ذبح کر دیئے۔ یہ مختصر روایت ہے۔

تفصیلی روایت:

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنے دادا سے متعلق روایت ہے، جسے ابن اسحاق نے یزید بن ابی حبیب سے، اس نے مرثد بن عبداللہ سے اور اس نے عبداللہ بن یزید الیافی سے روایت کیا ہے کہ عبدالمطلب نے کہا ہے:

''میں اپنے حجرے میں سویا ہوا تھا آنے والا میرے پاس آیا اور اس نے کہا ''طیبہ کھودو'' میں نے کہا کہ طیبہ کیا ہے؟ وہ چلا گیا اور میں اپنے بستر پر پھر سو گیا۔ وہ پھر آیا اور کہا کہ ''برّہ کھودو'' میں نے کہا کہ برّہ کیا ہے؟ وہ میرے پاس سے پھر چلا گیا اور جب اگلے دن میں اپنے بستر پر آ کر سو گیا تو وہ آنے والا پھر آیا اور اس نے کہا کہ ''زم زم کھودو'' میں نے کہا کہ زم زم کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ''اس کا پانی کبھی ختم نہ ہوگا اور نہ کبھی اس کی برکت زائل ہوگی''۔ قریہ نمل کے پاس وہ حاجیوں کی بہت بڑی تعداد کو سیراب کرے گا۔''

جب عبدالمطلب پر اس کی حقیقت واضح ہوگئی اور انہیں اس کی نشاندہی کر دی گئی تو وہ سمجھ گئے کہ کہنے والے نے سچ کہا ہے۔ اگلے دن صُبح کو وہ اپنی کدال لے کر نکلے اور ان کے ساتھ ان کا بڑا بیٹا حارث تھا (اس وقت حارث کے علاوہ ان کا اور کوئی بیٹا نہ تھا) چنانچہ انہوں نے کھودا اور جب عبدالمطلب کے سامنے ایک خلا ظاہر ہوئی تو انہوں نے اللہ کی کبریائی کا نعرہ بلند کیا۔ (اللہ اکبر کہا) اس پر قریش سمجھ گئے کہ انہوں نے اپنا مطلوب پالیا۔ وہ اٹھ کر ان کی طرف آئے اور کہا کہ اے عبدالمطلب! یہ اسماعیل علیہ السلام کا کنواں ہے، اس میں ہم بھی حقدار ہیں، لہٰذا ہمیں اپنے ساتھ شریک کرو۔ عبدالمطلب نے کہا میں ایسا نہیں کروں گا،

یہ امر تمہیں چھوڑ کر صرف میرے لئے مخصوص ہے اور تمہارے درمیان صرف مجھے عطا کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ہمارے ساتھ انصاف کیجئے، ہم تمہیں ثالثی فیصلہ کرائے بغیر نہ چھوڑیں گے، عبدالمطلب نے کہا کہ اپنے اور میرے درمیان اپنی مرضی کا حَکَم مقرر کرلو۔ انہوں نے کہا کہ وہ بنی سعد بن ہزیم کی کاھنہ ہوگی۔ وہ کاہنہ شام کے شرفاء میں شمار کی جاتی تھی۔ عبدالمطلب نے اس کی ثالثی قبول کرلی۔ عبدالمطلب بنی عبدِمناف کی ایک جماعت کے ساتھ سوار ہوئے اور اسی طرح سے قریش کے ہر قبیلہ کے لوگ سوار ہوکر چلے۔

کاھنہ شام کی طرف سفر:

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ سرزمین اس وقت بیابان تھی مگر وہ نکلے اور جب حجاز اور شام کے مابین کسی بیابان میں تھے تو عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا، جس سے انہیں اپنی ہلاکت یقینی نظر آنے لگی۔ انہوں نے قریش کے ہمراہی قبیلوں سے پانی مانگا، مگر انہوں نے انکار کردیا اور کہا کہ اس بیابان میں ہمیں بھی اپنی جانوں کا خطرہ ہے۔ جب عبدالمطلب نے ان کا یہ رویہ دیکھا، نیز اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کے خطرے کو بھانپ لیا تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہماری رائے آپ کی رائے کے تابع ہے، جیسا آپ چاہیں حکم کریں۔ عبدالمطلب نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ تم میں سے ہر آدمی اپنی قبر کھودے اور جب فوت ہو جائے تو باقی لوگ اسے دفن کردیں۔ یہاں تک کہ آخر میں ایک آدمی رہ جائے تو ایک آدمی (نعش) کا ضائع ہوجانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ پوری کی پوری جماعت ضائع ہوجائے۔ انہوں نے کہا ہمیں آپ کا فیصلہ منظور ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ عجیبہ کا ظہور:

چنانچہ ہر ایک نے اپنے لئے گڑھا کھودا، پھر پیاس کے مارے ہر ایک اپنی موت کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ اس پر عبدالمطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا بخدا ہم نے اپنے آپ کو عجز کے حوالے کردیا ہے اور اپنے لئے کوئی حیلہ تلاش نہیں کررہے، بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کسی مقام پر پانی عطا فرمادے۔ اپنے کجاوے کس لو۔ انہوں نے کجاوے کس لئے اور عبدالمطلب اور ان کے ساتھی قریش کے دیگر قبیلوں سے،

جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، الگ ہو کر نکل کھڑے ہوئے۔ عبدالمطلب آگے بڑھ کر اپنی سواری پر سوار ہوئے، جب ان کی اونٹنی ان کو لے کر کود کر اُٹھی تو اس کے پاؤں کے نیچے سے میٹھے پانی کا چشمہ اُبل پڑا۔ اس پر عبدالمطلب نے اللہ کی کبریائی کا نعرہ بلند کیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا۔ (اللہ اکبر کہا)

خواجہ عبدالمطلب کے حق میں خدائی فیصلہ:

عبدالمطلب سواری سے اُترے اور پانی پیا ان کے ساتھی بھی اترے اور انہوں نے بھی پانی پیا اور انہوں نے اپنے مشکیزے بھی پانی سے بھر لئے، پھر انہوں نے قریش کے ساتھی قبائل کو پانی کی طرف دعوت دی اور کہا کہ آؤ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پانی پلا دیا ہے۔ پس انہوں نے بھی پانی پیا اور خوب سیراب ہوئے۔ اس وقت عبدالمطلب سے جھگڑنے والے قبائل نے کہا اے عبدالمطلب! اللہ عزوجل نے ہمارے مقابلے میں تیرے حق میں فیصلہ فرما دیا ہے۔ بخدا ہم زم زم کے بارے میں تیری مخالفت کبھی نہ کریں گے۔ جس نے تجھے اس بیابان میں پانی پلا دیا ہے وہی تجھے آب زم زم پلائے گا۔ پس واپس چلو اپنے سقایہ کی طرف، چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت واپس لوٹے اور کاہنہ کی طرف نہ گئے، اس کے بعد قریش نے زم زم کے بارے میں عبدالملطب کے کام میں مداخلت نہیں کی۔

ابن اسحاق نے کہا میں نے بھی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب سے روایت کرنے والے کو زم زم سے متعلق سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالمطلب کو جب (خواب میں) زم زم کھودنے کی ہدایت کی گئی تو انہیں کہا گیا پیاس بجھانے والا تازہ پانی مانگو۔ لہٰذا عبدالمطلب قریش کی طرف نکلے اور کہا کہ کیا آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ مجھے زم زم کھودنے کا حکم دیا گیا ہے؟ انہوں نے پوچھا کہ کیا تمہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟ آپ نے کہا کہ نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اپنے بستر پر جایئے جہاں آپ نے خواب دیکھا ہے۔ اگر وہ اللہ کی طرف سے حق ہوا تو تجھے واضح کر دیا جائے گا اور اگر وہ شیطان ہوا تو تیری طرف لوٹ کر نہیں آئے گا، چنانچہ عبدالمطلب اپنے بستر پر واپس آ کر سو گئے اور خواب دیکھا، خواب میں انہیں کہا گیا کہ زم زم کھودو، اسکی برکت کبھی نہ ختم ہوگی اور وہ تمہارے جدامجد کی میراث ہے۔ جب یہ کہا گیا تو انہوں نے پوچھا،

وہ ہے کہاں؟ تو ان سے کہا گیا کہ وہ قریہ نمل (چیونٹیوں کی بلوں) کے پاس ہے، جہاں کل کوا چونچ مار کر زمین کرید رہا ہوگا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ عبدالمطلب اپنے بیٹے حارث کے ساتھ اگلی صبح گئے تو انہوں نے قریہ نمل پایا، جس کے پاس اساف اور نائلہ دو بتوں کے مابین کوا چونچ مار کر زمین کرید رہا تھا۔ انہوں نے کدال لی اور حسب ہدایت کھودنے کے لئے اُٹھے۔ جب قریش نے ان کی کاوش کو دیکھا تو اُٹھے اور کہا بخدا ہم تجھے ان دو بتوں کے مابین جن کے پاس ہم قربانی کرتے ہیں کھودنے کی اجازت نہ دیں گے، اس پر عبدالمطلب نے حارث سے کہا تم رہنے دو، میں کھودوں گا اور خدا کی قسم میں وہ کام پورا کر کے چھوڑوں گا جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ جب قریش نے سمجھ لیا کہ وہ اس کام سے ہٹنے والے نہیں ہیں، تو اس کی کھدائی میں مخل ہونے سے رُک گئے۔

کھودنے پر دفینہ ظاہر ہوگیا:

چنانچہ عبدالمطلب نے تھوڑا ہی کھودا تھا کہ انہیں کنویں کی تہہ سے پانی بہتا ہوا ظاہر ہوا، انہوں نے اللہ اکبر کہا تو جان لیا گیا کہ عبدالمطلب نے سچ کہا تھا، انہوں نے اس کی کھدائی کو جاری رکھا تو اس میں سے سونے کے دو ہرن برآمد ہوئے۔ یہ وہی ہرن تھے جو جرھم نے مکہ سے نکلتے وقت دفن کئے تھے، نیز انہوں نے اس میں قلعی تلواریں، زرہیں اور اسلحہ پایا۔ قریش نے ان سے کہا کہ اس سب کچھ میں تیرے ساتھ ہمارا بھی حصہ اور حق ہے، انہوں نے کہا کہ نہیں لیکن آؤ قرعہ اندازی کے ذریعہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ ہو جائے، انہوں نے کہا کہ کیسے کریں گے؟ عبدالمطلب نے کہا کہ کعبہ کے لئے دو تیر مقرر کر دو، دو میرے لئے اور دو اپنے لئے مقرر کرلو، قریش نے کہا کہ تُو نے انصاف کی بات کی ہے، لہٰذا کعبہ کے لئے دو زرد رنگ کے تیر بنا دیئے گئے۔ دو سیاہ تیر عبدالمطلب کے لئے اور دو سفید تیر قریش کے لئے مقرر کر دیئے گئے۔ پھر عبدالمطلب نے کہا کہ یہ تیر کسی شخص کو دو، جو ہبل کے پاس ان کے ذریعہ فال نکالے، عبدالمطلب اس وقت اُٹھے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کی:

''اے اللہ! تو تعریف کیا ہوا فرمانروا ہے، تو میرا ربّ ہے، پیدا

کرنے والا اور لوٹانے والا ہے۔ جدید وقدیم تیری ہی طرف
سے ہیں ہمارے لئے کل وہ کچھ نکال جو تجھے پسند ہے''

چنانچہ فال نکالی گئی تو دونوں زرد تیر ہرنوں پر کعبہ کے لئے دونوں سیاہ تیر تلواروں اور زرہوں پر عبدالمطلب کے لئے نکل آئے اور قریش کے دونوں تیر چوک گئے۔ عبدالمطلب نے تلواریں کعبہ کے دروازے پر نصب کردیں اور سونے کے ہرنوں میں سے ایک ہرن بھی دروازے پر نصب کردیا۔ یہ پہلا سونا تھا جس سے کعبہ کو زیور پہنایا گیا۔ دوسرا ہرن عبدالمطلب نے کعبہ کے اندر تھیلی میں رکھ دیا جہاں کعبہ کو آنے والے تحائف رکھے جاتے تھے اور قریش کا بُت ہبل کعبہ کے اندر تھیلی کے اوپر رکھا ہوا تھا، یہ ہرن کعبہ کے اندر ہی رہا حتی کہ ایک مقتدر شخص نے اسے اُٹھالیا۔

ایک بڑے ادیب ڈاکٹر طہ حسین نے اپنی کتاب ''علی هامش السيرة'' میں بڑے حیرت انگیز ادبی اسلوب سے عبدالمطلب کے خواب کی نقشہ کشی کی ہے، ادیب موصوف نے اس ھاتف کا قصہ بیان کیا ہے جسے عبدالمطلب نے تین راتوں میں اپنے خواب میں دیکھا جو انہیں طیبہ، برّۃ یا مضنونہ کے کھودنے کا حکم کرتا رہا، عبدالمطلب اپنے اس خواب کے بعد حیرت و پریشانی میں مبتلا ہو گئے حتی کہ انہوں نے اس معاملے کو کاہن کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر خوف زدہ ہو گئے کہ نہ معلوم کاھن کے دل میں کیا کیا خیال اُبھریں گے اور اگر یہ بات پھیل گئی تو حرب بن امیہ، اس کے بیٹے اور مخزومی نوجوان ان کا مذاق اڑائیں گے، ہوسکتا ہے عبدالمطلب کے دل میں یہ گمان ہو کہ وہ ھاتف قریش کے مردوں میں سے کسی کا سایہ ہو، جسے اس کے لوگوں نے بھلا دیا ہو اور اس کی (قبر کی) زیارت نہ کرتے ہوں اور نہ اس سے تقرب حاصل کرتے ہوں یا یہ کہ وہ شیاطین میں سے کوئی شیطان ہو، انسانوں کو اپنی اطاعت پر اُکساتے رہتے ہیں یا یہ کہ وہ ان کے معبودوں میں سے کوئی معبود ہو، جو اس سے قربانی کا مطالبہ کرتا ہو۔

عبدالمطلب کی بیوی کا عمدہ مشورہ:

عبدالمطلب نے اپنی حیرت و پریشانی کو اپنی پیاری بیوی سمراء پر ظاہر کرنے کو ترجیح دی اور اس سے مشورہ طلب کیا۔ اس نے کہا اسے اپنے اوپر بوجھ نہ بنایئے، خوف نہ کھایئے اور نہ ہی اپنی پریشانی میں

اضافہ کیجئے۔ بس اُٹھئے اور اپنے معبودوں کو قربانی پیش کیجئے تا کہ وہ راضی ہو جائیں اور فقیر، غریب اور بھوکے خوش ہوں اور قریش کے بعض لوگوں کو (حسد کے باعث) غصہ آئے۔

چنانچہ مکہ میں لوگوں کا وہ دن قربانی کے موٹے جانوروں کا خون بہانے اور سامان خورد ونوش کی بہتات میں گزرا، نیز بتوں کو بھی خوش کر دیا گیا۔ پھر عبدالمطلب خوش خوش اپنے بستر پر آئے اور خواب میں پھر اسی ھاتف کو دیکھا جس نے کہا ''زم زم کھودو'' عبدالمطلب نے پوچھا وہ ''زم زم کیا ہے''؟ اس نے کہا ''نہ تو کبھی اس کا پانی ختم ہوگا اور نہ تم ملامت کئے جاؤ گے'' تم حاجیوں کی ایک عظیم تعداد کو پانی پلاؤ گے اور وہ گوبر اور خون کے درمیان ہے، جہاں سفید پاؤں والا کوّا چونچ کے ساتھ کھوج کرید کر رہا ہوگا۔ عبدالمطلب نے کہا اب میں سمجھ گیا ہوں۔

عبدالمطلب کو جب کنواں کھودنے کا حکم دیا گیا تھا، اس وقت انہوں نے اللہ عزوجل کی خوشنودی کے لئے نذر مانی تھی کہ اگر چاہ زم زم کی کھدائی کا کام ان کے ہاتھوں مکمل ہو جائے اور ان کے ہاں دس بیٹے ہوں تو وہ ان میں سے ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کریں گے۔

اللہ تعالیٰ ان کے عزوشرف اور ان کی اولاد میں اضافہ فرمایا اور ان کے ہاں دس بیٹے پیدا ہوئے:

عبدالمطلب کی اولاد کی تفصیل:

(۱) حارث: ان کی والدہ بنی سواءۃ بن عامر سے تھی، جو ہلال بن عامر کے بھائی تھے۔

(۲) عبداللہ اور

(۳) زبیر: ان کی والدہ مخزومیہ تھیں۔

(۴) عباس اور ضرار کی والدہ نمریہ تھیں۔

(۶) ابولہب کی والدہ خزاعیہ تھیں۔

(۷) غیداق: ان کی والدہ غیشانیہ خزاعیہ۔

(۸) حمزہ اور

(۹) مُقوّم: ان دونوں کی والدہ زھریہ یعنی بنو زہرہ سے تھیں۔

(۱۰) ابوطالب۔

قرعہ اندازی برائے ذبح:

جب ان بیٹوں کی تعداد دس ہوگئی اور زم زم کی کھدائی کا کام ان کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا کہ ان میں سے کس کو قربان کریں۔ قرعہ میں رسول اللہ ﷺ کے والد جناب عبداللہ کا نام نکلا، لہٰذا عبدالمطلب انہیں قربان کرنے کے لئے تیار ہوگئے مگر جناب عبداللہ کے اخوالی ''بنومخزوم''، قریش کے سردار اور دیگر اہل الرائے نے مخالفت کی۔ انہوں نے کہا بخدا! تم عبداللہ کو ذبح نہ کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو ہمارے ہاں ہماری اولاد کے بارے میں اور پھر پورے عرب میں یہ ایک رسم بن جائے گی۔ عبدالمطلب کے بیٹوں کا موقف بھی قریش سے ہم آہنگ تھا۔ قریش نے عبدالمطلب سے کہا حجاز میں ایک قیافہ شناس (عرّافہ) ہے۔ اس کا ایک تابع (مؤکّل) ہے اس سے دریافت کرو اور پھر فیصلہ کرو اگر وہ ذبح کرنے کو کہے تو بیٹے کو ذبح کرو اور اگر وہ اس آزمائش سے بچنے کی کوئی صورت بتادے تو اس پر عمل کرو۔

عرّافہ مدینہ کی طرف سفر:

چنانچہ عبدالمطلب اور دیگر زعمائے قریش روانہ ہوکر مدینہ پہنچے اور وہاں پر ''تخییر'' نامی ایک عورت سے ملے۔ قریش نے اپنا سوال پیش کیا اور عبدالمطلب نے اپنا سارا قصہ بیان کیا۔ عرّافہ نے کہا آج میرے ہاں سے چلے جاؤ حتی کہ میرے پاس میرا تابع (مؤکّل) آئے اور میں اس سے پوچھ لوں، لہٰذا وہ اس کے ہاں سے لوٹ آئے اور اگلی صبح پھر وہاں گئے تو عرافہ نے ان سے کہا۔ ہاں مجھے تمہارے بارے میں اطلاع ملی ہے تم لوگ یہ بتاؤ کہ تمہارے ہاں ایک آدمی کا خون بہا یعنی دیت کتنی ہے؟ انہوں نے کہا کہ دس اُونٹ۔ اس نے کہا کہ اپنے شہر لوٹ جاؤ اور دس اُونٹ قربان کرو۔ اگر فال اونٹوں پر نکلے تو انہیں ذبح کردو اور اگر فال تمہارے صاحب کے نام نکلے تو اُونٹوں کی تعداد کو دس کے حساب سے بڑھاتے جاؤ حتی کہ تمہیں اپنے ربّ کی منشاء تک رسائی حاصل ہوجائے۔ جب فال اُونٹوں پر نکل آئے تو انہیں ذبح کردو۔ تم اپنے ربّ کی خوشنودی بھی حاصل کرلو گے اور تمہارے صاحب کی جان بھی بچ جائے گی۔

ایک انسان کی دیت سو اونٹ قرار پائی:

چنانچہ وہ لوٹ آئے اور عبدالمطلب نے عبداللہ اور دس اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا تو فال عبداللہ کے نام نکلی۔ قریش نے عبدالمطلب سے کہا کہ اس پر اضافہ کرو حتی کہ تمہارا ربّ راضی ہو جائے۔ عبدالمطلب دس دس اُونٹوں کا اضافہ کرتے رہے مگر فال عبداللہ کے نام ہی نکلتی رہی۔ قریش تعداد بڑھانے کا مطالبہ کرتے رہے اور عبدالمطلب بڑھاتے رہے حتیٰ کہ اُونٹوں کی تعداد جب سو ہوگئی تو فال اُونٹوں پر نکل آئی۔ قریش نے کہا یہ اُونٹ ذبح کرو، تمہارا ربّ راضی ہو گیا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ جب تک میں تین مرتبہ عبداللہ اور اونٹوں کے درمیان قرعہ اندازی نہ کرلوں گا اپنے ربّ کے ساتھ انصاف نہ کرسکوں گا۔ لہٰذا عبدالمطلب نے تین مرتبہ عبداللہ اور سو اُونٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا اور فال ہر بار سو اونٹوں کے نام نکلی، تب عبدالمطلب نے وادیوں، گھاٹیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر اونٹوں کو ذبح کیا۔ انسانوں پرندوں اور درندوں میں سے کوئی بھی ان کا گوشت نکالنے سے پیچھے نہ رہا۔ مگر عبدالمطلب کے بیٹوں نے اس میں سے کچھ نہ کھایا۔ مکہ کے گردونواح کے بدوی مذبوحہ اونٹوں کو کھینچ کر لے جاتے رہے اور جو باقی بچا اس پر درندے جھپٹ پڑے۔ یہ پہلی دیت تھی جو سو اونٹوں کے ساتھ ادا کی گئی پھر اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو نافذ فرمایا اور دین اسلام میں یہی دیت قائم رہی۔

حضرت خواجہ عبداللہ کی زوجیت:

اس دن عبدالمطلب جب لوٹ کر اپنے گھر گئے تو وھب بن منبہ بن زھرہ بن کلاب جو اس وقت اشراف مکہ میں سے تھا کے پاس گئے جب کہ وہ مسجد میں بیٹھا تھا۔ (اس ملاقات کے نتیجہ میں) اس نے اپنی بیٹی آمنہ کو عبداللہ بن عبدالمطلب کی زوجیت میں دے دیا۔

چاہ زم زم کی آب رسانی اور اکابرین قریش کا حسین عمل:

خواجہ عبدالمطلب کے پاس کثیر تعداد میں اونٹنیاں تھیں۔ جب حج کا موسم آتا تو ان کو جمع کرتے، ان کے دودھ کو زم زم کے پاس ایک چمڑے کے برتن میں شہد ملا کر حاجیوں کو پلاتے اور زبیب خرید کر آب زم زم میں ملا کر بھی انہیں پلاتے۔ آب زم زم اس وقت بہت گاڑھا تھا لہٰذا اس کے گاڑھا پن کو کم کرنے کے

لئے وہ اس میں زبیب کی آمیزش کرتے۔ عبدالمطلب اپنی وفات تک لوگوں کو یہ مشروب پلاتے رہے۔ پھر عبدالمطلب کے بعد پلانے (سقایہ) کا کام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہاتھ لے لیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طائف میں انگوروں کا باغ تھا، وہ اپنے سِقایہ کے لئے وہاں سے زبیب کو لایا کرتے۔ نیز وہ اہل طائف کو قرض دیا کرتے اور اس کے عوض میں ان سے زبیب لیتے اور سارے کا سارا آب زم زم میں ملا کر حج کے دنوں میں حاجیوں کو پلایا کرتے۔ سبحان اللہ!

یہ سلسلہ جاہلیت کے اختتام اور اسلام کے آغاز تک جاری رہا، حتی کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے اور آپ ﷺ نے عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عبدالمطلب سے سقایہ اور کعبہ کی حجابت عثمان بن طلحہ سے اپنے قبضہ میں لے لی۔ اس پر عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن عبدالمطلب اُٹھے اور اپنا دست سوال دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میرے ماں باپ آپ پر قربان سقایہ اور حجابت میرے لئے جمع فرما دیجئے''۔ مگر نبی ﷺ جبکہ کعبہ کے دروازے کے چوکھٹ کے درمیان کھڑے ہوئے تھے فرمایا دورِ جاہلیت کے خون کے سارے دعوے، مالوں کے تمام مطالبے، کبر وغرور اور تفاخر سارے کے سارے میرے ان دو قدموں کے نیچے پامال ہیں۔ البتہ محترم حرم کی تولیت اور حُجاج کی آب رسانی کے عہدے مستثنیٰ ہیں، وہ انہی کے سپرد کرتا ہوں جن کے پاس زمانہ جاہلیت میں تھے۔ لہٰذا آب رسانی (سِقایہ) کا منصب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے پاس رہا۔ اور حجابت اور کلید برداری خاندانِ شیبہ میں باقی رکھی گئی۔

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ چاہ زم زم کی طرف تشریف لائے جبکہ آب رسانی کا منصب عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس تھا اور آب زم زم سے بھرا ہوا ایک بڑا ڈول منگوایا، جسے آپ ﷺ نے کنویں سے خود کھینچ کر نکالا تھا، اس سے وضو کیا اور پانی نکالنے کا حق آب رسانی کے حقداروں کے لئے چھوڑ دیا اور فرمایا اے بنی عبدالمطلب (ڈول) کھینچو، اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ تم سے چھین لیا جائے گا تو میں بھی تمہارے ساتھ کھینچتا۔

چاہِ زم زم کی پیائش اور اس کے چشمے کے بارے میں اکابرینِ اُمت کی تحقیق:

ابن جبیر رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں زمزم کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ''ہماری پیائش کے مطابق اس کی گہرائی ۱۱ قامہ اور پانی کی گہرائی ۷ قامہ ہے''۔ جہاں تک اُرزقیؒ نے کنویں کی گہرائی میں ۳ چشموں کا ذکر کیا ہے، فاکہیؒ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے کعب احبار سے پوچھا کہ اس کے چشموں میں کونسا چشمہ سب سے زیادہ پانی دینے والا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ''وہ چشمہ جو حجرِ اسود کے سامنے سے پھوٹتا ہے''، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، آپ نے ٹھیک کہا۔

دارقطنی نے اپنی سنن میں ابن سیرین سے روایت کیا ہے کہ ایک زنگی زمزم میں گر کر مر گیا، ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہدایت پر اسے نکالا گیا اور پانی کھینچا گیا تو رکن سے آنے والا پانی ان پر چھا گیا، پھر اسے بند کر دینے کی ہدایت کی۔

طحاویؒ نے معانی الآثار کی شرح میں اور ابن شیبہ نے عطاء سے صحیح اسناد کے ساتھ بیان کیا ہے ''ایک حبشی زمزم میں گر کر مر گیا تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس پانی کو نکالنے کا حکم دیا مگر پانی ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا، دیکھا گیا تو پانی حجرِ اسود کے سامنے سے جاری تھا، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارے لئے بس اتنا پانی نکالنا کافی ہے''۔ اور العمری نے مسالک الابصار میں کہا ہے: ''ایک حبشی اس میں گر کر مر گیا تو اس کی وجہ سے پانی نکالا گیا تو تین چشموں سے پانی اُبلتا ہوا پایا گیا، حجرِ اسود کے قریب والے چشمے کا پانی سب سے زیادہ طاقت ور تھا۔ اسے دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ دُعا کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں آبِ زمزم سے زیادہ سے زیادہ مُستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۫ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الصافات:۱۰۲)

حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ الصلوۃ والسلام

کی

قربانی کا واقعہ

حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَزَلْ وَلَا یَزَالُ حَیًّا قَیُّوْمًا قَادِرًا سَمِیْعًا بَصِیْرًا
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَحَبِیْبِنَا وَشَفِیْعِنَا وَقَائِدِ غُرِّ الْمُحَجَّلِیْنَ مُحَمَّدٍ
وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَ اَزْوَاجِهٖ وَاَتْبَاعِهٖ وَاَشْیَاعِهٖ اَبَدَ الْاٰبِدِیْنَ وَدَهْرَ الدَّاهِرِیْنَ
اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ، رَبِّ هَبْ
لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ، فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ
اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ، قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ،
سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ [1]

قربانی کی تاریخ اور اس کی ابتداء:

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ملک شام میں جا پہنچے اور یہ دعا کی کہ اے میرے رب مجھ کو ایک نیک فرزند دے، سو ہم نے ان کو ایک حلیم المزاج فرزند (لڑکے) کی بشارت دی، سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ اس فرزند کو اللہ کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں، آنکھ کھلی تو اس وجہ سے کہ انبیاء کا خواب ''وحی'' ہوتی ہے اس کو اللہ کا حکم سمجھا اور اس کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہوئے، پھر اس خیال سے کہ یہ فعل فرزند سے متعلق بھی ہے اللہ جانے اس کی کیا رائے ہو، یعنی اتفاق یا اختلاف اس کو اطلاع کرنا ضروری سمجھا۔ شقِ اوّل میں طبیعت یکسو ہو جائے گی اور شق ثانی میں اس کو سمجھا دیں گے، اس لئے اس فرزند (یعنی اسماعیل علیہ السلام) سے فرمایا کہ برخوردار میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو اللہ کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے، وہ بولے ابا جان اس میں مجھ سے پوچھنے کی کیا بات ہے جب آپ کو اللہ کی طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے تو اس حکم کو بلا تامل پورا کیجئے۔ ان شاء اللہ آپ مجھ کو سہار کرنے والا (یعنی صبر کرنے والا) دیکھیں گے۔

---

[1] سورۃ الصّٰفّٰت، آیت نمبر: ۱۰۰ تا ۱۰۲۔

محترم بھائیو! ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کا ایک اہم واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے لئے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی پیش کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنی قوم کے ایمان سے نا اُمید ہو گئے، اپنی قوم کے ساتھ مزید رہنا ناپسند کرنے لگے تو فرمایا میں ایسی جگہ جانا چاہتا ہوں جہاں اپنے ربّ کے اوامر پورے کرسکوں، یعنی شام۔ وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ میں تو اپنے ربّ کی طرف چلا جاتا ہوں۔ یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ اپنے اہلِ وطن یعنی عراق والوں سے بالکل مایوس ہو گئے، اور وہاں آپ کے بھانجے حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کوئی آپ پر ایمان نہیں لایا۔

ربّ کی طرف چلے جانے سے مراد یہ ہے کہ میں دار الکفر کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں کا مجھے اپنے ربّ کی طرف سے حکم ہوا ہے، اور جہاں میں اپنے پروردگار کی عبادت کرسکوں گا۔ سَیَهْدِیْنِ میرا ربّ ضرور میرے دینی مقاصد میں میری رہنمائی فرمائے گا۔

میرے محترم بھائیو! جو اللہ کے نام پر پسے اور قربانیاں دے، اللہ تعالیٰ رہتی دنیا تک اُسے نیک انسانوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دلوں کی بہار بنا دیتے ہیں۔ اِس کائنات کا ذرہ ذرہ اُسے سلام کرتا ہے۔ قربانی کے بغیر یہ منصب نہیں ملتا۔

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو رفعت، محبوبیت اور روشنی کا مینار بنا دیا۔ اللہ پاک ان سے ایسے خوش ہوئے کہ جو سب سے اونچی چیز نبوت ہے، ساری دنیا جس کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی، اللہ نے نبوت اُن کے خاندان میں رکھ دی، مسلسل کئی نبی اُن کی اولاد سے آئے۔

اُمتِ محمدیہ ابراہیمی دعا کا صدقہ:

اللہ تعالیٰ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی: اے اللہ! جیسے ہم باپ بیٹے نے تیری فرمانبرداری کی، ہماری ذریت میں ایسی امت مسلمہ پیدا فرما جو آپ کی فرمانبردار ہو۔ یہ اُمتِ محمدیہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور قربانی کا صدقہ ہے۔ مشرق مغرب میں، ہر اقلیم میں، برِ اعظم میں، اندھیروں میں اور اُجالے میں ابراہیمی زندگی اُجاگر کرنے اور اس کی تجدید کے لیے اُمتِ محمدیہ پیدا کی گئی۔

خلیل اللہ اور حبیب اللہ:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا: خلّۃ محبت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے۔ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ رسولِ پاک ﷺ اللہ کے حبیب ہیں اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں۔ حالانکہ دونوں نبی، اللہ کے حبیب بھی ہیں اور دونوں نبی، اللہ کے خلیل بھی ہیں۔ حدیث موجود ہے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا غَيْرَ رَبِّي لَاتَّخَذْتُ اَبَابَكْرٍ خَلِيلًا[1]

دنیا میں میرا کوئی خلیل نہیں ہے، میں دنیا میں اگر کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بناتا، لیکن میرا خلیل تو رحمان ہے اور میں رحمان کا خلیل ہوں۔

محبت کے درجات:

محبت کے دس درجے ہیں:

۱۔ علاقہ: یعنی تعلق: جیسے محب کا محبوب کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ ہم اپنی زبان میں علاقہ کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں جگہ سے میرا تعلق ہے۔

۲۔ ارادت یعنی مرید: یعنی محبت ذرہ آگے بڑھی تو اس کا نام ہے ارادت۔ یہ آدمی اس کا مرید ہو گیا یعنی محبت میں اس کے تابع ہو گیا۔

۳۔ صبابت یعنی میلان: پانی اونچائی سے ڈھلان کی طرف جمع ہو جائے، ایسے ہی محب محبوب کی طرف پلٹا کھاتا ہے۔ محبت کے اس درجہ کو صبابت کہتے ہیں۔

۴۔ غرام: غریم تاوان (قرض) کو کہتے ہیں، جیسے قرض آدمی کو چمٹ جاتا ہے، جان نہیں چھوڑتا ایسے ہی محب کو محبوب کی محبت چمٹ جاتی ہے، یعنی محب محبوب کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

۵۔ وِداد یعنی وُدّ: اللہ تعالیٰ کا نام بھی ودود ہے۔ جس سے اللہ پاک محبت کرتے ہیں خالص کرتے ہیں، کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ایسے ہی محب جو محبوب سے محبت کرتا ہے وہ خالص ہوتی ہے، کوئی غرض نہیں ہوتی۔

---

[1] صحیح البخاری: ج۱، ص۵۱۶

میں نے اسے چیز دینی ہے اسی وجہ سے میں اس سے محبت کررہا ہوں، ورنہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

۶۔ شغاف یعنی شغف: محبت دل کو چیر کر دل کے پردے میں اُتر گئی۔ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا یوسف علیہ السلام کی محبت زلیخا کے دل کے اندر گھس گئی۔

۷۔ عشقا، عشق: عشقاء اس بیل کو کہتے ہیں جو درخت پر چڑھ جاتی ہے، جس سے درخت سوکھ جاتا ہے۔ یعنی وہ درخت پر عاشق ہوگئی اور اس کو ختم کردیا۔ اسی طرح عاشق حقیقی محبوب کے عشق میں ختم ہوجاتا ہے۔ محب محبوب کی محبت میں فنا ہوجاتا ہے۔

۸۔ تُتم: انکساری آجائے، محب محبوب کے سامنے مِٹ گیا، عاجزی اختیار کرلی۔

۹۔ تعبُّد: طریقِ معبد اس راستے کو کہتے ہیں جس پر آدمی بار بار چلے، مٹی پس جائے، باریک ہوجائے۔ محب کی یہ خواہش ہے کہ میں محبوب کے سامنے روندا جاؤں، میں محبوب کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاؤں، محبوب کے سامنے میرا لہو بہے، محبوب کے سامنے میرا ذرہ ذرہ ہوجائے۔

میرے بھائیو! تعبد اور عبدیت بڑا اونچا مقام ہے اللہ نے اپنے نبی کو یہ مقام دیا۔ اس لیے رسول پاک ﷺ نے فرمایا: لَا مَقَامَ اَشْرَفُ مِنَ الْعُبُوْدِيَّةِ آپ کی ایک ہی خواہش تھی میں مالک کے سامنے ریزہ ریزہ ہوجاؤں، میرے لہو کے قطرات مالک کے سامنے بہیں، جیسے شہید کی تمنا ہوتی ہے کہ میرے جسم کے زیادہ ٹکڑے ہوں، جتنے زیادہ ٹکڑے ہوں گے قیامت میں اعزاز اُتنا زیادہ ہوگا۔ اسے تعبّد کہتے ہیں۔

۱۰۔ خلیل، خُلّت: محبت کا انتہائی درجہ خُلّت ہے۔ انسان کی عقل سے غیر کی سوچ، انسان کے قلب سے غیر کا وسوسہ اور انسان کے روئیں، روئیں سے غیر کا دھیان نکل جائے۔ دماغ، دل، رگ رگ اور لہو کے ہر ہر قطرے میں محبوب بس جائے۔ گویا کہ اس کا ذرہ ذرہ محبوب کی یاد میں رطب اللسان ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا۔

واقعہ عجیبہ:

روایات میں ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس پانچ ہزار بکریوں کا ریوڑ تھا فَتَعَجَّبَ الْمَلَائِكَةُ مِنْ كَثْرَةِ مَالِهٖ مَعَ خُلَّتِهِ الْعَظِيْمَةِ عِنْدَ اللّٰهِ فرشتوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ

انہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں خُلّۃ کا مقام حاصل ہے اس کے باوجود بھی مال کی کثرت ہے چنانچہ ایک دن حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بکریاں اور چرواہے لے کر چلے، بکریوں کی گردنوں میں سونے کے ہار تھے فَطَلَعَ مَلَکٌ فِیْ صُوْرَۃِ اٰدَمِیٍّ عَلٰی شَرَفِ الْوَادِیْ فَسَبَّحَ قَائِلًا: سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَالرُّوْحُ اچانک ایک فرشتہ، انسانی شکل میں وادی کے کنارے پر ظاہر ہوا اور یہ تسبیح کہہ رہا تھا ''سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَالرُّوْحُ''۔

جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تسبیح سُنی اور اس میں اپنے محبوب کا تذکرہ سُنا تو انہیں بہت اچھا لگا اور دوبارہ سننے کا شوق پیدا ہوا تو فرمایا: یَا اِنْسَانُ کَرِّرْ ذِکْرَ رَبِّیْ فَلَکَ نِصْفُ مَالِیْ اے انسان: میرے ربّ کی یہ تسبیح دوبارہ کہو تو اپنا آدھا مال تمہیں دے دوں گا، اس نے مذکورہ تسبیح پھر پڑھی تو اور لذت محسوس کی اور شوق مزید بڑھ گیا اور کہنے لگے کَرِّرْ تَسْبِیْحَ خَالِقِیْ فَلَکَ جَمِیْعُ اَمْوَالِیْ مِنَ الْاَغْنَامِ وَالْغِلْمَانِ کہ میرے خالق کی تسبیح پھر بیان کرو تو یہ جو بکریاں اور غلام تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمہارے لئے ہونگے وَکَانُوْا خَمْسَۃَ اٰلَافِ غُلَامٍ اور وہ پانچ ہزار غلام تھے۔

فَاَنْصَفَتِ الْمَلَائِکَۃُ وَسَلَّمَتْ بِخُلَّتِہٖ کَمَا سَلَّمَتْ بِخِلَافَۃِ اٰدَمَ وَھٰذَا مِنْ جُمْلَۃِ الْاِسْرَارِ الَّتِیْ جُعِلَ بِھَا اَبًا ثَانِیًا لَنَا پس فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خلیل اللہ ہونے کو تسلیم کر لیا، جیسا کہ انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے خلیفہ ہونے کو تسلیم کیا تھا۔ اور یہ من جملہ ان اسرار کے ہے جن کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہمارا ابائے ثانی قرار دیا گیا۔

دعائے خلیل:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی چھیاسی (۸۶) سال کی عمر ہوگئی، لیکن اولاد نہیں تھی، اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی: رَبِّ ھَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ، ای بَعْضَ الصَّالِحِیْنَ یعنی اے پروردگار! مجھے صالحین میں سے ایک ایسا بیٹا عطا فرما جو دعوت وطاعت میں میری مدد کرے، میرے لئے اُنس کا سبب ہو۔

میرے محترم بھائیو! اللہ تعالیٰ نے ہمیں تعلیم دی کہ جب بھی اولاد مانگو، نیک مانگو۔ بیٹا تو مانگ لیا، لیکن وہ باپ کے لئے سر درد بنا، ساری زندگی ماں باپ کو پریشان کیا۔ بُری اولاد انسان کیلئے دُنیا ہی میں عذاب

ہے۔ اس لئے کبھی یوں دُعا نہیں مانگنی چاہیے کہ اللہ بیٹی دے یا بیٹا دے بلکہ یہ دُعا مانگنی چاہیے کہ اے اللہ! نیک بیٹا دے، نیک بیٹی دے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے نیک اولاد کی دُعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ کیلئے کوئی مشکل نہیں تھا۔ ربُ العالمین نے اُنہیں اسماعیل جیسا عظیم بیٹا دیا۔

سیدنا اسحاق علیہ السلام تیرہ سال بعد حضرت سارہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ننانوے سال تھی:

وُلِدَ اِسْحَاقُ وَعُمُرُ اِبْرَاهِيْمَ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ سَنَةً[۱]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے (اسماعیلؑ) اور بیوی (ہاجرہؓ) کو لق دق میدان (جہاں بیت اللہ ہے) میں چھوڑ گئے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ:

اس فرمانبردار فرزند سعید کی ولادت کا واقعہ یہ ہوا کہ جب حضرت سارہؓ نے یہ دیکھا کہ مجھ سے کوئی اولاد نہیں ہو رہی تو وہ سمجھیں کہ میں بانجھ ہو چکی ہوں، اُدھر فرعونِ مصر نے حضرت سارہؓ کو اپنی بیٹی جن کا نام ہاجرہؓ تھا، خدمت گزاری کے لئے دیدی تھی، حضرت سارہؓ نے یہی ہاجرہؓ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمادیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے نکاح کرلیا۔ انہی ہاجرہؓ کے بطن سے یہ صاحبزادے پیدا ہوئے اور ان کا نام اسمٰعیل علیہ السلام رکھا گیا۔

حلیم المزاج بیٹے کی بشارت:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول کرتے ہوئے فرمایا: فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ[۲] ہم نے خوشخبری دی کہ آپ کو جو بیٹا دے رہے ہیں وہ حلیم المزاج ہوگا، ضبط، حوصلے اور بُردباری میں اُس کی کوئی مثال دُنیا میں نہیں ہوگی۔ وہ ایسی بردباری، حوصلہ اور تحمل کا مظاہرہ کرے گا کہ دُنیا اُس کو یاد رکھے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج ۵، ص ۳۵۰

[۲] الصافات: ۱۰۱

گی۔ ''ف'' کے ساتھ عطف کا استعمال بتلاتا ہے کہ دعا کے فوراً بعد قبولیت ظاہر ہوگی۔

غلام، صبی اور حلیم کا معنیٰ:

بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ جو بچہ عمر کے اعتبار سے دس سال سے بڑھ جائے اسے ''غلام'' کہتے ہیں۔ جو بچہ عمر میں دس برس سے کم ہو اسے ''صبی'' کہتے ہیں اور حلیم اس بچے کو کہتے ہیں جو امور کو بجالانے میں اور انجام تک پہنچانے میں عجلت سے کام نہ لے وَلَا يَضْطَرِبُ عِنْدَ اِصَابَةِ الْمَكْرُوْهِ اور کسی ناگوار بات کے پیش آنے پر یکلخت حیران اور پریشان نہ ہوجائے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اوصافِ عالیہ:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے اوصافِ عالیہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ. اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا. وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ. وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا

''حضرت اسماعیل علیہ السلام میں بردباری، صبر، عہد و پیمان کی سچائی اور محافظت علی الصلوٰۃ کا مادہ اتم واکمل تھا، اپنے اہل وعیال کو بھی نماز اور زکوۃ کی ادائیگی کا حکم کرتے تھے، وہ اپنے ربّ کے ہاں پسندیدہ شخصیت تھے۔''

دنیا میں سب سے پہلے حضرت اسماعیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہوئے، اس سے پہلے گھوڑا ایک وحشی جانور تھا، انھوں نے اس کو سدھایا اور مانوس کیا اور پھر اُس پر سواری کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''گھوڑوں کو اپناؤ اور اُن پر سواری کرو، بے شک یہ تمہارے باپ اسماعیل علیہ السلام کی میراث ہے۔''

رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''پہلا شخص جس نے واضح عربی زبان کے ساتھ زبان کھولی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، آپ اُس وقت چودہ سال کی عمر کے تھے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا خواب:

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا بچپن گزر گیا، بڑے ہو گئے۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ[1] باپ کے ساتھ کام کاج میں چلنے لگے۔ چھوٹا بچہ پیارا ہوتا ہے لیکن جب پاؤں پر چلنے لگے تو اور پیارا اور تھوڑا بڑا ہو جائے تو اور پیارا، قریب البلوغ ہو جائے تو محبت کی انتہا ہوتی ہے۔ اس وقت سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا۔ بعض مؤرخین نے کہا کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی عمر اُس وقت تیرہ (۱۳) سال تھی اور بعضوں نے کہا بالغ ہو چکے تھے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مسلسل تین راتیں خواب دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں۔ آٹھویں کے دن دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ اللہ آپ کو حکم کر رہے ہیں کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو! جب صبح کی رَوَّیْ یعنی شام تک سوچتے رہے، اس وجہ سے وہ یوم الترویة کہلاتا ہے، پھر آئندہ رات یہی خواب دیکھا، فَعَرَفَ اَنَّهٗ مِنَ اللّٰهِ، پہچان لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اس وجہ سے وہ دن یوم عرفہ کہلاتا ہے، پھر تیسری رات دیکھا فَهُوَ يَنْحَرُ کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں فَسُمِّيَ يَوْمَ النَّحْرِ۔ پس اسی وجہ سے اس دن یعنی دسویں کا نام یوم النحر رکھا گیا ہے۔

نبی کا خواب وحی الٰہی ہوتا ہے، ہمارے خواب میں شیطانی خیالات آتے ہیں، نبی کے خواب میں شیطانی تلبیسات نہیں آسکتیں، وہاں شیطان کی دسترس نہیں، وہاں اللہ کے فرشتوں کے مکمل پہرے ہوتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام جب سوتے ہیں تو اُن کی آنکھ سوتی ہے لیکن دِل جاگتا رہتا ہے۔

ایک باریک نکتہ:

اللہ تعالیٰ نے نیند میں حکم دیا، براہِ راست حکم نہیں دیا۔ علماء نے اس کی ایک باریک وجہ یہ بتائی کہ اگر صاف حکم آتا تو اِتنی آزمائش نہیں تھی جتنا خواب والی بات میں، اس لئے کہ انسانی نفس کہہ سکتا ہے کہ شاید یہ مراد ہو، شاید وہ مراد ہو، یعنی انسان تاویلات کر سکتا ہے، لیکن سیدنا ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ جو میں دیکھ رہا ہوں گویا کہ اللہ کا اَمر ہے۔

---

[1] الصافات: ۱۰۲

وحی کی اقسام:

وحی الٰہی کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

وحی متلو: جیسے ہمارے نبی پاک ﷺ پر قرآنِ پاک اُترا اس کو وحی متلو کہتے ہیں جس کو ہم نماز میں تلاوت کرتے ہیں۔

وحی غیر متلو: دوسری صورت میں بھی فرشتہ ہزاروں مرتبہ اللہ کے نبی ﷺ کے پاس وحی لیکر آیا، اس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا جتنا میرے اوپر قرآن اُترا، اتنا قرآن کے علاوہ میرے اوپر وحی اُتری۔ ۲۶ ہزار مرتبہ جبرائیل علیہ السلام آقائے نامدار ﷺ پر وحی لے کر تشریف لائے۔ کبھی قرآن والی وحی لے کر اور کبھی دوسری وحی۔

میرے بھائیو! نبی کا خواب بالکل سچا ہوتا ہے، اس میں شیطانی وساوس کی آمیزش نہیں ہوتی ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا: رُؤْيَا الْاَنْبِيَاءِ فِي الْمَنَامِ وَحْيٌ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔[1]

منحر کی طرف روانگی:

قَالَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ كَانَ اِبْرَاهِيْمُ اِذَا زَارَهَاجَرَ وَاِسْمَاعِيْلَ حَمَلَ عَلَى الْبُرَاقِ فَيَغْدُوْ مِنَ الشَّامِ فَيُقِيْلُ بِمَكَّةَ وَيَرُوْحُ مِنْ مَّكَّةَ فَيَبِيْتُ بِالشَّامِ حَتّٰى اِذَا بَلَغَ اِسْمَاعِيْلُ مَعَهُ السَّعْيَ، وَاَخَذَ بِنَفْسِهٖ وَرَجَاهُ لِمَا كَانَ يَأْمَلُ فِيْهِ مِنْ عِبَادَةِ رَبِّهٖ وَتَعْظِيْمِ حُرُمَاتِهٖ اُمِرَ فِي الْمَنَامِ اَنْ يَّذْبَحَهٗ وَذٰلِكَ اَنَّهٗ رَاٰى لَيْلَةَ التَّرْوِيَةِ كَاَنَّ قَائِلًا يَّقُوْلُ لَهٗ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكَ بِذَبْحِ ابْنِكَ هٰذَا، فَلَمَّا اَصْبَحَ رَوّٰى فِيْ نَفْسِهٖ اَيْ فَكَّرَ مِنَ الصَّبَاحِ اِلَى الرَّوَاحِ اَمِنَ اللّٰهِ هٰذَا الْحُلْمُ اَمْ مِنَ الشَّيْطٰنِ فَمِنْ ثَمَّ سُمِّيَ يَوْمَ التَّرْوِيَةِ فَلَمَّا اَمْسٰى رَاٰى فِي الْمَنَامِ ثَانِيًا فَلَمَّا اَصْبَحَ عَرَفَ اَنَّ ذٰلِكَ مِنَ اللّٰهِ فَمِنْ ثَمَّ سُمِّيَ عَرَفَةَ كَذَا اَخْرَجَ الْبَيْهَقِيُّ فِيْ شُعَبِ الْاِيْمَانِ مِنْ طَرِيْقِ الْكَلْبِيِّ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ. قَالَ ابْنُ اِسْحَاقَ وَغَيْرُهٗ فَلَمَّا اُمِرَ اِبْرَاهِيْمُ بِذَبْحِ ابْنِهٖ قَالَ

[1] تفسیر ابن کثیر: ج ۵ ص ۳۵۱

لِابْنِهٖ خُذِ الْحَبْلَ وَالْمُدْيَةَ نَنْطَلِقْ اِلٰى هٰذَا الشِّعْبِ نَحْتَطِبْ فَلَمَّا خَلَا اِبْرَاهِيْمُ بِابْنِهٖ فِيْ شِعْبِ ثَبِيْرٍ اَخْبَرَهٗ بِمَا اُمِرَ بِهٖ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بیٹے اور بیوی ہاجرہؓ کے پاس جاتے تو براق پر سوار ہو کر صبح کے وقت ملک شام سے مکہ کی طرف روانہ ہو جاتے، قیلولہ مکہ میں کرتے اور رات واپس شام میں آ کر گزارتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ساتویں، آٹھویں اور نویں کی رات خواب دیکھا، حکمِ الٰہی سمجھ کر بیٹے کو ساتھ لے کر چل پڑے، چھری اور رسی بھی ساتھ لے لی اس لئے کہ حکمِ الٰہی کو تو پورا کرنا ہی ہے۔

یہ امتحان کس قدر سخت تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرنے کے لئے یہاں اللہ تعالیٰ نے **فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ** کے الفاظ بڑھائے ہیں، یعنی ارمانوں سے مانگے ہوئے اس بیٹے کو قربان کرنے کا حکم اس وقت دیا گیا تھا جب یہ بیٹا اپنے باپ کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا اور پرورش کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اب وقت آیا تھا کہ وہ قوتِ بازو بن کر باپ کا سہارا ثابت ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ بالغ ہو چکے تھے۔[1]

سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ **السَّعْيَ** کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جوان ہو گئے تھے۔

فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ''سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟''، یہ پوچھنا منیٰ کے کوہ ثبیر کے پاس تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات حضرت اسماعیل علیہ السلام سے اس لئے نہیں پوچھی کہ آپ کو حکمِ الٰہی کی تعمیل میں کوئی تردد تھا، بلکہ دو باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے مشورہ لیا:

(۱) وہ اپنے بیٹے کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ وہ اس آزمائش میں کس حد تک پورا اُترتا ہے۔

(۲) انبیاء کرام علیہم السلام کا طرز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی اطاعت کیلئے تو ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن اطاعت کیلئے ہمیشہ راستہ وہ اختیار کرتے ہیں جو حکمت اور حتی المقدور سہولت پر مبنی ہو۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے سے کچھ کہے بغیر بیٹے کو ذبح کرنے لگتے تو یہ دونوں کیلئے مشکل کا سبب ہوتا۔

---

[1] تفسیر مظہری

اب یہ بات آپ نے مشورہ کے انداز میں بیٹے سے اس لئے ذکر کی کہ بیٹے کو پہلے سے اللہ کا یہ حکم معلوم ہو جائے گا تو وہ ذبح ہونے کی اذیت سہنے کے لئے پہلے سے تیار ہو سکے گا، نیز اگر بیٹے کے دل میں کچھ تذبذب ہوا بھی تو اُسے سمجھایا جا سکے گا۔[۱]

لیکن وہ بیٹا بھی اللہ کے خلیل علیہ السلام کا بیٹا تھا اور اُسے خود منصب رسالت پر فائز ہونا تھا، اس نے جواب میں کہا: يَآ اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ''اباجان جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اُسے کر گزریئے''۔ اس سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بے مثال جذبہ جاں سپاری کی تو شہادت ملتی ہی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کمسنی ہی میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کیسی ذہانت اور کیسا علم عطاء فرمایا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے سامنے اللہ کے کسی حکم کا حوالہ نہیں دیا تھا بلکہ محض ایک خواب کا تذکرہ فرمایا تھا لیکن حضرت اسماعیل علیہ السلام سمجھ گئے کہ انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور یہ خواب بھی درحقیقت حکمِ الٰہی کی ہی ایک شکل ہے، چنانچہ انہوں نے جواب میں خواب کے بجائے حکمِ الٰہی کا تذکرہ فرمایا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی طرف سے اپنے والد بزرگوار کو یہ یقین بھی دلایا کہ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے) اس جملے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی غایت ادب اور غایت تواضع دیکھئے۔ ایک تو انشاء اللہ کہہ کر معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا اور اس وعدے میں دعوے کی جو ظاہری صورت پیدا ہو سکتی تھی اسے ختم فرما دیا۔ دوسرے آپ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ ''آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے'' لیکن اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ ''آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے'' جس سے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ یہ صبر و ضبط تنہا میرا کمال نہیں ہے بلکہ دنیا میں اور بھی بہت سے صبر کرنے والے ہوئے ہیں۔ انشاء اللہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں گا، اس طرح آپ نے اس جملے میں فخر و تکبر، خود پسندی کے ہر ادنیٰ شائبہ کو ختم کر کے اس میں انتہاء درجے کی تواضع اور انکساری کا اظہار فرما دیا۔[۲]

---

[۱] روح المعانی و بیان القرآن

[۲] روح المعانی

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو کسی معاملے میں اپنے اُوپر خواہ کتنا ہی اعتماد ہو لیکن اُسے ایسے بلند بانگ دعوے نہیں کرنے چاہئیں جن سے غرور وتکبر ٹپکتا ہو۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا (پس جب وہ دونوں جُھک گئے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو اور اسماعیل علیہ السلام نے اپنی جان کو سپرد کر دیا) **اَسْلَمَ** کے معنی ہیں جھک جانا، مطیع ہو جانا، سپرد کر دینا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ اللہ کے حکم کے آگے جھک گئے، یعنی باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کا اور بیٹے نے ذبح ہو جانے کا عزم کر لیا۔ یہاں **لَمَّا** (جب) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی آگے یہ نہیں بتایا گیا کہ جب یہ واقعات پیش آ چکے تو کیا ہوا؟ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ باپ بیٹے کا یہ اقدامِ فداکاری اس قدر عجیب وغریب تھا کہ الفاظ اس کی پوری کیفیت کو بیان کر ہی نہیں سکتے۔

سیدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے پاس شیطان کا آنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدہ ہاجرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہا کہ ہم کام جا رہے ہیں، شیطان انسانی شکل میں سیدہ ہاجرہ کے پاس آیا اور پوچھا کہ ابراہیم آپ کے بیٹے کو کہاں لے کر جا رہا ہے:

خَرَجَ اِبْرَاهِيْمُ بِاِبْنِهٖ لِيَذْبَحَهٗ، فَذَهَبَ الشَّيْطَانُ فَدَخَلَ عَلٰى سَارَةَ فَقَالَ: اَيْنَ ذَهَبَ اِبْرَاهِيْمُ بِاِبْنِكِ؟ قَالَتْ: غَدَا بِهٖ لِبَعْضِ حَاجَتِهٖ، فَقَالَ: اِنَّهٗ لَمْ يَغْدُ بِهٖ لِحَاجَتِهٖ، اِنَّمَا ذَهَبَ بِهٖ لِيَذْبَحَهٗ، قَالَتْ: وَلِمَ يَذْبَحُهٗ؟ قَالَ: زَعَمَ اَنَّ رَبَّهٗ اَمَرَهٗ بِذَالِكَ قَالَتْ: فَقَدْ اَحْسَنَ اَنْ يُطِيْعَ رَبَّهٗ۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے لختِ جگر کو لیکر منحر کی طرف چلے۔ سیدہ ہاجرہؓ کے پاس شیطان آیا کہ پتہ ہے کہ تمہارا خاوند اسماعیل کو کہاں لے جا رہا ہے؟ ذبح کرنے کیلئے جا رہا ہے۔ سیدہ ہاجرہؓ نے کہا وہ تو اپنے بیٹے پر بڑے شفیق ہیں اور بڑے مہربان ہیں، اس پر شیطان نے کہا کہ وہ یہ کہتے ہیں: مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے۔ اس پر حضرت ہاجرہؓ نے کہا: اگر رب نے حکم دیا ہے تو وہ تو پورا کرنا ہی چاہیے۔

میرے بھائیو! وہ عام خاتون نہیں تھی، اس کا دل تجلیاتِ الٰہی سے روشن تھا، نبی کی بیوی ہے، ساری

زندگی تربیت الٰہی میں رہی، اس لئے اُس نے کہا اگر اللہ کا امر ہے تو ابراہیم کو کر گزرنا چاہیے۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے پاس شیطان کا آنا:

فَذَهَبَ الشَّيْطَانُ فِيْ اَثْرِهِمَا فَقَالَ لِلْغُلَامِ: اَيْنَ يَذْهَبُ بِكَ اَبُوْكَ؟ قَالَ لِبَعْضِ حَاجَتِهٖ، قَالَ: اِنَّهٗ لَايَذْهَبُ بِكَ لِحَاجَتِهٖ وَلٰكِنَّهٗ يَذْهَبُ بِكَ لِيَذْبَحَكَ، قَالَ: وَلِمَ يَذْبَحُنِيْ؟ قَالَ: يَزْعَمُ اَنَّ رَبَّهٗ اَمَرَهٗ بِذَالِكَ، قَالَ: فَوَاللّٰهِ لَئِنْ كَانَ اللّٰهُ اَمَرَهٗ بِذٰلِكَ لَيَفْعَلَنَّ، قَالَ: فَيَئِسَ مِنْهُ۔[۱]

پھر یہ ظالم (شیطان) اسماعیل علیہ السلام کے پاس پہنچا (انسانی شکل میں) اور کہنے لگا: تمہیں پتہ ہے کہ تمہارے والد تمہیں کہاں لے جارہے ہیں؟ ذبح کرنے کیلئے لے جارہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ اُنہیں اللہ کا اَمر ہے۔ اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: اچھا! اُنہیں اللہ کا اَمر ہے، پھر تو کر گزرنا چاہیے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس شیطان کا آنا:

اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَمَّا اُمِرَ بِالْمَنَاسِكِ عَرَضَ لَهُ الشَّيْطَانُ عِنْدَ الْمَسْعٰى فَسَابَقَهٗ، فَسَبَقَهٗ اِبْرَاهِيْمُ ثُمَّ ذَهَبَ بِهٖ جِبْرِيْلُ اِلٰى جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ فَعَرَضَ لَهُ الشَّيْطَانُ فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ حَتّٰى ذَهَبَ ، ثُمَّ عَرَضَ لَهٗ عِنْدَ الْجَمْرَةِ الْوُسْطٰى فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ۔۔۔ثُمَّ ذَهَبَ بِهٖ جِبْرِيْلُ اِلَى الْجَمْرَةِ الْقُصْوٰى فَعَرَضَ لَهُ الشَّيْطَانُ فَرَمَاهُ بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ حَتّٰى ذَهَبَ[۲]

شیطان تیسری مرتبہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس گیا، تین دفعہ روکا کہ کیا کر رہے ہو؟ خواب پر عمل کر رہے ہو؟ خواب غلط ہو سکتے ہیں۔ کیا بیٹے کو ذبح کیا جاتا ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سات کنکریاں ماریں۔ جمرہ عقبہ جس کو ہم بڑا شیطان کہتے ہیں۔ پھر وہاں سے یہ شیطان بھاگا، آگے آیا۔ جمرہ وُسطیٰ پر سامنے آیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ اکبر کہہ کر سات کنکریاں پھر ماریں، وہ وہاں سے بھاگ کر جمرہ اولیٰ پر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج۵، ص۳۵۲

[۲] مسند احمد: رقم الحدیث ۲۷۱۱، ج۱، ص۳۸۸

سامنے آیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سات کنکریاں اور ماریں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تو میرے رَب کے حکم کو پورا کرنے میں آڑ بن رہا ہے، ہٹ جا!۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایسے جذبہ، غیرت اور حمیتِ دین کے ساتھ یہ کنکریاں ماریں کہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ اللہ نے قیامت تک آنے والے جتنے مسلمان ہونگے اُن سب کو کہا کہ تم منیٰ میں (منحر میں) ایسے ہی کنکریاں مارو، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے ماریں۔ حدیث شریف میں ہے تم ان کنکریوں کے مارنے کو کیا سمجھتے ہو؟ ابراہیم علیہ السلام نے جو ماریں سو ماریں حجاج کرام جو اس سنتِ ابراہیمی کی نقل پر کنکریاں مارتے ہیں وہ ایک ایک کنکری شیطان کو ایسے لگتی ہے جیسے نیزہ لگتا ہے، اُس کی چیخیں نکلتی ہیں۔

باپ بیٹے کا مکالمہ:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے قربان گاہ میں پہنچ کر اپنے بیٹے سے فرمایا:

''یٰبُنَیَّ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی''[1]

اے میرے پیارے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں آپ کو ذبح کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے چھیاسی سال کی عمر میں جا کر بیٹا دیا، پھر بیٹا تیرہ سال کا ہو چکا ہے، بیٹا نوجوان ہو، باپ کا سہارا بن گیا ہو، بیٹا صفاتِ حمیدہ سے آراستہ ہو اور بڑی عمر میں اللہ نے بیٹا دیا ہو تو کتنی محبت ہوگی۔ لختِ جگر ہے، پیار سے فرمایا ''یٰبُنَیَّ'' اے میرے پیارے بیٹے، میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میرے پیارے بیٹے! غور وفکر کر لیں کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ صورت مشورے کی ہے، حقیقت میں ابراہیم علیہ السلام پوری طرح اللہ کے اَمر پر تیار ہو چکے ہیں اور اللہ کے نبی دُنیا میں جو راستہ چلتے ہیں وہ سہولت اور ترغیب کا راستہ ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا اگر دو راستے ہیں: ایک عزیمت کا مشکل راستہ ہے اور ایک رُخصت کا آسان راستہ ہے تو میں آسانی کے راستے کو اختیار کرونگا کیونکہ اُمت نے نبی کی اقتداء کرنی ہے تاکہ اُمت پر مشکل نہ آئے۔ اس لئے سیدنا ابراہیم علیہ

---

[1] الصافات: ۱۰۲

السلام نے پوچھا: اے میرے بیٹے! آپ کی رائے کیا ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اگر بالفرض بیٹا تامل کرے گا تو ترغیب دوں گا تاکہ تیار ہوجائے، بغیر بتائے فوراً عمل کرلیں تو باپ بیٹا دونوں کیلئے مشکل ہوسکتی ہے، اس لئے سہولت اور ترغیب کا راستہ اختیار کیا۔ آخر وہ بیٹا بھی خلیل اللہ کا تھا، معمولی بچہ تو تھا نہیں، عام لڑکا تو نہیں تھا، ساری کائنات کے بچے مل کر اُس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

بیٹے میں کمالِ فراست:

سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: **یٰٓاَبَتِ** میرے ابا جان! جیسے ابراہیم علیہ السلام نے پیار سے فرمایا: **یٰبُنَیَّ**! اے میرے پیارے لختِ جگر! اسی طرح سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے بھی کہا: **یَآاَبَتِ** اے میرے پیارے اَبا جان! **اِفْعَلْ مَاتُؤْمَرُ** جس کا آپ کو حکم ہوا ہے اور آپ نے خواب دیکھا ہے وہ کر گزریں، تاخیر نہ کریں۔ حالانکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ بتایا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کررہا ہوں۔ آگے یہ لفظ نہیں کہے کہ اللہ نے اَمر دیا ہے کہ میں تجھے ذبح کروں، لیکن بیٹا خواب ہی سے سمجھ گیا، بیٹے میں کمال فراست اور کمال ذہانت تھی کہ میرے والد جو خواب دیکھ رہے ہیں یہ خواب وحیِ الٰہی ہے، نبی کا خواب سچا ہوتا ہے، اس لئے یہ اَمر کے حکم میں ہے۔

اولاد ہو تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام جیسی ہو:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو (خواب میں) حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کی جان ہم پر فدا کرو، ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کو اسماعیل علیہ السلام سے بیان کیا۔ اس واقعہ میں زیادہ عجیب سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا راضی ہوجانا تھا کہ وہ اس نوعمری میں بارہ تیرہ سال کی عمر تھی اللہ تعالیٰ پر اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہوگئے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام تو نبی ہوچکے تھے، معرفت کامل ہوچکی تھی، خلیل اللہ کا لقب ان کو مل چکا تھا ان کا اس حالت میں لڑکے کی قربانی کرنے پر آمادہ ہوجانا اس قدر عجیب نہیں جتنا اسماعیل علیہ السلام کا اس حکم کو سُن کر بغیر کسی پس وپیش کے ذبح ہونے کے لئے آمادہ ہونا عجیب ہے۔

اور درحقیقت یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فیض تھا کہ ان کی طرح ان کی اولاد میں بھی اللہ تعالیٰ کی کمالِ محبت تھی۔

آیت (اِفْعَلْ مَاتُؤْمَرْ) کے تحت مفسرین نے بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ فرمانبردار اولاد آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔ جب بھی ماں حکم کرے، باپ حکم کرے، شریعت کے ضابطے کے تحت فرمایا کہ وہ لبیک کہتے ہیں۔ اے ابا! ہم حاضر ہیں۔ اس لئے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا، قرآن میں بھی آیا ہے کہ ماں باپ کے سامنے اُف نہ کہو، جن کے ماں باپ زندہ ہیں، ابھی موقع ہے کہ اُن کے سامنے بچھ جائیں۔ کہا اے ابا جان! اللہ کا اَمر ہے۔ میں کیسے انکار کرسکتا ہوں؟ (یوں نہیں کہ ابا کہہ رہا ہے فلاں کام کرو، بیٹا کہتا ہے میں نہیں مانتا) اولاد ہو تو سیدنا اسماعیل علیہ السلام جیسی ہو کہ جو رَب کا حکم آیا ہو جو حکم محمد عربی ﷺ نے دیا ہو اُس کو کر گزرے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں اولاد کو ہدایت کی ہے کہ تم ایسے کرو جیسے اسماعیل علیہ السلام نے اَبا کا حکم مانا ہے۔

سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی کمالِ تواضع:

سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ کیا کمال ہے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کا کہ انشاء اللہ کہا، یعنی میں دعویٰ نہیں کرتا، اگر اللہ نے چاہا تو میرا شمار بھی عظیم صبر کرنے والوں میں سے ہوگا، اس لئے کہ آدمی کوئی عظیم الشان کام کر رہا ہے، بڑے کام میں ہاتھ ڈال رہا ہے تو اللہ کی مدد کو شامل کرلے، اللہ کی مشیت اور ارادے کے بغیر کوئی بھی بھلے سے بھلا کام بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے ابتدا اِن شاء اللہ سے کی۔ اور پھر یہ کہا کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ صبر کروں گا بلکہ یوں کہا: مِنَ الصّٰبِرِیْنَ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے یعنی بھلائی کا کام اور اللہ کی منشاء پوری کرنے والی بہت بڑی جماعت ہے، اُن صابرین کا میں بھی ایک فرد ہوں۔ تکبر نہیں کر رہے، اکڑ نہیں کر رہے، نخوت نہیں ہے بلکہ تواضع اور عاجزی کا پیکر بن رہے ہیں کہ اے میرے ابا! آپ اس حکمِ الٰہی کو پورا کریں۔

بھائی! اللہ کی مدد نہ ہو تو آدمی صبر نہیں کرسکتا۔ اس لئے اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: مشکلات مانگو مت، آجائیں تو پھر اللہ سے صبر مانگو کہ کہیں قدم پھسل نہ جائے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فروتنی ظاہر کی، اپنی عاجزی ظاہر کی، تکبر کے طور پر نہیں کہا کہ میں تیار

ہوں۔ ہمیں سبق دے رہے ہیں کہ اللہ کے امر کے بارے میں ایک اللہ کو ساتھ لے لو اور دوسرا نہایت عاجزی کے ساتھ لبیک کہو۔ عاجزانہ انداز اختیار کرو، فخر اور مُباہات اللہ کو پسند نہیں۔ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ جن لوگوں میں تواضع ہے، اے نبی! آپ اُنہیں خوشخبری دیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا حوصلہ اور ہمت:

تفسیری روایات میں آتا ہے:

اَنَّهٗ قَالَ لِاَبِيْهِ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ يَا اَبَتِ اشْدُدْ رِبَاطِيْ حَتّٰى لَا اَضْطَرِبَ وَاكْفُفْ عَنِّيْ ثِيَابَكَ حَتّٰى لَا يَنْتَضِحَ عَلَيْهَا مِنْ دَمِيْ شَيْءٌ فَتَرَاهُ اُمِّيْ فَتَحْزَنُ وَاسْرِعْ مَرَّ السِّكِّيْنِ عَلٰى حَلْقِيْ فَيَكُوْنَ اَهْوَنَ لِلْمَوْتِ[۱]

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد محترم سے عرض کیا اے ابا جان! آپ مجھے اچھی طرح مضبوطی سے باندھ لیں تاکہ میں ہلنے نہ پاؤں اور مجھ سے اپنے کپڑے بچایئے تاکہ میرے خون کے چھینٹے آپ پر نہ پڑیں ورنہ میری والدہ اس کو دیکھ کر غمگین ہوگی اور آپ چھری تیزی سے میرے حلق پر چلایئے تاکہ موت میرے لئے آسان ہوجائے۔

تفسیر روح المعانی میں یہ بھی ہے:

فَاِذَا اَتَيْتَ اُمِّيْ فَاقْرَأْ عَلَيْهَا السَّلَامَ فَاَقْبَلَ عَلَيْهِ اِبْرَاهِيْمُ يُقَبِّلُهٗ وَكُلٌّ مِنْهُمَا يَبْكِيْ[۲]

آپ جب میری والدہ صاحبہ کے پاس تشریف لے جائیں تو ان کو سلام عرض کر دینا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کی (یہ گفتگو سُن کر) حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بوسہ لے رہے تھے اور دونوں باپ بیٹا رُو رہے تھے۔

رئیس المفسرین جامع المعقول والمنقول حضرت امام فخر الدین رازی محمد بن عمرؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

---

[۱] تفسیر روح المعانی، ج: ۱۲، ص: ۱۳۰

[۲] تفسیر روح المعانی، ج: ۱۲، ص: ۱۳۰

حُكِيَ فِيْ قِصَّةِ الذَّبِيْحِ اَنَّ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا اَرَادَ ذَبْحَهٗ قَالَ يَا بُنَيَّ خُذِ الْحَبْلَ وَالْمُدْيَةَ وَانْطَلِقْ بِنَا اِلَى الشِّعْبِ نَحْتَطِبْ فَلَمَّا تَوَسَّطَا شِعْبَ ثَبِيْرٍ اَخْبَرَهٗ بِمَا اُمِرَ بِهٖ فَقَالَ يَا اَبَتِ اشْدُدْ رِبَاطِيْ فِيْ كَيْلَا اَضْطَرِبَ وَاكْفُفْ عَنِّيْ ثِيَابَكَ لَا يَنْتَضِحُ عَلَيْهَا شَيْءٌ مِّنْ دَمِيْ فَتَرَاهُ اُمِّيْ فَتَحْزَنُ وَاسْتَحِدَّ شَفْرَتَكَ وَاسْرِعْ اِمْرَارَهَا عَلٰى حَلْقِيْ لِيَكُوْنَ اَهْوَنَ فَاِنَّ الْمَوْتَ شَدِيْدٌ وَاقْرِ اَعَلٰى اُمِّيْ سَلَامِيْ وَاِنْ رَاَيْتَ اَنْ تَرُدَّ قَمِيْصِيْ عَلٰى اُمِّيْ فَافْعَلْ فَاِنَّهٗ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ اَسْهَلَ لَهَا فَقَالَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ نِعْمَ الْعَوْنُ اَنْتَ يَا بُنَيَّ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْهِ يُقَبِّلُهٗ وَقَدْ رَبَطَهٗ وَهُمَا يَبْكِيَانِ ثُمَّ وَضَعَ السِّكِّيْنَ عَلٰى حَلْقِهٖ فَقَالَ كُبَّنِيْ عَلٰى وَجْهِيْ فَاِنَّكَ اِذَا نَظَرْتَ وَجْهِيْ رَحِمْتَنِيْ وَاَدْرَكَتْكَ رِقَّةٌ وَقَدْ تَحُوْلُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ اَمْرِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى فَفَعَلَ ثُمَّ وَضَعَ السِّكِّيْنَ عَلٰى قَفَاهُ فَانْقَلَبَتِ السِّكِّيْنُ وَنُوْدِيَ يَا اِبْرَاهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا۔[1]

ذبح کے واقعہ کی حکایت کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب (حضرت اسماعیل علیہ السلام کو) ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو فرمایا اے پیارے بیٹے! رسی اور چھری (وغیرہ) پکڑ لو! ساتھ لے لو اور چلیں ہمارے ساتھ گھاٹی کی طرف تاکہ ہم لکڑیاں چُن لائیں، جب دونوں باپ بیٹا ثبیر کی گھاٹی کے درمیان پہنچے تو اپنے بیٹے کو بتادیا جس بات کا حکم ان کے رب تعالیٰ نے ان کو دیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا اے ابا جان! مجھے رسی سے باندھ لیجئے تاکہ میں حرکت نہ کرسکوں اور آپ اپنے کپڑے مجھ سے بچایئے تاکہ خون آلود نہ ہوں کیونکہ اگر میری والدہ دیکھیں گی تو غمگین ہوں گی اور آپ اپنی چھری کو تیز کرلیں اور جلدی سے میرے حلق کی رگیں کاٹ دیں تاکہ روح نکلنے میں آسانی ہو، اس لئے کہ موت بڑی سخت چیز ہے اور میری والدہ صاحبہ کو میرا اسلام عرض کرنا اور اگر

---

[1] التفسیر الکبیر، ج:۹، ص:۳۵۰، ط: علوم اسلامیہ، لاہور

آپ میری قمیص کو میری والدہ کے پاس پہنچانا چاہیں تو ایسا کرلیں کیونکہ ہوسکتا ہے ان کے لئے کچھ آسانی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے! آپ میرے بہت اچھے معاون ثابت ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانے پر، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کا بوسہ لیا باندھے ہوئے ہی کا، جبکہ دونوں باپ بیٹا رو بھی رہے تھے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مبارک حلق پر چھری رکھ دی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ میرا چہرہ زمین کی طرف کر دیں، اس لئے کہ اگر آپ میرے چہرے کو دیکھیں گے تو آپ کو میرے اُوپر رحم آجائے گا اور آپ کے دِل میں رقت پیدا ہوجائے گی جو حکم کی تعمیل میں رکاوٹ پیدا کردے گی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح کرلیا پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری رکھ دی تو پس اچانک چھری اُلٹی واُوندھی ہوگئی اور آواز آئی کہ اے ابراہیم علیہ السلام آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی محبت پر حکمِ الٰہی کو مقدم رکھنا:

اب دیکھئے کہ یہ حکم اوّل تو اولاد کے بارے میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی فرزند اکلوتا اور فرزند بھی ناخلف نہیں بلکہ غلامِ حلیم، ایسے بچے کی قربانی کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا اتنا زیادہ مشکل نہیں مگر اپنے ہاتھ سے اپنی اولاد کو ذبح کرنا بڑا سخت اور مشکل کام ہے، مگر چونکہ حکم الٰہی تھا اس لئے آپ نے اپنے بیٹے کی محبت پر حکمِ الٰہی کو مقدم رکھتے ہوئے فرمانِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

نکتہ:

بعض عارفین نے لکھا ہے فطرۃً انسان کو اولاد سے محبت ہوتی ہے اور پھر جب اولاد بھی مطیع اور فرمانبردار ہو تو محبت اور زیادہ ہوتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے بہت محبت تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جو خُلّت اور محبت کا مقام اور مرتبہ عطا فرمانا تھا اس کا

تقاضا یہ تھا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دِل میں غیر کی ذرّہ برابر بھی محبت نہ ہو فَأُمِرَ بِذِبْحِ وَلَدِهٖ اِمْتِحَانًا وَّاخْتِبَارًا لَّهٗ تو اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لینے کیلئے انہیں اپنے راستے میں اپنی محبوب ترین چیز یعنی بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم دیا وَاِشْعَارًا لِلْمَلَائِكَةِ بِأَنَّهٗ خَلِيْلُ اللّٰهِ اور اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر یہ ظاہر فرمادیا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میرے خلیل ہیں لَا يَسَعُهٗ غَيْرِ الْحَقِّ انہیں حق کام کرنے کی ہی قدرت میسر ہوتی ہے۔

فَلَيْسَ الْمُبْتَغٰى مِنْهُ تَحْصِيْلَ الذِّبْحِ اِنَّمَا هُوَ اِخْلَاءُ السِّرِّ عَنْهُ وَتَرْكُ عَادَةِ الطَّبْعِ یعنی باری تعالیٰ کا مقصود حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرانا نہیں تھا بلکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دِل اور رگ وپے میں فطری طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جو محبت ہے اسے مغلوب کرنا تھا۔

چنانچہ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلادی۔ جب چھری کند ہوگئی تو اس وقت حکم الٰہی ہوا قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ [1]

''بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزاء دیا کرتے ہیں۔ اب ہم اس کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں''۔

چنانچہ اسی دن سے اونٹ، بھینس، گائے، مینڈھا، بکرا، وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ (بدلہ) میں مقرر کیا گیا ہے۔

خلیل اللہ علیہ السلام کے کارناموں میں سے جو چیزیں کسی خاص مقام کے ساتھ مخصوص تھیں وہ صرف حجاج پر لازم کی گئیں، جو اس مقام پر پہنچ کر انجام دیتے ہیں، جیسے منیٰ میں تینوں جمرات پر کنکریاں مارنا، صفا ومروہ کے درمیان دوڑنا اور سات چکر لگانا، اور جو چیزیں اس خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتیں ہر جگہ کی جاسکتی ہیں۔ جیسے جانور کی قربانی، اس کو تمام امت کے لئے حکمِ عام کے ساتھ واجب ولازم قرار دے دیا گیا اور خود

---

[1] الصفت پارہ: ۲۳

رسول اللہ ﷺ اور تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ علیہم اور پوری امت ہر خطے، ہر ملک اور ہر جگہ میں اس واجب کی تعمیل کرتے رہے ہیں، اور اس کو نہ صرف واجبات اسلامی میں سے ایک واجب قرار دیا گیا بلکہ شعائرِ اسلام میں داخل سمجھا گیا ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ [1] یعنی قربانی کے جانوروں کو ہم نے اللہ کی یادگار بنایا ہے، اللہ کی یادگار سے مراد اللہ کے دین کی یادگار ہے۔ ہاں یہ ظاہر ہے کہ جو قربانی اس مقام میں کی جائے جہاں سے اس کا آغاز ہوا یعنی منیٰ میں وہ زیادہ افضل ہے اور موجب ثواب و برکات ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے آخری حج میں سو اُونٹوں کی قربانی کی جن میں سے تریسٹھ اُونٹوں کی قربانی خود فرمائی، باقی کو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد فرمایا۔ یہ اتنی بڑی تعداد میں قربانی اسی فضیلت کی وجہ سے کی گئی ورنہ مدینہ طیبہ میں عام عادت دو جانوروں کو ذبح کرنے کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں دس سال قیام فرمایا اور ہر سال قربانی کرتے تھے۔

حضور ﷺ کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم کیوں دیا گیا؟

یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی شریعت تو تمام ملتوں اور ادیان (مذاہب) کو منسوخ کرنے والی ہے۔ پھر ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم کیوں فرمایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا حکم اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ملتِ ابراہیم ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ محمد ﷺ کی شریعت ہے اور ملتِ ابراہیمی بھی اس کا ایک لقب ہے اور یہ لقب اس لئے ہے کہ یہ دونوں ملتیں آپس میں اصولاً اور فروعاً متناسب ہیں (یعنی دونوں ملتوں کے بہت سے احکام ایک ہی طرح کے ہیں) اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ اِتَّبِعُوْا اِبْرَاهِيْمَ کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو بلکہ وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ فرمایا یعنی ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی اتباع کرو۔

الغرض حضور اکرم ﷺ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب ہے نسب کے اعتبار سے بھی اور شریعت کے اعتبار سے بھی۔ نسب کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ حضور ﷺ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد

---

[1] سورۃ الحج، پارہ: ۱۷

میں ہیں اور شریعت کے اعتبار سے اس لئے کہ حضور ﷺ کی شریعت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سے بہت ملتی جلتی ہے اصول میں بھی اور فروع میں بھی۔

اسی واسطے فرمایا:

وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا یعنی ملتِ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو۔

قربانی کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنّت کیوں فرمایا؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اُضحیۃ (یعنی قربانی) کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنّت فرمایا ہے حالانکہ جو عمل سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا وہ اور ہے اور (جانور کی) قربانی دوسرا عمل ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا عمل تو لڑکے کو ذبح کرنا ہے اور قربانی میں حیوان (جانور) کو ذبح کرنا ہوتا ہے، پھر قربانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنّت کیسے ہوئی؟ یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو قربانی میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو لڑکے کے ذبح کرنے میں ثواب ملا تھا، دونوں عملوں کی غایت کے اتحاد کی وجہ سے دونوں کو ایک عمل فرمایا، گو عمل علیحدہ علیحدہ ہیں، گویا یہ فرمایا کہ اے اُمّت محمدیہ ﷺ تم کو جانور کے ذبح کرنے میں وہی اَجر ملے گا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو لڑکا ذبح کرنے میں ملا تھا۔ دیکھئے! کس قدر قربانی کی فضیلت اس حدیث سے معلوم ہوئی۔[1]

ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے تو جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبہ کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر ان سے جو کم درجہ کے ہیں ان کو اسی درجہ کا انعام ملے گا۔ مثلاً وزراء اور ارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپڑاسیوں اور خدام کو کم، پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر نبی ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ وہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہئے۔ یعنی اگر یہ فعل لڑکے کے ذبح کرنے کا کوئی دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا

---

[1] ترغیب الاضحیہ ص ۱۲۵

جس قدر کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں بھی کوئی فعل اس فعل سے کم درجہ کا ہو وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر اس کے باوجود کہ ہمارا یہ عمل لڑکے کو ذبح کرنے سے بدرجہا کم ہے پھر بھی وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا۔ اللہ اکبر! کتنا بڑا انعام ہے اور اُمّتِ محمدیہ ﷺ پر حضور ﷺ کی برکت سے کیسا لطف وکرم ہے۔ قربانی کی یہ فضیلت تو ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ قربانی واجب بھی نہ ہو تو اس ثواب کو حاصل کرنے کے لئے وہ بھی نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے، بغیر کئے نہ رہے۔

ذبح کے وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جذبات:

جب منحر پر پہنچے (جہاں ذبح کرنا تھا) تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يَا اَبَتِ اشْدُدْ رِبَاطِيْ حَتّٰى لَا اَضْطَرِبَ وَاكْفُفْ عَنِّيْ ثِيَابَكَ حَتّٰى لَا يَنْتَضِحَ عَلَيْهَا مِنْ دَمِيْ شَيْءٌ فَيَنْقُصَ اَجْرِيْ وَتَرَاهُ اُمِّيْ فَتَحْزَنَ وَاسْتَحِدَّ شَفْرَتَكَ وَاسْرِعْ مَرَّ السِّكِّيْنِ عَلٰى حَلْقِيْ لِيَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَيَّ فَاِنَّ الْمَوْتَ شَدِيْدٌ وَاِذَا اَتَيْتَ اُمِّيْ فَاقْرَءْ عَلَيْهَا السَّلَامَ مِنِّيْ وَاِنْ رَاَيْتَ اَنْ تَرُدَّ قَمِيْصِيْ عَلٰى اُمِّيْ فَافْعَلْ فَاِنَّهٗ عَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ اَسْلٰى لَهَا.

اے میرے ابا جان! مجھے اچھی طرح سے باندھ دیجئے کیونکہ موت بہت سخت چیز ہے، چھری کو اچھی طرح تیز کر لینا، جب میرے حلق پر چلانا تو تیزی سے چلانا تاکہ اللہ کے امر میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ ابا جان! اپنے کپڑے بھی لہو سے بچانا، میرا کرتہ بھی اُتار لیں تاکہ آپ کے ثواب میں کمی نہ آجائے اور یہ کرتہ میری والدہ کو دے دینا تاکہ وہ سکون حاصل کریں۔

قَالَ اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ: نِعْمَ الْعَوْنُ اَنْتَ يَا بُنَيَّ عَلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَفَعَلَ اِبْرَاهِيْمُ مَا قَالَ لَهُ ابْنُهٗ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَيْهِ وَقَبَّلَهٗ وَرَبَطَهٗ وَهُوَ يَبْكِيْ ثُمَّ اِنَّهٗ وَضَعَ السِّكِّيْنَ عَلٰى حَلْقِهٖ فَلَمْ يَحُكَّ السِّكِّيْنُ. وَرُوِيَ اَنَّهٗ كَانَ يُمِرُّ الشَّفْرَةَ عَلٰى حَلْقِهٖ وَلَا يَقْطَعُ فَشَحَّذَهٗ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا بِالْحَجَرِ كُلَّ ذٰلِكَ

لَا یَقْطَعُ[۱]

اکلوتے بیٹے کی زبان سے یہ الفاظ سُن کر ایک باپ کے دل پر کیا گزر سکتی ہے؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام استقامت کے پہاڑ بن کر جواب یہ دیتے ہیں کہ بیٹے! تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لئے میرے کتنے اچھے مددگار ہو۔ یہ کہہ کر انہوں نے بیٹے کو بوسہ دیا، پُرنم آنکھوں سے انہیں باندھا اور چھری ان کی گردن پر چلانا شروع کی، لیکن چھری نے بحکمِ الٰہی کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس دوران سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دو یا تین مرتبہ چھری کو تیز بھی کیا مگر یہ تیز کرنا بے سود رہا۔

روایات میں آتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام فرمانے لگے، اے ابّا جان! آپ مجھے اچھی طرح باندھ دیجئے، چھری تیز کر لیں، موت بڑی سخت چیز ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ کہا اے ابا جان! اپنے کپڑوں پر خون نہ پڑنے دینا، خون کو دیکھ کر کہیں میری ماں کا غم بڑھ نہ جائے اور ایک روایت میں آیا ہے کہ میرا سفید کرتا اتار لو، شاید کفن کے کام آئے تو اس میں مجھے دفنا دینا۔

روح المعانی میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے پیار کیا، ماتھا چوما۔ دونوں باپ بیٹا رو پڑے اور پھر اُنہیں لِٹا دیا۔

ذبح کا منظر:

فَلَمَّآ اَسْلَمَا باپ بیٹا دونوں تیار ہو گئے، بیٹا ذبح ہونے کیلئے اور باپ ذبح کرنے کیلئے۔ اِسلام کہتے ہیں گردن جھکا دینا، یعنی اُن دونوں نے کہا کہ یارب! تیرے حکم کی تکمیل کیلئے ہم دونوں خود کو آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ قرآن میں ان دونوں حضرات کی اس موقع پر کیفیت بیان نہیں کی گئی کیونکہ زبان اُس کیفیت کو ادا نہیں کر سکتی۔

قرآن کریم کہتا ہے ''فَلَمَّآ اَسْلَمَا'' جب باپ بیٹا بالکل تیار ہو گئے، کپڑے اتر گئے، لٹا دیا گیا۔

---

[۱] تفسیر مظہری، ج:۶، ص:۱۰۲، ط: بیروت

ساری کائنات اور فرشتے لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔

میرے بھائیو! اپنے لختِ جگر کی گردن پر چھری رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، ہم اپنے آپ کو دیکھ لیں، بچے کو تھوڑا سا درد ہو جائے ساری رات باپ پریشان، بچے کو کوئی تھپڑ مار دے باپ سے برداشت نہیں ہوتا۔ بچے کو تکلیف ہو ماں ساری رات نہیں سوتی، میرا بیٹا گیا ہاتھ سے۔

ماں کی اولاد سے محبت کا ایک واقعہ:

نشتر ہسپتال میں ایک خاتون اپنے بیٹے کو لائی، اُس کی آنکھ میں شدید درد تھا، ڈاکٹر حضرات نے دیکھ کر کہا کہ آنکھ کے پیچھے پھوڑا ہے، اس کی آنکھ نکالنی پڑے گی، آپریشن کریں گے درد تو ختم ہو جائے گا لیکن ایک آنکھ ضائع ہو جائے گی۔

بیٹا نشتر میں، ماں رشتے دار کے گھر آ گئی نواں شہر کہ کل آپریشن ہوگا، وہ ماں ساری رات مصلے پر بیٹھ کر روتی رہی، اے میرے اللہ! میرا بیٹا کانا ہو جائے گا، اے میرے اللہ! ساری زندگی لوگ اُسے طعنہ دیں گے۔ گھر والوں نے کہا سو جا، اُس نے کہا میرے بیٹے کی آنکھ جا رہی ہے اور میں سو جاؤں۔

اللہ کی شان! ساری رات وہ روئی، صبح ہسپتال گئی تو کیا دیکھا کہ پھوڑا پھٹا پیپ نکلتی رہی، آپریشن کے وقت ڈاکٹروں نے کہا آپریشن کس لئے کر رہے ہو وہ پھوڑا تو پھٹ گیا ہے۔ اللہ نے شفا دے دی، ڈاکٹروں نے کہا اماں مبارک ہو، ماں خوشی سے نیچے گر پڑی، کہ اللہ نے بغیر آنکھ ضائع ہوئے میرے بیٹے کو شفا دے دی۔

میرے بھائیو! بیٹا ہے کوئی بکری نہیں ہے، آپ اپنے بیٹے کو لٹانا برداشت کریں گے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو دیکھو کیسے اپنے بیٹے کو لٹایا ہوا ہے، اللہ نے آگے کا منظر بیان نہیں کیا کہ باپ بیٹے پر کیا بن رہی تھی، زمین و آسمان رو رہے تھے، اے ابراہیم! تیری قربانیاں پہلے بھی بڑی ہیں لیکن اتنی بڑی قربانی اپنے لختِ جگر کو ذبح کرنا، کیا خیالات تھے باپ بیٹے کے قرآن نے ذکر نہیں کیا اِس لئے کہ وہ الفاظ میں آ ہی نہیں سکتے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے روئیں روئیں کی کیا کیفیت ہوگی، سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے روئیں روئیں کی کیا کیفیت ہوگی قرآن وہ الفاظ نہیں بیان کر رہا، وہ ہموم وغموم، وہ کیفیت الفاظ میں ضبط

نہیں ہوسکتی۔

کیا کیفیت ہوگی؟ کیا منظر ہوگا؟ عجیب منظر کہ ملائکہ میں بھی کہرام مچ گیا۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ، جبین پیشانی کی دونوں اطراف کو کہتے ہیں بعض مفسرین نے جبین کے معنی پہلو کے بھی کئے جبکہ بعضوں نے جبین کے معنی گدی کے کئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کا مطلب یہ منقول ہے کہ انہیں اس طرح کروٹ پر لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک کنارہ زمین سے چھونے لگا[۱]۔

لغت کے اعتبار سے یہ تفسیر راجح ہے، اس لئے کہ جَبِيْنٌ عربی زبان میں پیشانی کی دونوں کروٹوں کو کہتے ہیں اور پیشانی کا درمیانی حصہ جَبْهَةٌ کہلاتا ہے۔ اسی لئے حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اس کا ترجمہ کروٹ پر لٹانے سے کیا۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

صَرَعَهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ لِيَذْبَحَهٗ مِنْ قِفَاهُ وَلَا يُشَاهِدَ وَجْهَهٗ عِنْدَ ذَبْحِهٖ لِيَكُوْنَ اَهْوَنَ عَلَيْهِ. قَالَ اِبْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَسَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَالضَّحَّاكُ وَقَتَادَةُ، وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ: اَكَبَّهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ[۲]

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اُنہیں پہلو کے بل لٹا کر باندھ دیا اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بیٹے کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بسم اللہ پڑھی۔ جب اسماعیل علیہ السلام کو لٹایا گیا تو انہوں نے پڑھا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اس منظر کو دیکھ کر پڑھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلاتے ہوئے پڑھا: اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

تکبیراتِ تشریق:

یہ وہ کلمات ہیں جو ذبیح اللہ (اسماعیل علیہ السلام)، جبرائیل علیہ السلام اور موحدِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ

---

[۱] مظہری

[۲] تفسیر ابن کثیر: ج۵، ص۳۵۲

السلام نے ذبح کے وقت میں پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کلمات اتنے پسند آئے کہ اللہ نے اُمتِ محمدیہ کے ہر مسلمان مرد وعورت پر لازم قرار دیا کہ تم ان مبارک کلمات کو کہو جو اِن تین عظیم شخصیات نے ادا کئے۔ لہٰذا ۹ ذی الحجہ کی صبح سے ۱۳ ذی الحجہ کی عصر تک ہر مسلمان مرد وعورت کیلئے ہر فرض نماز کے بعد یہ تکبیریں پڑھنا ضروری ہیں۔ خواتین آہستہ آواز سے پڑھیں جبکہ مردوں کیلئے اُونچی آواز سے پڑھنے کا حکم ہے۔

یہ کلمات ادا کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چھری چلائی، مگر چھری چل نہیں رہی۔ اس پر بعض مفسرین نے لکھا ہے حَالَ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ صَفِيْحَةٌ مِنْ نُحَاسٍ [۱] کہ اللہ کے امر سے اسماعیل علیہ السلام کے گلے اور چھری کے درمیان پیتل کا ٹکڑا حائل ہوگیا، جبکہ بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ ایسا کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ کائنات کا ذرہ ذرہ تو اُس مالک کے قبضہ قدرت میں ہے، اللہ کا چھری کو براہِ راست حکم تھا کہ خبردار! اسماعیل کے چمڑے کا ایک ذرہ یا بال بھی نہیں کاٹنا۔ میں رب ہو کے حکم دے رہا ہوں، کوئی چھری کام نہیں کرے گی، کائنات کا ذرہ ذرہ امرِ الٰہی کا پابند ہے، باپ ذبح کرنا چاہتا ہے اور بیٹا ذبح ہونا چاہتا ہے، نیچے تیار پڑا ہے، میرا چمڑا کٹے، میری رگ کٹے، میرا لہو بہے، اللہ کے نام پر قربان ہو جاؤں۔

جذبہ فداکاری:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پوری طاقت صرف کر رہے ہیں مگر چھری نہیں چل رہی، حالانکہ ایک نبی میں چار ہزار آدمیوں کے برابر طاقت ہوتی ہے۔ ہماری گردن ہے ہی کتنی بڑی؟ یہ تو چھوٹی سی نرم ونازک ہے، چھری خلیل کے ہاتھ میں ہے، چمڑا باریک ہے، بچہ نحیف ہے، پھول کی پتیوں سے زیادہ نازک ہے، ایسے بچے پر چھری چلا رہے ہیں۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے چھری نہ چلنے پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا کہ شاید آپ ایک باپ کی حیثیت سے محبت کی وجہ سے ایسا کرنے سے کترا رہے ہیں تو آپ مجھے الٹا کر دیں تاکہ اللہ کا اَمر پورا ہو سکے۔

يَاأَبَتِ كُبَّنِيْ عَلٰى جَبِيْنِيْ فَإِنَّكَ إِذَا نَظَرْتَ فِيْ وَجْهِيْ رَحِمْتَنِيْ وَأَدْرَكَتْكَ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج ۵، ص ۳۵۳

رِقَّةٌ تَحُوْلُ بَيْنَكَ وَبَيْنَ اَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَاَنَا لَا اَنْظُرُ اِلَى الشَّفْرَةِ فَاَجْزَعُ، فَفَعَلَ اِبْرَاهِيْمُ ثُمَّ وَضَعَ الشَّفْرَةَ عَلٰى قِفَاهُ فَانْقَلَبَتِ السِّكِّيْنُ[1]

اہل روایت نے بیان کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت کہا: ابا! مجھے پیٹ کے بل کردو۔ آپ کی نظر میرے چہرے پر پڑے گی تو آپ کو پیار آجائے گا اور آپ کے دل میں رقت پیدا ہوجائے گی جو حکم کی تعمیل میں رکاوٹ پیدا کردے گی اور چھری پر میری نظر پڑے گی تو بیتابی اور بیقراری میرے اندر پیدا ہو جائے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور جب گردن پر چھری رکھی تو چھری (کی دھار) لوٹ گئی۔

کامیابی کا اعلان:

جب یہ عمل ہورہا تھا تو اُوپر سے آواز آئی: يٰٓاِبْرَاهِيْمُ! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اے ابراہیم! تو نے خواب میں اتنا ہی دیکھا تھا کہ میں ذبح کررہا ہوں، یہ تو نہیں دیکھا تھا کہ میں ذبح کرچکا۔ اے خلیل! تو نے خواب سچا کردیا، ہمارے امر کو پورا کردیا۔ اے ابراہیم! ہم نے بڑے بڑے امتحانات آپ سے لئے، یہ بھی ایک بڑا کٹھن امتحان تھا کہ وہ ہونہار بیٹا جسے اللہ نے آپ کی بڑی اُمنگوں اور آرزوؤں پر عطا کیا تھا وہ جب جوانی کے قریب پہنچا اور پھر اللہ کے اَمر سے تم دونوں (باپ بیٹا) قربانی کیلئے تیار ہوگئے تو جو خواب آپ نے دیکھا تھا اُسے سچا کرکے دکھادیا۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ محسنین اور مخلصین کو ہم ایسے ہی بدلہ دیتے ہیں، آپ کو بیٹا ذبح کرنے کا اَجر مل چکا، آپ دونوں باپ بیٹا سرخرو ہوئے اور اَجر کے مستحق قرار پائے۔ اللہ کے اَمر سے آپ نے جو خواب پورا کیا تو اسماعیل (علیہ السلام) ذبیح اللہ بن چکے۔

اے ابراہیم! آپ قربانی کی ساری لائنوں میں کامیاب ہیں، آپ محسنین کے امام ہیں، اے ابراہیم! ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد نبوت تیرے خاندان میں چلائیں گے اور کسی خاندان سے میں نبی نہیں بناؤں گا۔

---

[1] تفسیر البغوی: ج ۴، ص ۳۴

فائدہ:

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ (اس وقت ہم نے ان کو آواز دی: اے ابراہیم!)

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے: اس جملہ میں واؤ زائد ہے اور یہ کلام **فَلَمَّآ اَسْلَمَا** کا جواب (جزاء) ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے: **لَمَّآ اَسْلَمَا** کی جزاء محذوف ہے، کلام محذوف اس طرح تھا کہ جو کچھ واقع ہونا تھا وہ ہو گیا تو دونوں کی خوشی قابل بیان ہوئی۔ کوئی حالت یا مقامی وضاحت اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ آئی ہوئی مصیبت کو اللہ نے دور کر دیا اور باپ بیٹے کو وہ توفیق عنایت کی جو کسی اور کو عنایت نہیں کی۔ سارے جہان پر ان کو برتری عطا فرمائی اور ثوابِ آخرت جو ان کے لئے مقرر فرمایا اس کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔ ان تمام نعمتوں پر دونوں نے اپنے ربّ کا شکر ادا کیا۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا (تم نے خواب کو سچ کر دکھایا) یعنی تمہارے اختیار میں جو کچھ تھا، وہ تم نے پورا کر دیا۔ کسی کام پر مامور کرنے کا مقصد صرف آزمائش اور اس امر کا امتحان ہے کہ بقدر اختیار بندہ حکم کی تعمیل کرتا ہے یا نہیں، امر کی اس کے سوا کوئی غرض نہیں ہوتی۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب صرف یہ دیکھا تھا کہ میں بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، خون بہاتے نہیں دیکھا تھا۔ پس جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیداری میں اس کو پورا کر دیا۔ اس مطلب پر تصدیقِ رؤیا کا حقیقی مفہوم مراد ہوگا اور اوّل مطلب پر مجازی معنی مراد ہوگا۔

سوال: اگر بیٹے کو ذبح کر دینا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب نہ تھا، بلکہ فعلِ ذبح کا ارتکاب اور اسبابِ ذبح کی فراہمی ان پر واجب تھی تو پھر **فَدَيْنٰهُ** (ہم نے ان کے بدلہ میں دے دیا) کا کیا معنی؟ فدیہ تو واجب کے عوض ہوتا ہے؟

جواب: فعلِ ذبح کا ارتکاب اصل واجب تھا، لیکن فعل ذبح کرنے کے بعد ذبح ہو جانا عام طور پر لازم ہوتا ہے، اس لئے ذبح کر ڈالنے کا وجوب دلالتِ الزامی کے طور پر ہو گیا، پس دلالتِ التزامی کے طور پر جو امر واجب تھا، اس کی تکمیل نہ ہونے پر اس کے بدل کو فدیہ کہہ دیا گیا۔

نوٹ: آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ واجب التزامی کے ادا پر قدرت حاصل ہونے سے پہلے ہی حکم کو

منسوخ کر دیا گیا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی قربانی کر ڈالی تھی:

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دو فعل صادر ہوئے ایک بیٹے کا ذبح دوسرے دنبہ کا ذبح۔ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دو فعل کہاں ہوئے کیونکہ یہاں تو فقط دنبہ ذبح ہوا تھا نہ کہ بیٹا، یہ شبہ ایک شرعی قاعدے کے سننے کے بعد بالکل رفع ہو جائے گا وہ یہ کہ شریعت میں ثواب کا دارومدار فعلِ اختیاری کے پختہ ارادہ پر ہے، خواہ وہ فعل کسی مانع یا شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے نہ پایا جائے۔ ایسی صورت میں چونکہ اس شخص کی طرف سے اختیارِ فعل کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا لہٰذا ثواب کا مستحق ضرور ہوگا۔

مثلاً اگر کوئی نماز کا پختہ ارادہ کر کے کھڑا ہوا اسی حالت میں زلزلہ سے چھت گر گئی تو نماز کا اَجر اس کو مل گیا۔ پس اسی طرح یہاں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو جب بیٹا ذبح کرنے کا حکم ہوا تو انہوں نے فوراً پختہ ارادہ کر لیا اور اس فعل ذبح کو کر بھی ڈالا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ اور فعل دونوں وقوع میں آئے کیونکہ ذبح کے معنی ہیں اِمْرَارُ الْسِّكِّيْنِ عَلَى الْحُلْقُوْمِ یعنی چھری کا گلے پر پھیرنا اور یہ فعل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پورے طریقہ سے صادر ہوا۔ پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ذبح بھی کر ڈالا اور مستحقِ ثواب بھی ہوئے، رہا اس ذبح کے بعد دنبہ کا ذبح بھی ہو جانا تو یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل نہیں بلکہ فعل کا اثر (اور اس کا نتیجہ) ہے۔

جنتی دُنبہ:

روایت میں آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک آواز سنی تو نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اوپر جبرائیل علیہ السلام نظر آئے جن کے ساتھ ایک سینگوں والا مینڈھا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا: یہ آپ کے بیٹے کا فدیہ ہے، اس کی قربانی کر دیجئے۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے تکبیر کہی اور مینڈھے نے بھی تکبیر کہی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے نے تکبیر کہی، پھر منیٰ کی قربان گاہ میں جا کر مینڈھے کو ذبح کر دیا۔ فدیہ پیش کرنے والے تو حقیقت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، لیکن قربانی کا جانور اللہ کا عطا کردہ تھا اور اللہ نے ہی جانور کو بجائے اسماعیل کے ذبح کرنے کا حکم دیا

تھا، اس لئے فَدَيْنٰهُ میں فعل فدیہ کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی۔

عَظِيْمٍ سے مراد ہے عظیم الجثہ، موٹا۔ یا ثواب کے لحاظ سے عظیم المرتبت۔ حسین بن فضلؒ نے کہا: (عظیم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ) وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا: اس کو عظیم ہونے کا حق تھا۔ مجاہدؒ نے کہا: اس کو عظیم اس لئے فرمایا کہ اس کو قبول فرمالیا گیا۔

بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ وہ مینڈھا جنّت کے اندر چالیس خریف (یعنی موسم بہار) رہا تھا (یعنی چالیس بہار کے موسموں میں جنّت کا سبزہ چر کر موٹا ہوا تھا)۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایات میں یہی آیا ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ جس مینڈھے کی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی پیش کی تھی وہ وہی مینڈھا تھا جس کی آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیل رضی اللہ عنہ نے قربانی پیش کی تھی۔

نکتہ:

اسکۃ الحکم میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس مینڈھے کے فدیہ کو ذبح عظیم کہا ہے حالانکہ قربانی میں اُونٹ بنسبت مینڈھے کے اعظم ہے اس لئے کہ اس میں سات آدمی حصہ دار ہو سکتے ہیں اور مینڈھے میں صرف ایک، اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ نفسِ انسانی جو اپنے آپ کو اللہ کی راہ میں فنا کرنے کے لئے لحظہ کیلئے بھی تامل نہ کرے اس میں اور کبش میں شدید مناسبت پائی جاتی ہے اس لئے کہ اُس کبش کی تخلیق کا مقصد اصلی ہی یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ذبح ہونے کیلئے سپرد کر دے، اسی مناسبت کی وجہ سے اسے ذبح عظیم کہا گیا ہے۔

پھر یہ کبش آخرت کے دن موت کی صورت میں پل صراط پر ذبح کیا جائے گا جیسا کہ فناء کلی اور تَسْلِیم وانقیاد کا اعلیٰ مرتبہ بھی یہی ہے۔ اس لئے کہ معنوی فضیلت کا درجہ صوری فضیلت سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ فضل صوری تو فضل معنوی کے تابع ہے اور مقصود فضل معنوی ہے جو کبش میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اس

کے مقابلے میں بدنہ (اُونٹ) کی تخلیق کا مقصد اوّلی ہی کچھ اور ہے اس سے مقصود تو اس پر سواری کرنا ہے اور اسے بار برداری کیلئے استعمال کرنا ہے۔

نیز: اس کبش کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ جنتی کبش تھا جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت سے واضح معلوم ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں:

یہ وہ کبش (مینڈھا) تھا جسے ھابیل علیہ السلام نے قربانی کیلئے پیش کیا تھا اللہ پاک نے ان کی قربانی قبول فرمائی تھی اور اسے جنّت میں اُٹھالیا تھا یہ جنّت میں چرتا رہا اور پھر اسے اسماعیل علیہ السلام کے فدیے میں بھیجا گیا، ھابیل علیہ السلام کے زمانے میں آسمان سے جو آگ اُتری تھی اس نے اسے جلایا نہیں تھا بَلْ رَّفَعَهُ اِلَى السَّمَاءِ بلکہ آسمان کی طرف اُٹھالیا تھا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آگ نے اسے کھالیا تھا لیکن احتمال ہے کہ اس کی روح کو اور جسم دیا گیا ہو اور وہ باقی رہا ہو پھر ابراہیم علیہ السلام نے اسے ذبح کیا ہو، اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ: وَهُوَ الْكَبْشُ الَّذِيْ قَرَّبَهُ اِبْنُ آدَمَ فَتُقُبِّلَ مِنْهُ۔[1]

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ اللہ کے حکم سے جبرائیل علیہ السلام ایک عظیم ذبیحہ (ایک دُنبہ) لے کر آئے اور اسماعیل علیہ السلام کو ہٹا کر جنت کا چرا ہوا دُنبہ نیچے لٹا دیا

اس آیت سے حنفیہ نے استدلال کیا ہے کہ جس شخص نے اپنے بیٹے کے قربان کرنے کی نذر مانی ہو، اس پر ایک بکری کی قربانی لازم ہے۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ اللہ اکبر پڑھ کر اسے ذبح کردیں۔ وہ دُنبہ جو جنت سے آیا اور پھر اللہ کے حکم سے آیا تو یہ قربانی کوئی عام قربانی تو نہیں، یہ تو ذبح عظیم ہے، عطیہ عظیمہ ہے۔ چالیس سال جنت میں چرتا رہا، سینگوں والا حسین دُنبہ اللہ نے بھیجا۔ موٹی موٹی آنکھوں والا اَقْرَن،

---

[1] البدایہ: ج ۱، ص ۱۰۴

اَعْيَنُ اس دُنبہ کو ذبح کر دیا۔ اللہ نے فرمایا وہ ہم نے اُس کے بدلے میں دے دیا۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ہم نیکوکاروں کو یہی بدلہ دیتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام وحضرت اسماعیل علیہ السلام کی نیکی کو تکلیف ومصیبت دور کرنے کا سبب قرار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے جزاء دی، ثوابِ عظیم ذبح کا عطا کیا اور ذبح اسماعیل سے درگزر کی (اسماعیل کو بچالیا) اور سارے جہان پر ان کو برتری عنایت کی، اس طرح (عام طور پر) ہم تمام نیکی کرنے والوں کو جزاء دیتے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ تاکید در تاکید یہ بڑا امتحان تھا۔ بڑا بھاری امتحان تھا[1] لیکن ابراہیم علیہ السلام کامیاب ہو گئے، یا (بلاء کا معنی ہے) تکلیف اور کھلی ہوئی سختی تھی، اس سے زیادہ سخت حکم کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک بلاء سے مراد ہے نعمت، یعنی بیٹے کی جگہ مینڈھے کو ذبح کر دینے کا حکم اللہ کا بڑا انعام تھا۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ تیرا تذکرہ قیامت تک رہے گا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ میری تاریخ کو، میری زندگی کو روشنی کا مینارہ بنا دینا تا کہ نیک لوگ اس زندگی کو دیکھیں۔ رُبُّ العالمین کی طرف سے اعلان ہوا کہ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ رہتی دُنیا تک کائنات کے سارے انسانوں کی طرف سے عرش وفرش سے، درختوں اور بحر وبر سے، اے ابراہیم علیہ السلام تیرے اوپر سلامتی رہے گی۔ تو نے کیسے اللہ کے نام پر قربانی دی۔

فائدہ جلیلہ (ماخوذ از روح البیان):

روایات میں ہے کہ پیارے نبی ﷺ نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ کو آسمان سے اُترنے میں کبھی مشقت اور تھکان بھی ہوئی ہے تو جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا جی ہاں: چار موقعوں پر مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ یاد رہے یہ مشقت کنایہ ہے کمال سرعت سے اس لئے کہ فرشتے تعب وتھکان سے پاک ہیں۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ: قصۃ الذبیح علیہ السلام: ج ۱ ص ۱۰۴

۱۔ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو میں اس وقت اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَدْرِکْ عَبْدِیْ میرے پیارے بندے کے پاس پہنچو، فَاَدْرَکْتُہٗ تو میں فوراً ان کے پاس حاضر ہوا اور کہا هَلْ لَّکَ مِنْ حَاجَةٍ آپ کی کوئی حاجت ہو تو پوری کرنے کیلئے حاضر ہوں تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا مجھے آپ کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کو بھیجنے والا میری حالت سے اور حاجت سے خوب واقف ہے۔

۲۔ جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کے حلق پر چھری چلانے کیلئے رکھی تو میں عرش کے نیچے تھا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَدْرِکْ عَبْدِیْ میرے بندے کے پاس پہنچو فَاَدْرَکْتُہٗ طَرْفَةَ عَیْنٍ تو میں پلک جھپکنے سے پہلے وہاں پہنچا فَقَلَبْتُ السِّکِّیْنَ اور میں نے چھری کی دھار کو پلٹ دیا۔

۳۔ جس وقت یوسف علیہ السلام کو ان کے بے دید بھائیوں نے کنویں میں ڈالا تو اس وقت بھی مجھے آسمان سے اُترتے ہوئے مشقت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندے کی فریاد رسی کیلئے جلدی پہنچو فَاَدْرَکْتُہٗ قَبْلَ اَنْ وَصَلَ اِلٰی قَعْرِ الْجُبِّ میں ان کے کنویں کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے ان کے پاس پہنچا اور کنویں کی تہہ سے ایک بڑا پتھر نکال کر اس پر یوسف علیہ السلام کو بٹھا دیا۔

۴۔ جس وقت کفار نے آپ کو زخمی کیا تھا یعنی اُحد کے دن اور دانت مبارک شہید کر دیئے تھے اس دن بھی مجھے آسمان سے اُترتے ہوئے بڑی مشقت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جلدی پہنچو اور میرے حبیب کا خون زمین پر نہ گرنے دینا اگر ایک قطرہ بھی زمین پر گر گیا تو قیامت تک زمین نہ کوئی گھاس اُگائے گی اور نہ کوئی درخت تو میں فوراً آیا اور فَقَبَضْتُ دَمَکَ بِکَفِّیْ ثُمَّ رَمَیْتُہٗ فِی الْهَوَاءِ آپ کا مبارک خون اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے ہوا میں اُڑا دیا۔

اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم:

وَلَوْ لَمْ یَفْدِ اللّٰہُ بِالْکَبْشِ لَصَارَ ذَبْحُ النَّاسِ وَاحِدًا مِّنْ اَبْنَائِہِمْ سُنَّةً اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ اگر اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ کبش (مینڈھے) کے ذریعے اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ نہ دیتے تو قیامت تک لوگ اپنی اولادوں کو ذبح کرتے رہتے۔

نیک نیتی پر ثواب:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہت بڑی قربانی دی، اپنے وطن میں آگ میں ڈالے گئے اسے خوشی سے منظور کرلیا، اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حفاظت فرمائی اور صحیح سالم آگ سے باہر آگئے، پھر جب ہجرت فرما کر شام میں آگئے اور مکہ معظمہ میں اپنی ایک بیوی اور ایک بچے کو آباد کردیا، پھر جب اس کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو اسے بھی ذبح کردیا (یعنی اپنی کوشش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی) اللہ تعالیٰ نے یہاں بھی مدد فرمائی اور ان کے بیٹے کو بچالیا اور اس کی جگہ ایک مینڈھا بھیج دیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو بھی کوئی شخص سچی نیت سے اور سچے دِل سے کسی عمل کا ارادہ کرے اور پھر وہ کام نہ ہوسکے تب بھی اس کا ثواب مل جاتا ہے۔

حدیث شریف میں وارد ہے:

جو شخص حج، عمرہ یا جہاد کے لئے اپنے گھر سے نکل گیا پھر راستے میں مَر گیا تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جل شانہ مجاہد، حاجی اور عمرہ کرنے والوں کا ثواب لکھ دے گا۔[۱]

قرآن شریف میں وارد ہے:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ [۲] اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کے لئے نکل جائے پھر اس کو موت آجائے تو اللہ کے ذمہ اس کا ثواب ثابت ہوگیا۔

حدیث شریف میں یہ بھی وارد ہے:

جو شخص تہجد کی نماز پڑھنے کی نیت سے سو گیا اور پھر آنکھ نہ کھل سکی تو اس کو تہجد پڑھنے کا ثواب ملے گا۔[۳]

کثرتِ اولاد کی بشارت:

ایک فرشتے نے اعلان کیا: اے ابراہیم! اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ آپ نے ساری زندگی ہر ہر قدم پر

---

[۱] مشکوۃ المصابیح، ص: ۲۲۳

[۲] سورۃ النساء

[۳] الترغیب والترہیب، ج:۱، ص:۴۰۹

مشکلات کے باوجود اپنے رَب کے ہر حکم کو پورا کیا مگر یہ قربانی سب سے کٹھن قربانی ہے جو آپ نے دی اور اللہ نے آپ کی یہ قربانی قبول فرمالی اور یہ فیصلہ فرمایا: اللہ آپ کی ذریت کو ساحلِ سمندر کے ذرات کی طرح دُنیا میں بکھیریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بارہ بیٹے دیئے اور انہیں میں سے عرب کے خاندان آئے اور انہیں میں کائنات کے امام سید الاولین والآخرین حضرت محمد ﷺ تشریف لائے۔

یَاابْنَ الذَّبِیْحَیْنِ:

ایک حدیث میں ہے:

اِنَّ رَجُلًا قَالَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاابْنَ الذَّبِيْحَيْنِ فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ایک آدمی نے آپ علیہ السلام کو کہا اے **ذبیحین** کے بیٹے! اس پر آپ ﷺ مسکرا دیئے[۱]

آپ علیہ السلام نے فرمایا: میرا باپ عبداللہ بھی ذبیح اللہ، میرا بڑا باپ اسماعیل بھی ذبیح اللہ، لہٰذا میں **ذبیحین** کا بیٹا ہوں (حضرت عبداللہؓ کیسے ذبیح اللہ ہیں اِسے بعد میں عرض کریں گے)۔

سنّتِ ابراہیم علیہ السلام کا مصداق:

اور اگر لفظ پر نظر کی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت نہیں کیونکہ سنّت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے۔ پس سنّتِ ابراہیم علیہ السلام کا مصداق وہ فعل ہونا چاہئے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلامی نفس ہے یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کو فنا کہتے ہیں یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا: ''اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' اور ذبحِ ولد اس کی صورت تھی، نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ ان کو قتلِ نفس کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتلِ نفس سے بھی اشد اور سخت ہے، چنانچہ ہر

---

[۱] تفسیر ابن کثیر: ج ۵، ص ۳۵۷۔ البدایہ: ج ۱، ص ۱۰۵

صاحبِ حس سمجھتا ہے خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کُلفت سے سہل ہوتی ہے۔ اولاد کی حفاظت کے لئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے اور ذبحِ ولد عمر بھر کا سانحہ ہے۔

چند اہم گزارشات:

میرے بھائیو! قربانی کا دن عظیم دن ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ یہ تمہاری جان کا بدلہ ہے، شوق سے اپنی قربانیاں پیش کرنا، یقین جانیں پورا جسم گناہوں سے پاک ہوجائے گا، ایک ارب خرچ کردیں وہ اجر نہیں ہے جو ان دنوں میں خون بہانے کا ہے۔ لہو کے قطرے زمین پر جانے سے پہلے انسان کی بخشش ہوجائے گی۔

میرے دوستو! یہ ابراہیمی یادیں ہیں۔ ہم نے جذبہ یہ بنانا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبق یہ دے رہے ہیں کہ اس قربانی کے ساتھ اپنے اندر پوری زندگی میں ابراہیمی زندگی لے آؤ، اُن کی نقل پر چلو۔ ہاجرہؓ کی راہ پر آئیں۔ بیٹے اسماعیل کی راہ پر آئیں۔ ہم سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی راہ پر آئیں۔ اُس راستے پر چلو۔ اس راستے کے قدم قدم پر اللہ کی رضا موجود ہے۔ صدق اور صفاء کا پیکر بنو، قربانیوں پر آؤ۔ اپنے آپ کو گندگیوں سے صاف کرو۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پیش کرو۔ قربانی کی ہر لائن میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کرو۔

میرے بھائیو! اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ توبہ کے ساتھ یہ قربانی کریں ''**اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ**''۔ آج کے بعد میں ہر چھوٹے بڑے گناہ سے توبہ کررہا ہوں، ہر خواہش سے توبہ کررہا ہوں کہ میں اپنی خواہش کی زندگی پر نہیں چلونگا، کیونکہ یہ قربانی اللہ کی طرف سے عطیہ ہے، مالک کا انعامِ عظیم ہے، بابرکت گوشت ہے اور عظیم قربانی ہے۔ اللہ کا اَمر ہے، اللہ کے خلیل (ابراہیم علیہ السلام) اور اللہ کے حبیب ﷺ جیسے چلے، میں ویسے زندگی گزاروں گا۔ ایسے ہی جذبات کے ساتھ قربانی کرنا ہے۔

کوشش ہو کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ جانور ہو۔ اگر خود ذبح کیا جائے تو سب سے افضل ہے۔ قربانی کے جانور کی کھال اُتارنے میں شریک ہونا، خود گوشت بنانا سعادتِ عظمیٰ ہے، اس لئے قربانی والے دِن یہ عطیہ اور

قربانی پیش کرنا سب سے اُونچا عمل ہے۔ ربُّ العالمین ہمیں اپنی بارگاہ میں زیادہ پیسے والے، زیادہ عمدہ جانور، گھٹیا کے بجائے بڑھیا جانور اور ہر اعتبار سے بے عیب جانور قربان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ایسا جانور جس کا عیب بینائی، پاؤں یا کہیں اور صاف نظر آ رہا ہے اُسے اللہ کے نام پر پیش نہ کرو۔ اللہ کے نام پر پیاری اور عمدہ چیز پیش کرنا چاہیے۔ پھر ذبح کرتے ہوئے اللہ پاک کے سامنے دُعا مانگنی چاہیے کہ اے اللہ! جیسے آپ نے اپنے خلیل (ابراہیم علیہ السلام) اور اپنے حبیب ﷺ کی قربانی قبول کی، مجھ گناہگار کی قربانی بھی ایسے ہی قبول فرما۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات (مشرق و مغرب، شمال وجنوب)، سارے فرشتے اور سارے مسلمانوں کی طرف سے جو اس دنیا سے جا چکے اور جو آئیں گے، ساری کائنات کے ذرے ذرے کی طرف سے اللہ کے حبیب سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر سلام ہو اور اللہ پاک کے پیارے بندے حضرت اسماعیل (ذبیح اللہ) علیہ السلام پر سلام ہو اور اللہ کے حبیب محمد ﷺ پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اُنہیں کی راہ پر چلائے۔ آمین

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران:۹۶)

عظمتِ بیت اللہ الکریم

عظمتِ بیت اللہِ الکریم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَسَنَدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، اَرْسَلَهُ اللّٰهُ كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا، وَدَاعِيًا اِلَيْهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ، فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرَاهِيْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا[۱]

اوّلِ عالم:

بزرگانِ محترم! مکۃ المکرمۃ اوّلِ عالَم بھی ہے، مرکزِ عالَم بھی ہے، وسطِ عالَم بھی ہے اور اصلِ عالَم بھی ہے۔ میں نے چار الفاظ مکہ مکرمہ کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اوّلِ عالم، اصلِ عالم، مرکزِ عالم اور وسطِ عالم۔ یعنی سب سے پہلا مقام دین میں یہی ہے اور ہم سب کی اصل یہی ہے اور اس عالمِ شاہد کے بیچوں بیچ بھی یہی ہے اور مرکزِ عالَم بھی یہی ہے۔ یہ چار چیزیں ہیں، اس میں بعض امور تو نصِ قطعی سے ثابت ہیں۔ یعنی قرآن کریم نے خود تصریح فرمائی ہے اور بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہیں۔ یعنی اس بارے میں یا تو حدیث مرفوع ہے ہی نہیں یا ہمارے علم میں نہیں، لیکن آثارِ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بکثرت ملتے ہیں، جن سے یہ چاروں دعوے ثابت ہوتے ہیں۔

---

[۱] آل عمران: ۹۶، ۹۷

قرآن حکیم نے تو ارشاد فرمایا:

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ [۱]

اللہ ﷻ کا سب سے پہلا گھر جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے وضع کیا وہ بکہ میں ہے۔

خواہ بکہ کے معنی (مکمل شہر) مکہ کے ہوں یا بکہ کے معنی خاص اس موضع کے ہوں جس میں بیت اللہ الکریم واقع ہے اور اس کے اِردگرد کو مکہ کہتے ہیں۔ یہ اختلاف اقوال ہے۔ مگر بہر حال حاصل یہ نکلا کہ اللہ کا سب سے پہلا گھر جو عبادت کے لئے بنایا گیا وہ مکہ میں ہے، جس کا نام بیت اللہ الکریم ہے۔ یعنی قدرت نے جب ارادہ کیا کہ اس عالم کو پیدا کیا جائے اور بنایا جائے تو اس میں سب سے پہلی وضع بیت اللہ کی واقع ہوئی، جیسا کہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس پورے عالم میں پانی ہی پانی تھا۔ یعنی عناصرِ اربعہ میں سب سے پہلے اللہ نے پانی کو پیدا فرمایا۔

جب حق تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اس پانی سے دوسرے عنصر تیار کئے جائیں اور دوسری کائنات بنائی جائے تو اس پانی میں ایک وضع واقع ہوئی۔ اب جہاں بیت اللہ واقع ہے پانی میں اتنی جگہ کا کچھ حصہ اُبھرا ہوا تھا، جیسے پہاڑی کا ایک چھوٹا سا مقام ہوتا ہے، وہ بھر گیا، وہ بیت اللہ تھا، اس کے بعد کچھ گہرائی واقع ہوئی۔ اس کے بعد پانی نے ٹکرانا شروع کیا تو پانی اور بالخصوص سمندر کا پانی جب ٹکراتا ہے تو اس میں غِلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوتا ہے جیسا کہ اب بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کناروں پر جب پانی ٹکریں کھاتا ہے تو جھاگ پیدا ہوتی ہے، وہ سمندری جھاگ مثل پتھر کے ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پانی نے ٹکرانا شروع کیا اور ٹکریں کھانے کی وجہ سے اس میں غلظت اور گاڑھا پن پیدا ہوا۔ گاڑھے پن نے سختی اختیار کی اور ایک اینٹ کے برابر جگہ میں سختی پیدا ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل زمین ایک اینٹ کے برابر بنی تو زمین کی اصل یہی بیت اللہ ہے، اس کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو بڑھایا اور پھیلانا شروع کیا۔ وہ پھیلتے پھیلتے زمین بنتی گئی اور اس حد پر آ کر رُک گئی، جس حد تک آج زمین ہے۔

یہ سب کتنے دنوں میں ہوا؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، قرآن کریم میں بعض جگہ تصریحات بھی ہیں لیکن

---

[۱] آل عمران: ۹۶

اس وقت مدت سے بحث نہیں کہ کتنی مدت تک زمین پھیلی، بہر حال زمین پھیلی۔ اس کا حاصل یہ نکلا کی بیت اللہ ساری زمین کی اصل ہے، یہیں سے ایک اینٹ کے برابر زمین پیدا ہوئی، وہیں سے پھیلی اور پھیلتے پھیلتے اس حد پر آ کر رُک گئی جس کو آج ہم زمین کہتے ہیں۔

ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے:

گویا زمین کا اوّل حصہ وہ ہے جو بیت اللہ ہے۔ نیچے سے زمین شروع ہوئی اور آپ سب جانتے ہیں کہ ہم سب زمینی مخلوق ہیں، ہمیں اللہ نے اس مٹی سے پیدا کیا جیسا کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا:

كُلُّكُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ تم سب کے سب آدم کی اُولاد ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔[۱]

سیدنا آدم علیہ السلام کی اصل بھی مٹی ہے ہم سب کی اصل بھی مٹی ہے، اسی لئے انسان کو مشت خاک اور مشتِ غبار کہا جاتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے ہم سب کو مٹی سے بنایا اور مٹی کی اصل بیت اللہ ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ ہم سب کی اصل بیت اللہ ہے۔ ایک عام اصول ہے **كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ** ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر شاخیں ہیں تو وہ جڑ کی طرف رجوع کریں گی، پانی ہے تو وہ اپنے مرکز کی طرف رجوع کرے گا۔ زمین ہے تو وہ مرکز ثقل کی طرف رجوع کرے گی۔ ہر چیز اپنے مرکز کی طرف فطرتاً دوڑتی ہے، اسے کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اگر بیٹے کو باپ کی طرف کشش ہے تو آپ بیٹوں کو تلقین نہیں کرتے کہ بھئی! باپ کی طرف رجوع کرو۔ کہیں یا نہ کہیں وہ تو رجوع ہوگا، اس لئے خلقتاً وطبعاً تمام انسانوں کا بیت اللہ کی طرف رجوع ہے۔

لوگ بیت اللہ کی طرف کیوں کھنچتے ہیں:

بعض کے علم میں ہے کہ یہ ہماری اصل ہے اور بعض کے علم میں نہیں ہے، علم میں آجائے تو پھر ان میں کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے مثلاً کسی شخص کی اولاد ہوئی، بچہ پیدا ہوتے ہی باپ چھوڑ کر کہیں چلا گیا، بچہ جوان ہوا، بڑی عمر کا ہوا۔ اب اگر باپ کہیں سامنے آئے گا تو طبعی کشش تو ہوگی، مگر یہ نہیں

---

[۱] شعب الایمان للامام البیہقی، ج:۱۱، ص: ۲۳

جانے گا کہ یہ باپ ہے، جب تک کہ پہچان نہ ہو جائے۔ بیٹا جب پہچان جائے گا کہ یہی ہے وہ باپ جس کی طرف کشش ہے تو طبعی کشش کے ساتھ وہ کشش عقلی بھی بن جائے گی۔

تو فطرتاً ہر انسان جانتا ہے کہ یہ میری اصل ہے، اس کی طرف کشش ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے آ کر تعارف کرادیا کہ جس اصل کی طرف انسانوں کی کشش ہے وہ یہی اصل ہے، مگر علم میں نہیں، کشش موجود ہے اور وہ تشخص کے ساتھ موجود ہے۔ جن کے علم میں آ گیا وہ ایمان لے آئے، انہیں کشش بھی ہے اور تشخص یعنی معرفت اور پہچان بھی ہے۔ غرض انسان کا بیت اللہ کی طرف خلقتاً رجوع ہے۔

چونکہ طبعی کشش تھی حق تعالیٰ نے عقلی کشش بھی پیدا فرمادی کہ عبادت میں بھی اسی کو مرکوز رکھو۔ اگر عبادت کا مرکز کوئی ایسا ہوتا کہ طبعاً اس کی طرف رجوع نہ ہوتا تو لوگ زبردستی رجوع کرتے، کیونکہ فطری کشش نہ ہوتی، مگر حق تعالیٰ نے اسی چیز کو مرکزِ عبادت بنایا جس کی طرف کشش بھی تھی۔ وہ طبعی کشش انسانوں کو اس کی طرف کھینچ کر لاتی ہے۔ اب یہ لاکھوں انسان اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے لے کر اربوں کھربوں انسان جو ''مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ''[1]۔ (ہر گھاٹی سے نکل نکل کر آ رہے ہیں)۔ سفر کی سختیاں اُٹھاتے ہیں، محنتیں کرتے ہیں، خلافِ طبع باتیں برداشت کرتے ہیں، مگر پھر بھی آتے ہیں۔

کوئی کشش تو ہے، وہ فطری کشش بھی ہے، شرعی کشش بھی ہے اور عقلی کشش بھی ہے۔ کئی طرح کی کشش جمع ہوگئی۔ فطری تو یوں ہے کہ وہ ہماری اصل ہے، اور عقلی یوں ہے کہ اصل کی طرف رجوع ہوتا ہی ہے معقول بات ہے، اور شرعی یوں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعارف کرادیا کہ یہی ہے وہ بیت اللہ جو تمہاری اصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نبی ایسے نہیں گزرے جنہوں نے آ کر بیت اللہ کا طواف نہ کیا ہو، اور جب انبیاء کرام علیہم السلام نے طواف کیا تو یقیناً ان کی اقوام کے دلوں میں بھی یہ چیز ہوگی کہ یہ ہماری اصل ہے۔ یہ اصل صرف آپ ہی کی نہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں بلکہ آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کی اصل ہے۔

---

[1] الحج: ۲۷

بیت اللہ کی حدود:

حضرت آدم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی ہے، ملائکہ علیہم السلام نے اس کی بنیادیں بھری ہیں اور بنیادیں بھی دس، بیس، سو، پچاس گز نہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تحت الثریٰ تک بیت اللہ کی بنیادیں بھری گئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ فقط اس حصہ میں نہیں ہے جو چار دیواری آپ کے سامنے ہے بلکہ تحت الثریٰ تک جتنا حصہ چلا گیا وہ سب بیت اللہ ہے۔ اس طرح سے اُوپر کی طرف جایئے تو عرش تک سب بیت اللہ ہی ہے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر آسمان میں ایک قبلہ ہے، وہ قبلہ ٹھیک اسی سیدھ میں ہے جہاں یہ بیت اللہ ہے اور ساتویں آسمان پر بیت المعمور ہے، وہ ساتویں آسمان کا قبلہ ہے۔

تو ہر آسمان میں قبلہ ہے یہ ایسا ہے جیسے ایک تار میں لٹو باندھ دیئے جائیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے پرو دیئے جائیں تو ہر لٹو دوسرے لٹو کا محاذی ہوگا۔ گویا بالکل سیدھ میں بیت اللہ ہے جیسے حدیث میں ہے کہ اگر بیت المعمور سے کوئی پتھر گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت پر آکر گرے گا تو بیت اللہ فقط اس چار دیواری کا نام نہیں ہے جو کعبہ شریف کی شکل میں موجود ہے، وہ ایک علامتی نشان ہے، ورنہ بیت اللہ عرش سے لے کر تحت الثریٰ تک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آپ بلندی پر پہنچ جائیں اور بیت اللہ کی طرف نماز پڑھیں تو آپ کو اُلٹا نہیں لٹکنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو نیچے ہے، اسی طرح نماز پڑھیں گے جیسے زمین پر پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں بھی بیت اللہ سامنے ہے اور اگر آپ کسی طرح زمین کی بڑی تہہ میں پہنچ جائیں تو وہاں آپ کو اُلٹ کے سجدہ نہیں کرنا پڑے گا کہ بیت اللہ تو اُوپر ہے۔ آپ اسی طرح سجدہ کریں گے جیسے زمین پر تو بیت اللہ نیچے سے لے کر اُوپر تک ایک کیل کی مانند ہے۔ ایک نورانی لاٹ ہے جس کے اِردگرد یہ سارے جہان چکی کے پاٹ کی طرح سے چکر کھا رہے ہیں، یہ بیچ میں ایک مرکز ہے۔

بیت اللہ میں گویا اللہ کا عکس ہے:

حق تعالیٰ نے اسے مرکز بنا کر اس پر خاص تجلی نازل فرمائی تا کہ اس کو وجود دیا جا سکے اور مرکز سے جو چیز چلتی ہے وہ چہار طرف برابر چلتی ہے۔ اگر آپ پانی کے بیچ میں ڈھیلا ماریں تو دائرے بنتے بنتے کنارے تک پہنچیں گے مگر مرکز سب کا ایک ہی رہے گا اور برابر دائرے بنتے چلے جائیں گے تو مرکز میں جو حرکت

ہوتی ہے وہ پورے محیط (دائرہ) میں ہوتی ہے۔ وجود کو جب حرکت دی گئی کہ زمین کو پیدا کیا جائے تو اسی مرکز کو قدرتِ حق نے تاکا اور وجودی تجلی یہیں نازل ہوئی۔ اس لئے بیت اللہ محض کوئی کمرہ نہیں ہے، کوئی عمارت نہیں ہے بلکہ وہ تجلی گاہِ ربانی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ کی وہ تجلی جو اقرب الی الذات ہے وہ موجود ہے۔ اسی تجلی کو ہم سجدہ کرتے ہیں۔ اس تجلی کو سجدہ کرنا گویا عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے۔ تجلی کے معنی فی الحقیقت عکس کے ہیں تو بیت اللہ آئینہ جمال خداوندی ہے جس میں حق تعالیٰ نے اپنا عکس ڈالا ہے اور عکس اور اصل میں عینیت ہوتی ہے، جو حرکت ذات کرتی ہے وہ عکس بھی کرتا ہے سایہ بھی کرتا ہے اگر ذات ہنس رہی ہے تو سایہ بھی ہنسے گا، اگر ذات چل رہی ہے تو وہ بھی چلے گا۔ البتہ شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے ورنہ حرکت اور سکون وہ بھی وہی کرتا ہے جو اصل ذات کرتی ہے تو وہ تجلی ربانی بیت اللہ میں اُتری ہوئی ہے جسے ہم سجدہ کرتے ہیں در حقیقت عینِ ذات کو سجدہ کرنا ہے مگر عین ذات اتنی لطافت میں ہے کہ کوئی سیدھ اور محاذات بن نہیں سکتی۔ اگر محض ذات کو سجدہ کرایا جاتا تو تصورِ محض ہوتا، ظاہر میں اصلیت کچھ نہ ہوتی۔

لیکن ذات کا عکس جب اتار دیا گیا تو عکس کا قاعدہ ہے کہ بڑی سے بڑی چیز کا عکس بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں آجاتا ہے۔ آفتاب کو اپنے آئینے میں دیکھتے ہیں تو آئینہ زمین کا ایک حصہ ہے، اس حصہ کو سورج (جیسے کرہ) کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پورا آفتاب مع اپنی شکل وصورت کے اس میں موجود ہو جاتا ہے پھر جو کام اصل آفتاب کرتا ہے وہی آئینہ کا آفتاب بھی کرتا ہے، آپ آئینے کو دوسرے آئینہ کے سامنے کریں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا تیسرے کے مقابل رکھیں اس میں بھی عکس پہنچ جائے گا۔ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے گی، چاہے آپ اندھیرے کوٹھے میں روشنی پہنچا دیں۔ اسی طرح آفتاب کا کام حرارت پہنچانا ہے، آئینوں کے ذریعے سے بھی وہی حرارت پہنچتی ہے، بس شدت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے تو جو کام آفتاب کا ہے وہی اس کا عکس بھی کرتا ہے۔

اس لئے عکس کو دیکھ کر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے آفتاب کو دیکھا۔ آفتاب کی ذات کو ٹکٹکی باندھ کر کوئی نہیں دیکھ سکتا ورنہ تو نگاہیں کھو دینی پڑیں گی۔ آئینے میں جب آفتاب کا عکس آتا ہے تو دیکھ بھی سکتے ہیں، اس کی ہر جانب اور سمت کو آپ دیکھ سکتے ہیں، معائنہ کر سکتے ہیں۔ تو عینِ ذات کو سجدہ کرنا، یہ ناممکن تھا، اس لئے کہ وہ

غایتِ لطافت میں اور غیب در غیب میں ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔

اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحم کھایا کہ اپنا عکس بیت اللہ میں اُتار دیا جو آئینہ جمالِ الٰہی ہے تاکہ ایک حد تک محدود ہو جائے اور بندوں کی نگاہ اس حد تک جا سکے اور اس کی طرف جھک سکیں، ورنہ جھکنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل اور عنایت ہے کہ ذات اور تجلی کی نسبت سے اپنی وہ تجلی جو اقرب الی الذات تھی اُتار کر بندوں کو سجدہ کا موقع دیا ورنہ کہاں ذاتِ باری تعالیٰ اور کہاں یہ بندے! وہ نورِ مطلق اور ہم ظلمتِ محض! بیچ میں ایک چیز تجلی کی صورت میں اُتار دی تاکہ سجدہ بھی کر سکیں، طواف بھی کر سکیں، عبادت بھی کر سکیں اور اس کی عبادت کو ذات کی عبادت قرار دیا۔

مادیت، روحانیت اور نورانیت سب کی اصل بیت اللہ ہے:

بیت اللہ فی الحقیقت ہماری مادی اصل بھی ہے، روحانی اصل بھی ہے۔ مادی اصل تو یوں ہے کہ زمین اسی سے بنی اور ہم سب زمینی مخلوق ہیں تو وہ ہماری مادی اصل ہوئی اور روحانی اصل یوں ہے کہ جب عبادت کریں گے تو انوارِ ربانی اسی کے ذریعہ سے ہمارے قلب میں آئیں گے تو روحانی اصل بھی ہوئی اور جب یہ بیت اللہ تحت الثریٰ تک ہے اور اُوپر عرش تک ہے تو جہاں جہاں بیت اللہ ہے اس کے اِردگرد جو مخلوق ہے اس سب کی اصل یہی بیت اللہ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ہر وطن کے مناسب اس کی صورت بن جاتی ہے، زمین میں بیت اللہ ہے تو اس کی صورت اینٹ پتھر کی ہے، آگے آسمانوں میں جائے گا لطافت بڑھتی جائے گی نورانیت بڑھتی جائے گی عرش کے قریب پہنچ جائے گا تو نورانیت محضہ رہ جائے گی۔ اس لئے کہ وہاں نوری مخلوق پیدا ہوئی، یہاں کثیف اور خاکی مخلوق پیدا ہوئی، مگر ہے سب کی اصل بیت اللہ۔ اس لئے سب کا رجوع اس کی طرف ہے، ملائکہ علیہم السلام بھی اس کا طواف کرتے ہیں، انسان بھی طواف کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض جانور بھی اس کا طواف کرتے ہیں اس لئے کہ سب پہچانتے ہیں کہ یہ ہماری اصل ہے۔

تو میں نے ایک تو عرض کیا تھا کہ وہ اولِ عالم ہے۔ تو واقعی وہ اول عالم ہے اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ[1] سب سے پہلے قدرت نے اسی کو بغور دیکھا اور حدیث میں فرمایا گیا ہے: جب زمین پھیلنی شروع

---

[1] آل عمران:۹۶

ہوئی تو سب سے پہلے وہ پہاڑیاں پیدا ہوئیں جو مکہ کے اِردگرد ہیں، پھیلتے پھیلتے اور پہاڑیاں بن گئیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب چاروں طرف زمین پھیلنا شروع ہوئی تو جس جس چیز میں جو خصوصیت تھی وہ چمک اُٹھی تو مدینہ منورہ بھی تو اسی میں آتا ہے، وہ بھی اول عالم ہے اپنے ماسوا کے لحاظ سے، اس لئے کہ مدینہ کے دائرہ کے باہر جو ہے، اس سے مدینہ مقدم ہے اور وہ مدینہ سے مؤخر ہے۔ تقدیم وتاخیر ہوتی چلی جائے گی۔ تو اصل سب کی بیت اللہ ہی نکلتی ہے، اس لئے وہ اوّل عالم بھی ہے، اصل عالم بھی ہے اور وسطِ عالَم بھی ہے۔

بیت اللہ کے وسطِ عالم ہونے کی حکمت:

معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کوئی مرکزی جگہ ہے جس میں قدرت نے تجلی ڈالی تا کہ چہار طرف انوار و برکات برابر پھیلیں۔ اسی واسطے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرمایا کرتے تھے **يَا اَهْلَ مَكَّةَ اَنْتُمْ فِيْ وَسَطٍ مِّنَ الْاَرْضِ** اے اہل مکہ! تم زمین کے بیچوں بیچ واقع ہوئے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ وسط عالم بھی ہے اور مرکز ہوتا بھی وسط میں ہی ہے، دائرہ جبھی بنے گا جب بیچ میں مرکز ہو۔ پرکار کی ایک ٹانگ کو آپ مرکز پر رکھیں گے اور ایک ٹانگ گھمائیں گے تبھی تو دائرہ بنے گا اگر مرکز سے ٹانگ ہٹ جائے دائرہ بن نہیں سکتا تو معلوم ہوا کہ اوّل بھی ہے، اصل بھی ہے، مرکز بھی ہے اور وسط و درمیان بھی ہے۔

بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت مکہ میں فرمائی اور اللہ کی طرف سے اسلام اور جامع دین کی گویا پہلی دعوت مکہ سے چلی تا کہ مرکز سے دعوت چلے اور یکسانی کے ساتھ تمام عالم میں اس کی آواز پھیل سکے۔ اگر مثلاً بیت اللہ کو روس میں اور کاکیشیا کے پہاڑوں پر بنا دیتے تو ساری دنیا کو مصیبت اُٹھا کر وہاں جانا پڑتا اور اگر کہیں مغرب میں امریکہ کی طرف بنا دیتے تو روس سے جو لوگ چلتے وہ لاکھوں مصیبتیں اُٹھا کر پہنچتے، بہت سے پہنچ نہ سکتے۔ اللہ نے اسے بیچ میں رکھ دیا تا کہ نرم اور گرم ہر ملک کا ہر انسان وہاں پہنچ سکے۔ مشقت سب پہ برابر پڑے اور اپنے مرکز کو پہنچ جائیں جیسا کہ وسط ہونے کی وجہ سے آسانی ہے۔ اسی طرح مرکز سے جو چیز چلے گی اسے پھیلنے میں بھی آسانی ہوگی۔ حق تعالیٰ نے دعوت الی اللہ اور جامع دین کا کارخانہ مکہ سے شروع کیا اور اسلام کی پہلی دعوت مکہ سے شروع ہوئی۔

مرکزیت کی منتقلی:

وہیں سے جناب نبی کریم ﷺ نے دعوت دی، اس کے بعد مدینہ مرکز بنا۔ یہ حق تعالیٰ کی مشیت اور شان ہے کہ اس نے کمالات کی، ظاہر ہوں یا باطن کسی کے ساتھ تخصیص نہیں رکھی۔ مثلاً یہ کہ علم ہوگا تو صرف فلاں خاندان میں ہوگا اور کسی میں نہیں ہوگا، روحانیت ہوگی تو فلاں خاندان والے اس کے وارث ہونگے، دوسرے محروم رہیں گے، علم ہوگا تو فلاں ہی خطے میں ہوگا بلکہ بنی آدم کے ہر طبقہ کو علم اور روحانیت سے نوازا اور تمام زمین کے خطوں کو اس میں سے حصہ دیا تو اوّل مرکز مکہ بنا، اس کے بعد وہ مرکزیت مدینہ کی طرف منتقل ہوئی۔ خلفائے راشدین کی حکومت وہاں قائم ہوئی اور علم کے دریا اور نہریں وہاں سے جاری ہوئیں۔ اس کے بعد مرکزیت عراق کی طرف منتقل ہوئی، بغداد دار الخلافہ بن گیا، تو وہاں ہزاروں لاکھوں علماء تیار ہوئے۔ اس کے بعد خراسان کی طرف مرکزیت منتقل ہوگئی، بڑے اکابر علماء اسپین میں پیدا ہوئے، کبھی فلسطین مرکز بنا۔

تو مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے کسی ایک خطہ زمین کو خاص نہیں کیا کہ اسی میں اس کی برکت آئے گی۔ وہ مبدء فیض ہے، اس کے لئے سب برابر ہیں۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی وہاں۔ اسی طرح سے خاندان بدلتے رہتے ہیں۔ کتنے عرصے بنی اسرائیل میں نبوت رہی، جب انہوں نے نا شکری و نا قدری کی تو اس خاندان بنی اسرائیل کو محروم کر کے بنی اسماعیل میں نبوت آگئی اور ایک ہی نبوت ایسی آئی کہ ساری نبوتوں سے فائق تر ہوگئی۔ خاتم الانبیاء ﷺ پیدا فرمائے گئے اور بنی اسماعیل کو نوازا گیا۔

حضور ﷺ کے برکات و کمالات بھی کسی ایک خاندان کے ساتھ خاص نہیں ہیں، صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ اوّل ہیں تو صدیقیت کے ساتھ خلافت آئی، پھر فاروقیت کے ساتھ آئی، عثمانیت کے ساتھ آئی اور پھر علویّت کے ساتھ آئی۔ ہر خاندان کو حصہ ملتا رہا اور ہر خطہ زمین مستفیض ہوتا رہا۔

کبھی مکہ مرکز ہے تو کبھی مدینہ، کبھی خراساں مرکز ہے تو کبھی اسپین، کبھی ماوراء النہر مرکز ہے اور کبھی ہندوستان، مرکزیت منتقل ہوتی ہوئی دہلی پہنچ گئی۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، انہوں نے علم حدیث پھیلایا، پھر وہ دہلی سے ضلع سہارن پور کی طرف

منتقل ہوگئی، بڑے بڑے اجلہ علماء اس میں پیدا ہوئے۔ تو مرکزیت کسی ایک خطے کے ساتھ خاص نہیں مگر مرکز سب کا بہر حال ایک ہی رہے گا، مرکزیت حقیقی وہ صرف بیت اللہ کو حاصل ہے۔ وہیں سے علم اور کمالات کے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔

برکت وہدایت کا گھر:

اسلئے فرمایا ''اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ'' [۱]

تو یہ گھر برکت والا بھی ہے اور ہدایت والا بھی ہے۔ برکت کا لفظ عام طور پر مادیات میں استعمال ہوتا ہے، چاہے روحانیت میں بھی استعمال کریں مگر عام استعمال مادیات میں ہے۔ جیسے مثلاً کھانے میں برکت ہوگئی، فلاں کی عمر میں برکت ہوگئی، فلاں کے کاموں میں برکت ہوگئی تو برکت کا لفظ مادیات میں استعمال ہوتا ہے اور ہدایت کا لفظ معنویات میں استعمال ہوتا ہے۔ علم ہے، معرفت ہے اور کمالات معنویہ ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ برکت کا گھر بھی ہے اور ہدایت کا گھر بھی ہے۔ یعنی مادی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں اور روحانی برکتیں بھی اس میں موجود ہیں۔

آیاتِ بینات:

فِیْہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰھِیْمَ [۲] حج کے موقع پر لاکھوں لوگ وہاں ہوتے ہیں تو یہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں کہ لاکھوں کو روٹی بھی مل رہی ہے پھل بھی مل رہے ہیں اس وادی غیر ذی زرع میں جہاں نہ سبزہ، نہ پانی، نہ نہریں، نہ باغات، لیکن ہر تازہ پھل میسر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے کہ وَارْزُقْ اَھْلَہٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْھُمْ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ [۳] اے اللہ! اس گھر والوں کو رزق دے اور رزق بھی کیا! فروٹ جو اعلیٰ ترین رزق ہے یعنی تازہ پھل اگر کہیں ملک شام میں دعا مانگتے تو اسباب طبعیہ کے مطابق دعا قبول ہوتی کہ وہاں پر تو پیدا ہوتے ہیں یہاں دعا مانگی، جہاں نہ سبزہ نہ پانی لیکن دنیا بھر کے تازہ پھل موجود اور ہر ملک کے موجود اور ہر شخص ان سے مستفید ہو رہا ہے، دوسری جگہ دس

---

[۱] آل عمران: ۹۶

[۲] آل عمران: ۹۷

[۳] البقرۃ: ۱۲۶

بیس ہزار کا مجمع ہوتو گرانی الگ ہو جاتی ہے، جھگڑے اور نزاعات الگ ہوتے ہیں فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ[1] کھلی کھلی نشانیاں ہیں، رزق بھی مل رہا ہے، جھگڑے بھی نہیں ہوتے اور لاکھوں آدمی جمع ہیں۔ عرفات میں تو ایک جگہ جمع ہوتے ہیں جو چودہ پندرہ لاکھ آدمی ہوتے ہیں (اور یہ تعداد روز افزوں بھی ہے) لیکن سانس کی آواز نہیں ہوتی، ہر شخص اپنے کام میں لگا ہوا ہے، ہر شخص اپنے مرکز کی طرف متوجہ ہے۔ کوئی آواز ہو، کوئی گفتگو ہو، کوئی جھگڑا ہو بالکل بھی نہیں۔ ایک ایسا سکونِ محض ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کی مسجدوں میں بھی دیکھنے میں نہیں آتا جتنا میدان عرفات کے لاکھوں آدمیوں میں سکون ہوتا ہے تو کیا یہ آیات بینات میں شامل نہیں ہے۔

قالبی امن کے ساتھ قلبی امن بھی:

انسان میں دو ہی قوتیں ہیں جن سے ساری معصیتیں پھیلتی ہیں ایک قوتِ شہوانی اور دوسری قوت غضبی ایک سے فواحش ومنکرات پھیلتے ہیں اور دوسری سے مار دھاڑ، جھگڑے اور تنازعات پھیلتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ مطاف کے اندر عورت مرد مخلوط ہو کر طواف کرتے ہیں، کندھے سے کندھا لگ رہا ہے، صرف یہی نہیں کہ مرد کو ادھر توجہ نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت پیدا ہوتی ہے کہ عورت کیوں سامنے آگئی۔ تو ایک (باطل) جذبے کو سرد کر دینا، کیا یہ آیات بینات میں داخل نہیں ہے! یہ اللہ کی کھلی نشانی ہے ورنہ مرد کو عورت کی طرف طبعی کشش ہوتی ہے، لیکن سینکڑوں عورتیں موجود، کندھے سے کندھا، کمر سے کمر لگتی ہے۔ نا صرف یہ کہ رغبت نہیں بلکہ بعض اوقات کراہت بھی ہوتی ہے کہ یہ کہاں بیچ میں آگئی! اور ہماری طاعت وعبادت کے درمیان خلل انداز ہوگئی تو دلوں کا بدل ڈالنا بلاشبہ آیاتِ بینات میں داخل ہے۔

یہی قوت غضبی کا حال ہے ورنہ اتنے جھگڑے جھمیلے ہوتے کہ حکومت کو فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا، جگہ جگہ لڑائیاں ہوتیں، لیکن کہیں لڑائی نہیں، حتیٰ کہ کندھے سے کندھا ٹکراتا ہے، خلافِ طبع امور پیش آرہے ہیں اور لاکھوں آدمیوں میں علماء تو نام کو ہیں زیادہ تو جہلاء ہیں لیکن جھگڑے کا نشان نہیں اور یوں کبھی اتفاق سے ہو جائے تو بندہ بشر ہے، انسان ہے! کہیں ہو جائے لیکن جتنا طبعاً ہونا چاہئے تھا، قطعاً اس کا نشان نہیں۔ تو

---

[1] آل عمران: ۹۷

قوتِ غضبی بھی ساکن ہے اور قوتِ شہوانی بھی ساکن ہے، کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ باطنی طور پر بھی امن کا گھر ہے۔ تو اندر بھی امن ہے اور باہر بھی امن ہے اور قلوب کے اندر بھی امن ہے۔ قلبی اور نفسانی قوتوں کو وہاں اتنا پامال کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے کام میں نہیں لگتیں۔ اللہ کی ذات بابرکات کی اطاعت وعبادت اور روحانیت کی طرف متوجہ کر دیا جاتا ہے تو فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ میں رزق کا ملنا، جھگڑوں کا نہ ہونا بھی داخل ہے، شہوانی امور کا مٹنا اور نہ ہونا، یہ بھی داخل ہے۔ خالص قلبی اور قالبی امن ہے، باطنی بھی اور ظاہری بھی ہے وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا[۱] جو اس میں داخل ہو گیا وہ امن میں آ گیا، تو امن فقط اسی کو نہیں کہتے کہ جان بچ جائے، امن اسے بھی کہتے ہیں کہ آدمی نفس سے بچ جائے تو ''آیات بینات'' ظاہر میں بھی نمایاں، باطن میں بھی نمایاں تو مکہ مکرمہ اور بیت اللہ اوّلِ عالم بھی ہے، مرکزِ عالَم بھی ہے، وسط عالَم بھی ہے اور ہم سب کی اصل بھی ہے۔

وسطِ عالَم میں ولادت نبوی ﷺ کی حکمت:

اس لئے نبی کریم ﷺ کو مکہ میں پیدا فرمایا گیا کہ یہ دین عالمی ہے مقامی نہیں ہے کہ کسی ایک خطہ اور قوم کے لئے ہو، پوری دنیا کے لئے ہے تو پھر ایسی جگہ سے آواز اُٹھائی جائے کہ چاروں طرف اس کی آواز برابری کے ساتھ پھیلے، وہ مکہ ہی ہوسکتا تھا۔ اس لئے ولادت باسعادت مکہ میں ہوئی اور آپ ﷺ نے جو دعوت الی اللہ شروع کی وہ مکہ سے شروع کی ہر طرف اس کی آواز پھیلی۔ اگر کسی ایک جانب ہوتے تو وہاں دین کا غلبہ ہوتا اور دوسری طرف اندھیرا ہوتا لیکن جتنا بھی دین پھیلا ہے بہر حال چہار طرف پھیلا ہے کوئی ملک خالی نہیں جس میں اللہ کے نام لیوا موجود نہ ہوں۔ پھر اس کا وعدہ دیا گیا کہ ایک وقت آرہا ہے کہ پورے عالَم میں یہی ایک دین ہو جائے گا۔

حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ[۲] روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھر، کوئی اینٹ پتھر کا گھر اور کوئی کپڑے اور چمڑے کا خیمہ ایسا باقی نہیں رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو

---

[۱] آل عمران: ۹۷

[۲] المستدرک للامام الحاکم، ج:۱، ص: ۶۶۴

جائے گا، رغبت سے مانے یا مجبور ہوکر مانے۔ جبر کے معنی یہ نہیں کہ مسلمان گلے پر تلوار رکھیں گے کہ کلمہ قبول کرو، اس کی تو ممانعت ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [۱] دین میں کوئی اکراہ (جبر) نہیں اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ [۲] اے پیغمبر! کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ دین قبول کریں! تو دین جبری چیز نہیں۔ اس لئے اسلام میں اکراہ جائز نہیں، پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ ''بِذُلٍّ ذَلِيْلٍ''، یعنی دنیا میں چہار طرف دھکے کھا کھا کر اسلامی اصول مجبور کر دیں گے کہ انہیں میں پناہ لی جائے اس کے سوا پناہ گاہ کوئی نہیں رہے گی، مجبور ہوکر سب اس کی طرف آئیں گے۔

بہت سی اقوام میں بیٹیوں کو وراثت نہیں ملتی تھی۔ اسلام نے بیٹے اور بیٹیوں کا حق رکھا۔ البتہ فرقِ مراتب ضرور قائم رکھے مگر جس طرح بیٹا باپ کا وارث ہے، بیٹی بھی وارث ہوگی۔ بعض اقوام میں بیٹیوں کی بالکل وراثت نہیں تھی۔ ہندوستان میں بعض قوموں کی عورتوں نے ایجی ٹیشن برپا کیا اور انہوں نے اسمبلی کے گرد دھاوا بولا کہ: جس باپ کی اولاد لڑکے ہیں، اسی کی اولاد ہم لڑکیاں بھی ہیں کیا وجہ ہے کہ ہمیں میراث نہ ملے! آخر بالکل مجبور ہوکر گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑا اور وراثت میں ان کو حصہ دار بنایا۔ اس قانون کے بنانے میں اقوام نے کدھر رجوع کیا! ان کے ہاں تو کچھ نہیں تھا، سوائے اس کے کہ انہوں نے اسلامی فقہ کو لے کر اپنے الفاظ میں ادا کر دیا اور کیا کہا جائے گا؟ تو لوگ اسلام کا نام نہیں لیتے مگر اس کے اصول اختیار کرتے جارہے ہیں۔

ہندو گورنر کے ایم منشی کا تسلیمِ حق:

کے ایم منشی جو یوپی کا گورنر تھا اس نے ایک جلسہ میں اپنا پیغام بھجوایا۔ اس کو جلسہ میں شرکت کی دعوت دی گئی تو اس نے معذرت کی کہ حکومت کے کام بہت پڑے ہوئے ہیں میں نہیں آسکتا، میں اپنے بجائے اپنا پیغام بھیجتا ہوں۔ سیرت کا جلسہ تھا، وہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا، اس کے دو جزء تھے۔

پہلا جزء یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب اور فضائل اس نے بیان کئے اور ایسے بیان کئے کہ شاید کوئی مسلمان بھی اتنا نہ بیان کرے۔ اس نے کہا: دنیا میں اگر کوئی ہستی ایسی ہے جس کی زندگی پر انگلی رکھنے کی

---

[۱] پارہ: ۳ سورۃ البقرۃ الآیۃ: ۲۵۶

[۲] پارہ: ۱۱، سورۃ یونس، الآیۃ: ۹۹

گنجائش نہیں تو وہ سوائے محمد ﷺ کے دوسری کوئی نہیں، کامل اور مکمل ہستی ایک ہی پیدا ہوئی، یہ تو ابتدائی جزء تھا۔ دوسرا جزء یہ تھا کہ ہم نے ہندوستان کا قانون اسلامی اصولوں پر بنایا ہے، ہم نے عدل قائم رکھا، مساوات قائم رکھیں، اقوام کے حقوق برابر رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان حقوق کو چور اور ڈاکو مارنے لگیں اور نہ پہچانیں، مگر قانون میں حقوق برابر رکھے گئے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ہاں اس قسم کے اصول نہیں تھے، آخر مجبور ہو کر اسلام کی طرف رجوع ہوئے اور وہاں سے اصول لئے۔

گاندھی جی کا صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی حقانیت کے آگے سرنگوں ہونا:

ہندوستان میں جب کانگریس کی عارضی حکومت قائم ہوئی تھی تو گاندھی نے کہا تھا کہ ''ہمارے وزراء اگر عالمی وقار چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ چھوت چھات کو ختم کریں، نسلی امتیازات کو ختم کریں، اُونچ نیچ ختم کریں اور صدیق و فاروق کا نمونہ اختیار کریں''۔ گاندھی کی قوم نے برا مانا اور کہا کہ آپ کو صدیق وفاروق ہی کا نمونہ ملتا ہے! اس نے کہا:

''بھئی! کسی اور قوم میں تم نمونہ بتادو، جب نہیں ملا تو اب میں کس کا نام لوں! یہ ساری مثالیں انہوں نے ہی قائم کی ہیں کہ حکومت بھی قائم اور درویشی بھی قائم، دبدبہ بھی قائم اور ساتھ میں پیوند لگی چادریں بھی قائم اور زہد وقناعت بھی قائم۔ تم کوئی حکومتیں مثال میں بتلا دو کہ نظامِ عالَم بھی قائم ہے اور سارے درویش کے درویش ہیں''۔

خلفائے راشدین نے کوئی سونے چاندی کے محل نہیں قائم کرائے، یہی سادہ زندگی جو عوام الناس کی تھی، وہی زندگی ان کی تھی مگر پورے عالم میں دین حق کا ایک دبدبہ پھیلا دیا۔ تو قوم نے بُرا مانا کہ تمہیں یہی نمونہ ملتا ہے۔ اس نے کہا جب نمونہ نہیں ہے تو میں کسے پیش کروں، تم بُرا مانو یا بھلا! بہر حال مطلب یہ ہے کہ لوگ اسلام کی طرف جھکیں گے، مسلمان ان کے گلے پر کوئی تلوار نہیں رکھیں گے کہ اسلام قبول کرو، بلکہ اصول مجبور کریں گے کہ اسلام کی طرف آؤ، زمانہ مجبور کرے گا۔ دوسری طرف پناہ نہیں ملے گی، اصول میں پناہ ملے گی، اس لئے کہ یہ فطری اصول ہیں، تو قبول کرنے کیلئے لامحالہ مجبور ہوں گے۔

فیضانِ نبوت کا پورے عالم میں پھیل جانا:

نبی کریم ﷺ نے وعدہ دیا، فرمایا ''لَا يَبْقَىٰ عَلَى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ'' الخ روئے زمین پر کوئی کچا پکا گھرانہ نہیں رہے گا مگر اس میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا[1] فَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر پورے عالم میں ایک دین ہو جائے گا۔

بعض حضرات شراح فرماتے ہیں کہ یہ کلمہ: فَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ حدیث کا جزء ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے مگر بہر حال مقولہ حق ہے کہ جب روئے زمین کے ہر گھر میں اسلام کا کلمہ داخل ہو جائے گا تو پورے عالَم میں دین واحد ہو جائے گا۔

یہ مکہ کی آواز تھی، سارے عالم میں پھیلنی چاہئے تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں بھی وہ آواز مرکز سے چہار طرف پھیلی اور اس کی تکمیل ہوئی تھی، مگر وہ تکمیل کیفیت کے لحاظ سے تھی۔ حضور ﷺ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد تیار فرما دیئے، جو نبی تو نہیں تھے مگر آثارِ نبوت سب کے اندر موجود تھے: عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَآءِ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ وہ انبیاء علیہم السلام تو نہیں تھے، مگر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے وہ کام کئے جو انبیاء کرتے ہیں، جو جس خطے میں پہنچ گیا اس خطے کو ایمان، علم اور معرفت سے رنگ دیا۔ اسی طرح فقہاء کرام میں سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عراق میں تھے، ان کا مذہب پھیلا تو خراسان، ہندوستان، افغانستان میں حنفیت ہو گئی، اس راستے سے کروڑوں آدمی جنّت میں پہنچ گئے۔ امام شافعیؒ کا ابتدائی قیام حجاز میں تھا اور وفات کے وقت مصر میں قیام تھا تو مصر و حجاز میں اکثریت شوافع کی ہے۔ غرض جو امام جہاں بیٹھ گیا اس نے علم و تفقہ اور کمالات سرانجام دیئے۔ طاقت ایک ہی نبوت کی تھی اور وہ ہے ختمِ نبوت! اس کے نیچے آ کر علماء نے کام کیا۔ فیضان ایک نبوت کا ہے، اس کے تحت علوم و کمالات دنیا میں پھیلے اور پھیلتے ہی رہیں گے تو عہدِ نبوت میں دین مکمل ہوا اور چہار طرف پھیلا مگر کیفیت کے لحاظ سے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ایسے نمونے تیار ہو گئے کہ شاید ہر صحابی کسی ایک نبی کی نسبت پر ہے گویا حضور ﷺ کی ذات بابرکات

---

[1] المستدرک للامام الحاکم، ج:۱، ص ۶۶۴

جامع النسب ہے اور آپ کی تربیت سے وہ نسبتیں آگے پھیلیں تو کیفیت کے لحاظ سے دین مکمل ہو گیا۔

مگر آواز مرکز کی یعنی مکہ کی تھی، اسے سارے عالم میں پھیلنا تھا، تو دور عیسوی میں اور دورِ مہدوی میں جو کہ آخری دو مجدد ہوں گے، اس وقت کے بارے میں فرمایا گیا کہ وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ[1] پورے عالم میں دین واحد ہو جائے گا۔ اسلام واحد کے سوا کوئی دین باقی نہیں رہے گا اور اسلام سارے عالم میں پھیل جائے گا، تو کمیت یعنی تعداد کے لحاظ سے اخیر میں تکمیل ہوگی۔ کیفیت کے لحاظ سے پہلے تکمیل ہو چکی ہے تو مکہ کی آواز جو مرکز سے اُٹھی تھی بے اثر نہیں جا سکتی تھی، کیفاً بھی پہنچ گئی اور جب کمیت کے لحاظ سے پورے عالم میں دین واحد ہو گیا تو مقصد دنیا پورا ہو جائے گا کہ عبادت کا کارخانہ مکمل ہو چکا، اس کے بعد پھر قیامت کا دور ہے، چنانچہ یہ عالم ختم کر دیا جائے گا۔ میرے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کی آواز مکہ سے اُٹھی، حضور ﷺ کے زمانہ خیر و برکت کے بعد پوری اُمت آپ کی قائم مقام ہے تو اس اُمت کا فرض بھی یہ ہے کہ اس آواز کو آگے بڑھائے اور مرکز سے چلائے۔

قاری طیب صاحبؒ کے وفد کی شاہِ حجاز ملک عبدالعزیزؒ سے ملاقات:

کافی عرصہ پہلے جب ملک عبدالعزیز بن سعود مرحوم زندہ تھے اور ان کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا تھا کہ مطاف میں ان پر کسی نے حملہ کیا، اللہ نے ان کو بچا لیا تو ہندوستانی زعماء کی طرف سے مبارک بادی کا جلسہ منعقد کیا گیا کہ ملک کو مبارک باد دیں کہ اللہ نے آپ کی حفاظت کی اور آپ کو محفوظ رکھا۔ فندق مکہ میں یہ جلسہ ہوا اور تقریباً تین چار سو کے قریب حضرات، جن میں علماء، زعماء، تجار اور امراء سب جمع تھے، اس حج کو لوگ حج العظماء کہا کرتے تھے۔ یعنی ہر ملک کے بڑے بڑے لوگ اس حج میں شریک ہوئے۔ خیر وہاں جلسہ ہوا تو تقریریں ہوئیں، تجویز پاس ہوئی اور ایک وفد گیارہ آدمیوں کا تیار کیا گیا، جس میں مفتی نعیم صاحب مرحوم لدھیانوی، حافظ ہدایت حسین صاحب کانپوری، مولانا آزاد سبحانی مرحوم وغیرہ گیارہ آدمی تھے اور انہوں نے قاری طیب صاحبؒ کو رئیس الوفد بنا دیا کہ جا کر ملک کی خدمت میں تجاویز پیش کریں کہ کل جلسہ ہوا تھا، یہ اس کی کاروائی ہے۔ ملک نے اجازت مرحمت فرمائی اور بہت ہی توقیر و عزت کی۔

---

[1] پارہ:۹ سورۃ الانفال، الآیۃ:۳۹

انہوں نے یہ فرمایا کہ: وہ جو گیسٹ ہاؤس ہے یعنی مہمانوں کے بیٹھنے کی جگہ، وہاں علماء کو نہ بٹھایا جائے، اس لئے کہ وہاں میں آؤں گا تو علماء میری تعظیم کو کھڑے ہوں گے، میں چاہتا ہوں کہ خود ان کی تعظیم کروں، وہ میری تعظیم کو کھڑے نہ ہوں۔ لہٰذا محل میں جوان کا اپنا کمرہ تھا اس میں بلوایا، تاکہ جب علماء آئیں تو میں تخت سے اُتر کر ان کی تعظیم کروں چنانچہ وفدان کے پاس پہنچا، ملک اپنے شہ نشین سے اُترے اور انہوں نے ہر ایک سے مصافحہ کیا، اپنا تعارف کرایا، خیر یہ کاروائی ہوتی رہی اس کے بعد اخیر میں قاری صاحبؒ نے تجویز پیش کی کہ:

> اس وقت کوئی عیسائی حکومت ایسی نہیں، جس کے ہاں تبلیغی مشن نہ ہو۔ امریکہ، انگلستان اور فرانس کی حکومتیں کروڑوں روپے اس پر خرچ کر رہی ہیں اور جگہ جگہ ملکوں میں تبلیغی مشن کے افراد پہنچے ہوئے ہیں اگر حکومت حجاز اس قسم کا اقدام کرے اور اسلامی تبلیغ کے لئے یہاں سے وفود روانہ کرے تو سارے مسلمانوں کے لئے ایک عزت افزائی کا سامان ہوگا، حکومت کی محبت بھی دلوں میں قائم ہوگی۔ اور اس آواز میں بھی اثر ہوگا، سارے علماء اس کی حمایت اور اس کے تعاون کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔

اس تجویز کو ملک نے بہت پسند فرمایا اور فرمایا کہ بالکل مناسب تجویز ہے مگر یہ کہا کہ ابھی اس کا وقت نہیں، اس لئے کہ مثلاً برطانوی حکومت ہے، ہم اسلامی تبلیغ کے لئے وفد بھیجیں گے وہ کہیں گے اس میں کوئی سیاسی چال ہے، تو تبلیغ تو ایک طرف رہ جائے گی اور سیاسی قصّے آجائیں گے پھر اس میں کہیں شکوک وشبہات اور فتنے نہ کھڑے ہو جائیں مگر تجویز معقول ہے اس کے اُوپر عمل درآمد ہوگا، مناسب وقت کا انتظار کیا جائے

بہر حال وہ حکومت کا قصہ ہے جس طرح حکومت نے حج کے سلسلے میں احسانات کئے ہیں، حرم شریف کی توسیع اور حج کے انتظامات کئے ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی ایک چیز ہے کہ دین کی تبلیغ اور اشاعت کی طرف توجہ ہو، مگر بہر حال جب تک حکومت متوجہ نہ ہو اس وقت تک علماء کا کام ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کو چلائیں اور اس کو مرکز بنایا جائے۔

اہلِ مکہ کے بجائے تبلیغی جماعت نے دین کا کام اُٹھایا:

الحمد للہ ہماری تبلیغی جماعتوں نے اس کو مرکز بنالیا ہے۔ دیہات تک میں کام پھیلا دیا ہے۔ باقی اہلِ حرمین اس کے زیادہ حقدار تھے کہ یہ کام پھیلاتے، یہ کام اس کا مستحق تھا کہ انہیں سے جاری ہو۔ برکت اور وسعت کا اس میں اثر ہے۔ مکہ کے لوگ جب باہر ملکوں میں پہنچیں گے تو کہا جائے گا کہ یہ تبلیغ کے لئے آئے ہیں تو قلوب پر کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ جو جماعتیں پہنچتی ہیں اس میں عرب ہوتے ہیں تو ہندوستان والے اس سے اثر قبول کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں ایک نیت پیدا ہوتی ہے کہ بھئی جب عرب تک کے لوگ تبلیغ کرنے آگئے تو ہم ہی بیٹھے ہیں، ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم بھی تبلیغ کریں، اس کا اثر پڑتا ہے۔ بہرحال تبلیغی جماعت نے یہاں بھی اور دنیا کے ہر ملک میں بحمد اللہ مراکز قائم کئے حجاز میں بھی مرکز قائم ہے، مدینہ ومکہ میں بھی ہیں اور یہاں سے مضافات میں بھی جماعتیں جاتی ہیں اور بہت سے لوگوں کے اندر یہ سلسلہ پھیل گیا ہے تو واقعی مکہ ہی اس کا احق تھا کہ یہیں سے آواز اُٹھتی۔

شام مرکزِ سیاست ہے:

آج مکہ مکرمہ جس طرح بین الاقوامی عبادت گاہ ہے اسی طرح بین الاقوامی تجارت گاہ بھی بن گیا ہے۔ دنیا کے ہر ملک کی چیز وہاں ملتی ہے اور کہیں ملے نہ ملے۔ تو بین الاقوامی تبلیغ گاہ بھی وہاں ہونی چاہئے۔ یہیں سے اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو اور آثار وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اخیر دور میں عرب بھی کھڑے ہوں گے۔

انہی کے ہاتھوں پر قوت وشوکت کے ساتھ یہ چیز آگے بڑھے گی اور باطل قوتیں بھی انہی کے ہاتھوں ٹوٹیں گی۔ مہدی ہیں وہ بھی عربی ہیں اور حسنی ہوں گے، ان کے زمانے میں مغرب کی قوتیں ٹوٹیں گی، بیعت بھی انہی کے ہاتھ پر مکہ ہی میں شروع ہوگی اور وہ شام کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے اس لئے کہ وہ مرکز سیاست اسلام ہے۔ حجاز مرکز عبادت بتایا گیا ہے، عبادت کے لئے امن کی ضرورت ہے، فتنہ ہوتا ہے تو آدمی نہ تلاوت کر سکے نہ ذکر کر سکے، عبادت کے لئے سکون ضروری ہے۔ جب اللہ نے اس کو مرکزِ عبادت

بنایا تو امن کا بھی مرکز بنا دیا وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا[۱] اور اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ [۲] پھر اس کو امن گاہ بھی عالمی بنایا، اس لئے کہ یہ عبادت گاہ تھی اور عبادت فتنوں کے اندر نہیں ہوسکتی۔ یہاں جانوروں اور درختوں تک کو پناہ ہے، بلکہ یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں کاٹی جاسکتی۔ یہاں کے پتھر وغیرہ ہیں ان کے بارے میں بھی یہ پسندیدہ نہیں سمجھا گیا کہ آدمی اُٹھا کر لے جائے کیونکہ یہاں امن ہے، مُحرم کے لئے شکار تک ممنوع ہے۔ تو جانوں کو بھی پناہ، مال کو بھی پناہ، یعنی امن کامل۔ جب اتنا امن ہے، تبھی عبادت کا کارخانہ یہاں چل سکتا ہے اور سیاست کے لئے تعلقات، روابط، جوڑ توڑ اور اُونچ نیچ کی ضرورت ہے، اگر وہ یہاں ہوتی تو نظامِ عبادت درہم برہم ہوجاتا۔ اسلام نے شام کو مرکز سیاست قرار دیا ہے، حجاز مرکز عبادت ہے، اصل اصول وہی ہے۔ لیکن جب جنگ کرنی ہو، فوجیں بھیجنی ہوں تو وہ شام سے ہو تو شام کو مرکز سیاست قرار دیا۔

مصر مرکزِ عسکریت ہے:

اور مصر کو مرکزِ عسکریت قرار دیا کہ وہاں فوجی قوت جمع رکھو۔ شام اور حجاز کو مہاجر بنایا، کوئی ہجرت کرے تو شام میں اور حجاز میں کرے۔ مصر کو ہجرت گاہ نہیں بنایا، وہ فوجی چھاؤنی ہے۔ اس لئے کہ فوج میں جو لوگ بھرتی ہوتے ہیں وہ ہجرت کر کے وطن چھوڑ کے تھوڑا ہی جاتے ہیں، وہ تو طاقت کو فراہم کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مصر کو فوجی طاقت بناؤ اور لوگ مدد پہنچائیں مگر ہجرتیں کر کے وہاں نہ جائیں طاقت ان کے وہاں پہنچتی رہے۔

اس لئے کہ مصر درحقیقت یورپ کے لئے ایشیا کا دھانہ ہے اور ایشیاء کے لئے یورپ کا دھانہ مصر ہے تو ادھر کے لئے ادھر دھانہ اور ادھر کے لئے ادھر دھانہ، اس دھانے پر جو غالب ہوگا اسی کے اثرات غالب ہوں گے اگر ایشیاء مصر پر غالب ہے تو یورپ تک اثرات پہنچیں گے اور اگر یورپ نہر سویز اور مصر پر غالب ہوگیا تو پورے ایشیاء پر یورپ کے اثرات پہنچیں گے۔ اس لئے احادیث سے اشارے ملتے ہیں کہ مصر کو

---

[۱] پارہ ۱، سورۃ البقرۃ، الآیۃ: ۱۲۵

[۲] پارہ: ۲۱، سورۃ العنکبوت، الآیۃ: ۶۷

قوت گاہ بناؤ اور مرکز عسکری قرار دو، شام کو مرکزِ سیاست قرار دو۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس جنگوں کے بیچ میں رہا ہے، کبھی ہم غالب، کبھی یہودی غالب، کبھی نصرانی غالب، ایک جنگ ختم ہوتی ہے دوسری چھڑ جاتی ہے۔ وہ مرکز عبادت بنتا تو عبادت کا کارخانہ کبھی نہ جم سکتا، رات دن جنگیں اور جوڑ توڑ رہتا تو عبادت کا مرکز حجاز کو قرار دیا، اسے امن بخشا، سیاست کا مرکز شام کو قرار دیا کہ یہاں لڑتے مرتے رہو، جو بھی غالب آجائے۔

اسلام کی بقاء تبلیغ میں ہے:

بہر حال دین کی تبلیغ، یہ بھی امن کی چیز ہے، بدامنی میں تبلیغ بھی مشکل ہوتی ہے، جیسے نماز پڑھنی مشکل تو ملک (حجاز) زیادہ احق ہے کہ مرکزِ تبلیغ بنے۔ یہیں سے اللہ کے دین کی آواز اُٹھے، جیسا کہ یہاں سے دین اُٹھا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ علماء نے اس کو سمجھا ہے اور کام چل رہا ہے۔ تو ہم سب کا فرض ہے کہ اس کام میں شرکت کر کے قوت پہنچائیں، اس لئے کہ اس کی قوت سے ہماری قوت ہے۔ اسلام کی قوت جو ہے وہ پھیلنے میں ہے، سکڑنے میں نہیں ہے۔ اگر اسلام کو آپ کسی کوزے میں بند کر کے رکھ دیں وہ پھیل نہ سکے گا، اسلام کی اصلیت ختم ہو جائے گی، اسلام میں جامعیت اور پھیلاؤ ہی ہے، وہ جبھی اپنی اصلی صورت میں رہے گا جب کہ وہ دنیا کے اندر پھیلتا رہے ''لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ'' اس کے اندر جماعتی رنگ رہنا چاہئے اگر یہ تبلیغی دین نہ ہوتا تو حجاز سے باہر نہ نکلتا لیکن یہ ساری دنیا میں پھیلا ہے، یہ تبلیغ ہی کی برکت ہے۔ اس لئے کہ جب یہ دین کا مرکز ہے تو تبلیغ کا مرکز بھی ہے۔[1]

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

---

[1] از حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ بتغیر و تسہیل

''اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ''۔(القرآن)

تاریخ وبناءِ بیت اللہ

اور

دعواتِ سیدنا ابراہیم علیہ السلام

تاریخ وبنا بیت اللہ اور دعواتِ سیدنا ابراہیم علیہ السلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِاسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ، فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔[1]

سیدنا آدم علیہ السلام اور تعمیرِ بیت اللہ:

جب حضرت آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر آئے اور انہوں نے فرشتوں کی آوازیں اور ان کی تسبیحات کو سنا تو انہیں گھبراہٹ ہونے لگی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے بارے میں التجا کی تو اللہ تعالیٰ نے جنت کے یاقوتوں میں سے ان کے لئے ایک یاقوت نازل کیا جو کہ اب بیت اللہ کی جگہ پر نصب ہے، پھر فرمایا کہ اے آدمؑ! میں نے آپ کے لئے ایک گھر تیار کیا ہے، تاکہ آپ اس کا طواف کریں، جیسا کہ میرے عرش کا طواف کیا جاتا ہے۔ اور اس گھر میں نماز پڑھیں، جیسے کہ آپ میرے عرش کے پاس نماز پڑھا کرتے تھے۔ تو پھر حضرت آدم علیہ السلام مکہ تشریف لائے، بیت اللہ کو دیکھا اور اس کا طواف کیا۔

حضرت ابوصالح رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف وحی نازل کی اور فرمایا کہ میرا حرم میرے عرش کے بالکل مقابل ہے، آپ چلیں اور اس میں میرے لئے ایک گھر بنائیں، اور پھر اس کا طواف کریں، جیسا کہ آپ نے فرشتوں کو میرے عرش کا طواف کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس جگہ پر میں آپ کی بھی دعائیں قبول کروں گا اور آپ کی اولاد میں سے ان لوگوں

---

[1] آل عمران: ۹۶، ۹۷

کی بھی دعائیں قبول کروں گا جنہوں نے میری اطاعت اور فرمانبرداری کی ہوگی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے ربّ! مجھ سے یہ سب کیسے ہوگا؟ نہ ہی مجھ میں یہ سب کرنے کی طاقت ہے اور نہ ہی مجھے اس کے بارے میں معلومات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے لئے ایک فرشتے کو مقرر فرمایا جو حضرت آدم علیہ السلام کو مکہ کی جانب لے کر چلا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام ایک نہایت سرسبز وشاداب اور آنکھوں کو لبھانے والی جگہ سے گزرے تو فرشتے کو کہا کہ مجھے یہیں اتار دو، فرشتے نے ان سے کہا آپ کے اترنے کی جگہ یہ نہیں کوئی اور ہے۔ یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے، تو جس جگہ آپ اترے وہاں آبادی ہوگئی، اور جس جگہ آپ کے قدم نہ لگے اور آپ وہاں سے تجاوز کر کے آگے بڑھ گئے، وہاں جنگل اور ویرانی باقی رہ گئی۔

پھر آپ نے بیت اللہ کی تعمیر فرمائی، جب آپ بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوگئے تو فرشتہ آپ کو عرفات کے مقام پر لے گیا اور وہ سارے مناسک دکھائے جو تمام لوگ آج کے دن کریں گے۔ پھر واپس مکہ تشریف لائے اور ایک ہفتے تک بیت اللہ کا طواف کرتے رہے، پھر اس کے بعد ہندوستان کے علاقے میں واپس لوٹ آئے۔

سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حج مبرور:

حضرت آدم علیہ السلام جب مکہ آئے تو فرشتوں نے اُن سے ملاقات کی اور کہا اے آدمؑ! حج مبرور نصیب ہو، ہم تو آپ سے دو ہزار سال پہلے اس بیت اللہ کا حج کر چکے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ تم اس بیت اللہ کا چکر لگاتے وقت کیا کہتے تھے؟ فرشتوں نے عرض کیا کہ ہم یہ کہتے تھے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ

جب حضرت آدم علیہ السلام نے طواف کیا تو آپ نے بھی یہی کلمات کہے، اور سات ہفتے تک بیت اللہ کا طواف کرتے رہے، جن میں سے پانچ ہفتوں تک رات میں طواف کیا اور باقی دو ہفتے دن میں طواف کیا۔

پھر حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ اے میرے ربّ! میری اولاد میں سے کچھ ایسے زیارت

کرنے والے لوگ پیدا فرما جو تیرے اس گھر کی زیارت کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی کی اور فرمایا میں آپ کی اولاد میں سے ایک نبی کے ذریعے اس جگہ کو آباد کرنے والا ہوں جن کا نام ابراہیم ہے، ان کو میں نے اپنا دوست بنایا ہے، اس کے ہاتھوں سے میں اس کی تعمیر کرواؤں گا، اور اس کے لئے پانی نکالوں گا، اور ان کو اس بیت اللہ کی جلالت وحرمت اور اس کے تمام مقامات کا وارث بناؤں گا، اور اس کے تمام مناسک اور مشاعر کے بارے میں ان کو تعلیم دوں گا۔

امن وایمان کی خوشخبری:

اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا اور کہا کہ اے میرے پروردگار! میں اپنی اولاد میں سے اس شخص کے لئے جو اس گھر میں وفات پائے اور اس نے تیرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، اس کے لئے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ اس کو میرے ساتھ جنت میں داخل کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے آدمؑ! جو شخص بھی حرم میں اس حال میں مرے کہ اُس نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو تو میں اسے قیامت کے دن امن اور ایمان کی حالت میں اُٹھاؤں گا''۔

ابو یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ جو کہ ایک تاجر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ اُسے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ حدیث سنائی ہے:

''جب آدم علیہ السلام ہندوستان کی سرزمین پر اُترے تو انہوں نے چالیس حج پیدل کیے۔ میں نے اُن سے کہا اے ابوحجاج! وہ سواری پر سوار کیوں نہیں ہوئے؟ تو فرمایا کہ وہ کس چیز پر سوار ہوتے، وہ اتنے طویل القامت تھے کہ کیسے کسی چیز پر سوار ہو سکتے تھے، (اللہ کی قسم! ان کا ایک قدم تین دن کی مسافت پر پڑتا تھا)۔''

حضرت وہب بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر تشریف لائے اور زمین کی وُسعت کو دیکھا لیکن اپنے علاوہ کسی اور کو اس میں نہ پایا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کی اے میرے پروردگار!

میرے علاوہ اس زمین کو آباد کرنے والا کوئی اور کیوں نہیں ہے جو کہ تیری تسبیح کرے اور تیری پاکی بیان کرے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں اس زمین میں تیری اولاد کو پیدا کروں گا، جو میری تعریف کرے گی اور میری پاکیزگی کو بھی بیان کرے گی، اور عنقریب میں اس زمین میں ایسے گھر بھی بناؤں گا (یعنی مساجد) جن میں میرا ذکر کیا جائے گا اور میری تخلیق کی تسبیح کی جائے گی، اور اُن مساجد میں میرا نام لیا جائے گا۔

اور ان گھروں (مساجد) میں سے ایک ایسا گھر بناؤں گا جو میری کرامت کے ساتھ خاص ہوگا، اسے میں اپنا نام دوں گا اور وہ میرا گھر ہوگا جو میری عظمت پر دلالت کرے گا، اور میں اپنا جلال اس پر ظاہر کروں گا، پھر میں اس کو ایسا امن والا بناؤں گا جو اپنے اردگرد کی حرمت کی وجہ سے محترم ہوگا۔ جو شخص اس کی حرمت کا احترام کرے گا تو اس کے لئے میں اپنی کرامت کو واجب کردوں گا، اور جو اس حرم والوں کو ڈرائے گا تو وہ میرے دین کو ضائع کرے گا، میرے ذمے کو توڑ دے گا اور میری حرمت کو مباح بنادے گا۔ میں اس کو وہ پہلا گھر قرار دوں گا جو ایسے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے جو دبلی پتلی اونٹیاں لے کر آئیں گے: وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ اور چلاتے ہوئے تلبیہ پڑھیں گے، اور گڑگڑاتے ہوئے روئیں گے اور دور دراز کے راستوں سے تکبیر کہتے ہوئے آئیں گے۔

جو شخص اس حرم کو مقدم رکھے گا اور اس کے علاوہ کی طرف التفات نہیں کرے گا تو گویا کہ اس نے میرا قصد کیا، اور میرا دیدار کیا، اور میری مہمانی کی، (اور چونکہ میں کریم ذات ہوں) اس لئے کریم ذات پر حق ہے کہ وہ اپنے وفد کا اور اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور فضل نازل کرے، اور اس کے ذریعے ہر ایک اپنی حاجت کو پورا کرے۔

اے آدمؑ! جب تک آپ زندہ ہیں آپ اس حرم کو آباد رکھیں گے، پھر اس کے بعد آپ کی اولاد میں سے باقی قومیں (امتیں) اور نسلیں اور انبیاء علیہم السلام امت در امت اور نسل

درنسل اس کو آباد رکھیں گے۔

اس طرح کعبۃ اللہ کی ابتداء ہوئی، اللہ ربُّ العزت اس کی حفاظت فرمائے، آمین۔

طوفانِ نوح اور بناءِ ابراہیمی:

پھر کعبۃ اللہ پر طوفان کا زمانہ آیا، ان دنوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا تا کہ وہ حجرِ اسود کو جبل ابی قبیس نامی پہاڑ میں چھپادیں تا کہ وہ طوفان میں غرق ہونے سے محفوظ ہو سکے۔

پس بیت اللہ کی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے تک خالی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہما السلام کی ولادت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ اللہ ربُّ العزت کے لئے ایک ایسا گھر تعمیر کریں جس میں اس کی عبادت کی جائے اور اس کا نام لیا جائے۔ (لیکن) حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ بیت اللہ کس جگہ بنائیں، چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے بارے میں سوال کیا کہ اس بارے میں ان کو بتایا جائے؟

اب علماء کرام نے اس بیان کی کیفیت میں اختلاف کیا ہے، ایک گروہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر سکینہ نازل کی تا کہ وہ ان کو بیت اللہ کی جگہ کی جانب رہنمائی کر سکے، جیسا کہ سماک بن حرب نے خالد بن عرعرہ سے نقل کیا ہے کہ ایک آدمی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑا ہوا اور کہا کہ آپ مجھے بیت اللہ کے بارے میں بتایئے کہ کیا یہ وہی بیت اللہ ہے جو لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے؟ (اور جس کا ذکر قرآن میں اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ سے کیا گیا ہے)؟ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں، لیکن یہ وہ پہلا گھر ہے جو بنایا گیا ہے، اس میں برکت ہے اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو بھی رکھا گیا ہے، (یعنی مقامِ ابراہیم کو)۔ اور جو شخص اس میں داخل ہوگا وہ مامون ہوگا اور اگر تو چاہے تو میں تجھے بتاؤں کہ وہ کیسے تعمیر کیا گیا؟

اس کی کیفیت یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ میرے لئے زمین میں ایک گھر بناؤ، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل ذرا تنگ ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی رحمت سکینہ نازل فرمائی، سکینہ وہ ایک مخفی ہوا ہے جس کے دو سر تھے،

پس ان میں سے ایک سر دوسرے کے پیچھے چلا، یہاں تک کہ وہ دونوں مکہ مکرمہ پہنچے، پس اس سکینہ نے بیت اللہ کی جگہ کو ایسے ڈھانپ لیا جیسے ڈھال انسان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ جس جگہ یہ سکینہ ٹھہر گئی ہے یہاں بیت اللہ کی تعمیر کرو، تو انہوں نے بیت اللہ کو بنایا۔

علماء کے دوسرے گروہ نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرف بیت اللہ کی پیائش کے برابر ایک بادل بھیجا، پھر وہ بادل ان کے ساتھ چلا یہاں تک کہ وہ مکہ پہنچ گئے، پھر وہ بادل بیت اللہ کی جگہ پر ٹھہر گیا، پھر آواز آئی کہ اس کے سائے کی جگہ تعمیر کریں اور اس سے کمی بیشی نہ کریں۔

اور بعض حضرات نے کہا کہ جو شخص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ شام سے چلا تھا تا کہ وہ ان کی بیت اللہ کی جگہ تک رہنمائی کرے، وہ جبرئیل علیہ السلام تھے، اسی کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ.... الاٰية''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کرنا شروع کی اور حضرت اسماعیل علیہ السلام انہیں پتھر پکڑاتے جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام عبرانی تھے اور اسماعیل علیہ السلام عربی تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک دوسرے کی زبان کا الہام کیا (تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں) حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے تھے هَبْ لِيْ كَيْنًا 'یعنی مجھے پتھر لا کر دو'، حضرت اسماعیل علیہ السلام فرماتے تھے هَاكَ فَخُذْهُ ''کہ یہ لیجئے''، پس ان دونوں حضرات نے پانچ پہاڑوں کے پتھر سے (کعبۃ اللہ) کی تعمیر کی، وہ پانچ پہاڑ یہ ہیں:

۱۔طور سیناء ۲۔طور زیتا ۳۔لبنان ۴۔جودی ۵۔حراء

راوی کہتے ہیں کہ ایک پتھر کی جگہ رہ گئی، حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کو تلاش کرنے کے لئے گئے، پھر واپس آئے تو دیکھا کہ پتھر اپنی جگہ پر جوڑ دیا گیا ہے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے کہا کہ ایک خوبصورت سا پتھر لے کر آؤ جس کو میں بیت اللہ کے ایک کنارے پر لگا دوں تا کہ وہ لوگوں کیلئے نشانی اور علامت بن سکے، یکا یک جبل

ابوقبیس سے آواز آئی کہ اے ابراہیم! میرے پاس آپ کیلئے ایک امانت ہے، آپ آیئے اور اسے لے جایئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حجرِ اسود کو جبل ابی قبیس سے نکالا اور اسکو اپنی جگہ پر نصب کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آبادی کی بقاء کیلئے دعا فرمائی:

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ یعنی اس شہر کے رہنے والوں کو روزی دے، ثمرات مختلف قسم کے ہوں تا کہ لوگ میوے کھانے کے شوق کی وجہ سے اس خشک جنگل کو چھوڑ کر میوہ دار علاقوں کی طرف نہ جائیں۔

اس دعا کو اللہ تعالیٰ نے بایں صورت قبول فرمایا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام شہر طائف کو زمین فلسطین اور شام سے اپنے پروں پر اُٹھالائے اور اس کو خانہ کعبہ کے اردگرد سات بار طواف کرایا، اسی لئے اس شہر کا نام طائف رکھا گیا۔ اس کے بعد مکہ سے تین دن کی مسافت پر پہاڑ کے اوپر اس شہر کو رکھ دیا اور اس کی آب وہوا کو اپنی اصل وضع پر باقی رکھا اور یہ قصہ عجائبات قدرتِ الٰہی سے ہے، اس لئے کہ مکہ کے قیام میں گرم ہوا چلنے اور پتھروں کی تپش کی وجہ سے ایک سخت حالت معلوم ہوتی ہے، جو لوگ مکہ سے طائف آتے ہیں تو اس کی آب وہوا بعینہ سرد ممالک کی طرح پاتے ہیں اور سرد ممالک کے دوسرے میوے بکثرت موجود رہتے ہیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کی دوسری صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کے دلوں میں مکہ معظمہ اور اس کے رہنے والے لوگوں کی طرف عظیم کشش پیدا کی جو ہر طرف سے اجناس وغلات اور پھل لا کر مکہ پہنچاتے ہیں مصر، ہند، سندھ، فارس اور بصرہ سے جہاز کے جہاز بھر کر آتے ہیں اور خالی واپس جاتے ہیں، اس واسطے مکہ معظمہ میں ہر ملک کا عمدہ مال پایا جاتا ہے۔

یہ دعا کرتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد آیا کہ میں نے اپنی اولاد کیلئے امامت طلب کی تھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا تیری اولاد میں سے ظالموں کو امامت نہ پہنچے گی، اس لئے اس کی موافقت کرتے ہوئے طلب رزق میں تخصیص کر کے کہا کہ میں طلب رزق میں مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ کو خاص کرتا ہوں یعنی اس شخص کو جو اس شہر والوں میں سے ایمان لایا ہو اللہ پر اور آخرت پر، تا کہ ان کے غیر بے معاشی کی وجہ سے اس شہر میں سکونت نہ کر سکیں اور کوئی کافر اس شہر میں اقامت نہ کر سکے،

تاکہ یہ شہر کفر اور بت پرستی کی آلودگی سے خالی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ روزی کو امامت پر قیاس مت کرو، اس لئے کہ امامت تو نبوت کی نیابت ہے لہٰذا صاحبِ امامت ظالم اور ستمگار نہیں ہونا چاہیے اور روزی تو پرورش الٰہی کے قبیل سے ہے اور اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے مومن و کافر، ظالم و عادل اور صالح و فاسق سب کی پرورش کرتا ہے، البتہ ایمان والوں کا دنیا میں رزق آخرت کے رزق کے ساتھ ملا ہوا ہے، پس گویا کہ مومن ابتدائے پیدائش سے ابدالآبدین تک مرزوق ہے۔

تعمیرِ بیت اللہ کے بعد ربّ کے حضور دعا مانگنا:

پس جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے اور اسے مکمل کر دیا تو انہوں نے اپنے ربّ کے حضور دعا مانگی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ [1]

اُس وقت کا تصور کرو جب ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے، اور اسماعیل علیہ السلام بھی (ان کے ساتھ شریک تھے، اور دونوں یہ کہتے جاتے تھے کہ) ''اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا مکمل فرمانبردار بنالے، اور ہماری نسل سے بھی ایسی اُمّت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو۔ اور ہم کو اپنی عبادتوں کے طریقے سکھادے، اور ہماری دعا قبول فرمالے۔ بیشک تو، اور صرف تو ہی معاف کر دینے والا خوگر (اور) بڑی رحمت کا مالک ہے۔

---

[1] البقرۃ: ۱۲۷، ۱۲۸

قواعد کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کی آراء:

اکثر مفسرین نے قواعد کی تفسیر اساس اور بنیاد کے ساتھ کی ہے، اس صورت میں رفع قواعد معقول نہیں، اس لئے کہ تعمیر کرنے والا بنیاد کو اپنی جگہ سے بلند نہیں کرتا بلکہ اس بنیاد کے اُوپر دیواروں کو چنتا ہے، مگر یہ کہ مخالفت روایات کا ارتکاب کہا جائے اور یہ کہا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تہ زمین سے بھی خانہ کعبہ کی بنیاد کو اُٹھا کر روئے زمین تک بلند کیا، یا یہ کہا جائے کہ بنیاد کو بلند کرنے کا مجازی معنی یہ ہے کہ اس بنیاد کے اُوپر دیواریں بنائی جائیں۔

بعض مفسرین نے کہا کہ قواعد سے مراد پتھر اور اینٹ کی لائنیں ہیں کہ ہر نیچے والی لائن اُوپر والی لائن کیلئے بنیاد کی طرح ہے، اسی لئے لغت عرب میں اور لائنوں کو ساقات البناء اور ہندی میں رَدّہ کہتے ہیں، اگرچہ ان لائنوں کیلئے اپنی جگہ سے رفع حقیقی متصور نہیں ہوسکتا، لیکن بنیاد کے اعتبار سے اس تمام کو رفع حقیقی حاصل ہے۔

لیکن اصح یہ ہے کہ قواعد سے مراد دیواریں ہیں، اس لئے کہ لفظ قاعدہ عربی زبان میں بمعنی ستون کے بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے اور دیواریں چھت کیلئے بمنزل ستون کے ہوتی ہیں۔ بالخصوص جب ان دیواروں کے درمیان کوئی دروازہ کھولیں تو اس صورت میں یہ ستونوں کیساتھ کمال مشابہت رکھتی ہے۔

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ:

ظاہر عبارت یوں تھی کہ کہا جاتا وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاھِیْمُ قَوَاعِدَ الْبَیْتِ اس عبارت میں جو کہ اَلْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ ہے بلاغت کا کونسا لطف ہے؟

جواب: اگر لفظ مِنْ بیان کیلئے ہے تو اس عبارت کا مدلول تبیین بعد الابہام ہے، اس لئے کہ اس کلام کے حاصل معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بلند کرتے تھے دیواروں کو اور وہ دیواریں خانہ کعبہ کی تھیں، پس اس سے خانہ کعبہ کی تعظیم حاصل ہوئی جو کہ قَوَاعِدَ الْبَیْتِ سے حاصل نہیں ہوتی۔

اور اگر لفظ مِنْ تبعیض کیلئے ہے تو اس عبارت کا لانا یہ سمجھانے کیلئے ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تمام خانہ کعبہ کو بنیاد سے تعمیر نہیں کیا، بلکہ خانہ کعبہ کے اجزاء میں سے صرف دیواروں کو تعمیر کیا جبکہ بنیاد پہلے سے موجود تھی۔

فائدہ: حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام کلام پوری ہونے کے بعد لانے کی وجہ:

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کلام پورا ہونے کے بعد کیوں لائے ہیں، درمیان کلام میں کیوں درج نہیں فرمایا کہ عبارت اس طرح ہوتی: وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرَاهِیْمُ وَ اِسْمَاعِیْلُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ اس کا جواب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شرکت برابر کی نہ تھی، بلکہ ایسی تھی جیسے تابع کی شرکت متبوع کیساتھ ہو اور خادم کی شرکت مخدوم کیساتھ ہو۔ اس کی دو وجہ ہیں: اوّل یہ کہ خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم اصالۃً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہوا تھا جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اصالۃً مامور نہیں تھے، بلکہ انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کہا تھا۔ دوم یہ کہ رفع قواعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل ہے نہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بمنزل مزدور کے تھے، پتھر لاتے تھے۔

اور عمارت کو عرف میں حکم کرنے والے کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا بنانے والے کی طرف، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ اس قلعہ کو فلاں بادشاہ نے تعمیر کیا ہے یا اس دیوار کو فلاں معمار نے بنایا ہے، مزدور کی طرف تعمیر کی نسبت عرف میں نہیں کی جاتی۔ اس فرق کو ظاہر کرنے کیلئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام درمیان کلام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ درج نہیں فرمایا، تاکہ مساوات کی شرکت نہ سمجھی جائے۔ البتہ دعا میں دونوں مساوات کی شرکت رکھتے تھے کیونکہ دونوں برابر اپنی محنت کے قبول ہونے کے آرزومند تھے اور اپنی اولاد کیلئے اللہ تعالیٰ کی عنایت کے خواہشمند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دعا کی حکایت کرتے ہوئے متکلم کا صیغہ ارشاد فرمایا:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے، بے شک تو اور صرف تو ہی ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کی جاننے والا ہے۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا یعنی ہمیں ہماری عبادت کے مکان دکھلا جو اس گھر سے متعلق ہیں، اور اس عبادت کا وقت اور عبادت کی کیفیات اور وہ اسرار جو اس کے ضمن میں مخفی ہیں گویا ان چیزوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے ظاہر کر دے تاکہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور اپنی اولاد کو بھی اس کا حکم کریں۔

قبول اور تقبّل میں فرق:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تعمیرِ بیت اللہ کے بعد دُعا کرتے ہوئے قبول کی بجائے تقبّل کا لفظ استعمال کیا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز قبول ہونے کی لیاقت رکھتی ہو اس جگہ قبول کا لفظ بولا جاتا ہے اور اگر چیز ناقص ہو اور اس قابل نہ ہو کہ اس کو قبول کیا جائے تو اس جگہ تقبل کا لفظ بولا جاتا ہے اس لئے کہ تقبل کا معنی بتکلف قبول کرنا ہے اور بتکلف قبول کرنا وہاں ہوتا ہے جہاں چیز قبولیت کی لیاقت نہ رکھتی ہو۔

پس اس لفظ میں کمال کسر نفسی، تواضع اور اپنے عمل کی کوتاہ بینی (ناقص سمجھنا) ہے گویا معنی یہ ہے کہ ہماری خدمت قبولیت کے لائق تو نہیں مگر تو محض اپنے فضل اور مہربانی سے اسے قبول فرمالے۔ اس طرح کسر نفسی اور تواضع آپ ﷺ سے بھی منقول ہے۔ دارِ قطنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ روزہ افطار فرماتے تو کہتے: **اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْنَا وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْنَا فَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ**۔ اے اللہ! ہم نے آپ کے حکم پر روزہ رکھا اور آپ کے رزق سے افطار کیا، پس آپ اِسے قبول فرمالیں۔ بے شک آپ اور صرف آپ ہی ہر ایک کی سننے والے، ہر ایک کو جاننے والے ہیں۔

فائدہ نمبر ۱:

یہ بات کس قدر ذہن میں بٹھانے کے لائق ہے کہ اللہ کے دو پیارے، اللہ کے دونوں پیغمبر خلیل اللہ اور ذبیح اللہ علیہما السلام اللہ کا گھر اللہ کے حکم سے بنا رہے ہیں۔ اُن کے اخلاص میں ذرا بھی شبہ نہیں پھر بھی وہ دونوں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہم سے قبول فرمایئے، اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص کیسا ہی مخلص ہو اور کیسا ہی عمل صالح کرے اُسے اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے رہنا چاہئے، اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں خود پسندی اور عجبِ نفس میں مبتلا نہ ہو جائے، درحقیقت اہلِ اخلاص کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کام کرتے جاتے ہیں اور ڈرتے جاتے ہیں کہ ہمارا یہ عمل قبول ہوتا ہے یا نہیں؟ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى: ''**وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ**''۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمان ہے کہ ''عارفین نیک عمل کر کے بھی لرزتے ہیں''۔

فائدہ نمبر ۲:

جاننا چاہیے کہ بارگاہِ الٰہی میں وہی عبادت اور خدمت مقبول ہے کہ جس کو کرنے والا دل وجان سے قابل قبول نہ سمجھے اور کرنے والے کی نظر اپنے عمل پر نہ ہو بلکہ اس کے لطف اور فضل پر ہو۔

فائدہ نمبر ۳:

ان دونوں بزرگوں نے اپنی فراست صادقہ اور نورِ نبوت سے یہ سمجھا کہ جب ہم کو ایسے خانہ تجلی آشیانہ کی تعمیر کا حکم ہوا ہے تو لامحالہ اس کے ہمرنگ کسی ایسی عبادت کا بھی حکم ہونے والا ہے جو عشق اور محبت کا رنگ لئے ہوئے ہو۔ اور ان عبادتوں کا بجالانے والا صورۃً اگرچہ انسان ہوگا مگر معنی ہمرنگ ملائک ہوگا گویا کہ دربارِ الٰہی کا معائنہ اور مشاہدہ کر رہا ہے اور جس اُمت کے لئے اس گھر کو قبلہ بنایا جائے گا اس کو ایسے جدید وضع کے کچھ احکام دیئے جائیں گے جن کے اسرار وحکم ظاہر نظر میں جلوہ گر نہ ہوں گے، ظاہر پرست ان کو صورت پرستی پر محمول کریں گے اس لئے ان دونوں بزرگوں کو اندیشہ ہوا کہ مبادا ہماری ذریت اور اولاد ان جدید وضع کے احکام کے نزول پر اُن کے قبول میں کسی قسم کا توقف اور تردّد کرے اس لئے جنابِ الٰہی میں چند دُعائیں فرمائیں:

اُمّتِ مسلمہ کے لئے دعا اور اُس کی قبولیت:

پہلی دعا: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

''اے اللہ! ہم کو اپنا مسلم اور حکم بردار بندہ بنا''۔ ''اور ہماری ذریت میں ایک اُمتِ مسلمہ پیدا فرما یعنی ایسی اُمت اور ایسی قوم پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور نام بھی اس قوم کا مسلم اور مسلمان ہو یعنی صفت بھی اس کی اسلام یعنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ہو اور اسی نام یعنی اسلام سے پکاری جاتی ہو''۔

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دعا بھی کی کہ اے ہمارے ربّ! تُو ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری ذرّیت میں سے بھی ایک اُمّت بنا دے جو تیری فرمانبردار ہو، اس میں اوّل تو وہی خوف وخشیت والی بات کا مظاہرہ کیا کہ مسلم اور فرمانبردار ہوتے ہوئے بھی اپنے بارے

میں دعا کی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا فرمانبردار ہی رکھے۔ مؤمن کو چاہئے کہ ڈرتا رہے اور ایمان واسلام کی دولت کے لئے اللہ تعالیٰ کا ہمیشہ شکرگزار رہے اور اس کو محض اللہ کی توفیق سمجھے اور اس نعمت کی بقاء اور دوام کی دعا کرتا رہے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اپنی ذرّیت میں سے اُمّت مسلمہ کے پیدا ہونے کی دعا کی، کیونکہ ارشادِ الٰہی لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ سے معلوم ہو چکا تھا کہ اُن کی ساری ذرّیت مؤمن نہ ہوگی اس لئے انہوں نے یوں عرض کیا کہ اے ہمارے ربّ! ہماری ذرّیت سے اُمتِ مسلمہ بنا دینا۔ بعض حضرات کا فرمانا ہے کہ اس سے عرب مراد ہیں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

توجہ طلب بات:

اس سے معلوم ہوا کہ مومن بندوں کو اپنے دین وایمان کی فکر رکھتے ہوئے اپنی نسل اور ذرّیت کے دین وایمان کے لئے بھی فکرمند ہونا چاہئے اور یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ ہماری نسل میں موحّدین، مومنین، مخلصین، متقین باقی رہیں۔ سورۂ فرقان میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا [۱] اور وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ ہماری بیویوں اور ہماری اُولاد کی طرف سے ہمیں آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا پیشوا بنا دے، اور سورۂ تحریم میں فرمایا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا [۲] اے ایمان والو! بچاؤ اپنی جانوں کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ سے۔ اہل وعیال کے دین وایمان کے لئے دعا بھی کرنا چاہئے اور فکر بھی کرنا چاہئے۔

مناسکِ حج کی تعلیم:

دوسری دعا: وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

---

[۱] الفرقان: ۷۴

[۲] التحریم: ۶

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو قبول فرمایا اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان دونوں کے پاس بھیجا تا کہ وہ انہیں مناسکِ حج کی تعلیم دیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام ان دونوں حضرات کو یوم ترویہ (۸ ذی الحجہ) میں لے کر منیٰ کی طرف چلے اور ان کو ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں پڑھائیں، پھر ان دونوں کے ساتھ رات بسر کی یہاں تک کہ صُبح ہوگئی تو پھر ان کو صُبح کی نماز پڑھائی، پھر ان کو عرفات کے مقام کی طرف لے کر نکلے اور ان کو وہاں کھڑا کر دیا یہاں تک کہ جب سورج ڈھلنے لگا تو انہیں ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی پڑھائیں، پھر شام کے وقت ان کو عرفات کے میدان میں جو ٹھہرنے کی جگہ ہے وہاں پر لے کر چلے اور ان کو اس جگہ ٹھہرایا جہاں آج کل لوگ وقوفِ عرفہ کرتے ہیں۔

جب سورج غروب ہوا تو جبرائیل علیہ السلام ان دونوں حضرات کو لے کر مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں پر مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھائیں، پھر وہاں رات گزاری یہاں تک کہ فجر کا وقت ہوگیا (صُبح ہوگئی) پھر ان کو صُبح کی نماز پڑھائی اور مقام قزح میں ان کو ٹھہرا دیا۔ جب صُبح خوب روشن ہوگئی تو جبرائیل علیہ السلام ان دونوں حضرات کو لے کر منیٰ کی جانب واپس لوٹے اور ان کو دکھایا کہ کیسے وہ دونوں حضرات شیطان کو کنکریاں ماریں گے، پھر ان کو قربانی کا حکم دیا اور ان کو منیٰ میں قربانی کرنے کی جگہ دکھلائی اور ان کو سر منڈوانے کا حکم دیا، پھر اس کے بعد ان حضرات کو لے کر واپس بیت اللہ آ گئے۔

اعلانِ حج:

حَجَّ اِبْرَاهِيْمُ وَاِسْمَاعِيْلُ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ وَهُمَا مَاشِيَانِ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے حج کیا درانحالیکہ وہ دونوں پیادہ تھے"۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حج سے فارغ ہو گئے تو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہُوا کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کیلئے حج کی اذان دو یعنی حج کے بارے لوگوں میں اعلان کرو، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ! میری آواز کس کس کے کان تک پہنچے گی؟ لوگ تو اطرافِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حکم ہوا کہ اذان دینا (اعلان کرنا) تمہارے ذمہ ہے اور اس آواز کا پہنچانا ہمارے ذمہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اس پتھر پر کھڑے ہوئے جو مقامِ ابراہیم کے نام سے مشہور ہے، خانہ کعبہ کی

تعمیر بھی انہوں نے اس پتھر پر کھڑے ہوکر کی تھی، وہ پتھر اتنا بلند ہوا کہ کوہ ابوالقبیس اور دوسرے پہاڑوں سے بھی بلند ہو گیا۔ اس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بآوازِ بلند تین بار کہا اے لوگو! تمہارے اللہ نے زمین میں ایک گھر بنایا ہے اور تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اس گھر کے حج کیلئے آؤ، چاہے تم سوار ہو یا پیادہ۔ اللہ تعالیٰ نے وہ آواز جہان میں جتنے لوگ موجود تھے ان تک پہنچائی اور ان ارواح تک بھی پہنچائی جو ماں کے پیٹ اور باپ کی پشت میں تھیں، کسی نے ایک بار لبیک کہا، کسی نے دو بار، کسی نے زیادہ اور کسی نے اجابت نہ کی۔ جس نے اجابت نہ کی اس کو بیت اللہ کے حج کی توفیق نہ ہوئی اور جس نے ایک بار لبیک کہا وہ ایک بار حج کرتا ہے اور اسی طرح قیاس کرلیں۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عبید بن عمیر سے فرمایا کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یمن، مشرق، مغرب اور شام کی طرف رُخ کیا اور حج کی دعوت دی تو جواب آیا: ''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ''، جس کے بارے میں ارشاد باری بھی ہے: وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَأْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّأْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ۔[1]

چنانچہ ان کے بعد موحدین برابر حج کرتے رہے اور ان کے حجوں میں توحید کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ جب ان ہی کی نسل اور ذرّیت میں مشرکین پیدا ہو گئے اور وہی کعبہ شریف کے متولی بنے تو ان لوگوں نے حج میں شرک کی آمیزش کردی اور حج کے احکام بدل دیئے، حج کا مہینہ بدل دیتے تھے، عرفات ہی میں نہیں جاتے تھے، مزدلفہ سے واپس آجاتے تھے۔ بعض قبائل بیت اللہ شریف کا ننگے طواف کرتے تھے۔ جب حضور اقدس ﷺ نے مکہ فتح کیا اور مکہ سے مشرکین کا تسلط ختم ہوا تو آپ نے اعلان کروادیا کہ آئندہ کوئی شخص بیت اللہ کا ننگے طواف نہ کرے اور کوئی مشرک حج نہ کرے۔ پھر آپ نے ۱۰ھ میں حج کیا جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں اور اُس میں پوری طرح حج کے احکام سکھائے اور بتائے اور حکم فرمایا کہ خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ (یعنی تم مجھ سے احکام حج سیکھ لو) اور یہ بھی فرمایا:

قِفُوْا عَلٰی مشاعر کم فانکم علی ارث من ارث ابیکم ابراھیم

---

[1] الحج: ۲۷

علیہ السلام کہ تم لوگ انہیں جگہوں میں وقوف کرو جو پرانی جگہیں معروف ہیں کیونکہ تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی میراث پر ہو۔[۱]

جس کسی کو بھی حج یا عمرہ کرنا ہو اس کو لازم ہے کہ حج اور عمرہ کے احکام معلوم کرے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ حج اور عمرہ کے لئے چل دیتے ہیں اور ذرا بھی ان کے احکام معلوم نہیں کرتے، تلبیہ تک نہیں جانتے، فرائض وواجبات تک چھوڑ دیتے ہیں اور جب کوئی عالم بتانے لگتا ہے تو اس کا بتانا ناگوار ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ من الجهل والسفاهة والحمق والضلالة۔

وَتُبْ عَلَيْنَآ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ:

سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں، ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اور ارزقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تاریخ میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے اسی طرح نقل کیا ہے:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ اندیشہ ہوا کہ بیت اللہ کے مناسک احرام سے لے کر سر کے حلق تک افعال کثیرہ شاقہ (مشکل) طویلۃ المدۃ پر مشتمل ہوں گے اور لامحالہ ان افعال میں کوئی سہو اور کوتاہی ہو جائے گی اس لئے دوسری دعا کی اور کہا وَتُبْ عَلَيْنَا یعنی خانہ کعبہ کے مناسک میں ہم سے اور ہماری اولاد سے اگر کوتاہی ہو جائے تو ہمیں معاف فرما اور اس کوتاہی کے کفارہ سے بھی ہمیں آگاہ کرتا کہ ہم اس کا تدارک کریں۔ مثلاً حالت احرام میں جو ہم لباس پہن لیں یا ناخن تراش لیں یا خوشبو استعمال کرلیں یا سر کے بال کاٹ لیں یا شکار کرلیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے اور صفا، مروہ کی سعی اگر ہم بھول جائیں یا ہم خانہ کعبہ کا طواف بے طہارت کرلیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے تا کہ اس جنابت کے بوجھ سے خلاصی ہو۔ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ''یعنی تحقیق تو ہی بار بار توبہ قبول فرماتا ہے اور اپنے گنہگار بندوں پر مہربانی فرماتا ہے''۔[۲]

---

[۱] رواہ الترمذی وابوداؤد النسائی وابن ماجہ کمافی المشکوٰۃ ص ۲۲۸

[۲] اکثر مضامین ماخوذ از تفسیر عزیزی

بَلَدًا اٰمِنًا اور هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا میں فرق:

سورۃ بقرہ میں بَلَدًا اٰمِنًا واقع ہوا ہے، جبکہ سورت ابراہیم میں هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا واقع ہوا ہے، ان دونوں عبارتوں کا فرق اس وجہ سے ہے کہ جو دعا سورۃ بقرۃ میں مذکور ہے وہ اس جگہ کے شہر کی صورت اختیار کر کے آباد ہونے سے پہلے تھی، تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا اے اللہ! اس بے آباد صحراء کو پہلے شہر بنادے، پھر اس کو پُر امن بنادے۔ اور جو دعا سورت ابراہیم میں مذکور ہے وہ شہر آباد ہونے کے بعد کی ہے، پس گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ! اس شہرِ آباد کو حوادث سے محفوظ رکھ۔

دین کیلئے طلبِ دنیا منافی کمال نہیں:

بعض اوقات کاملین بھی دنیاوی امور اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے ہیں جیسا کہ امن، روزی اور میوے کھلانا، کیونکہ یہ چیزیں فروغِ دین اور رونقِ شریعت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں، اس لئے کہ ظاہر ہے کہ امن، روزی اور فراغِ خاطر کو عبادت میں دل جمعی کے ساتھ بہت تعلق ہے، کہ جو شہر خوف سے مامون ہو اور لوگوں کی روزی وہاں کشادہ ہو اکثر اس شہر میں مخلوق کا اجتماع ہوتا ہے اور ہر طرف سے لوگوں کی آمد ورفت ہوتی ہے پس درحقیقت یہ طلب دنیا نہیں بلکہ طلبِ دین ہے اور دین کیلئے طلبِ دنیا منافی کمال نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے: نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِرَجُلِ الصَّالِحِ۔

فائدہ:

اس دعا کی ایک وجہ تو مذکورہ روایت میں بیان کی گئی، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیا کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اگرچہ کبائر اور صغائر سب گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال سے ہر وقت لرزاں اور خائف رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حقِ ربوبیت اور حقِ عبودیت کسی سے ادا نہیں ہوسکتا اور جانتے ہیں کہ جو حق واجب تھا وہ ہم سے ادا نہ ہوسکا اس لئے بصد خشوع وخضوع اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ تو ہمارے عجز اور قصور کو جانتا ہے ہمیں معاف کر اور تیرے حقوق میں ہم سے جو تقصیریں ہوئیں اُن سے درگزر کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ

الرَّحِیْمُ کہنا اسی قبیل سے تھا۔ دنیا کے بادشاہوں اور ان کے خواص اور مقربین کے تعلقات پر نظر کرو، عام رعایا کے لئے ایک عام قانون ہوتا ہے اور اس کی پابندی ان کے لئے کافی ہوتی ہے مگر خواص مقربین کے لئے ایک خاص قانون اور خاص بندشیں اور خاص ہدایتیں ہوتی ہیں۔

خواص اور مقربین ہر وقت اپنے آقا اور ولی نعمت کے خوش رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

یہی حال بلکہ اسے سے ہزار درجہ بڑھ کر انبیا علیہم السلام کا خداوند ذوالجلال کے ساتھ ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے یہ سچے عاشقانِ باوفا اور محبانِ باصفا اپنے محبوبِ حقیقی کے خوش رکھنے کے لئے کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے لیکن اللہ جیسے محبوب برحق کے حقوق کوئی عاشق کیا ادا کرسکتا ہے اس لئے حضرات انبیاء بصد عجز وزاری بارگاہِ الٰہی میں یہ عرض کرتے ہیں **وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ** بارِالٰہی ہم سے تیرے حقوق اور واجبات کے ادا کرنے میں تقصیر ہوئی، ہم اپنے عجز اور ناتوانی کی وجہ سے تیرا حق ادا نہیں کرسکتے تو ہم پر رحم فرما اور ہماری تقصیروں سے درگزر کر۔

اہلِ مکہ میں سے ایک رسول بھیجنے کی دعا اور اس کی مقبولیت:

تیسری دعا:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ

''اے اللہ! اس اُمتِ مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج اور اس پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرما یعنی قرآنِ کریم اور پھر وہ رسول اس اُمت کو کتاب وسنت کی تعلیم دے''۔

ان دونوں بزرگوں نے بارگاہِ الٰہی میں بصد عجز ونیاز یہ عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ان ساکنانِ حرم میں ایک عظیم الشان رسول بھیج جو اس اُمتِ مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے اور وہ رسول ہم دونوں کی ذریت اور اولاد سے خارج نہ ہو بلکہ انہی میں سے ہوتا کہ دنیا اور آخرت میں ہمارے لئے عزت اور شرف کا موجب ہو اور اس طرح قیامت تک میری امامت باقی رہے اس لئے کہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ رسول انہی میں سے ہوگا تو لوگ اس کے مولد اور منشاء سے اور اس کے

حسب اور نسب اور اس کی امانت اور دیانت اور اخلاق اور اس کی صورت اور سیرت سے بخوبی واقف ہونگے اور اس کے اتباع سے عار نہ کریں گے اور جب حق نبوت ورسالت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی تو اس رسول کی اعانت اور نصرت وحمایت اور اس کی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھیں گے۔ اس نبی کو اپنا سمجھ کر معاملہ کریں گے۔ اجنبی اور غیر کا معاملہ نہ کریں گے۔

تفسیر ابن کثیر میں ابو العالیہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا:

قَدِاسْتَجِيْبَ لَکَ هُوَ كَائِنٌ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ[۱] تمہاری دعا قبول ہوئی اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور یہی قتادہ اور سدی رحمہا اللہ سے منقول ہے۔

اور اس آیت میں جو سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ نبی خاتم الانبیاء ہوگا۔

وَقَرَأَ أُبَيٌّ وَابْعَثْ فِيْ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا یعنی ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قراءت میں ہے وَابْعَثْ فِيْ اٰخِرِهِمْ رَسُوْلًا یعنی ان کے آخر میں ایک رسول بھیج۔[۲]

معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس رسول کی دعا مانگی تھی ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نبی آخری ہو ،اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی:

اَخْرَجَ اَحْمَدُ وَالطَّبْرَانِيُّ وَالْبَيْهَقِيُّ عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! مَا بَدَءَ اَمْرُکَ قَالَ: دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَبُشْرٰى عِيْسٰى وَرَأَتْ اُمِّيْ اَنَّهٗ يَخْرُجُ مِنْهَا نُوْرٌ اَضَاءَتْ لَهٗ قُصُوْرُ الشَّامِ[۳]

مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ابو اُمامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ابتدا کس طرح سے ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[۱] تفسیر ابن کثیر

[۲] روح المعانی ص ۳۴۶، ج ۱

[۳] درمنثور: ص ۱۲۹، ج ۱

فرمایا: میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا (رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیۃ) کا مصداق ہوں سب سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے میری بعثت کی دعا کی اور پھر میں اپنے بھائی عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی بشارت ہوں کہ انہوں نے میری آمد کی بشارت دی اور پھر میں اپنی ماں کا خواب ہوں کہ انہوں نے میری پیدائش کے وقت دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔

اور عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنِّیْ عِنْدَاللّٰهِ فِیْ اُمِّ الْکِتَابِ لَخَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَاَنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَةٍ وَسَاُنَبِّئُکُمْ بِاَوَّلِ ذٰلِکَ دَعْوَةِ اِبْرٰهِیْمَ الحدیث [۱]

میں اللہ تعالیٰ کے یہاں لوحِ محفوظ میں خاتم النبیین لکھا ہوا تھا اور سیدنا آدم علیہ السلام ہنوز مٹی اور گارے کے پُتلے ہی میں تھے اور میری نبوت کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے۔

معلوم ہوا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جس نبی اور رسول کے ظہور کی دعا کی تھی اس دعا کا مصداق خاتم النبیین سرورِ عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں کہ جن کے بعد کوئی نبی نہیں اور آپ پہلے ہی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے، یہاں تک کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے آپ کی بعثت کی دعا کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارت دی۔

مفسر ابن کثیر نے ص ۱۸۴، ج: ا مسند امام احمد سے روایت نقل کی ہے:

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ابتدائی تذکرہ اولاً کیسے شروع ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنے باپ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہوں اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور میری والدہ نے جو خواب دیکھا کہ اُن کے اندر سے نور نکلا ہے جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا۔ میں اس خواب کا مظہر ہوں۔

---

[۱] مسند احمد وغیرہ، درمنثور: ص ۱۲۹۔

یہ حدیث صاحب مشکوٰۃ نے بھی ص: ۵۱۳ شرح السنہ سے نقل کی ہے اس میں یوں ہے کہ میں اپنی والدہ کے خواب کا مظہر ہوں جنہوں نے وضع حمل کے وقت دیکھا تھا اُن کے لئے ایک نور روشن ہوا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔

حدیث نقل کر کے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مطلب یہ کہ سب سے پہلے جنہوں نے میرا تذکرہ کیا اور لوگوں میں مجھے مشہور کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ یہ تذکرہ دعا کی صورت میں تھا۔ ذکر مشہور ہوتا رہا، یہاں تک کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے جو آخری نبی تھے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام انہوں نے آپ کا نام لیکر بشارت دی، اور بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَیۡكُمۡ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوۡرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوۡلٍ یَّاۡتِیۡ مِنۡۢ بَعۡدِی اسۡمُهٗۤ اَحۡمَدُ (کہ اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں۔ میرے سامنے جو توراۃ ہے اس کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایک ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا)۔

زمانہ حمل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ نے خواب دیکھا تھا کہ ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس کی وجہ سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔ انہوں نے اپنا خواب اپنی قوم کو سنایا جو لوگوں میں مشہور ہو گیا اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے لئے ایک بہت بڑی تمہید تھی۔

آخر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری نبی مبعوث فرمایا جن کے لئے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور عیسیٰ علیہ السلام نے جن کی بشارت دی تھی آپ کا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی۔ آپ پر اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت ختم فرمادی اور سارے عالم کے انسانوں کے لئے رہتی دنیا تک آپ کو نبی اور رسول بنا کر بھیج دیا، اور سورۂ احزاب میں آپ کے خاتم النبین ہونے کا اعلان فرمادیا اور آپ نے لَا نَبِیَّ بَعۡدِیۡ میرے بعد کوئی نبی نہیں اور خُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوۡنَ مجھ پر نبیوں کی آمد ختم ہوگئی اور اِنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انۡقَطَعَتۡ فَلَا رَسُوۡلَ بَعۡدِیۡ وَلَا نَبِیَّ بلاشبہ نبوت ختم ہوگئی اب میرے بعد نہ کوئی رسول ہے نہ

نبی ہے۔[۱]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور رسالتِ عامہ کا اعلان فرمانے کے لئے سورۂ اعراف میں یوں ارشاد فرمایا **قُلْ يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا** آپ فرمادیجئے کہ اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا اللہ کا رسول ہوں۔

جس رسول کے آنے کی دعا کی اس کی صفات:

حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے اپنی نسل میں سے جس رسول کے مبعوث ہونے کے لئے دعا کی تھی اس کی صفات میں **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِكَ** اور **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ** فرمایا تھا۔ سورۂ آل عمران (ع ۱۸) میں بھی آپ کی یہ صفات مذکور ہیں اور سورہ جمعہ میں بھی آپ کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کام اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد فرمائے تھے۔ آپ نے ان کو پوری طرح سے انجام دیا۔

تلاوتِ کتاب:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقاصدِ بعثت میں سورۂ بقرہ میں اوّل تو یہ فرمایا کہ **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ** کہ وہ نبی لوگوں کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت فرمائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی، اس کے الفاظ کا پڑھنا پڑھانا اور سننا اور سنانا، تلاوت کرنا اور صحیح طریقہ پر ادا کرنا بھی مطلوب اور مقصود ہے۔ بہت سے جاہل جو تلاوت کا انکار کرتے ہیں اور بچوں کو قرآن مجید حفظ کرانے سے روکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح رَٹنے سے کیا فائدہ؟ یہ لوگ کلام الٰہی کا مرتبہ اور مقام نہیں سمجھتے، دشمنوں کی باتوں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید کو لوگوں کے آپس کے خطوط پر اور انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر قیاس کرتے ہیں اور اپنی جہالت سے یوں کہتے ہیں کہ قرآن کے معانی اور مفاہیم کا سمجھنا کافی ہے، اس کا پڑھنا اور یاد کرنا ضروری نہیں۔ (العیاذ باللہ) یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ قرآن مجید کے الفاظ کو محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے۔ صحیفوں پر اعتماد کئے بغیر سینوں میں یاد رکھنا لازم ہے تاکہ اگر مطبوعہ مصاحف

---

[۱] سنن ترمذی

(العیاذ باللہ) معدوم ہوجائیں تب بھی قرآن شریف اپنی تمام قراءتوں کے ساتھ محفوظ رہ سکے۔

کتاب اور حکمت کی تعلیم:

رسول اللہ ﷺ کا دوسرا کام ذکر کرتے ہوئے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ارشاد فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فریضہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیں۔ کتاب اللہ کے الفاظ بھی سکھائیں اور معانی بھی سمجھائیں۔ عربی زبان جاننا قرآن کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ قرآن کی تفسیر وہی معتبر ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بتائی اور جو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے سیکھی، پھر اُن سے تابعین اور تبع تابعین اور سلف صالحین سے ہوتے ہوئے اُمّت تک پہنچی۔ سورۂ نحل میں فرمایا وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ اور ہم نے آپ کی طرف ذکر نازل کیا تا کہ آپ لوگوں کے لئے وہ بیان کریں جو ان کی طرف تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا گیا۔

آج کل بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تھوڑی بہت عربی جان کر قرآن شریف کے معانی اور مفاہیم اپنی طرف سے بتانے لگے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیم وتفسیر سے بے نیاز ہوکر گمراہ ہو رہے ہیں اور گمراہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جہالت اور گمراہی سے کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا خط ہے جو مخلوق کی طرف بھیجا گیا اور رسول کی حیثیت محض ایک ڈاکیے کی ہے۔ ڈاکیے کا کام خط پہنچا دینا ہے۔ خط پڑھ کر سنانا، سمجھانا اس کا کام نہیں۔ قرآن مجید نے تو اپنے بارے میں یہ کہیں نہیں فرمایا کہ یہ اللہ کا خط ہے جو مخلوق کی طرف آیا ہے اور اس کو خود ہی سمجھ لینا اور اس کے لانے والے سے مت سمجھنا بلکہ قرآن نے تو رسول اللہ ﷺ کے فرائض میں کتاب وحکمت کی تعلیم دینا بتایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو درمیان سے نکال کر قرآن سمجھنا کفر کی دعوت اور اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ اُمّت مرحومہ کو ان لوگوں کے فریب سے محفوظ فرمائے۔

آیت شریفہ میں الکتاب اور الحکمۃ دو لفظ مذکور ہیں اور دونوں کی تعلیم دینا رسول اللہ ﷺ کے منصب رسالت کے فرائض میں شمار فرمایا ہے۔ مفسر بغوی معالم التنزیل ص ۱۱۶، ج:۱ میں لکھتے ہیں کہ الکتاب سے قرآن مجید مراد ہے اور الحکمۃ سے مجاہد کی تفسیر کے مطابق فہم القرآن مراد ہے اور بعض

حضرات نے اس سے احکام قضاء مراد لئے ہیں اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیر العلم والعمل سے کی ہے۔ صاحب روح المعانی نے ص:۳۸۷، ج:۱، بعض مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ **الحکمۃ** سے کتاب اللہ کے حقائق ودقائق اور وہ سب چیزیں مراد ہیں جن پر قرآن مجید مشتمل ہے۔ اس صورت میں تعلیم کتاب سے مراد اُس کے الفاظ سمجھانا اور اس کی کیفیت ادا بیان کرنا مراد ہے اور تعلیم الحکمۃ سے اس کے معانی اور اسرار اور جو کچھ اس میں سے ہے اس سے واقف کرانا مراد ہے اور بعض حضرات نے حکمت کی تفسیریوں کی ہے **ماتکمل به النفوس من المعارف والاحکام** یعنی وہ تمام معارف اور احکام جن سے نفوس کی تکمیل ہوتی ہے، حکمت سے وہ سب مراد ہیں۔

درحقیقت حکمت کے جو معانی حضرات مفسرین نے بتائے ہیں وہ ایک دوسرے کے معارض اور منافی نہیں ہیں، مجموعی حیثیت سے اُن سب کو مراد لیا جاسکتا ہے۔

تزکیہ نفوس:

رسول اللہ ﷺ کا تیسرا فرض منصبی **وَيُزَكِّيهِمْ** بیان فرمایا **یُزَکِّیْ تزکیه** سے مضارع کا صیغہ ہے۔ تذکیہ لغت میں پاک صاف کرنے کو کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کا پڑھا دینا اور سمجھا دینا ہی نہیں بلکہ نفوس کا تزکیہ بھی آپ کے فرض منصبی میں داخل تھا۔ **يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ** میں **تحلیة النفوس بالفضائل** اور **یزکیهم** میں **تخلیة النفوس عن الرذائل** کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو توحید الٰہی سے آراستہ کیا اور کُفر اور شرک کی نجاست سے پاک کیا، ایمان اور یقین دیا، شک سے بچایا، گناہوں کی گندگی سے دُور کیا، نفوس کے رذائل دُور کئے، اخلاقِ عالیہ اور اعمال صالحہ بتائے اور عمل کر کے دکھایا۔ گناہوں کی تفصیل بتائی ان کے اثرات ظاہرہ، باطنہ، دنیویہ، اُخرویہ سے باخبر فرمایا، نیکیوں کی تفصیلی فہرست بتائی اور اُن کے منافع دنیویہ اور اخرویہ سے مطلع فرمایا۔ حسد، بخل، کینہ، تکبر، حرص، لالچ، حب جاہ کی مذمت فرمائی۔ حب فی اللہ اور تواضع اور فروتنی، صلہ رحمی، سخاوت، ضعیف کی مدد، بڑوں کی خدمت، یتیم کے ساتھ رحم دلی، تقویٰ، اخلاص، اکرام اہلِ ایمان، نرمی، حسن الجوار، غصہ پی جانا وغیرہ وغیرہ کی تعلیم دی۔ انسان کو

انسان بنایا، حیوانیت اور بہیمیت سے بچایا۔ آپ نے فرمایا کہ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ رواہ مالک فی المؤطا

نفوس کا تزکیہ صرف زبانی طور پر بتادینے سے نہیں ہوجاتا، اس کیلئے صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ کے لئے انسانوں ہی میں سے انبیاء اور رسول مبعوث فرمائے تاکہ وہ عملی طور پر ان کا تزکیہ کرسکیں اور تاکہ اُن کی صحبت سے انسانوں کے نفوس خیر کی طرف پلٹ سکیں اور اعمالِ صالحہ کے خُوگر ہوجائیں اور نفوس کی شرارتوں کو سمجھ سکیں اور اُن سے بچ سکیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہوجاؤ۔ اس آیت شریفہ میں سچوں کے ساتھ ہونے کی تعلیم فرمائی ہے، جو لوگ اپنے اخلاق اور عمل میں سچے ہیں ان کے ساتھ رہنے سے طبیعت اعمال صالحہ کی طرف راغب ہوتی ہے اور نفس و شیطان کی مکاریوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے، پھر ان کا توڑ بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ جس کسی کی صحبت اختیار کرے پہلے دیکھ لے کہ وہ متبع سنّت ہے یا نہیں؟ اس میں فکرِ آخرت کتنی ہے؟ حبِّ دُنیا اور جلبِ زر کے لئے تو مرشد بن کر نہیں بیٹھا۔ جس کسی کو متبع سنت اور آخرت کا فکرمند پائے اس کی صحبت اُٹھائے، مال و جاہ کا حریص مصلح اور مرشد نہیں ہوسکتا، اس کی صحبت میں رہنا زہرِ قاتل ہے۔

ملتِ ابراہیمی سے اعراض کرنا حماقت ہے:

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ [1]

اور کون پسند نہ رکھے دین ابراہیم کا مگر جو بیوقوف ہوا اپنے جی سے اور ہم نے اس کو خاص کیا دنیا میں اور وہ آخرت میں نیک ہے جب اس کو کہا اس کے رب نے حکم بردار ہو بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے۔

---

[1] البقرۃ: ۱۳۰، ۱۳۱

گزشتہ آیات میں اجمالاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ اور وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے پسند کیا اور اس کی دعا کی وہ طریقہ طریقۂ اسلام ہے۔ اب آئندہ آیات میں اس کی تفصیل فرماتے ہیں کہ وہ ملتِ ابراہیم عین توحید اور عینِ اسلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کی دل وجان سے بے چون وچرا اطاعت کرنا اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کردینا آخیر پارہ تک اسی ملت اسلام کے فضائل اور اسی کے اتباع کی ترغیب میں کلام چلا گیا ہے جس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب کا رَدّ کرنا مقصود ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور پھر ان کے خلاف طریقہ پر چل رہے ہیں حالانکہ اسی ملتِ اسلام پر قائم رہنے کی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے لئے دعا مانگی اور اسی کی وصیت کی اور اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ملتِ اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ کون شخص ہے کہ جو ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے عدول اور انحراف کرے حالانکہ وہ ملت تمام ملتوں سے افضل اور بہتر ہے اور صاحب ملت لوگوں کا امام اور پیشوا ہے اور سب سے پہلے اسی نے نہایت تضرع اور زاری سے اُمت مسلمہ کے وجود اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی دعا مانگی کہ جو اُمتِ مسلمہ کو اسلام کا طریقہ بتلائے تو ایسی بہتر ملت کے اتباع سے کون اعراض اور انحراف کرسکتا ہے مگر وہی شخص کہ جو اپنے ہی نفس سے جاہل اور نادان ہو کہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ کون سی ملت فطرتِ سلیمہ کے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب اور کون سی ملّت روح اور قلب کے لئے نافع ہے اور کون سی مضر اور کس ملت کے قبول کرنے سے نفس کے لئے کمالات کا دروازہ کھلتا ہے اور کس ملت سے کمالات کا دروازہ بند ہوتا ہے، اگر یہ سفیہ اور اپنے نفس سے بے خبر نہ ہوتا تو ملتِ ابراہیمی سے اعراض نہ کرتا۔

اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم کو دنیا میں برگزیدہ بنایا اور اپنے مقبول بندوں میں سے اس کو منتخب کیا اور تمام کمالات روحانیہ سے اس کو مکمل کیا یعنی نبوت ورسالت اور ولایت وامامت ان کو عطا کی اور خلت کا خلعت ان کو پہنایا اور جو معبد انہوں نے تعمیر کیا اس کو قبلہ عالم بنایا اور تحقیقِ آخرت میں وہ صالحین اور

نیکوکاروں سے ہیں۔ صلاح، فساد اور خلل کی ضد ہے اور فساد اور خلل، معصیت اور غفلت سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر صلاح کے یہ معنی ہونگے کہ ان کا ظاہر و باطن ہر قسم کے فساد اور خلل سے بالکل پاک ہے اور اس جگہ صلاح سے صلاح کامل مراد ہے اور یہ آیت ماقبل کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اللہ کا برگزیدہ اور منتخب بندہ ہو اور صلاح کامل کے ساتھ موصوف ہو اس کے طریقہ سے سوائے نادان کے کون اعراض کرے گا۔ آئندہ آیت میں اس ملت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ یعنی اسلام ہے بلکہ یہی اسلام ان کے برگزیدہ اور امام ہونے کا سبب ہے جبکہ ان کے پروردگار نے کہا کہ اے ابراہیم! اسلام اختیار کر اور مسلم بن جا یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کر دے اور اپنی خواہش اور ارادہ کو اس کی رضا اور خوشنودی میں فنا کر دے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں نے اسلام اختیار کیا اور میں نے اپنے تمام کام ربُّ العالمین کے سپرد کر دیئے اور اپنے نفس کو درمیان سے بالکل نکال لیا۔

اب اس میں تعیین ہوگئی کہ وہ ملت کیا ہے یعنی اسلام ہے جو تمام کمالات کا تخم اور تمام فضائل کی اصل سے اخیر پارہ تک اسی اسلام کی فضیلت میں کلام چلا گیا۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی ملت میں توحیدِ الٰہی پر جینے اور مرنے کا حکم ہے اور شرک سے بیزاری ہے۔ ظاہری باطنی نظافت اور طہارت ہے، مہمانی ہے، قربانی ہے، اللہ کی عبادت ہے اور فرمانبرداری ہے، انابت الی اللہ ہے، صحیح انسانیت کی تعلیم ہے، اُن کی ملت کا اتباع کرنے کا رسول اللہ ﷺ کو حکم ہوا۔ سورۂ نحل میں ارشاد ہے:

ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم کی ملت کا اتباع کیجئے جو باطل دینوں کو چھوڑ کر حق ہی کی راہ پر چلنے والے تھے اور مشرکین میں سے نہیں تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل اتمام کلمات اور اُن کو لوگوں کا پیشوا بنانے کا اعلان اور ان کے کعبہ بنانے اور قبولیت کی دعائیں کرنے اور اپنی نسل میں سے نبی آخر الزماں کی بعثت کی دعا مانگنے کا تذکرہ کرنے کے بعد ارشاد ہو رہا ہے کہ ملتِ ابراہیمی سے وہی شخص بے رغبت ہوسکتا ہے اور اُن کی ملت سے

وہی روگردانی کرسکتا ہے جو عقل سے کورا ہو اور جس نے اپنے نفس کو بالکل ہی احمق بنا دیا ہو، کوئی سلیم الفطرت عقل مند انسان اُن کی ملت سے انکاری نہیں ہوسکتا۔

فائدہ، ملتِ ابراہیمی اس وقت ملتِ محمدیہ میں منحصر ہے:

ملتِ ابراہیمی اس وقت ملتِ محمدیہ میں منحصر ہے اور آنحضرت سرورِ عالم ﷺ ہی اس کے داعی ہیں۔ جو لوگ اس سے بیزار ہیں وہ لوگ مُشرک، بُت پرست، بے حیا، بے شرم، بداخلاق، بداعمال، دھوکے باز اور زمین میں فساد کرنے والے اور قوموں کو لڑانے والے ہیں اور جس قدر بھی دنیا میں قبائح اور خراب کام ہیں سب انہیں لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو ملتِ ابراہیمی سے ہٹے ہوئے ہیں۔ گو کمزور ایمان والے مسلمانوں میں بھی معاصی ہیں لیکن اوّل تو انہیں گناہ سمجھتے ہوئے کرتے ہیں اور دوسرے توبہ کرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں گناہ بھی حماقت ہی سے ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ نساء میں فرمایا اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ (الآیۃ) مسلمین اہل معاصی کی حماقت ان لوگوں کی حماقت سے بہت زیادہ کم ہے جو کُفر اور شرک پر جمے ہوئے ہیں اور ملتِ ابراہیمی کو قبول کرنے کو بالکل تیار نہیں ہیں۔

یہ بتانے کے بعد کہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت سے وہی روگردانی کرے گا جس نے اپنی جان کو بیوقوف بنا دیا ہو، یہ ارشاد فرمایا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دنیا میں چُن لیا اور برگزیدہ بنالیا۔ دنیا میں ان کی فضیلت اور برتری سب پر ظاہر ہے، سب قومیں اُن کی فضیلت کی قائل ہیں اور اُن کے بعد جو بھی کوئی نبی آیا ہے انہیں کی نسل اور ذریت میں سے آیا ہے اور سب ان کو مانتے ہیں اور اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اُن کو دشمن نے آگ میں ڈالا، اللہ تعالیٰ نے وہ آگ اُن کے لئے گلزار بنادی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے کعبہ تعمیر کرایا، اس وقت سے لے کر آج تک کعبہ شریف کا حج ہوتا ہے اور اُن کو جو مناسک حضرت جبرائیل علیہ السلام نے بتائے تھے اُن پر برابر عمل ہو رہا ہے۔ انہوں نے جو بیٹے کی قربانی کی تھی، اس قربانی کے اتباع میں کروڑوں قربانیاں ہر سال پورے عالم میں ہوتی ہیں۔ درودِ ابراہیمی میں اُن کا ذکر ہے۔ اُمّت محمدیہ جس کا نام اُنہوں نے مسلمین رکھا تھا (کمافی سورۃ الحج) وہ اُن کی ملت کی اتباع کرنے والی ہے اور اُن کی یادگار ہے۔

پھر فرمایا وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ''آخرت میں بھی وہ صالحین میں سے ہوں گے'' ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی گواہی ہے کہ وہ ثابت قدم، صاحبِ استقامت اور خیر اور صلاح سے متصف ہونے والوں میں شمار ہوں گے، وہاں بھی اُن کی رفعت ہوگی جیسا کہ دنیا میں ان کی فضیلت مشہور ومعروف ہوئی۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: ای المشهود لهم بالثبات علی الاستقامة والخیر والصلاح اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں: وذٰلک من حیث المعنی دلیل مبین لکون الراغب عن ملة ابراهیم سفیها الاصطفاء والعزفی الدنیا غایة المطالب الدنیویة والصلاح جامع للکمالات الاخرویة ولا مقصد للانسان الغیر السفیه سوی خیر الدارین۔ یعنی ان کی خیر وصلاح اور ثبات علی الاستقامۃ میں اس امر کی واضح دلیل ہے کہ جو شخص ملتِ ابراہیمی سے منحرف ہو وہ واقعی بیوقوف ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ بندہ بننا اور معزز ہونا، دنیاوی مطلوبات کا آخری مقام ہے اور صلاح کمالات اُخرویہ کو جامع ہے اور سمجھدار آدمی کے لئے دونوں جہان کی خیر سے بڑھ کر کوئی مقصد نہیں (ناسمجھ یعنی بیوقوف ہی ان مقاصد عالیہ سے منحرف ہوسکتا ہے)۔

اسلام کا معنی ومفہوم:

پھر فرمایا اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (یعنی جب ان کے ربّ نے ان سے کہا کہ فرمانبردار ہوجا تو اُنہوں نے عرض کیا میں ربّ العالمین کا فرمانبردار ہوں)۔

لفظ اسلام کا مادہ **سین۔لام۔میم** ہے۔ جب یہ مادہ باب افعال میں مستعمل ہوتا ہے تو حکم ماننے فرمانبرداری کرنے اور حکم کے سامنے جھک جانے اور ظاہر اور باطن سے فرمانبردار ہوجانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کا صیغہ اسم فاعل مُسْلِم ہے جس کی جمع **مسلمون** اور **مسلمین** ہے۔ اللہ جل شانہٗ خالق اور مالک ہیں سب اس کے بندے ہیں۔ بندہ اپنے خالق کا فرمانبردار ہو اس سے بڑھ کر اس کی کوئی سعادت نہیں، حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہما السلام کعبہ شریف بناتے ہوئے یہ دعا کرتے جارہے تھے رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَکَ کہ ہماری ذرّیت میں سے بھی ایک اُمّتِ مسلمہ بنادے۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ اپنے ربّ کے مطیع اور فرمانبردار ہو جاؤ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں اپنے رب کا فرمانبردار ہوں۔ فرمانبردار تو وہ تھے ہی فرمانبرداری پر ثابت قدم رہنے کے لئے حکم ہوا اور انہوں نے ہمیشہ فرمانبردار رہنے کا اقرار کیا اور یہ بتادیا کہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے ربّ کا فرمانبردار ہوں۔ لفظ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہہ کر یہ بات ظاہر کردی کہ چونکہ وہ ربّ العالمین ہے اس لئے اس کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم ہی لازم ہے، جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے گا وہ اپنے مخلوق ہونے کا فرض منصبی ادا کرے گا۔

سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَکُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ
قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ

سورۃ آل عمران میں فرمایا:

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ کیا اللہ کے دین کے سوا دوسرا دین چاہتے ہیں حالانکہ اس کے لئے سب فرمانبرداری کے ساتھ جھکے ہوئے ہیں جو بھی آسمانوں میں اور زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے، اور سب اُس کی طرف لوٹیں گے۔

ساری مخلوق پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کی اطاعت کریں۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام امتحانات میں کامیاب ہوئے، ہر مرحلہ سے گزرتے گئے اور اطاعت وفرمانبرداری ہی کو اختیار کئے رہے اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا یہی مقصد تھا کہ وہ سارے انسانوں کو اللہ تعالیٰ شانہٗ کی فرمانبرداری کی طرف بلائیں، تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا دین اسلام تھا۔ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک مانیں اور شرک سے بیزار ہوں اور احکامِ الٰہیہ کی تعمیل کریں اور ہر طرف سے فرمانبردار ہوں۔ گو احکام فرعیہ میں اختلاف بھی رہا۔ لیکن اصول میں سب متحد اور متفق تھے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاَنْبِیَاءُ اِخْوَةٌ مِّنْ عَلَّاتٍ وَّاُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰی وَدِیْنُهُمْ وَاحِدٌ۔[۱]

فوائدِ جلیلہ:

حق جل شانہٗ نے اس سلسلہ میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا:

پہلا: وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ میں دوسرا: اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ تیسرا: قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ چوتھے: اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں، پانچویں وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں چھٹے وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں ساتویں: لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ میں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کا مذہب اسلام ہے۔ امم سابقہ میں جو لوگ اطاعت کرنے والے تھے ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی مگر اُمتِ مسلمہ ان کا لقب نہ تھا، صرف صفت تھی۔ یہ لقب صرف اُمتِ محمدیہ کو عطا کیا گیا۔ ایک زمانہ میں دینِ حق کا لقب یہودیت رہا اور ایک زمانہ میں عیسائیت اور نصرانیت رہا۔ صفت اسلام سب میں مشترک رہی سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے مگر اُمت کا لقب خاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی اُمت کو عطا کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں مگر غلام کا نام غلام رکھ دیا جائے تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے۔ صفت بھی غلام اور لقب اور نام بھی غلام۔ اور مثلاً جیسے سب اللہ کے بندے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام ہی عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ رکھے تاکہ ہر وقت اس کی عبدیت اور غلامیت سے لذت حاصل کرتا رہے تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

اور یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تجویز فرمایا جیسا کہ سورۂ حج میں ہے: مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل وجان سے اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بن جائیں محض لفظ مسلم اور مومن پر قناعت نہ کریں۔

فائدہ نمبر ۲:

لفظِ اسلام جہاں فرمانبرداری کے معنی دیتا ہے وہاں اپنے مادہ کے اعتبار سے اس بات پر بھی دلالت کرتا ہے کہ حقیقی سلامتی دین اسلام ہی میں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصرِ روم کو جو اسلام کا دعوت نامہ بھیجا تھا

---

[۱] رواہ البخاری ومسلم کما فی المشکوٰۃ ص ۵۰۹

اُس میں تحریر فرمایا تھا اَسْلِمْ تَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ تو اسلام قبول کر، سلامت رہے گا اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا فرمائے گا۔[۱]

حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام نے جو اُمت مسلمہ کے لئے دعا کی اس کی قبولیت کا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ وجود میں آگئی اور اس اُمت کے اعیان واشخاص وافراد کا نام حضرت ابراہیمؑ نے ''مسلمین'' رکھ دیا تھا۔ حَيْثُ قَالَ: فِيْ دُعَائِهٖ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ۔

فائدہ نمبر ۳:

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کا نام اسلام ہے، دعوت بھی فرمانبرداری کی ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام پورا کر دیا اور میں نے اسلام کو دین کے اعتبار سے تمہارے لئے پسند کر لیا، اور فرمایا اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ کہ بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اور فرمایا وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ اور جو اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

پس مسلمانوں کا دین لفظاً ومعنیً سراپا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی فرمانبرداری ہے۔ زندگی کے آخری لمحات تک فرمانبردار رہنے کا حکم ہے۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت میں مت مرنا۔

معلوم ہو گیا کہ مسلمان کا کام بس یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرے، بغیر چوں چرا اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب پر عمل پیرا ہو۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت، اللہ ہی کی اطاعت ہے مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ بہت

---

[۱] صحیح بخاری ص: ۵، ج: ۱

سے لوگ اپنے دعویٰ میں تو مسلمان ہیں لیکن دل سے مسلمان نہیں۔ وہ اپنی عقل سے اسلام کی باتوں کو رَد کرتے ہیں اور دشمنان اسلام کی صحبتوں سے متاثر ہو کر اسلام پر اعتراض کرتے ہیں اور بہت سے لوگ اسلام کو اپنے نظریات کے تابع بنانا چاہتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ حقائق ایمانیہ کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام والے نہیں (اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی ہیں)، ایسے لوگ ملتِ ابراہیمیہ سے منحرف ہیں۔

دینِ اسلام کے علاوہ ہر دین مردود ہے:

شاید کوئی ناسمجھ یہ اعتراض کرے کہ جب خالق و مالک کی فرمانبرداری ہی مطلوب ہے تو دین اسلام قبول کرنے کی ضرورت کیا ہے، جس دین پر بھی کوئی شخص ہو اور اس دین میں رہتے ہوئے (اللہ تعالیٰ کی) فرمانبرداری کرے تو مقصود حاصل ہو گیا اور وہ مستحق نجات ہوگا۔ اس جاہلانہ سوال کا جواب یہ ہے کہ خالق و مالک نے اُسی کو فرمانبردار قرار دیا ہے جو اُس کے بھیجے ہوئے دین کے مطابق اس کی فرمانبرداری کرے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنے اپنے زمانہ میں آتے رہے، ان پر ایمان لانا فرض تھا اور اُن کی کتابوں اور صحیفوں پر بھی ایمان لانا فرض تھا اور قیامت پر ایمان لانا بھی اُن تفصیلات کے ساتھ فرض تھا جو انہوں نے بتائیں۔ اللہ کے کسی نبی سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری اللہ کے یہاں معتبر نہیں ہے۔ کسی بھی نبی کا انکار اور اللہ کی کسی کتاب کا انکار کفر ہے، کفر سب سے بڑی نافرمانی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی عبادت اور کوئی فرمانبرداری معتبر نہیں، سب سے آخر میں خاتم النبیین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان لانا ہر انسان پر فرض ہے، جو شخص آپ کے لائے ہوئے دین سے اور آپ کی لائی ہوئی کتاب سے اور آپ کی نبوت اور رسالت سے منحرف ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کا باغی اور نافرمان ہوگا۔ لہٰذا اس کی نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں۔

اسلام کے علاوہ دنیا کے جتنے مذاہب ہیں کُفر تو ان سبھی میں ہے اور اُن میں اکثر مشرکین ہیں اور بہت بڑی بھاری تعداد میں وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے ہیں، یہ سب کیسے اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو سکتے ہیں؟ پھر ان لوگوں میں بے شرمی، بے حیائی، سود خوری، رشوت ستانی اور زنا کاری اس قدر

پھیلی ہوئی ہے کہ یہ کسی طرح بھی فرمانبرداری کے دائرہ میں نہیں آسکتے، ہندوؤں اور بدھسٹوں کے پیشوا تو لنگوٹی باندھے ہوئے عام مخلوق کے سامنے آجاتے ہیں، یورپ اور امریکہ کے لوگ اور اُن کی تقلید کرنے والے جہاں کہیں بھی ہیں حتیٰ کہ ان کے مذہبی مقتدا اور سیاسی زعما بداعمالی اور بدکرداری میں لت پت ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ قدوس کی فرمانبرداری سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ جس قوم میں زنا کاری عام ہو اور اُن کے عقیدہ میں اتوار کے دن چرچ میں پوپ کے معاف کر دینے سے گناہ معاف ہو جاتے ہوں اور چھوٹے پوپ کے گناہ بڑا پوپ معاف کر دیتا ہو، اللہ قدوس کے حکم کے فرمانبردار نہیں ہو سکتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور انجیل شریف کی تحریف کی اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہ صرف یہ کہ ایمان نہ لائے بلکہ آپ کی ذاتِ گرامی پر اعتراضات کئے اور کرتے رہے اور کرتے ہیں، ایسے لوگ خداوند قدوس کے نافرمان اور سراپا نافرمان ہیں، ان میں جو کوئی شخص راہب ہے اور اپنے خیال میں اللہ قدوس کی عبادت کرتا ہے اس کی رہبانیت اور عبادت سب بیکار ہے اور ضائع ہے، بھسم ہے اور راکھ کا ڈھیر ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دعاؤں میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ خانہ تجلی آشیانہ جس اُمت کا قبلہ ہوگا اس اُمت کا نام اُمتِ مسلمہ ہوگا جیسا کہ سورۂ حج میں ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ اور ملتِ اسلام اس اُمت کا مذہب ہوگا اور وہ عظیم الشان رسول جو ان میں مبعوث ہوگا وہ ساکنانِ حرم اور اسماعیل علیہ السلام کی ذریت سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور بذریعہ وحی کے بتلا دیا کہ جس اولوالعزم رسول کے پیدا ہونے کی تم دعا کر رہے ہو وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور خاتم الانبیاء والمرسلین ہوگا اور ملتِ ابراہیمی کا متبع ہوگا اور اس کی اُمت کا نام اُمتِ مسلمہ ہوگا۔

بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل قریش کا بیت اللہ کی تعمیر کرنا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے لیکر پینتیس برس تک (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر جب ۳۵ برس ہوئی) بیت اللہ بنائے ابراہیمی پر ہی رہا، اور یہ عرصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثتِ نبوت سے پانچ سال پہلے تک کا ہے، تب قریش نے بیت اللہ (کی بنائے ابراہیمی) کو منہدم کر کے پھر نئے سرے سے اس کی تعمیر کی۔

اس تعمیر نو کا سبب کیا تھا؟

اس کے بارے میں محمد بن اسحاق رحمہ اللہ اور دیگر مؤرخین کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنائے ابراہیمی میں کعبۃ اللہ میں جو پتھر لگائے گئے تھے وہ قامت انسان سے بھی بلند تھے تو قریش نے اس کو مزید بلند کرنے اور اس پر چھت ڈالنے کا ارادہ کیا تو اس وقت روم کے تاجروں میں سے ایک تاجر شخص کی کشتی کو سمندر کی لہروں نے جدہ کے ساحل پر لا کر ڈال دیا، (سمندر کی طغیانی کے باعث) وہ کشتی ٹوٹ گئی، انہوں نے اس کشتی کی لکڑیوں کو اکٹھا کیا اور اس کو بیت اللہ کی چھت بنانے کے لئے تیار کیا، مکہ میں ایک قبطی بڑھئی تھا اس نے اس لکڑی کو تیار کیا۔

تب بیت اللہ کے کنویں میں جہاں ہر روز نذر و نیاز (سونا چاندی) وغیرہ ڈالے جاتے تھے، وہاں سے ایک سانپ نکل آیا اور کعبۃ اللہ کی دیوار پر چڑھ بیٹھا اور اُن سب لوگوں کو ڈرانے لگا، جو کوئی بھی اسکے قریب جاتا تھا تو وہ پھنکارتا تھا اور اپنا منہ کھول کر دانت نکال کر ڈراتا تھا، وہ سب ڈر گئے۔ اسی اثناء میں ایک دن جس وقت وہ کعبۃ اللہ کی دیوار پر بیٹھا تھا اللہ تعالیٰ نے ایک پرندے کو بھیجا جو اس سانپ کو اُچک کر اُڑ گیا۔ تب قریش نے کہا کہ اس بات سے ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ جو ہم نے بیت اللہ کی از سر نو تعمیر کا یہ ارادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ ہمارے اس ارادے سے راضی ہے اور بے شک ہمارے پاس عامل رفیق اور خشب ہے اور سانپ کے مقابلے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے۔ یہ واقعہ حرب فجار کے پندرہ سال بعد کا ہے۔

جب وہ بیت اللہ کے انہدام اور نئی تعمیر پر متفق ہو گئے تو ابو وہب بن عمرو بن عمیر بن عامر بن عمر و ابن مخزوم کھڑا ہوا اور کعبۃ اللہ میں سے ایک پتھر نکالا تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر واپس اپنی جگہ پر لگ گیا۔ یہ ماجرا دیکھ کر اس نے قریش سے کہا کہ اے معشرِ قریش! اس کی تعمیر میں اپنی حلال کمائی کے علاوہ (حرام کمائی میں سے) کچھ بھی نہ شامل کرنا، اور نہ ہی بدکار عورت کی کمائی، نہ سود کا منافع اور نہ ہی کسی پر ظلم کے ذریعے سے حاصل کیا ہوا مال اس پر لگانا۔

پھر لوگوں نے اس کو گرانے کا ارادہ کیا تو ولید بن مغیرہ نے کہا کہ میں تم سب کی طرف سے اس کو گرانا شروع کرتا ہوں، پس اس نے کدال لی اور کعبۃ اللہ پر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے اللہ! ہمارا خیر کے سوا کوئی

اور ارادہ نہیں ہے۔ پھر دونوں رکنوں کے کنارے سے توڑنا شروع کر دیا اور اُن کو گرا دیا۔ اس کے بعد لوگوں نے ایک رات تک انتظار کیا (کہ کوئی آفت نہ آجائے) اور کہا کہ ہم تھوڑا انتظار کریں گے کہ اگر اس کعبۃ اللہ کے منہدم کرنے کی وجہ سے ہم پر کوئی آفت آپڑی تو ہم باقی کچھ بھی منہدم نہیں کریں گے اور اس کو واپس اپنی اصلی حالت میں لوٹا دیں گے اور اگر کوئی مصیبت نہ آئی تو (اس کا مطلب ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہمارے اس کام سے راضی ہے۔

بیت اللہ کی تعمیر تقسیم کار:

بہر حال! پھر کعبۃ اللہ کی تعمیر نو کے لئے کام تقسیم کر دیئے گئے۔ اس کے دروازہ کا حصہ بنو عبد مناف اور زہرہ بنائیں گے، حجرِ اسود اور رکن یمانی کا درمیانی حصہ بنو مخزوم بنائیں گے، قریش کے اور لوگ بھی ان کا ساتھ دیں گے، کعبہ کا پچھلا حصہ بنو جمح اور بنو سہم بنائیں گے، حطیم کا حصہ بنو عبدالدار بن قصی، بنو اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی اور بنو عدی بن کعب بن لوی بنائیں گے۔ تقسیم کار طے کر لینے کے بعد لوگ عمارت ڈھانے کے لئے چلے، لیکن ہر ایک اس کو ڈھانے سے گھبرا رہا تھا۔ بالآخر ولید بن المغیرہ نے کہا: اے اللہ! آپ خوب جانتے ہیں کہ ہمارا ارادہ بُرا نہیں، ہم خیر ہی چاہتے ہیں۔ اب ولید بن المغیرہ آگے بڑھے اور کعبہ کا کچھ حصہ گرایا تو سب لوگ ان کے ساتھ گرانے لگے، حتیٰ کہ کعبۃ اللہ کو گرا کر بناء ابراہیمی تک پہنچ گئے۔

کعبۃ اللہ کے سبز پتھروں کا واقعہ:

یہاں سبز رنگ کے پتھر ملے جو ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ایک راوی کہتے ہیں کہ قریش کے ایک آدمی نے جو کعبہ کی عمارت کو منہدم کرنے میں شامل تھا، دو پتھروں کو الگ کرنا چاہا، اس میں کدال ڈال کر زور لگایا تو پتھر کے ہلنے کے ساتھ ہی تمام مکہ کی زمین ہلنے لگی تو انہوں نے سمجھا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں، چنانچہ اس ارادے سے باز آ گئے۔

ابنِ اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''پھر قریش کا ہر قبیلہ تعمیر کعبہ کے لئے پتھر جمع کرنے لگا، ہر قبیلہ اپنے اپنے حصہ کے مطابق علیحدہ علیحدہ پتھر جمع کرتا رہا''۔

حجرِ اسود کو اس کے مقام پر رکھنے کا واقعہ:

قریش نے عمارت بنانا شروع کردی، یہاں تک کہ حجرِ اسود رکھنے کی جگہ تک پہنچے۔ اب اس میں جھگڑنے لگے، ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے حاصل ہو، یہاں تک کہ باقاعدہ جنگ وجدال کی نوبت آ پہنچی، لوگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بنوعبدالدار اور بنوعدی بن کعب بن لوئی نے خون سے بھرے ایک لگن میں ہاتھ ڈال کر حلف اٹھایا کہ ہم سب مرجائیں گے مگر حجرِ اسود کسی اور کو نہیں رکھنے دیں گے۔ انہوں نے اس کا نام ''لعقۃ الدم'' رکھا۔

اسی طرح چار پانچ دن گزر گئے، پھر قریش جمع ہوئے اور باہم مشورہ وغیرہ کیا۔ بعض راوی کہتے ہیں کہ ابواُمیہ بن المغیرۃ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم نے جس نے اس سال تمام قریش کے لوگوں کو امن دیا تھا، کہا: قریشیو! ایسا کرو کہ جو سب سے پہلے یہاں مسجد میں آئے اسی کو اپنے اختلافی مسئلہ کا منصف بنالو۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کیا، پس سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی لوگ خوش ہو گئے اور کہنے لگے: یہ امین ہیں، ہمیں ان کا فیصلہ منظور ہے، یہ تو محمد ﷺ ہیں، ہم راضی ہیں۔ پھر سب آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور سارا قصہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جاؤ، کوئی چادر لے آؤ، وہ لے آئے، آپ ﷺ نے حجر اسود کو اپنے دستِ مبارک سے اُٹھا کر اس میں رکھ دیا، پھر فرمایا: ہر قبیلہ آئے اور اس کپڑے کا کنارہ پکڑ لے اور اس طرح ہر ایک اس کو اُٹھالے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، جب اسے لے کر اس کے رکھنے کی جگہ تک پہنچے تو حضور ﷺ نے اپنے دستِ مبارک میں لے کر اس کی جگہ رکھ دیا۔ نزولِ وحی سے پہلے قریش کے لوگ آنحضرت ﷺ کو ''الامین'' کہا کرتے تھے۔

کعبۃ اللہ اور غلاف:

ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حضورِ اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک میں کعبہ اٹھارہ ہاتھ کا تھا، قبطی کپڑا اس پر چڑھایا جاتا تھا، پھر چادر کا کپڑا چڑھنے لگا، ریشمی کپڑا سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے چڑھایا۔

ابراہیمی طرز پر کعبہ کی تعمیر:

کعبہ قریشی تعمیر پر قائم رہا، یہاں تک کہ ساٹھ سال کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امارت کے ابتدائی زمانہ میں اس کو آگ لگ گئی اور کعبہ جل گیا، یہ یزید کی حکومت کا آخری زمانہ تھا، جب اس نے حضرت بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، ان دنوں حضرت بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کو منہدم کر کے اس کو بناء ابراہیمی پر بنایا اور حطیم کو بھی اس میں شامل کرلیا، اور اس کے مشرقی اور مغربی دو دروازے رکھے، اور ان کو زمین کے ساتھ ملا دیا۔ حضرت بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ کام اس حدیث کے مطابق کیا جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے رسول کریم ﷺ سے سُنی تھی۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ امارت تک کعبۃ اللہ یونہی رہا، یہاں تک کہ حجاج نے آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا۔ پھر حجاج نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے کعبہ کو دوبارہ گرا کر پہلے کی طرح بنا دیا۔

صحیح مسلم میں ہے حضرت عطار حمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یزید کے زمانہ میں جب کہ اہل شام نے مکہ پر لشکر کشی کی تھی، بیت اللہ جل گیا اور حضرت بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس وقت بیت اللہ کو یونہی رہنے دیا۔ موسم حج کے موقع پر جب لوگ آئے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: لوگو! مجھے کعبہ کے بارے میں مشورہ دو، کعبہ کو گرا کر از سر نو تعمیر کروں یا جو حصہ خستہ ہو گیا ہے اور ٹوٹ گیا ہے صرف اسی کی مرمت کر دوں؟ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: میری رائے تو یہ ہے کہ شکستہ حصے کی صرف مرمت کر دی جائے۔ بیت اللہ کا باقی حصہ اسی طرح رہنے دیں، حضرت بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر کسی کا گھر جل جاتا تو وہ اس وقت خوش ہوتا جب اسے نئے سرے سے بنا لیتا، پھر تمہارا اپنے رب کے گھر کے بارے کیا حال ہے؟ میں تین دن تک اپنے رب سے استخارہ کروں گا، پھر کچھ کروں گا، تین دن کے بعد آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے یہ ہوئی کہ کعبہ کو گرا دیا جائے۔ مگر لوگ اس کے توڑنے کی ہمت نہیں کرتے تھے، انہیں ڈر تھا کہ جو پہلے توڑنے کے لئے چڑھے گا اس پر عذاب نازل ہوگا، لیکن ایک آدمی

اس پر چڑھ گیا اور اس نے اس کا ایک پتھر توڑا، جب لوگوں نے دیکھا کہ اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچی تو اب سب نے ڈھانا شروع کر دیا اور زمین تک برابر کر دیا، ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ستون کھڑے کر دیئے اور ان پر پردے تان دیئے، حتیٰ کہ اس کی عمارت اونچی ہوئی۔ ابن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فرماتے ہوئے سنا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: اگر لوگوں کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا اور میرے پاس خرچ بھی ہوتا جس سے میں اس کو بنا سکوں تو میں حطیم سے پانچ ہاتھ ضرور اس کعبہ میں شامل کر دیتا اور اس کا ایک دروازہ لوگوں کے داخل ہونے کے لئے اور ایک دروازہ نکلنے کے لئے رکھ دیتا۔ پھر ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمانے لگے: اب مجھے لوگوں کا کوئی خوف بھی نہیں ہے اور میرے پاس خرچ کے لئے رقم بھی موجود ہے، چنانچہ آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حطیم میں سے پانچ ہاتھ اندر شامل کر لئے اور اب جو بنیاد کھڑی کی تو ٹھیک بناء ابراہیمی نظر آنے لگی اور لوگوں نے بھی اس کو دیکھ لیا، کعبۃ اللہ کا طول پہلے اٹھارہ ہاتھ تھا، اب اس میں پانچ ہاتھ مزید بڑھایا۔ دو دروازے بنائے گئے، ایک اندر آنے کا اور دوسرا باہر جانے کا۔

حجاج نے عبدالملک کے حکم سے تعمیر کعبہ کو پھر بدل دیا:

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد حجاج نے عبدالملک کو خط لکھا اور ان سے مشورہ لیا کہ اب کیا کیا جائے؟ اور یہ بھی لکھا کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعبہ کو ایسی بنیادوں پر بنایا ہے کہ مکہ کے عادل لوگوں نے اس کو دیکھا ہے، عبدالملک نے جواب میں کہا: ہم ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کام کو کوئی حیثیت نہیں دیتے، طول میں جو اضافہ کیا گیا ہے اس کو تو برقرار رہنے دو، لیکن حطیم کو داخل کر کے جو اضافہ کیا گیا ہے اس کو ختم کر دو، یعنی حطیم کو اپنی جگہ لوٹا دو اور جو دروازہ کھولا گیا تھا اس کو بند کر دو۔ حجاج نے حکم کے مطابق کعبۃ اللہ کو توڑ کر اس کو پھر پہلے والی بناء میں کر دیا۔ حالانکہ سنت طریقہ یہی تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عمل کو باقی رکھا جاتا، اس لئے کہ حضور اقدس ﷺ کی چاہت یہی

تھی، لیکن اس وقت آنحضرت ﷺ کو ڈر یہ تھا کہ کہیں بعض قریب الاسلام لوگ اس کو ناگوار نہ سمجھنے لگیں۔

عبدالملک بن مروان کو بعد میں صدمہ ہوا:

یہ حدیثِ رسول اللہ ﷺ، عبدالملک بن مروان سے مخفی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالہ سے ان تک پہنچی تو کہتے تھے کہ کاش ہم کعبہ کو یونہی رہنے دیتے اور نہ گراتے۔ چنانچہ ابوقزعہ سے مروی ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے کہا: اللہ تعالیٰ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مارے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر اس حدیث کا بہتان لگاتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: اے عائشہ! اگر مجھے تیری قوم کے زمانہ کفر کے قریب ہونے کا ڈر نہ ہوتا تو میں کعبہ کو گرا کر اس میں حطیم کا حصہ بھی شامل کر دیتا، کیونکہ تیری قوم نے بنائے کعبہ میں کمی کر دی تھی۔ یہ سن کر حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ نے کہا: اے امیر المومنین! ایسا نہ کہو، کیونکہ میں نے خود یہ حدیث اُمّ المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سنی ہے، عبدالملک کہنے لگے: اگر یہ حدیث مجھے پہلے سے معلوم ہوتی تو میں اس کو نہ گراتا اور ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بناء کو باقی رہنے دیتا۔

یہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قطعی حدیث کی طرح ہے، کیونکہ یہ حدیث ان سے متعدد صحیح طرق سے مروی ہے۔ اسود بن یزید، حارث بن عبداللہ بن ابی ربیعہ، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن محمد بن ابی بکر اور عروۃ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عمل درست تھا، اگر عبدالملک بن مروان اس کو یونہی رہنے دیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔

لیکن کعبہ کا معاملہ سنگین ہونے کے بعد بعض علماء نے اس بات کو ناپسند قرار دے دیا، جیسا کہ امیر المومنین ہارون الرشید نے یا ان کے والد المہدی نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ کیا میں پھر کعبہ کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بنائے ہوئے طریقہ کے مطابق بنادوں؟ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! آپ ایسا نہ کریں ورنہ کعبہ بھی بادشاہوں کے لئے ایک کھلونے کی چیز بن جائے گا، ہر ایک اپنی خواہش کے مطابق توڑ پھوڑ کرتا رہے، چنانچہ ہارون الرشید نے اپنا ارادہ ترک کر دیا، اور اب تک اسی طرح رہا، واللہ اعلم۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کعبہ کو دو چھوٹی پنڈلیوں والا ایک حبشی برباد کرے گا۔ غالباً یہ واقعہ یاجوج وماجوج کے خروج کے بعد رونما ہوگا، اس لئے کہ صحیح بخاری میں ابوسعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوگ یاجوج وماجوج کے خروج کے بعد بھی حج اور عمرہ کریں گے۔

حرمت وتعظیمِ بیت اللہ کے واقعات:

امام ارزقی نے مطلق بن حبیب سے روایت کی ہے کہ ہم ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیساتھ بیت اللہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں تک سورج بلند ہونے کی وجہ سے وہ سایہ ختم ہو گیا اور لوگ اس مجلس سے اُٹھے، اچانک مسجد الحرام کے ایک دروازے سے جمِ غفیر ظاہر ہوا، ہم نے دیکھا کہ ایک سانپ آرہا ہے تمام حاضرین مجلس نے اپنی نگاہیں اس کی طرف مرکوز کرلیں۔ وہ سانپ سیدھا خانہ کعبہ کی طرف آیا، اس سانپ نے سات مرتبہ طواف ادا کیا، اس کے بعد مقامِ ابراہیم کے پیچھے گیا دو رکعت نماز ادا کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے بزرگانِ مجلس اس سانپ کے پاس گئے اور فرمایا کہ اے عزیز تیرا طواف ادا ہوگیا لیکن اس شہر میں ناواقف لوگ اور خدمت گزار غلام بہت ہیں، بہتر یہ ہے تو اپنے آپ کو لوگوں سے پوشیدہ رکھ، کہیں لوگ تمہیں ایذاء نہ پہنچائیں۔ محض اس کلام کو سننے سے سانپ اپنا سر دم سے لپیٹ کر آسمان کی طرف اڑ گیا، یہاں تک کہ ہماری نظروں سے غائب ہوگیا۔

ابوالطفیل سے روایت کی گئی ہے کہ جنات میں سے ایک صالح نوجوان جو مقام ذی طویٰ میں رہتا تھا، اکثر سانپ کی شکل اختیار کر کے خانہ کعبہ کے طواف کے لئے آتا تھا اور مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز ادا کرتا تھا۔ اس کی ماں جو کہ جنات میں سے تھی اس کو منع کرتی تھی اور اس کو ڈراتی تھی کہ کہیں کوئی آدمی تجھے سانپ سمجھ کر مار نہ ڈالے، وہ باز نہ آیا یہاں تک کہ بنوسہم کی ایک جماعت نے اس کو مار دیا۔ اس کو مارنے کی وجہ سے مکہ معظمہ میں ایک عظیم غبار اُٹھا اور شدید آندھی آئی اور لوگوں نے بنوسہم کی اس جماعت کو اپنے گھروں میں مردہ پایا۔

اس کے علاوہ تواریخ مکہ میں جمل طائف (طواف کرنے والا اُونٹ) کی حکایت مشہور ہے، جس کا

خلاصہ یہ ہے کہ جمادی الثانی ۸۱۵ ہجری میں جمالِ فاروقی کے اُونٹوں میں سے ایک اُونٹ اپنے مالک سے بھاگا، مکہ معظمہ گیا اور مسجدِ حرام میں داخل ہوا۔ بہت سے لوگ اس کے پیچھے بھاگے تاکہ اس کو پکڑیں مگر وہ اُونٹ کسی کو قابو نہ دیا، یہاں تک کہ اس نے سات چکر لگائے اور دو تین مرتبہ سات سات چکر لگائے، اس کے بعد حجرِ اسود کی طرف گیا اور حجرِ اسود کو بوسہ دیا، اس کے بعد مقام حنیفہ کی طرف متوجہ ہوا اور میزاب رحمت کے مقابل کھڑے ہو کر رونا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے بہت زیادہ آنسو جاری تھے۔ اسی حالت میں اس اُونٹ نے اپنے آپ کو نیچے گرایا اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور لوگ اس کی اس حالت کا نظارہ کر رہے تھے۔ لوگوں نے مرنے کے بعد اُس اونٹ کو اُٹھایا اور اسے صفا اور مروہ کی طرف لے جا کر دفن کر دیا۔

بیت اللہ کے مرجع الخلائق ہونے کے منجملہ اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہاں چند مقامات ایسے ہیں جہاں دعا قبول ہوتی ہے، لوگوں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور لوگ اپنی دعا کے مطالب دینی اور دنیوی کے حصول کیلئے ان مقامات کو قوی ترین وسیلہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بروایتِ صحیحہ حضرت حسن بصریؒ سے ثابت ہے کہ مکہ معظمہ میں پندرہ مقامات ہیں جہاں دعا قبول ہوتی ہے:

۱۔ ملتزم کے پاس ۲۔ میزاب رحمت کے نیچے ۳۔ رکنِ یمانی کے پاس
۴۔ صفا کے اُوپر ۵۔ مروہ کے اُوپر ۶۔ رکن اور مقام کے درمیان
۷۔ جوف کعبہ میں ۸۔ منیٰ میں ۹۔ مزدلفہ میں
۱۰۔ عرفات میں ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ جمار ثلثہ کے نزدیک ۱۴۔ آب زم زم کے پاس۔

مصنف ابن شیبہ میں مذکور ہے:

كَانَتِ الْأُمَّةُ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ لَتَقَدَّمُ مَكَّةَ فَاِذَا بَلَغَتْ ذَاطُوًى خَلَعَتْ نِعَالَهَا تَعْظِيْمًا لِلْحَرَمِ یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک اُمت مکہ آتی، جب ذی طویٰ مقام پر پہنچتی تو حرم کی تعظیم کیلئے اپنے جوتے اُتار لیتی تھی۔

نیز یہ بھی مذکور ہے:

كَانَتِ الْاَنْبِيَآءُ اِذَا اَتَوْا عِنْدَ الْحَرَمِ نَزَعُوْا نِعَالَهُمْ یعنی انبیاء علیہم السلام جب حرم کے پاس آتے تو (تعظیما) اپنے جوتے اُتار لیتے تھے

اور ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے حلیۃ الاولیاء میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے:

بعض بنی اسرائیل کے لاکھ لاکھ آدمی حج کیلئے آتے تھے، جب حد حرم میں پہنچتے تو برہنہ پا ہوجاتے (جوتے اُتار لیتے تھے)۔

ارزقی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ حواریوں نے اسی مقام کا حج کیا ہے، جب وہ حرم میں داخل ہوئے تو سواریوں سے نیچے اُتر کر پیدل چلنے لگے۔ اور ارزقیؒ نے حویطبؓ بن عبدالعزیٰ سے روایت کی ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک دن ہم خانہ کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک عورت آئی بیت اللہ کا پردہ پکڑا اور اللہ سے فریاد کی کہ اے اللہ! میں اپنے شوہر کے ہاتھ سے پریشان ہوں کہ مجھے حرم میں مارتا ہے۔ اس دعا کی وجہ سے اس کے شوہر کا ہاتھ سوکھ گیا، میں اس کو زمانہ اسلام میں دیکھتا تھا کہ اس کا ہاتھ سوکھا ہوا ہے۔

تواریخ میں یہ ثابت ہے کہ اساف اور نائلہ ایک مرد اور عورت تھے، کعبہ میں داخل ہوتے وقت مرد نے عورت کا بوسہ لیا، دونوں پتھر کی شکل میں مسخ ہو گئے، لوگ ان دونوں کو کعبہ سے باہر لائے اور عبرت کیلئے ان کو کعبہ کے باہر کھڑا کر دیا۔

ابن ابی شیبہ نے عبدالرحمٰن بن سابط سے روایت کی ہے:

جب لوگ موسم حج میں اپنے گھروں سے باہر آئے تو ایک چور مکان خالی دیکھ کر کسی کے گھر سے سونا چُرا کر لے آیا اور خانہ کعبہ کے اندر رکھ لیا، واپسی کے وقت وہ سونا لینے خانہ کعبہ میں داخل ہوا اور ابھی صرف اس کا سر خانہ کعبہ کے اندر تھا اور باقی اعضاء ابھی باہر تھے کہ خانہ کعبہ نے زور سے اس کو دبایا کہ اس کا سر تن سے جدا ہو گیا۔ لوگوں نے یہ عجیب واقعہ دیکھا اور اس کا سر اور تن باہر لا کر کتوں کے آگے ڈال دیا۔

نیز ارزقیؒ اپنی تاریخ میں صحیح سند کیساتھ لائے ہیں کہ:

زمانہ جاہلیت میں ایک عورت رشتہ داروں کے ایک لڑکے کی پرورش کرتی تھی، وہ عورت کسبِ معاش کیلئے گھر سے باہر جایا کرتی تھی، وہ لڑکا پیچھے تنہا رہتا تھا۔ ایک دن اس لڑکے نے اپنی تنہائی کی شکایت کی تو اس عورت نے کہا بیٹا تنہائی میں اگر کوئی ظالم تجھ سے تعرض کرے تو جان لو کہ مکہ میں ایک گھر (خانہ کعبہ) ہے، اپنے آپ کو اس گھر میں پہنچاؤ اور وہاں فریاد کرو کیونکہ اس گھر کا ایک مالک ہے جو فریادرس ہے۔ اتفاقاً ایک ظالم اس بچے کو تنہا پا کر قید کر کے لے گیا۔

ایک مدت تک اپنے پاس رکھا، ایک دفعہ تجارت کی غرض سے وہ مکہ آیا، وہ بچہ بھی اس کے ساتھ تھا، جب اس بچے نے خانہ کعبہ دیکھا تو لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ گھر کس کا ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ اللہ کا گھر ہے، اس بچے کو ماں کی بات یاد آئی، اس ظالم کے ہاتھ سے بھاگ کر خانہ کعبہ کے پاس آیا اور خانہ کعبہ کے پردوں کو مضبوطی سے پکڑا، اس کا مالک اس کے پیچھے پہنچا اور چاہا کہ اس کو کھینچ کر لے جائے، پہلے اپنا دائیاں ہاتھ بڑھایا تا کہ اس لڑکے کو پکڑے تو اس کا دائیاں ہاتھ سوکھ گیا، پھر اپنا بائیاں ہاتھ بڑھایا تو وہ بھی سوکھ گیا۔ جب اس ظالم نے اپنا یہ حال دیکھا تو سرداران قریش کے پاس گیا اور کہا کہ میں اس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں، اب تم گواہ ہو کہ میں نے اس بچے کو چھوڑ دیا ہے، اب میں اس سے کوئی تعرض نہ کروں گا، یہ جہاں چاہے چلا جائے لیکن مجھے میرے دونوں ہاتھوں کا علاج بتاؤ۔ بزرگانِ قریش نے فرمایا کہ اپنے ہر ہاتھ سے ایک ایک اُونٹ کی قربانی کرو، اس نے ایسا ہی کیا تو اس کے دونوں ہاتھ اچھے ہو گئے۔

نیز ارزقیؒ نے عبدالمطلب بن ربیعہ بن حارث سے روایت کی ہے کہ:

بنی کنانہ میں سے ایک شخص اپنے چچازاد بھائی پر بہت ظلم کرتا تھا، وہ ہر چند اُسے اللہ تعالیٰ اور قرابت کا واسطہ دے کر پناہ چاہتا تھا لیکن یہ باز نہ آتا تھا، مجبور ہو کر اس کے چچازاد نے خانہ کعبہ میں پناہ لی اور دعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ! یہ شخص مجھ پر ظلم کرتا ہے، میں نے تیرے

گھر میں پناہ لی ہے، اس کو ایسی تکلیف میں مبتلا کر جو لاعلاج ہو۔ یہ دعا کی اور اپنے گھر چلا گیا، اس ظالم کا پیٹ پھول گیا اور مشک کی طرح ہو گیا، وہ جتنی دوا کرتا فائدہ نہ ہوتا، یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹا اور وہ مر گیا۔

عبدالمطلب کہتے ہیں کہ میں نے قصہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے بھی ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اُوپر ظلم کرنے والے شخص کیلئے بددعا کی کہ وہ اندھا ہو جائے تو وہ فی الفور اندھا ہو گیا اور لوگ اس کو کھینچ کر لے گئے۔

ارزقیؒ نے حضرت حسن بصریؒ اور دیگر تابعین سے روایت کی ہے:

اَلْبَیْتُ بِحِذَاءِ الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ وَمَا بَیْنَهُمَا بِحِذَائِهٖ اِلَی السَّمَاءِ السَّابِعَةِ وَمَا اَسْفَلَ مِنْهُ بِحِذَائِهٖ اِلَی الْاَرْضِ السَّابِعَةِ حَرَمٌ كُلُّهٗ "یعنی بیت اللہ بیت المعمور کے مقابل ہے اور ان دونوں کے درمیان ساتویں آسمان تک اور اس کے مقابل ساتویں زمین تک سارا حرم ہے"۔

انبیاء سابقین میں سے کسی نبی کی کلام جو کتب بنی اسرائیل میں روایت ہے:

قَوْلُهٗ سُبْحَانَ الَّذِیْ تَجَلّٰی عَلٰی طُوْرِ سَیْنَاءَ وَاَشْرَقَ نُوْرُهٗ مِنَ السَّاعِیْرِ وَاسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانْ

فاران مکہ معظمہ کا نام ہے اور ساعیر بیت المقدس کا نام ہے۔ اس کلام کا معنی یہ ہے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے کوہ طور پر تجلی فرمائی اور ساعیر (بیت المقدس) سے اس کا نور چمکا اور وہ ظاہر ہوا فاران (مکہ) کے پہاڑوں سے۔

فضائل:

۱۔ جندیؒ نے عطاءؒ سے نقل کیا ہے:

اِنَّ نَظْرَةً اِلَی الْبَیْتِ فِیْ غَیْرِ طَوَافٍ وَلَا صَلٰوةٍ تَعْدِلُ عِبَادَةَ سَنَةٍ قِیَامَهَا وَرُكُوْعَهَا وَسُجُوْدَهَ یعنی بیت اللہ کی طرف ایک نظر کرنا طواف اور نماز کے علاوہ یہ

ایک سال کی عبادت کے برابر ہے یعنی ایک سال کے قیام، ایک سال کے رکوع، ایک سال کے سجود کے برابر ہے۔

۲۔ابن ابی شیبہؒ اور جندیؒ نے طاؤسؒ سے نقل کیا ہے:

اَلنَّظْرُ اِلَی الْبَیْتِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الدَّائِمِ الْمُجَاهِدِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یعنی بیت اللہ کی طرف نظر کرنا افضل ہے اس روزہ دار کی عبادت سے جو ہمیشہ رات کا قیام کرتا ہو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہو۔

۳۔ابن ابی عدیؒ اور بیہقیؒ نے شعب الایمان میں مع التضعیف حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل کی ہے:

اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰی فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ مِائَةً وَّعِشْرِیْنَ رَحْمَةً یُنْزِلُهَا لِهٰذَاالْبَیْتِ سِتُّوْنَ مِنْهَا لِلطَّائِفِیْنَ وَاَرْبَعُوْنَ لِلْمُصَلِّیْنَ وَعِشْرُوْنَ لِلنَّاظِرِیْنَ یعنی تحقیق ہر رات، دن میں اللہ تعالیٰ کی ایک سو بیس رحمتیں اس بیت اللہ کیلئے نازل ہوتی ہیں، ان میں ساٹھ طواف کرنے والوں کیلئے، چالیس نماز پڑھنے والوں کیلئے اور بیس بیت اللہ دیکھنے والوں کیلئے ہیں۔

۴۔ ازرقیؒ نے آپ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ سابقہ انبیاء میں کسی نبی کی اُمّت جب عذابِ الٰہی کے سبب ہلاک ہوجاتی تو وہ نبی مکہ کی طرف رجوع کرتے اور عبادت میں مشغول ہوجاتے جیسا کہ شاہی خدمت کار اور عہدیدار جب اپنے کام سے معطل ہوتے ہیں تو بادشاہ کے حضور رجوع کرتے ہیں اور حاضری دیتے ہیں، اسی طرح جس شخص کا دل دنیا سے سیر ہوتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے تو کہتا ہے کہ میں بیت اللہ کا ارادہ رکھتا ہوں گویا کہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کا یہی طریقہ سمجھتا ہے۔

۵۔ازرقیؒ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خانہ کعبہ کا قصد اس طرح کیا کہ سرخ اُونٹ پر سوار ہوئے

مقام روحا سے احرام باندھا اور دو گلیم (دو چادریں) قسطوانی پہنیں ایک کی لنگی باندھی اور دوسری کو چادر بنایا اور بیت اللہ کا طواف کیا، صفا اور مروہ کے درمیان لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑ رہے تھے کہ غیب سے ایک آواز ان کے کان میں پہنچی: لَبَّیْکَ عَبْدِیْ اَنَا مَعَکَ یعنی میں حاضر ہوں اے میرے بندے! میں تیرے ساتھ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ آواز سن کر بے اختیار سجدے میں گر گئے۔

ابن مردویہؒ اور اصبہانیؒ الترغیب والترھیب میں اور دیلمیؒ نے ابن جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب قیامت کا دن ہوگا تو فرشتے کعبہ کو عرش کی مانند زیب وزینت کے ساتھ آراستہ کر کے میدانِ محشر میں لے جائیں گے، راستے میں میری قبر سے گزر ہوگا تو کعبہ بزبان فصیح کہے گا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا مُحَمَّدُ! میں جواب میں کہوں گا: وَعَلَیْکَ السَّلَامُ یَا بَیْتَ اللّٰہِ، میری اُمّت نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا اور تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ کعبہ کہے گا اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ کی اُمّت میں سے جو کوئی میری زیارت کے لئے آیا میں اُس کی کفایت کروں گا اور اس کا شفیع ہوں گا، اس کی طرف سے آپ اپنے دل کو فارغ رکھیں (فکر نہ کریں) اور آپ کی اُمّت میں سے جو میری زیارت کو نہیں پہنچا آپ اس کی کفایت کیجئے اور اس کا شفیع بنئے۔

مقامِ ابراہیم:

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم سے مراد تمام حرم ہے اور مصلّٰی سے مراد دعا کرنے کی جگہ ہے کیونکہ صلوٰۃ کا اصلی معنی دعا ہے۔

عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مقامِ ابراہیم عرفات، مزدلفہ اور منیٰ ہے۔ اس لئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس جگہ کھڑے ہو کر دعا فرمائی ہے۔

سنن ابنِ ماجہ اور دیگر کتب حدیث میں بروایت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیا ہے:

لَمَّا وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ عِنْدَ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ لَهٗ عُمَرُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَهٰذَا مَقَامُ اِبْرَاهِيْمَ الَّذِىْ قَالَ اللّٰهُ: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى قَالَ نَعَمْ

جب رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے دن مقامِ ابراہیم کے پاس ٹھہرے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یارسول اللہ کیا یہی مقامِ ابراہیم ہے جسکے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى تو آپ ﷺ نے فرمایا جی ہاں۔

دیگر صحاح میں موجود ہے:

اَنَّ النَّبِىَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ رَمَلَ ثَلٰثَ اَشْوَاطٍ وَاَرْبَعَةً حَتّٰى اِذَا فَرَغَ عَمَدَ اِلٰى مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ فَصَلّٰى خَلْفَهٗ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَرَءَ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى ،

اَخْرَجَ جُنْدِىْ وَابْنُ الْبُخَارِى عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ اُسْبُوْعًا وَصَلّٰى خَلْفَ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ وَرَكْعَتَيْنِ وَشَرِبَ مِنْ مَّاءِ زَمْزَمَ غَفَرَاللّٰهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ كُلَّهَا بَالِغَةً مَّابَلَغَتْ

یعنی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس شخص نے بیت اللہ کا طواف کیا سات چکر اور پھر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی اور زم زم کا پانی پیا تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہ معاف فرمادیں گے چاہے جتنے بھی ہوں۔

اور ارزقیؒ نے حضرت عمرو بن شعیب سے بواسطہ ان کے باپ اور دادا کے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص حج کے ارادے سے گھر سے نکلتا ہے تو گویا وہ دریائے رحمت میں داخل ہو کر جاتا ہے اور جو مطاف میں ہو گویا کہ دریائے رحمت میں اس نے غوطہ کھایا اور جب طواف شروع کرتا ہے تو ہر قدم پر دو خیر اس کو حاصل ہوتی ہیں اور جس وقت قدم اُٹھاتا ہے پانچ سو نیکیاں اس کے لئے لکھی جاتی ہیں

اور جب قدم رکھتا ہے تو پانچ سو گناہ اس سے دور ہوتے ہیں اور جب طواف سے فارغ ہو کر مقامِ ابراہیم میں پہنچتا ہے اور طواف کی دو رکعت وہاں ادا کرتا ہے تو ایسا ہوتا ہے کہ گویا آج ہی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کہ کوئی گناہ اس کا نہیں ہوتا اور فرشتہ اس کے سامنے آ کر کہتا ہے کہ اپنی باقی زندگی میں از سرِ نو عمل کر کہ تو اپنی گزشتہ زندگی سے فارغ ہو چکا ہے اور اپنے اقارب میں ستر آدمیوں کی شفاعت کا مرتبہ اس کو دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حجِ بیت اللہ کرنے، خانۂ خدا کی زیارت کرنے اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دینے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ط هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (سورۃ الحج:۷۸)

اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثمرہ دعاءِ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام

ضمیمہ: جہادِ اکبر کیا ہے؟

(قرآن وسنت کی روشنی میں)

اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثمرہ دعاءِ ابراہیم علیہ السلام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ، هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ، مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ [۱]

منتخب اُمّت:

اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو تمام بنی آدم میں سے منتخب فرمایا، سورۃ حج میں ارشاد ہے:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ، هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ، مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ، هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ، مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ [۲]

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اس نے تم کو منتخب فرمایا اور تم پر دین میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو، اللہ نے تمہارا لقب مسلمان رکھا پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ تمہارے لئے رسول گواہ ہوں اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بنو۔

جُہد بالضم وسعت، طاقت **جَہد** بالفتح مشقت، بعض اہل لغت کے نزدیک **جہد** کا معنی ہے انتہائی کوشش۔ بعض کے نزدیک **جَہد جہد** دونوں کے معنی ہیں وسعت اور طاقت، اور انتہائی کوشش کے لئے صرف لفظ **جَہد** کا استعمال ہوتا ہے۔ **جہاد** اور **مجاہدہ** (باب مفاعلۃ) **جہد** سے ہی بنا ہے، یعنی طرفین سے انتہائی کوشش اور مشقت۔ دشمن سے جنگ کرنے میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ طرفین سے غالب آنے کی انتہائی کوشش ہوتی ہے، ہر فریق

---

[۱] سورۃ الحج: ۷۸

[۲] سورۃ الحج: ۷۸

اپنی انتہائی وسعت وطاقت صرف کرتا ہے اور قولی وعملی جہاد کرتا ہے۔

فی اللہ یعنی اللہ کی راہ میں دین کو سربلند کرنے اور مضبوط کرنے کے لئے بعض نے **فی اللہ** کا ترجمہ کیا ہے **لوجہ اللہ** خالص اللہ کے لئے۔

حق جہادہ کی ترکیب مقلوب ہے یعنی جہاد کرو ایسا جہاد جو حق ہو، خالص اللہ کے لئے ہو۔ **حق** کی اضافت **جہاد** کی طرف معنی میں زور پیدا کرنے کے لئے کردی گئی جیسے بولتے ہیں **ھو حق عالم** خلاصہ مطلب یہ ہے کہ خالص اللہ کے لئے جہاد کرو، اس لئے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے **حق جہادہ** کی تشریح میں فرمایا: اپنی پوری طاقت اللہ کی راہ میں لگا دینا اور اللہ کے دین میں کسی بُرا کہنے والے کی ملامت سے نہ ڈرنا ہی حق جہاد ہے۔ مقاتل اور ضحاک نے کہا: اللہ کے لئے کام کرو جیسا کہ کام کرنے کا حق ہے اور اس کی عبادت کرو جیسا کہ عبادت کا حق ہے۔

اکثر مفسرین نے فرمایا ہے کہ حق جہاد یہ ہے کہ خالص اللہ کے لئے ہو۔ سدیؒ نے کہا: حق جہاد یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ کی جائے۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نفس اور نفسانی ہوا وہوس سے جہاد کرنا ہی جہاد اکبر اور حق جہاد ہے۔ بغوی رحمۃ اللہ علیہنے بیان کیا: روایت میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس آئے تو فرمایا: ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہنے الزہد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کچھ غازی لوگ حاضر ہوئے، حضور ﷺ نے ان کو خوش آمدید فرمایا اور فرمایا تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ آئے۔ عرض کیا گیا: جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا: بندہ کا اپنی نفسانی خواہشات سے جہاد کرنا۔ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا اس کی سند میں ضعف ہے۔

اس آیت میں جہاد سے صرف کفار سے جنگ کرنا ہی مراد نہیں ہے۔ سباقِ آیت اس تخصیص کے خلاف ہے۔ ترتیب آیت میں خاص کے بعد عام کا ذکر کیا گیا ہے، پہلے "**وَاسْجُدُوْا وَارْكَعُوْا**" فرما کر نماز کا حکم دیا، اس کے بعد عام عبادت کا حکم دیا جس میں نماز بھی داخل ہے، اس کے بعد ہر عمل خیر کو اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی، اس کے اندر اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق، تمام نمازیں، روزے، کافروں سے جنگ، اخلاق کریمہ اختیار کرنا اور تمام نیکیاں کرنا داخل ہے۔ سنن اور مستحبات کو بھی یہ حکم شامل ہے، اس کے بعد جہاد کا حکم دیا تو اس ترتیب بیان کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ جہاد کو کافروں سے جنگ کے لئے مخصوص سمجھ لیا جائے، بلکہ اس سے مراد ہوگا تمام

گفتار، رفتار اور اطوار میں اخلاص ہو اور یہ اخلاص اسی وقت حاصل ہوگا جب نفس اور خواہشات نفس کی مخالفت کی جائے، کیونکہ جب تک دل کی صفائی نہ ہو اور نفس کو فنا نہ کر دیا جائے اس وقت تک اخلاص کا حصول ممکن نہیں اور دِل کی صفائی اور فناء نفس اس وقت ممکن ہے جب نفس امارہ اور اس کی خواہشات سے جہاد کیا جائے، لیکن اسی کے ساتھ مشکوٰۃ نبوت سے استفادہ بھی لازم ہے۔ اسی کو اصطلاح میں سلوک اور جذب کہا جاتا ہے۔ قدماء مفسرین کے اقوال میں اسی کو اخلاص کہا گیا ہے۔ صوفی جب نفس کو فنا کر دیتا ہے اور دِل کی صفائی اس کو حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا شمار مخلصین میں ہو جاتا ہے، اس وقت وہ کسی کے برا کہنے کی پرواہ نہیں کرتا اور بغیر دکھاوے اور شہرت طلبی کے خالص نیت کے ساتھ لوجہ اللہ اپنے ربّ کی عبادت کرتا ہے اور ہر دم اُس کی فرمانبرداری کرتا ہے، کبھی نافرمانی نہیں کرتا، درحقیقت یہی جہاد اکبر ہے۔ کافروں کے ساتھ لڑنا تو جہاد کی ایک ظاہری شکل ہے بلکہ تمام عبادتیں جہاد کی صورتیں ہیں، اگر خالص لوجہ اللہ نہ ہوں تو بیکار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

> تمام اعمال نیت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ہر شخص کے لئے وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو گی، پس جس شخص نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے گھر بار اور وطن چھوڑا تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی اور جس نے دنیا حاصل کرنے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لئے ہوگی جس کے لئے اس نے ہجرت کی ہو گی۔[۱]

یہ بھی اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے: میں سب شریکوں سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں، جس نے کوئی (نیک) عمل کیا اور میرے ساتھ دوسرے کو بھی اس میں شریک کر لیا تو میں اس (کے) عمل سے بیزار ہوں۔ اس کا یہ عمل اسی کے لئے ہوگا جس کے لئے اس نے کیا ہوگا۔[۲]

فائدہ:

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف آئے، اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ نفس کے ساتھ جہاد کرنا سب سے بڑا جہاد ہے اور یہ شیخ کامل کی صحبت سے مرید کو حاصل ہوتا ہے۔ کافروں سے جنگ

---

[۱] بخاری فی الایمان، باب: ۴۱، مسلم فی الامارۃ، حدیث: ۱۵۵

[۲] مسلم فی الزھد، حدیث: ۴۶

کرنے کے بعد جب صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور برکتِ صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے اور انوارِ رسالت سے استفادہ کا زیادہ موقع ملا اور علوم ظاہری و باطنی کو حاصل کرنے کی کامل فرصت ملی اور یہی سب سے بڑا جہاد تھا۔

(اس جملہ اور اس سے متعلقہ امور کی مزید تفسیر وتشریح آخر میں ضمیمہ میں کردی گئی ہے۔)

هُوَ اجْتَبٰكُمْ ''اس نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا''

اللہ نے تم کو اپنے نبی اور حبیب ﷺ کی مصاحبت کے لئے تمام لوگوں میں سے منتخب فرمالیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ نے (سارے انسانوں میں سے) مجھے منتخب فرمالیا اور میرے لئے میرے ساتھی منتخب فرما دیئے اور ساتھیوں میں سے میرے لئے سسرالی رشتہ دار اور مددگار منتخب فرمادیئے۔[۱]

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے: میں نے خود سنا، رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے:

اللہ نے اسماعیل علیہ السلام کی اُولاد میں کنانہ کو برگزیدہ بنادیا اور بنی کنانہ میں سے قریش کو بزرگی عطا فرمائی اور قریش میں سے بنی ہاشم کو منتخب کرلیا اور بنی ہاشم میں مجھے منتخب فرمایا۔[۲]

ترمذی کی روایت میں ہے:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو چھانٹ لیا اور اولادِ اسماعیل میں سے بنی کنانہ کو۔[۳]

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ

اور دین میں تم پر تنگی نہیں کی یعنی ایسی تنگی اور سختی نہیں کی جس کی تعمیل وتکمیل تمہارے لئے سخت ہوجاتی۔

بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مومن جب کسی گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے تو اللہ اس کے لئے گناہ کی سزا سے نکلنے کا راستہ ضرور بنادیتا ہے، توبہ کے ذریعے سے ہو یا دنیوی سزا اور ادائے حقوق کی صورت میں ہو یا کفارہ دے کر۔ بہرحال اللہ نے دین اسلام میں ایسی تنگی نہیں رکھی کہ کسی طرح اس گناہ سے پاک ہونے کی گنجائش ہی نہ ہو۔ گزشتہ اُمتوں کیلئے بعض گناہوں سے توبہ کرنے اور توبہ قبول ہونے کا اللہ نے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا۔

---

[۱] کنز العمال: ۱۱۲۶۰

[۲] مسلم فی الفضائل، احمد فی المسند ۴/ ۱۰۷

[۳] ترمذی فی المناقب، باب: ۱

بعض اہل علم نے کہا: تنگی نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے اداء فرض کے اوقات میں کوئی اشتباہ نہیں رکھا، فرائض کو ادا کرنے کے لئے اوقات مقرر فرمادیئے، مثلاً ہلال رمضان، ہلال فطر، وقت حج وغیرہ۔

مقاتل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تنگی نہیں کی یعنی ضرورت کے وقت سہولت کا باب کھول دیا، مثلاً سفر میں نماز کا قصر، پانی نہ ملنے یا نقصان رساں ہونے کی صورت میں تیمم۔ سخت ضرورت کے وقت مردار کو کھانا، مجبوری کے وقت بیٹھ کر بلکہ لیٹ کر نماز ادا کرنا، کلبیؒ نے بھی یہی تشریح کی ہے۔ یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کہ جب تم کو کسی بات کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے اس کی تعمیل کرو۔[۱]

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مروی ہے:

تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل پر (سخت احکام کے) جو بار تھے (اور سخت بندشیں تھیں) اللہ نے اس اُمت سے ان کو ساقط کر دیا۔

اور حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر مظہری میں فرمایا:

دین میں تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو ساری اُمتوں میں سے اپنے لئے منتخب فرمالیا ہے۔ اس کی برکت سے اس اُمت کے لوگوں کو دین کی راہ میں بڑی سے بڑی مشقت اُٹھانا بھی آسان بلکہ لذیذ ہوجاتا ہے۔ محنت سے راحت ملنے لگتی ہے خصوصاً جب دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہوجائے تو سارے بھاری کام بھی ہلکے پھلکے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ حدیث صحیح میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: **قرة عيني في الصّلوٰة** یعنی نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک کردی گئی ہے۔[۲]

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ

تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی (اس) ملت پر (ہمیشہ قائم رہو)۔

یہ سورت مکی ہے، اس لئے بظاہر آیت میں خطاب قریشی مومنوں کو ہے اور دوسرے لوگ ذیلی طور پر اس میں

---

[۱] بخاری فی الاعتصام، باب: ۶، مسلم فی الفضائل، حدیث: ۱۳۰

[۲] رواہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ

داخل ہو جائیں گے (کیونکہ قریش کے علاوہ بہت کثرت سے ایسے لوگ تھے جن کے نسبی مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الناس تبع لقريش فى هذاالشان مسلمهم تبع لمسلمهم وكافرهم تبع لكافرهم اس معاملہ میں دوسرے لوگ قریش کے پیرو ہیں۔ مسلمان مسلمان قریشیوں کے اور کافر کافر قریشیوں کے۔[۱]

مسلمؒ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

خیر وشر میں لوگ قریش کے پیرو ہیں۔[۲]

بعض علماء کے نزدیک تمام عرب کو خطاب ہے، کیونکہ سارے عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے لیکن حضرت سلمان فارسی، حضرت بلال حبشی، حضرت صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور موالی کی کثیر جماعت تو عرب نہ تھی اور قیامت تک آنے والے لوگ بھی نسل ابراہیمی سے نہیں ہوں گے، اس لئے یہ تفسیر کمزور ہے۔ بعض نے کہا کہ: تمام مسلمان مخاطب ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کے جدِ اعلیٰ تھے اور اُمت کے لئے رسول اللہ ﷺ باپ کی طرح ہیں (نسبی نہیں بلکہ) آپ تمام مسلمانوں کی ابدی زندگی کا سبب تھے اور مسلمانوں کی حقیقی زندگی کا سبب تھے اور مسلمانوں کی حقیقی زندگی حضور ﷺ ہی کی عطا کردہ تھی، اسی لئے اللہ نے فرمایا ہے **وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ** اور رسول اللہ ﷺ کی بیبیاں مسلمانوں کی مائیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

میں تمہارے لئے باپ کی طرح ہوں۔[۳]

اہل مکہ کو دین ابراہیمی مرغوب تھا، مسلمانوں کو بھی اور کافروں کو بھی۔ مشرکوں کا بھی دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیم پر ہیں، اس خیال کی تردید میں اللہ نے تنبیہ فرمائی کہ تمہارا یہ گمان غلط ہے اور دین ابراہیمی والے تو شریعت محمدی پر چلنے والے ہیں۔ ملت محمدی ہی ملت ابراہیمی ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے ''**اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا**'' ابراہیم علیہ السلام سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے

---

[۱] الحاکم فی المستدرک ۳/ ۶۳۲، الطبرانی فی المعجم الکبیر ۱۷/ ۱۴۰

[۲] مسلم فی الفضائل حدیث ۱، احمد فی المسند ۴/ ۱۰۷

[۳] ابوداؤد فی الطہارۃ، باب: ۴، نسائی فی الطہارۃ، باب: ۳۰

والے وہ لوگ ہیں جو ان کے متبع ہیں اور یہ نبی اور (اس نبی پر) ایمان والے لوگ بھی۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا اسی نے (یعنی اللہ نے) اس سے پہلے بھی (یعنی نزول قرآن سے پہلے سابق کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس (قرآن) میں بھی۔

ابن زیدؒ نے کہا: **هو** کی ضمیر ابراہیم علیہ السلام کی طرف راجع ہے، یعنی اس زمانہ سے پہلے اپنے زمانہ میں ابراہیم نے تمہارا نام مسلمان رکھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں کہا تھا: **رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ** اے ہمارے ربّ! ہم کو اپنا مسلم (مطیع) بنادے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک مسلمان اُمّت (یعنی اہل مکہ کو مسلمان اُمّت) بنادے۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس قرآن میں اُمّت محمدی کو مسلمان کا خطاب نہیں دیا، لیکن آپ نے اپنی دعا میں چونکہ اس اُمّت کو اُمّت مسلمہ کہا تھا (اور اللہ نے آپ کی دعا کو قبول فرمالیا) اور اسی سبب سے اللہ نے اس اُمّت کو قرآن میں مسلمہ کا خطاب دیا تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہی اس قرآن میں اُمّت محمدی کو مسلمہ کہا۔ **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ** درحقیقت **هُوَ اجْتَبٰكُمْ** کا بیان ہے، کیونکہ سچے اسلام کی ہدایت کرنا اور مسلمان نام رکھنا اسی وجہ سے ہے کہ اللہ نے تم کو منتخب کرلیا ہے۔

اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امتوں پر گواہی اور اس کے مطابق اِلٰہی فیصلہ:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

''(اللہ نے تم کو مسلمان ہونے کی توفیق دی اور تم کو مسلمان بنایا اور تمہارا نام مسلمان رکھا) تاکہ قیامت کے دن رسول شہادت دیں'' (کہ میں نے تم کو اسلام پہنچادیا تھا) اور تم دوسرے لوگوں پر گواہ ہوجاؤ (کہ ان پیغمبروں نے ان کو اللہ کا پیام پہنچادیا تھا)۔

ابن جریر اور ابن المنذر رحمہما اللہ نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قیامت کے دن میں اور میری اُمّت والے اُونچے ٹیلوں پر ہوں گے اور اُوپر سے مخلوق کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ہر شخص کی دلی خواہش ہوگی کہ وہ ہم میں سے ہوجائے (یعنی ہمارے پاس ٹیلے پر آجائے) اور کوئی نبی ایسا نہ ہوگا کہ اس کی قوم نے اس کی تکذیب نہ کی ہو اور ہم شہادت دیں

گے کہ اس نے اپنی قوم کو اپنے ربّ کا پیام پہنچا دیا تھا۔[۱]

ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے الزہد میں لکھا ہے:

قیامت کے دن سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور اللہ پاک اس سے فرمائے گا کہ کیا تُو نے میرا پیام پہنچا دیا تھا؟ اسرافیل جواب دیں گے جی ہاں! اس قول پر اسرافیل علیہ السلام سبکدوش ہو جائیں گے۔ اللہ جبرئیل علیہ السلام سے فرمائے گا پھر تو نے میرے حکم کی کیا تعمیل کی؟ جبرائیل عرض کریں گے: میں نے وہ حکم پیغمبروں کو پہنچا دیا تھا پھر پیغمبروں کو طلب کیا جائے گا اور دریافت کیا جائے گا: جبرائیل نے تم کو میرا حکم پہنچا دیا تھا؟ پیغمبر عرض کریں گے: جی ہاں! دریافت کیا جائے گا: پھر تم نے میرے حکم کا کیا کیا؟ پیغمبر جواب دیں گے: ہم نے (اپنی اپنی) اُمتوں کو پہنچا دیا، اس پر امتوں کو طلب کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ: کیا تم کو پیغمبروں نے میرا حکم پہنچا دیا تھا؟ کچھ لوگ اپنے جواب میں انبیاء کی تکذیب کریں گے اور کچھ تصدیق کریں گے۔ انبیاء علیہما السلام عرض کریں گے کہ ہمارے پاس تبلیغ حکم پر شہادت دینے والے گواہ موجود ہیں۔ اللہ فرمائے گا: شاہد کون ہے؟ انبیاء عرض کریں گے: محمد ﷺ کی اُمّت (شاہد ہے کہ ہم نے اپنی اپنی اُمتوں کو تیرا حکم پہنچا دیا تھا) چنانچہ اُمّت والے جواب دیں گے: جی ہاں! (ہم اس کی شہادت دیتے ہیں) اس وقت انبیاء کی امتوں کو میرا حکم پہنچا دیا تھا؟ محمد ﷺ کی اُمّت والے جواب دیں گے: جی ہاں! (ہم اس کی شہادت دیتے ہیں) اس وقت انبیاء کی امتیں کہیں گی: اے ہمارے ربّ! (یہ لوگ تو ہمارے بعد پیدا ہوئے تھے) انہوں نے تو ہمارا زمانہ نہیں پایا، پھر یہ کیسے شہادت دے رہے ہیں؟ اللہ فرمائے گا: تم لوگوں نے تو ان اُمتوں کا زمانہ نہیں پایا، پھر کس طرح ان کی شہادت دے رہے ہو؟ اُمّت محمدی کہے گی: اے ہمارے ربّ! تُو نے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا تھا اور ہم پر ایک کتاب اُتاری تھی اور اس کتاب میں بیان کیا تھا کہ انبیاء نے اپنی اپنی اُمتوں کو تیرا پیام پہنچا دیا۔ یہی مضمون ہے آیت: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

---

[۱] ابن کثیر فی تفسیرہ ۱/ ۲۷۶، السیوطی فی الدر المنثور ۱/ ۱۴۴

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا [۱] کا۔

اُمت محمد یہ ﷺ ساری اُمتوں سے افضل:

اللہ تبارک وتعالیٰ اُمت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کی فضیلت بیان فرمارہے ہیں کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ سب قبلوں سے افضل بنادیا اسی طرح ہم نے تم کو اعتدال والی اُمت بنادیا اور ساری اُمتوں سے افضل اُمت بنادیا۔ اس اُمت کی افضلیت کا ظہور میدانِ حشر میں اس طرح سے ہوگا کہ یہ اُمت تمام اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی اور رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے بارے میں گواہی دیں گے کہ ہاں میری اُمت عدل ہے، ثقہ ہے، اس کی گواہی معتبر ہے۔

صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> بعض روایات میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ جب اُمت محمد یہ علی صاحبہا الصلوٰۃ التحیۃ دوسری اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی کہ ان کے نبیوں (علیہم السلام) نے ان کو تبلیغ کی ہے تو سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو لایا جائے گا اور آپ ﷺ سے آپ کی اُمت کے بارے میں سوال کیا جائے گا کیا آپ کی اُمت عادل ہے؟ گواہی دینے کے لائق ہے؟ اس پر آپ ﷺ ان کا تزکیہ فرمائیں گے اور گواہی دیں گے کہ واقعی میری اُمت عدل ہے۔ گواہی کے لائق ہے، اس کی گواہی معتبر ہے [۲]

بلاشبہ اس اُمت کا بڑا مرتبہ ہے اور بڑی فضیلت ہے جس کا میدان حشر میں تمام اولین وآخرین کے سامنے ظہور ہوگا۔ یہ اُمت خیر الامم ہے، اس کو افضل الانبیاء کی اُمت میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے سب کتابوں میں سے افضل کتاب عطا فرمائی جو صرف اللہ کی کتاب ہی نہیں بلکہ اللہ کا کلام بھی ہے۔ جو چھوٹے بچوں تک کے سینوں میں محفوظ ہے اور صغیر وکبیر سب کے ورد زباں ہے۔

اُمت محمد یہ ﷺ کی آپس میں گواہی پر بخشش کے فیصلے:

اس اُمت کی فضیلتوں میں یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کی گواہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر ہے ان کی گواہی

---

[۱] البقرۃ: ۱۴۳

[۲] روح المعانی، ج: ۲، ص: ۵

سے دوسری اُمتوں کے خلاف فیصلہ ہوگا اور آپس میں بھی ان کی گواہی معتبر ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ کچھ لوگ ایک جنازے کو لے کر گزرے تو حاضرین نے اس جنازہ کے بارے میں اچھے کلمات کہے اور اس کی تعریف کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا **وجبت** پھر دوسرا جنازہ لے کر گزرے تو حاضرین نے بُرائی کے ساتھ اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اس پر بھی **وجبت** فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ **وجبت** کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں تم نے خیر کے کلمات کہے لہٰذا اس کے لئے جنت واجب ہوگئی اور اس کے بارے میں تم نے شر کے الفاظ استعمال کئے اس کے لئے دوزخ واجب ہوگئی۔ **انتم شھدآء فی الارض** یعنی تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔[۱]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

جس کسی مسلمان کے لئے چار آدمی خیر کی گواہی دے دیں اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔ ہم نے عرض کیا کہ اگر دو شخص گواہی دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، دو کا بھی یہی حکم ہے، پھر ہم نے ایک کی گواہی کے بارے میں دریافت نہیں کیا۔[۲]

تفسیر درمنثور ص ۱۴۵ ج ۱ میں بحوالہ مسند احمد وسنن ابن ماجہ وغیرہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عنقریب ایسا ہوگا کہ تم اپنے اچھے لوگوں کو بُرے لوگوں سے ممتاز کرسکو گے اور جان سکو گے کہ کون کیسا ہے؟ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! یہ کیسے ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا ذکر ہونے سے اور بُرا ذکر ہونے سے (یعنی جسے مسلمان اچھا کہیں وہ اچھا ہے اور جسے بُرا کہیں وہ بُرا ہے) تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ گواہی دینے کے اس بڑے مرتبہ سے وہ لوگ محروم ہوں گے جو لعنت کے الفاظ زیادہ نکالتے ہیں۔

سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

زیادہ لعنت کرنے والے قیامت کے دن نہ شہید ہوں گے نہ شفیع ہوں گے۔ (یعنی قیامت کے دن یہ لوگ نہ گواہی دینے کے اہل ہوں گے اور نہ سفارش کرنے کے لائق ہوں گے)

---

[۱] صحیح بخاری، ص ۱۸۳، ج ۱

[۲] صحیح بخاری: ص ۱۸۳، ج ۱

اُمت محمدیہ ﷺ کا اعتدال اور لفظ وسطاً کی تشریح:

اُمت محمدیہ کی تعریف میں اُمَّةً وَّسَطًا فرمایا لفظ وسط کا معنی بہترین بھی کیا گیا ہے اور عدول بھی کیا گیا ہے عدول، عدل کی جمع ہے، عدل اس کو کہتے ہیں جو ثقہ ہو، منصف ہو اور اس کی گواہی معتبر ہو، اوصافِ عالیہ سے متصف ہو۔ خیر کی صفات کو جامع ہو، برائیوں سے دور ہو، اور بعض حضرات نے اس کا معنی معتدل کا بھی لیا ہے۔ یعنی یہ اُمت ہر اعتبار سے اعتدال پر ہے اس کے اخلاق اور اعمال سب میں اعتدال ہے، یہ اُمت افراط اور تفریط سے بری ہے۔ نہ عبادات سے غفلت ہے نہ راہبوں کی طرح دنیا کو چھوڑ کر پہاڑوں میں رہنا ہے۔ ساری رات نماز پڑھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ نفس، بیوی اور مہمان کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم دی گئی۔ روزانہ روزہ رکھنے سے منع فرمایا گیا۔ نہ فضول خرچی ہے نہ بخل بلکہ درمیانی راہ ہے جس کا نام جُود ہے۔ اسی طرح نہ بزدلی، نہ ضرورت سے زیادہ بہادری، جس سے لوگوں پر ظلم ہو جائے بلکہ ان کے درمیان شجاعت ہے، ظالم بھی نہیں اور مظلوم رہنے کو بھی تیار نہیں۔ نہ عورتوں کو سردار بنایا گیا نہ ان کی مظلومیت روا رکھی گئی۔ نہ ہر فعل حلال قرار دیا گیا نہ ہر چیز کا کھانا جائز کیا گیا بلکہ حلال اور حرام کی تفصیلات بتائی گئیں۔ ضرر دینے والی اور خبیث چیزوں کے کھانے سے منع کر دیا گیا، نہ ہر چیز کا کھانا جائز کیا گیا بلکہ حلال حرام کی تفصیلات بتائی گئیں۔ ضرر دینے والی اور خبیث چیزوں کے کھانے سے منع کر دیا گیا، جن سے اخلاق واجسام پر بُرا اثر پڑے، طیب اور حلال چیزوں کے کھانے کی اجازت دی گئی۔ انسانیت کو اونچا کیا گیا۔ بہیمیت سے بچایا گیا، بربریت سے دور رکھا گیا، حد یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ عین میدانِ جنگ کے موقع پر عمل کرنے کے لئے بھی ایسے احکام صادر فرمائے جن میں اعتدال ہی اعتدال ہے، دشمنوں کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا گیا، مثلہ کرنے یعنی دشمن کے ہاتھ، پاؤں، ناک، کان کاٹنے سے منع فرمایا۔ معاشی نظام میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔ نفلی صدقات کا بھی حکم دیا گیا۔ میراث کے احکام جاری کئے گئے تاکہ دولت ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے، جان کا بدلہ قصاص مقرر کیا گیا لیکن خطا میں دیت رکھی گئی اور قصاص واجب ہونے کی صورت میں اولیاء مقتول کو یہ اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو قصاص لے لیں اور چاہیں دیت لے لیں۔ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں عام ابواب پر نظر کی جائے تو احکام میں سراسر اعتدال ہی نظر آتا ہے۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ پس نماز کی پابندی کرو۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ اور زکوٰۃ ادا کرو۔ یعنی اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی (جسمانی ومالی) طاعت کرو۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ اور (اپنے تمام امور میں) اللہ پر بھروسہ رکھو۔

اور اللہ کے سوا کسی اور سے کام میں مدد طلب نہ کرو۔ حسن نے کہا: **وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ** کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ایک روایت میں آیا ہے: اپنے ربّ سے مانگو، وہ تمام مکروہات سے تم کو محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا: اپنے ربّ سے دعا کرو، وہ تمام مکروہات سے تم کو محفوظ رکھے گا۔ بعض نے کہا: اپنے ربّ سے دعا کرو، تاکہ وہ دین پر تم کو ثابت قدم رکھے۔

بعض کا قول ہے کہ اعتصام باللہ کا معنی ہے قرآن وسنّت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہنا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں کہ جب تک ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کا طریقہ۔ [۱]

حضرت عصیف بن حارث یمنی راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> نہیں پیدا کی کسی قوم نے (اپنے دین کے اندر بلا ثبوت) کوئی نئی بات مگر (اس کے مقابلہ میں) ویسی ہی ایک سنّت اُٹھا دی گئی (مطلب یہ ہے کہ دین کے اندر کوئی نئی بات داخل کی جائے گی تو اللہ کے رسول کی سنّت اتنی ہی مٹتی چلی جائے گی) پس سنّت کو پکڑے رہنا (دین میں) بدعت کو ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔ [۲]

هُوَ مَوْلٰكُمْ وہی تمہارا مددگار ہے۔ وہی تمہارا محافظ ہے، وہ تمہارے کاموں کا کارساز اور ذمہ دار ہے۔

فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ وہی تم سب سے اچھا کارساز اور اچھا مددگار ہے۔

فَنِعْمَ میں **ف** سببیت کے لئے ہے، یعنی جب ثابت ہو گیا کہ اللہ تمہارا کارساز و مددگار ہے تو بس وہی سب سے اعلیٰ کارساز و مددگار ہے، اس کی مثل کوئی نہیں۔ بلکہ حقیقت میں اس کے سوا کوئی دوسرا کارساز و مددگار ہی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[۱] موطا امام مالک فی القدر، حدیث: ۳

[۲] احمد فی المسند ۴/ ۱۰۵، الہیثمی فی مجمع الزوائد ۱/ ۱۸۸

ضمیمہ

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ:

تفسیر معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لفظ جہاد اور مجاہدہ کسی مقصد کی تحصیل میں اپنی پوری طاقت خرچ کرنے اور اس کے لئے مشقت برداشت کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ کفار کے ساتھ قتال میں بھی مسلمان اپنے قول فعل اور ہر طرح کی امکانی طاقت خرچ کرتے ہیں، اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ اور **حَقَّ جِهَادِهٖ** سے مراد اُس میں پورا اخلاص اللہ کے لئے ہونا ہے، جس میں کسی دنیوی نام ونمود یا مالِ غنیمت کی طمع کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: حق جہاد یہ ہے کہ جہاد میں اپنی پوری طاقت خرچ کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت پر کان نہ لگائے۔

اور بعض حضرات مفسرین نے اس جگہ جہاد کے معنی عام عبادات اور احکام الٰہیہ کی تعمیل میں اپنی پوری طاقت پورے اخلاص کے ساتھ خرچ کرنے کے لئے ہیں۔

ضحاک اور مقاتل رحمہما اللہ نے فرمایا:

مراد آیت کی یہ ہے کہ **اعملوا لِلّٰهِ حق عمله واعبدوه حق عبادته** یعنی عمل کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کا حق ہے اور عبادت کرو اللہ کی جیسا کہ اس کا حق ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

یہاں جہاد سے مراد اپنے نفس اور اس کی بیجا خواہشات کے مقابلہ میں جہاد کرنا ہے اور یہی حق جہاد ہے۔

امام بغوی وغیرہ نے اس قول کی تائید میں ایک حدیث بھی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے:

ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت جو جہادِ کفار کے لئے گئی ہوئی تھی واپس آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **قدمتم خير مقدم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر قال مجاهدة العبد لهواه رواه البيهقي وقال هذا اسناد فيه ضعف** یعنی تم لوگ خوب واپس آئے چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف یعنی

اپنے نفس کی خواہشات بیجا کے مقابلہ کا جہاد اب بھی جاری ہے۔ اس روایت کو بیہقی نے روایت کیا ہے مگر کہا ہے کہ اس کے اسناد میں ضعف ہے۔

فائدہ: تفسیر مظہری میں اس دوسری تفسیر کو اختیار کر کے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب مقابلہ کفار میں جہاد کر رہے تھے، خواہشاتِ نفسانی کے مقابلہ کا جہاد تو اس وقت بھی جاری تھا مگر حدیث میں اس کو واپسی کے بعد ذکر کیا ہے اس میں اشارہ یہ ہے کہ اہواء نفس کے مقابلہ کا جہاد اگرچہ میدانِ کارزار میں بھی جاری تھا مگر عادۃً یہ جہاد شیخ کامل کی صحبت پر موقوف ہے اس لئے وہ جہاد سے واپسی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے وقت ہی شروع ہوا۔

مجاہدہ نفس جہادِ اکبر ہے، دلائل قرآن وسنت کی روشنی میں:

دلیل ۱۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ'' کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ سید محمود آلوسی مفتی بغداد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والجهاد كما قال الراغب استفراغ الوسع فى مدافعة العدووهو ثلاثة اضرب مجاهدة العدو الظاهر كالكفار ومجاهدة الشيطان ومجاهدة النفس وهى اكبر من مجاهدة العدو الظاهرة كما يشعر به من اخرج البيهقى وغيره عن جابر قال قدم على رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم قوم غزاة فقال قدمتم خير مقدم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر قيل وما الجهاد الاكبر؟ قال مجاهدة العبد هواه وفى اسناد ضعف مغتفر فى مثله[۱]

یعنی امام راغب کے کہنے کے مطابق دشمن کے دفاع میں اپنی پوری طاقت وقوت کو خرچ کرنا جہاد ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں ظاہری دشمن مثل کفار کے دفاع میں قوت خرچ کرنا اور شیطان کے ساتھ مقابلہ کرنا اور اس کے حملوں کا دفاع کرنا اور اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا اور اس کی خواہشات کا دفاع کرنا اور ظاہر دشمن کے جہاد کرنے سے یہ نفس کا جہاد جہاد اکبر ہے جس طرح کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کی امام بیہقی وغیرہ نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج ۹ ص ۳۰۹

روایت کیا ہے فرمایا کہ غازیوں کی ایک جماعت حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں آئی آپ نے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ تم جہاد اصغر سے لوٹ کر جہاد اکبر کی طرف آئے ہو کہا گیا کہ جہاد اکبر کیا ہے؟ کہا آدمی کا اپنی خواہش کے خلاف جہاد کرنا اور اس کے اسناد میں ضعف ہے۔ لیکن ایسے مواقع پر وہ ضعف قابل معافی (قابل قبول) ہے یعنی قابل گرفت نہیں ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حق تعالیٰ فرماتا ہے ''وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ'' اور مخالفت نفس وشیطان کی کرنا خود، جہاد اکبر ہے۔ نص سے یہ بات ثابت ہے''۔[۱]

دلیل ۲۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا [۲] ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے''۔

امام محی السنہ المعروف امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قِيْلَ المجاهدة هی الصبر علی الطاعات قال الحسن افضل الجهاد مخالفة الهویٰ [۳] ''اور کہا گیا ہے کہ عبادات پر صبر کرنا مجاہدہ ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں خواہش کی مخالفت کرنا افضل جہاد ہے''۔

دلیل ۳: حدیث رسول اللہ ﷺ:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّمَ: اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ [۴] ''حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کامل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ

---

[۱] فتاوی رشیدیہ تالیفات رشیدیہ ص ۱۹۵

[۲] سورۃ عنکبوت: ۶۹

[۳] تفسیر بغوی، ج: ۳، ص: ۴۷۵

[۴] مشکوٰۃ بحوالہ شعب الایمان، ص: ۱۵، ترمذی، ج: ۱، ص: ۱۹۵۔ کتاب الجهاد لابن مبارك، کتاب الزهد لابن مبارك، السنن الکبری للنسائی، کتاب الرقائق، مسند بزار، کشف الاستار، محاسبة النفس لابن ابی الدنیا، صحیح ابن حبان، کتاب السیر، معجم الکبیر للطبرانی کتاب الامثال للعسکری، کنز العمال، موارد الظمان، جامع صغیر، قال الهیثمی رجاله ثقاة۔

جہاد کرے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں''۔

اس صحیح حدیث سے ثابت ہوا کہ مجاہدہ نفس یعنی اپنے نفس کو ہر قسم کی خواہشات سے روک کر اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت پر پابند کرنا جہادِ اکبر ہے۔ دوسرے لفظوں میں ظاہراً وباطناً شریعت پر عمل کرنا جہادِ اکبر ہے اور اس کے مقابلہ میں قتال کفار نسبتاً جہادِ اصغر ہے۔ بہرحال یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے جملہ راوی ثقہ ہیں اور اس سے مجاہدہ نفس کا جہادِ اکبر ہونا اظہر من الشمس ہے۔

چنانچہ شارح مشکوٰۃ علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اِذْهُوَ الْجِهَادُ الْاَكْبَرُ وينشاء منه الجهاد الاصغر [۱] یعنی حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت وطاعت میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے کیونکہ جہادِ نفس، جہادِ اکبر ہے اور اسی سے جہادِ اصغر پیدا ہوتا ہے یعنی پوری شریعت کے اتباع سے قتال کفار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری محشی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث "**المجاهد من جاهد نفسه فی اطاعة الله**" کے تحت لکھا ہے:

هذا هو الجهاد الاكبر یعنی نفس کا جہاد یہی جہادِ اکبر ہے [۲]

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''یعنی المجاهد ليس من قاتل الكفار فقط بل المجاهد من جاهد نفسه وحملها واكرهها على طاعة الله لان نفس الرجل اشد عداوة من الكفار لان كفار العبد منه ولا يتفق التلاحق والتقاتل معهم الا حينا بعد حين واما نفسه فَاَبَدًا يلازمه و يمنعه من الخير والطاعة ولا شك ان القتال مع عدو الذى يلازم الرجل اهم من القتال مع العدو الذى هو بعيد منه.... اى المجاهد الحقيقى الذى ينبغى ان يسمى مجاهدا من جاهد نفسه وكان مجاهدته مع غير بالنسبة اليه كلا مجاهدته۔ [۳]

---

[۱] مرقاۃ نقل از حاشیہ مشکوٰۃ ص ۱۵

[۲] ترمذی ج ۱ ص ۱۹۵

[۳] التعلیق الفصیح علی مشکاۃ المصابیح ج ۱ ص ۴۴

یعنی مجاہد صرف وہ نہیں ہے جو کفار سے لڑائی کرتا ہے بلکہ مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرتا ہے اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مجبور کرتا ہے کیونکہ آدمی کا نفس دشمنی میں کفار سے زیادہ سخت ہے اس لئے کہ کفار تو اس سے دور رہتے ہیں اور ان کے ساتھ لڑائی اور مقابلہ کبھی کبھی ہوتا ہے لیکن آدمی کا نفس وہ تو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کو ہر نیکی اور بندگی سے روکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ ساتھ رہنے والے دشمن سے مقابلہ کرنا زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس دشمن کے جو آدمی سے دُور رہتا ہے حقیقی مجاہد جس کو مجاہد کہنا موزوں ومناسب ہے وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرتا ہے اور آدمی کا غیر نفس سے مجاہدہ کرنا نسبتاً نہ ہونے کے برابر ہے۔

شمس العلماء حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بیہقی کی حدیث حضرت فضیلہ سے روایت ہے حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ فِيْ طَاعَةِ اللّٰهِ یعنی مجاہد صرف وہی ہے یعنی مجاہد کامل کون ہے۔ جہاد میں ہزاروں سر کاٹنے والا نہیں! جہاد کرنے والا نہیں! بلکہ جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد اکبر سے اللہ کی بندگی کے لئے جہاد کرے شریعت کی بات پر عمل کرے جنگ کے میدان کا جہاد چھوٹا جہاد ہے نفس کا جہاد یا نفس کے ساتھ مقابلہ کرنا جہاد اکبر ہے جو مسلسل ہے۔ پیدا ہونے سے قبر تک کرنا پڑے گا۔[۱]

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور حضرت مولانا صوفی محمد سرور صاحب شرح بخاری میں تحریر فرماتے ہیں:

''اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ'' اس حدیث کے مطابق گناہوں سے بچنا سب سے بڑا جہاد ہے اور کافر شیطان بھی ہے، انسان بھی ہے۔ کافر شیطان ہم سے زیادہ قریب ہے اس سے جہاد اور سب شیطانی گناہوں کو چھوڑنا کافر انسانوں سے لڑنے سے پہلے ہونا چاہئے۔[۲]

عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ المجاهد من جاهد نفسه کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ای قهر نفسه الامارة بالسوء علی مافیه رضاء الله من فعل الطاعة و تجنب المعصية وجهاد ها اصل کل جهاد فانه مالم يجاهد هالم يمكنه جهاد

---

[۱] خطبات افغانی ص ۲۵۵

[۲] الخیر الجاری فی شرح صحیح بخاری، ج:۱، ص:۷۲

العدو الخارج[۱]

یعنی مجاہد حقیقی وہ ہے جس نے اپنے نفس امارہ بالسوء کو نیکی کرنے پر اور گناہ سے بچنے پر مجبور کیا اور نفس کا جہاد ہر جہاد کی اصل ہے پس جس شخص نے نفس کے ساتھ جہاد نہیں کیا اس کے لئے خارجی دشمن سے جہاد کرنا ممکن نہیں ہے۔ یعنی نفس انسانی اندرونی دشمن ہے اور کفار خارجی دشمن ہے اور خارجی سے پہلے داخلی دشمن سے جہاد کرنا اہم اور زیادہ ضروری ہے۔

دلیل ۴: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اعدیٰ عدوك نفسك التی بین جنبیك[۲]

''تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دو پہلو کے درمیان ہے''۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے اور ظاہر ہے کہ بڑے دشمن سے مقابلہ کرنا جہاد اکبر ہی ہوگا۔

دلیل ۵: حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

اخبرنا علی بن احمد بن عبدان انبانا احمد بن عبید ثنا تمتام (ای محمد بن غالب) ثنا عیسیٰ بن ابراهیم ثنا یحیٰ بن یعلی عن لیث عن عطاء عن جابر رضی الله عنه قال قدم علی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قوم غزاة فقال رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم قدمتم خیر مقدم من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر قیل وما الجهاد الاکبر قال مجاهدة العبد هواه هذا اسناد فیه ضعف وفی روایة۔[۳]

''تم لوگ خوب واپس آئے ہو چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف، پوچھا گیا جہاد اکبر کیا ہے؟ فرمایا کہ آدمی کا اپنی خواہش نفس کے خلاف جہاد کرنا''۔

یعنی اپنے نفس کی خواہشات بیجا کے مقابلہ کا جہاد اب بھی جاری ہے۔ اس حدیث میں صاف صاف بتایا گیا

---

[۱] تحفۃ الاحوذی ج ۳ ص ۲

[۲] کنوز الحقائق فی حدیث خیر الخلائق برھامش الجامع الصغیر ج ۱ ص ۳۱ بحوالہ بیہقی

[۳] کتاب الزھد الکبیر للبیہقی ص ۱۶۵ حدیث رقم ۳۷۳ تاریخ بغداد الخطیب ج ۳ ص ۵۲۴

ہے کہ مجاہدہ نفس یعنی ظاہراً وباطناً پوری شریعت کا اتباع جہاد اکبر ہے اور قتال کفار نسبتاً جہاد اصغر ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ جہاد کی تعریف اور فضیلت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''واشق منه قصر النفس على الطاعات فى النشاط والكسل على الدوام ومجانبة اهويتها ولذا قال صلى الله عليه وآله و سلم وقد رجع من غزوة رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر [۱]

یعنی اس جہاد سے زیادہ مشکل وسخت (وہ جہاد) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ ہر حال میں خواہ خوشی ہو یا سستی اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت پر پابند رکھنا اور اس کو اپنی خواہشات سے دور رکھنا اسی لئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا جبکہ ایک غزوۃ سے واپس ہوئے کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔[۲]

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وقال نبينا صلى الله عليه وآله وسلم لقوم قدموا من الجهاد مرحبا قدمتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر قيل يا رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وما الجهاد الاكبر قال جهاد النفس وقال صلى الله عليه

---

[۱] اوجز المسالک، ج: ۴، ص: ۱

[۲] یہ حدیث درج ذیل کتب حدیث میں پائی جاتی ہے:

(۱) بیہقی (۲) تاریخ بغداد (۳) کنز العمال (۴) جامع صغیر للسیوطی (۵) الدرر المنتثرہ فی الاحادیث المشتہرہ (۶) الاسرار المرفوعہ (۷) کنوز الحقائق برحاشیہ جامع صغیر ج ۲ ص ۲۹ (۸) فردوس دیلمی (۹) اوجز المسالک شرح موطا امام مالک (۱۰) السراج المنیر (۱۱) المغنی عن حمل الاسفار فی الاسفار فی تخریج ما فی الاحیاء من الاخبار ج ۳ ص ۷ (۱۲) سیرت النبی ج ۵ ص ۲۱۹ سید سلیمان ندوی (۱۳) سیف المقلدین علی اعناق المنکرین۔

مندرجہ ذیل تفسیروں میں بھی یہ حدیث منقول ہے:

(۱) تفسیر بغوی ج ۳ ص ۳۰۰ (۲) تفسیر روح المعانی ج ۹ ص ۳۰۹ (۳) تفسیر خازن ج ۳ ص ۳۱۹ (۴) تفسیر بیضاوی ص ۱۲۳ (۵) تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۵۸ (۶) تفسیر الجمل (۷) تفسیر روح البیان (۸) حاشیہ جلالین ص ۲۸۶ (۹) معارف القرآن ج ۶ ص ۲۸۹ (۱۰) تفسیر درمنثور (۱۱) تفسیر کشاف

فقہ کی مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث منقول ہے:

(۱) فتح القدیر شرح ہدایہ لابن ہمام ج ۵ ص ۱۸۷ (۲) فتاوی شامی ج ۳ ص ۲۳۷ (۳) حاشیہ فتاوی عزیزی ص ۲۸۔

تصوف کی مندرجہ ذیل کتب میں بھی یہ حدیث منقول ہے:

(۱) احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۷۔۶۶ (۲) الکشف (۳) کشکول معرفت (۴) مثنوی رومی (۵) کلیات امدادیہ (۶) البیان المشید ترجمہ البرہان المؤید ص ۶۹ (۷) عدۃ الطالبین مترجم اردو ص ۱۵۸ (۸) خطبات دیوبند ج ۲۔

وآله وسلم المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله عزوجل[۱]

یعنی ایک قوم جہاد سے واپس آئی حضور اکرم ﷺ نے ان کو فرمایا مرحبا تم لوگ جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف واپس ہوئے اور حضور اکرم ﷺ نے فرمایا مجاہد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''اور جو شہادت نفس کے مجاہدہ اور اس کی لذتوں اور خواہشوں کے مارنے سے حاصل ہو وہ رتبہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نزدیک اس شہادت سے بڑھی ہوئی ہے جو کفار سے لڑنے اور تلواروں کے توڑنے سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر" اب ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے (چھوٹا جہاد تو کفار کو مارنا تھا اور بڑا جہاد نفس کو مارنا یعنی دینوی لذتوں، خواہشوں کو مٹانا ہے)۔[۲]

حضرت مولانا خلیل الرحمٰن برہانپوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

در كنز الاعمال حديث موصوف موجود وفى الجامع الصغير قدمتم خير مقدم و قدمتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر مجاهدة العبد هواه عن جابر فى باب القاف قال العزيزى فى السراج المنير وشرحه اسناده ضعيف[۳]

امام محی السنہ ابو محمد الحسین بن مسعود بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وقال عبدالله بن المبارك هو مجاهدة النفس والهوىٰ وهو الجهاد الاكبر وهو حق الجهاد و قدروى ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما رجع من غزوة تبوك قال رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر واراد بالجهاد

---

[۱] احیاء علوم الدین ج ۳ ص ۷۔۶۶

[۲] البنیان المشید ترجمہ البرہان المؤید ص ۶۹

[۳] کذا فی الدر المنثور للسیوطی فی باب الراء ص ۱۶۹ علی ہامشہ فتاویٰ الحدیثیہ لابن حجر ۱۲ حاشیہ فتاوی عزیزی ص ۲۸

الاصغر الجهاد مع الكفار وبالجهاد الاكبر الجهاد مع النفس[۱]

یعنی امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں آیت **وجاهدوا فی الله حق جهاده** سے مراد نفس و خواہش کا جہاد ہے اور یہی جہاد اکبر ہے اور یہی جہاد کا حق ہے اور تحقیق روایت کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب غزوہ تبوک سے واپس ہوئے تو فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں اور جہاد اکبر سے جہاد مع النفس مراد ہے اور جہاد اصغر سے کفار کے ساتھ جہاد مراد ہے۔

ناصر الدین ابوسعید عبداللہ بن محمد شیرازی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ **فضل الله المجاهدين** کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قيل المجاهدون الاولون من جاهد الكفار والاخرون من جاهد نفسه وعليه قوله عليه السلام رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر[۲]

یعنی کہا گیا ہے کہ پہلے مجاہد وہ ہیں جو کفار سے جہاد کرتے ہیں وہ دوسرے مجاہد وہ ہیں جو نفس سے جہاد کرتے ہیں اور اسی پر حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

امام علامہ علاء الدین علی بن محمد ابراہیم المعروف خازن رحمۃ اللہ علیہ **وجاهدوا فی الله حق جهاده** کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

قيل مجاهدة النفس والهوىٰ هو حق الجهاد وهو الجهاد الاكبر روى ان النبى ﷺ لما رجع من غزوة تبوك قال رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر[۳]

یعنی کہا گیا ہے کہ مجاہدہ نفس وخواہش یہی جہاد کا حق ہے اور یہی جہاد اکبر ہے روایت کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ جب غزوۃ تبوک سے واپس ہوئے تو فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے

---

[۱] تفسیر بغوی ج ۳ ص ۳۰۰

[۲] تفسیر بیضاوی ص ۱۲۳

[۳] تفسیر خازن ج ۳ ص ۳۱۹

جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وھو المراد من الجھاد الاکبر فیما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقد رجع من الغزو رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر[۱]

یعنی حضور اکرم ﷺ جب کہ آپ کسی غزوۃ سے واپس آرہے تھے تو فرمایا تھا کہ ہم جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں اس سے وہی مراد ہے یعنی ذکر حضوری بالفاظ دیگر مجاہدہ نفس۔

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ افادات بنام ''کشکول معرفت'' میں لکھا ہے:

''جہاد کی دو قسم ہیں ایک قسم کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور دوسری قسم اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا[۲] ان دونوں میں سے نفس کے ساتھ جہاد کرنا، جہاد اکبر ہے اور کفار کے ساتھ جہاد کرنا جہاد اصغر ہے امام بیہقی نے ایک روایت نقل کی ہے حضرت جابر سے **قدم النبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم من غزاۃ فقال علیہ الصلوۃ والسلام قدمتم خیر مقدم و قدمتم من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر قالو وما الجھاد الاکبر قال مجاھدۃ العبد ھواہ** یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے کسی غزوہ کی واپسی میں فرمایا کہ آپ لوگ جہاد اصغر سے فارغ ہو کر جہاد اکبر کی طرف آئے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے پوچھا جہاد اکبر سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا بندے کا جہاد کرنا اپنے نفس کے ساتھ۔

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نفس کے ساتھ جہاد کرنے کو جہاد اکبر اس لئے فرمایا کہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے کی صورت میں تلوار صرف اعضاء پر پڑتی ہے اور یہ جہاد صرف میدان جنگ میں پایا جاتا ہے بخلاف نفس کے ساتھ جہاد کہ اس میں دِل پر تلوار چلتی ہے جو بادشاہ ہے تمام اعضاء کا اور یہ تلوار دل پر ہر وقت چلتی ہے اس لئے کہ نفس انسان کو لئے ہوئے پھرتا ہے اور گناہ کا تقاضا ہر وقت انسان کو ہوتا ہے۔

تفسیر روح البیان کے حوالہ سے جلالین کے حاشیہ پر لکھا ہے:

---

[۱] تفسیر مظہری ج ۱ ص ۲۵۸

[۲] تفسیر مظہری ص ۲۱۶ ج ۷

وفی الحدیث جاهدوا اهوائکم کما تجاهدون اعدائکم وعنه صلی الله علیه وآله وسلم انه رجع من غزوة تبوك فقال رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر فجهاد النفس اشد من جهاد الاعداء الشیاطین وهو حملها علی اتباع الاوامر والاجتناب عن النواهی[۱]

حدیث میں ہے کہ جس طرح اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے جہاد کیا کرو حضور اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ غزوہ تبوک سے واپس ہوئے تو فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے پس نفس کا جہاد دشمنوں اور شیطانوں سے جہاد سے زیادہ سخت ہے وہ یہ ہے کہ نفس کو اوامر شرعیہ پر پابند کیا جائے اور نواہی سے روکا جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ، جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہوسکتا ہے علماء دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے ان صحابہؓ سے جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے فرمایا تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد، جہادِ نفس کی طرف آرہے ہو۔

حضرت مولانا نور محمد صاحب دارالعلوم وزیرستان وانا لکھتے ہیں:

مثلاً ایک مرتبہ جہاد سے واپسی پر حضور علیہ السلام نے فرمایا **رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاکبر** ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں یعنی نفس کے ساتھ جہاد کی طرف اب یہاں صاف واضح ہے کہ حضور علیہ السلام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ ذہن نشین کرا رہے ہیں کہ اطاعت میں پامردی اور استقامت صرف میدان جنگ تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے باقی شعبوں میں بھی میدان جنگ سے بڑھ کر اطاعت میں پامردی اور استقامت کا مظاہرہ کرنا ہوگا حضور علیہ السلام کا مقصد قطعاً یہ نہ تھا آپ جہاد بالسیف کی تنقیص فرما

---

[۱] حاشیہ جلالین ص ۲۸۶

رہے تھے۔[۱]

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور چند متشدد دین علماء نے اس حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے جس کی مندرجہ بالا جمہور علماء واکابرین کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔

مفتی رشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک استفتاء اور اس کا جواب:

سوال: صوفیاء کرام مجاہدہ نفس کو جہادِ اکبر کہتے ہیں، کیا اس کا قرآن وحدیث سے کوئی ثبوت ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب:

قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم اعدى عدوك نفسك التى بين جنبيك اخرجه البيهقى [۲]وقال صلى الله عليه وآله وسلم المجاهد من جاهد نفسه[۳] واخرج الديلمى عن جابر رضى الله عنه، قال قدم على النبى صلى الله عليه وآله وسلم قوم غزاة فقال قدمتم خيرمقدم قدمتم من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر، مجاهدة العبد هواه۔ [۴]

واليه اشار العارف الرومى رحمة الله تعالىٰ:

قد رجعنا من الجهاد الاصغريم
يا نبى اندر جهاد اكبريم

ان نصوص کے علاوہ ویسے بھی ظاہر ہے کہ کفار کے ساتھ جہاد سے اصل مقصد حفاظت دین ہے اور وہ مجاہدہ نفس ومخالفت ہوئی پر موقوف ہے۔ فقط واللہ اعلم ۲ ربیع الاخر سنہ ۹۷ ہجری۔[۵]

---

[۱] جہاد افغان ص ۱۵۷

[۲] کنوز الحقائق

[۳] رواہ الترمذی وصححہ

[۴] کنز العمال

[۵] احسن الفتاوی ج ۱ ص ۵۵۰ سن طبع ۱۳۹۸ ہجری

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

غور کریں کہ آج ہم شب وروز نفس وشیطان کے لشکروں بے دین ماحول اور بدترین معاشرے کی فوجوں کے ساتھ برسر پیکار ہیں۔ یہ جہاد اکبر ہے بلکہ اصل جہاد یہی ہے اس لئے کہ کفار کے ساتھ جہاد سے اصل مقصد حفاظت دین ہے لہٰذا یہ سوچا کریں کہ ہم ہر وقت جہاد اکبر میں مشغول ہیں۔ شیاطین جن وانس کے لشکروں کے ساتھ سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔ [۱]

جہاد بالقرآن یعنی قرآن کی دعوت کو پھیلانا جہادِ کبیر ہے:

وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا: یہ آیت مکی ہے جبکہ کفار سے قتال وجنگ کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، اسی لئے یہاں جہاد کو بِہٖ کے ساتھ مقید کیا ہے۔ بِہٖ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ معنی آیت کے یہ ہیں کہ قرآن کے ذریعہ مخالفین اسلام سے جہاد کرو بڑا جہاد۔ قرآن کے ذریعہ اس جہاد کا حاصل اس کے احکام کی تبلیغ اور خلقِ خدا کو اس کی طرف توجہ دینے کی ہر کوشش ہے، خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا دوسرے طریقوں سے، اس سب کو یہاں جہادِ کبیر فرمایا ہے۔

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ زبان کا جہاد بڑا جہاد ہے اسے جہاد کبیر کہا گیا ہے کیونکہ وہ جہاد جو تلوار سے کیا جاتا ہے اس میں منٹوں کا قصہ ہوتا ہے اور تکلیف بھی تھوڑی دیر کی لیکن دین کی دعوت کا جہاد جو زبان سے کیا جاتا ہے وہ اذیت وتکلیف کے لحاظ سے زیادہ سخت ہے اور اس میں تکلیفیں اور اذیتیں اُٹھانا اور ہر لحہ قتل ہونا ہے ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا بہادر کون ہے لوگوں جواب دیا کہ جو حملہ کر کے قتل کر دے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں جو اپنے نفس کو قتل کر دے یہ دعوت کا کام جہاد کبیر ہے اس میں طعنے سننا، گالیاں کھانا، تکلیفیں اُٹھانا، مصیبتیں جھیلنا اور اذیتیں برداشت کرنا ہے اور میدان کارزار میں آدمی جا کر جنگ کرتا ہے پھر یا تو قتل کرتا یا قتل ہو جاتا ہے۔ [۲]

اس تمام بحث سے مقصود پوری دیانت داری کے ساتھ دین کے ایک اہم ترین شعبہ کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ۔

---

[۱] ارشاد الرشید ج ۱ ص ۹۸

[۲] خطبات حکیم الاسلام ج ۴ ص ۳۶۴، ۳۶۵

فائدہ جلیلہ، کس وقت کون سا عمل افضل ہے:

تفسیر مظہری میں حضرت قاضی ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس آیت میں جو عمارۃ مسجد پر جہاد کو فضیلت اور ترجیح دی گئی ہے وہ عمارۃ کے ظاہری معنی کے رو سے ہے یعنی مسجد کی تعمیر اور ضروری انتظامات کہ جہاد کا ان کے مقابلہ میں افضل ہونا مسلم ہے لیکن عمارۃ مسجد کے ایک دوسرے معنی عبادت اور ذکر اللہ کے لئے مسجد میں حاضری کے بھی آتے ہیں اور درحقیقت مسجد کی اصلی عمارۃ وآبادی اسی سے ہے اس معنی کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے صریح ارشادات کی بناء پر عمارۃ مسجد جہاد سے افضل واعلیٰ ہے جیسا کہ مسند احمد اور ترمذی ابن ماجہ میں حضرت ابو الدرداء کی روایت سے منقول ہے کہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسا عمل بتاؤں جو تمہارے تمام اعمال سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ افضل ہو اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بھی افضل ہو اور اس سے بھی افضل ہو کہ تم جہاد میں دشمن سے سخت مقابلہ کرو جس میں تم ان کو قتل کرو وہ تمہیں قتل کریں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ عمل ضرور بتلایئے آپ نے فرمایا کہ وہ عمل ذکر اللہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کی فضیلت جہاد سے بھی زیادہ ہے اور عمارۃ مسجد جب بمعنی ذکر اللہ لی جائے تو وہ بھی جہاد سے افضل ہے مگر اس جگہ مشرکین کا فخر وغرور ظاہر ہے ذکر اللہ اور عبادات کی بناء پر نہ تھا بلکہ ظاہری تعمیر اور انتظامات کی بناء پر تھا اس لئے جہاد کو اس سے افضل قرار دیا گیا اور قرآن وسنت کے مجموعی ارشادات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عمل کا دوسرے سے افضل واعلیٰ ہونا حالات وواقعات کے تابع ہوتا ہے بعض حالات میں ایک عمل دوسرے سے افضل ہوتا ہے اور حالات بدلنے کے بعد معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا جس وقت اسلام اور مسلمانوں سے دفاع کی ضرورت شدید ہو اس وقت یقیناً جہاد تمام عبادات سے افضل ہو گا جیسا کہ غزوہ خندق میں رسول کریم ﷺ کی چار نمازیں قضا ہو جانے کے واقعہ سے ظاہر ہے اور جس وقت ایسی شدید ضرورت نہ ہو تو ذکر اللہ وعبادت بمقابلہ جہاد کے افضل ہوگا۔ [۱]

اسی طرح بخاری شریف کی جس حدیث میں ایمان کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کو افضل عمل فرمایا گیا وہاں بھی علماء نے تصریح فرمائی ہے کہ ایمان سے مراد بجمیع ارکانہ ایمان مراد ہے لہٰذا اس حدیث سے بھی نماز وروزہ پر جہاد کی

---

[۱] معارف القرآن ج ۴ ص ۳۳۳۔۳۳۶

فضیلت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ بتایا گیا کہ سب سے افضل عمل ایمان ہے اور نماز روزہ وغیرہ ارکانِ اسلام، ایمان میں داخل ہیں اور ایک حدیث میں اس کی تصریح بھی ہے:

قال (ﷺ) والذی نفس محمد بیدہ ماشحب وجه ولا اغبرت قدم فی عمل یبتغی به درجات الآخرة بعد الصلوٰة المفروضة کجهاد فی سبیل الله [۱]

یعنی حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر کوئی ایسا نیک عمل نہیں جس میں منہ زخمی کیا جائے اور قدم خاک آلودہ ہوں۔

پس معلوم ہوا کہ فرض نماز کے بعد جہاد کا درجہ ہے اور یہی حال تمام فرائض کا ہے جو فرض عین ہیں۔ نیز بخاری شریف میں ایک روایت حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وقت پر نماز پڑھنا پھر پوچھا گیا۔ تو فرمایا والدین کے ساتھ حُسن سلوک، پھر پوچھا گیا تو فرمایا کہ جہاد فی سبیل اللہ۔

بہر حال مذکورہ بالا روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کا درجہ نماز وغیرہ ارکان اسلام کے بعد ہے چنانچہ جس حدیث میں جہاد کو ایمان کے بعد افضل کہا گیا ہے اس کی شرح میں امام ابن ہمام لکھتے ہیں:

وفی هذا لا یردد فی ان المواظبة علی اداء الفریضة واخذ النفس بها فی اوقاتها علی ماهو المراد افضل من الجهاد ولان هذه فرض عین وتتکرر والجهاد لیس کذلك ولان افتراض الجهاد لیس الا للایمان واقامة الصلوٰة فکان مقصودا وحسنا لغیرہ بخلاف الصلوٰة حسنة لعینها [۲]

یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ فریضہ نماز کی ادائیگی اور اپنے نفس کو بروقت نماز پڑھنے کا پابند بنانا جیسا کہ حدیث میں حضور اکرم ﷺ کی مراد ہے۔ جہاد سے افضل ہے اس لئے کہ نماز فرض عین ہے اور دن رات میں اس کا بار بار تکرار ہوتا ہے اور جہاد ایسا نہیں ہے اور اس لئے کہ جہاد کی فرضیت صرف ایمان اور اقامۃ صلوٰۃ کیلئے ہے لہٰذا وہ مقصود اور حسن لغیرہ ہے بخلاف نماز کے کہ

---

[۱] صححه الترمذی، فتح القدیر ج ۵ ص ۱۸۸

[۲] فتح القدیر ج ۵ ص ۱۸۸

وہ حسن لعینہ ہے۔

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف کی دونوں حدیثوں کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

وھذہ وان کان فی الصورۃ معارضۃ فان الحدیث الاول یدل علی افضلیۃ الصلوٰۃ علی الجھاد والثانی بالعکس لکن الجمع بینھما بحمل کل علی ما یلیق بحال السائل اویقال ان الصلوٰۃ والزکوٰۃ المفروضتین مرادۃ بلفظ الایمان فی حدیث ابی ھریرۃ فلا تعارض اویقال جعل الجھاد بعد الایمان فی حدیث ابی ھریرۃ صادق وان کان الجھاد بعد الصلوٰۃ والزکوٰۃ[1]

یعنی بظاہر صورۃ ان دونوں حدیثوں میں تعارض ہے کیونکہ پہلی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ نماز جہاد سے افضل ہے اور دوسری اس کے برعکس ہے لیکن ان دونوں میں یوں تطبیق دی جائے گی کہ حضور اکرم ﷺ نے ہر سائل کو اس کے حال کے مطابق جواب دیا۔ ایک صاحب کے حق میں نماز جہاد سے افضل تھی اور دوسرے سائل کے حق میں جہاد افضل تھا۔ یا یوں کہا جائے گا کہ لفظ ایمان میں فرض نماز اور زکوٰۃ مراد ہیں۔ یعنی ایمان بجمیع ارکانہ افضل عمل ہے اس کے بعد جہاد کا درجہ ہے پس اس صورت میں جہاد کا درجہ نماز وزکوٰۃ کے بعد ہی ہوگا یا یہ کہا جائے گا کہ ایمان کے بعد جہاد کا ذکر صحیح ہے اگرچہ جہاد کا درجہ نماز کے بعد ہے یعنی ایمان کے بعد جہاد کے ذکر کرنے سے جہاد کا درجہ نماز سے زیادہ نہیں ہوجاتا۔

افضل الاعمال کا مطلب:

افضل الاعمال کا مطلب حضور اکرم ﷺ نے مختلف اوقات، مختلف حالات اور مختلف اشخاص کے اعتبار سے بہت سے نیک کاموں کو افضل الاعمال فرمایا۔ کبھی ایمان کے بعد نماز کو افضل الاعمال فرمایا کبھی بھوکوں، پیاسوں کو کھانا کھلانے، پانی پلانے کو افضل الاعمال فرمایا کبھی سلام عام کرنے کو افضل الاعمال قرار دیا، کبھی اس شخص کو بہترین فرمایا جس کے ہاتھ زبان سے مسلمان محفوظ رہیں اور کبھی اس شخص کو بہترین فرمایا جو قرآن پڑھے اور

---

[1] تفسیر مظہری ج۱ ص ۲۵۷، ۲۵۸

پڑھائے اور کبھی اس کو بہترین فرمایا جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا سلوک کرے وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر عام قاری کو حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات میں تعارض نظر آتا ہے اور ہمارے علماء کرام نے اس ظاہری تعارض کے دو جواب دیئے ہیں پہلا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ بات مختلف اُوقات وحالات کے اعتبار سے اور مختلف اشخاص کے اعتبار سے فرمائی ہے مثلاً ایک وقت جہاد کی سخت ضرورت تھی تو اس وقت کے تقاضے کے اعتبار سے آپ ﷺ نے جہاد کو افضل الاعمال فرمایا اور ایک وقت میں بھوکوں کو کھانا کھلانے کی سخت ضرورت تھی تو آپ نے اس موقع پر کھانا کھلانے کو افضل الاعمال فرمایا۔ اسی طرح ایک شخص کے حال کے مناسب جہاد کرنا تھا تو آپ ﷺ نے اس شخص کیلئے جہاد کو افضل الاعمال فرمایا اور ایک شخص کے مناسب قرآن پڑھنا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس کے حق میں تلاوت قرآن مجید کو افضل الاعمال فرمایا اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا کسی نیک عمل کو افضل الاعمال کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عمل بھی افضل الاعمال میں سے ہے۔ یعنی جہاد بھی افضل اعمال میں سے ہے بھوکوں کو کھانا کھلانا بھی افضل اعمال میں سے ہے، سلام کو عام کرنا بھی افضل اعمال میں سے ہے، قرآن پڑھنا اور پڑھانا بھی افضل اعمال میں سے ہے یعنی یہ کام منجملہ افضل الاعمال میں سے ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر لحاظ سے ہر حال میں ہر وقت من کل الوجوہ یہ کام تمام کاموں سے افضل ہے پھر جن امور کو افضل الاعمال میں شمار کیا گیا ہے ان میں سے کون ہر لحاظ سے سب سے افضل ہے۔ اس کیلئے علیحدہ دلائل کی ضرورت ہے صرف افضل الاعمال کہنے سے کوئی عمل تمام اعمال سے من کل الوجوہ افضل ترین شمار نہیں ہوسکتا اور اس کیلئے دیگر دلائل وقرائن کی ضرورت ہے۔

چنانچہ شارح مسلم امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

فقد یتشکل الجمع بینهما مع ماجاء فی معناها من حیث جعل فی حدیث ابی هریرة ان الافضل الایمان ثم الجهاد ثم الحج وفی حدیث ابی ذر الایمان والجهاد وفی حدیث ابن مسعود الصلوٰة ثم البر الوالدین ثم الجهاد وقد تقدم فی حدیث عبدالله بن عمرو ای الاسلام خیر قال تطعم الاطعام وتقراء الاسلام علی من عرفت ومن لم تعرف وفی حدیث ابی موسٰی وعبدالله بن عمرو ای المسلمین خیر قال من سلم المسلون من لسانه ویده وصح فی حدیث عثمان رضی اللہ عنہ خیر کم من تعلم القرآن وعلمه وامثال

هذا فی الصحیح کثیرة واختلف العلماء فی الجمع بینهما فذکر الامام الجلیل ابو عبدالله الحلیمی الشافعی عن شیخه الامام المتقین ابی بکر القفال الشاشی الکبیر..... انه جمع بینهما بوجهین احدهما ان ذالك اختلاف جواب جری علی حسب اختلاف الاحوال والاشخاص فانه قد یقال خیر الاشیاء کذا ولا یرادبه انه خیر جمیع الاشیاء من جمیع الوجوه وفی جمیع الاحوال والاشخاص بل فی حال دون حال اونحو ذالك واستشهد فی ذالك باخبار منها عن ابن عباس رضی الله عنه ان رسول الله ﷺ قال حجة لمن لم یحج افضل من اربعین غزوة و غزوة لمن حج افضل من اربعین حجة والوجه الثانی انه یجوز ان یکون المراد من افضل الاعمال کذا اومن خیرها اومن خیر کم من فعل کذا فحذفت من وهی مرادة کما یقال فلان اعقل الناس وافضلهم ویرادانه من اعقلهم وافضلهم ومن ذالك قول رسول الله ﷺ خیر کم خیر کم لا هله ومعلوم انه لا یصیر بذالك خیر الناس مطلقا ومن ذالك قولهم ازهد الناس فی العالم جیرانه وقدیوجد فی غیر هم من هو اذهد منهم فیه هذا کلام القفال رحمه الله وعلی الوجه فی غیر هم من هوا اذهد منهم فیه هذا کلام القفال رحمه الله وعلی الوجه الثانی یکون الایمان افضلها مطلقا والباقات متساویات فی کونها افضل الاعمالِ والاحوال ثم یعرف فضل بعضها علی بعض بدلائل تدل علیها و تختلتلف باختلاف الاحوال والاشخاص۔[۱]

ترجمہ:

اس قسم کی حدیثوں میں جمع کرنا کبھی کبھی مشکل سمجھا جاتا ہے جبکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سب سے افضل ایمان کو کہا گیا ہے پھر جہاد کو پھر حج کو اور ابوذر رضی اللہ عنہ کی

[۱] نووی شرح مسلم، ج:۱، ص:۶۳

حدیث میں ایمان اور جہاد کو افضل کہا گیا ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ایمان کے بعد نماز کو افضل کہا گیا ہے، پھر والدین کے ساتھ احسان کرنے کو پھر جہاد کو اور حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا اسلام بہتر ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ بھوکوں کو کھانا کھلا اور واقف ناواقف پر سلام کر اور ابو موسیٰ اور عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا مسلمانوں میں سے کون بہتر ہے فرمایا کہ وہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان سالم رہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صحیح حدیث میں ہے تم میں بہتر وہ ہے جو قرآن پڑھے اور پڑھائے اور اس قسم کی مثالیں صحیح حدیثوں میں بکثرت موجود ہیں اور علماء کا ان کو جمع کرنے میں اختلاف ہے امام جلیل ابوعبداللہ حلیمی شافعی نے اپنے شیخ علامہ متفق ابوبکر قفال کبیر سے ذکر کیا کہ انہوں نے اس قسم کی حدیثوں کو دو طریقوں سے جمع کیا ہے ایک طریقہ یہ ہے کہ جواب کا یہ اختلاف احوال واشخاص کے اختلاف کے اعتبار سے ہے پس بے شک کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ چیز خیر الاشیاء ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ چیز **من کل الوجوہ** تمام احوال واشخاص میں بہتر ہے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک خاص حالت میں بہتر ہے نہ کہ ہر حال میں یا مثل اس کے اور اس سلسلہ میں کئی حدیثوں کی شہادت پیش کی ان میں ایک یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے حج نہیں کیا اس کیلئے حج کرنا چالیس غزوں کے برابر ہے اور جس شخص نے حج کیا ہے اس کیلئے ایک غزوہ چالیس حجوں کے برابر ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جس عمل کو افضل الاعمال کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ افضل الاعمال میں سے ایک یہ بھی ہے یا بہترین اعمال میں سے ایک یہ بھی ہے۔ یعنی ہر جگہ کلمہ "من" کا محذوف اور مراد ہے یعنی افضل الاعمال دراصل "مِنْ" **اَفْضَلِ الْاَعْمَالِ** ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ فلاں آدمی افضل الناس، اعقل الناس ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی افضل الناس واعقل الناس میں سے ہے اور اسی سے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہتر ہے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ صرف اس عمل سے تمام لوگوں سے مطلقاً بہتر نہیں ہو جاتا اور اسی سے ہے لوگوں کی یہ بات کہ فلاں آدمی جہاں کے تمام لوگوں سے زیادہ نیک ہے مراد یہ

ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں میں سے زیادہ نیک ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اور لوگوں میں اس سے زیادہ نیک بھی ہوں یہ ہے قفال رحمہ اللہ کا کلام اور اس دوسرے طریقہ پر ایمان تمام اعمال سے مطلقاً افضل ہے اور باقی افضل الاعمال والا حوال ہونے میں برابر ہیں اور پھر ان کی ایک دوسرے پر فضیلت، دوسرے دلائل سے معلوم کی جاتی ہے جو ان کی افضلیت پر دلالت کرتے ہیں اور وہ احوال واشخاص کے اختلاف کی وجہ سے مختلف بھی ہوتے ہیں۔

علامہ نواب قطب الدین شارح مشکوٰۃ ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس میں حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ افضل اور محبوب عمل کونسا ہے:

اتنی بات معلوم ہونی چاہئے کہ بہترین وافضل اعمال کے بارہ میں مختلف احادیث منقول ہیں چنانچہ اس حدیث سے تو پتہ چلتا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب اعمال یہ تین ہیں دوسری حدیثوں میں مذکور ہے کہ اسلام کے بہترین وافضل اعمال یہ ہیں کہ (غریبوں مسکینوں کو) کھانا کھلایا جائے، اسلام کی تبلیغ کی جائے اور رات میں اس وقت جبکہ لوگ آرام سے بستروں میں پڑے خواب شیریں سے ہمکنار ہوں خدا کی عبادت کی جائے اور نماز پڑھی جائے اسی طرح بعض احادیث میں منقول ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے بہترین وافضل عمل یہ ہے کہ لوگ تمہاری زبان اور تمہارے ہاتھ (کی ایذا) سے محفوظ رہیں نیز بعض حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل ترین عمل خدا کا ذکر کرنا ہے۔

بہرحال اس طرح دوسری احادیث میں دیگر اعمال کے بارہ میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اعمال بہترین وافضل ہیں تو اب ان تمام احادیث میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ یہ کہا جائے گا کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ایک کو رضا ورغبت اور اس کے مزاج کے مطابق جواب دیا ہے یعنی جس نے بہترین عمل کے بارہ میں سوال کیا اس کو وہی عمل ہوا چنانچہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہم اکثر کسی خاص چیز کے بارہ میں کسی وقت کہہ دیا کرتے ہیں کہ فلاں چیز تو سب سے اچھی ہے حالانکہ دل کے اندر اس کی اچھائی وفضیلت کے بارہ میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ چیز ہمہ وقت اور ہر حال میں نیز ہر ایک کیلئے سب سے اچھی اور افضل ہوگی بلکہ دل میں یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ چیز اس خاص وقت میں اچھی اور بہتر ہے نہ کہ ہمہ وقت مثلاً خاموشی اور سکوت کا معاملہ جہاں مناسب ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ

سکوت کے برابر کوئی چیز نہیں ہے یا خاموشی سے افضل کوئی چیز نہیں ہے۔

غرض یہ کہ آنحضرت ﷺ نے ہر ایک عمل کو حال اور مقام کے مناسب افضل فرمایا ہے مثلاً ابتداء اسلام میں جہاد ہی لوگوں کے حال کے مناسب تھا اس لئے جہاد کو فرمایا کہ یہ سب سے بہتر عمل ہے یا اسی طرح کسی شخص کو یا کسی جماعت کو بھوکا، ننگا دیکھا تو ان کی امداد واعانت کی خاطر صدقہ و خیرات کی طرف لوگوں کو رغبت دلائی اور فرمایا کہ صدقہ افضل ترین عمل ہے یا نماز کو باری تعالیٰ کے قرب حقیقی کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ اچھا اور بہتر عمل قرار دیا، بہر حال ان میں سے ہر ایک عمل کو افضل ترین عمل کہنے کی وجوہ اور حیثیات مختلف ہیں ہر ایک کی وجہ اور حیثیت اپنی اپنی جگہ دوسرے سے افضل واعلیٰ ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ ہمیں ان تعلیمات پر عمل کرنے اور آگے پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

[۱] مظاہر حق، ج:۱، ص:۴۱۹

قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ یَوْمِ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ اِھْرَاقِ الدَّمِ (الحدیث)

شرعاً وعقلاً

قربانی

کیوں ضروری ہے؟

شرعاً وعقلاً قربانی کیوں ضروری ہے؟

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا. مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ. وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ. اَرْسَلَهُ اللّٰهُ اِلٰى كَآفَّةٍ لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا

اَمَّا بَعْدُ!

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ: مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمِ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهٗ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَ اَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا. وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ. فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا اَوْ كَمَا قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ۔[۱]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: کہ بقرہ عید کے دن انسان کے تمام نیک اعمال میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ اور محبوب عمل قربانی ہے، یہ قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھر کے ساتھ (صحیح سالم) آئے گی اور یقیناً (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے حق تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ سو قربانی خوشدلی سے کیا کرو''۔

تمہید:

محترم عزیز بھائیو! دسویں ذی الحجہ کو خون بہانا کیوں ضروری ہے؟ کوئی اور عمل اس کے قائم مقام کیوں نہیں ہوسکتا نیز شرعاً وعقلاً قربانی کیوں ضروری ہے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے اصولِ ثالثہ کا سمجھنا اور جاننا انتہائی ضروری ہے۔

---

[۱] السنن للترمذی، ابواب الاضحیۃ، باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، ج:۱، ص:۴۰۷، ط: رحمانیہ، لاہور

پہلا اصول:

یہ اصول جس طرح تکوینی ہے اسی طرح تشریعی بھی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا ذرہ ذرہ دو چیزوں سے ملا کر بنایا ہے۔ ایک روح اور ایک جسم یعنی ہر چیز کی صورت ہے اور ایک اس کی حقیقت و ماہیت، یا یوں کہئے کہ ایک اس کا ظاہری حصہ ہے اور ایک باطنی۔ غرض تمام انسان، حیوانات، نباتات اور جمادات کی جہاں ایک صورت ہے وہاں ان کی ایک حقیقت بھی ہے، ایک اس کا بدن اور ایک اس کی روح ہے اور ہر بدن میں اللہ تعالیٰ نے اس کے مناسب روح ڈالی ہے۔

سب سے پہلے انسان ہی کو لیجئے کہ اوّل انسان کا بدن تیار کیا جاتا ہے جس کی ابتداء نطفہ یعنی ایک گندے قطرہ سے ہوئی، جس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔[1]

"یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ (یعنی گندے قطرے) سے بنایا، پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا، پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر ہم نے اسکو ایک دوسری مخلوق بنا دیا، پس بڑا ہی بزرگ ہے اللہ جو کاریگروں میں سب سے بہتر ہے"۔

تو روح ڈالنے سے پہلے ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس کی تیاری میں زمین و آسمان کی قوتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں، اور آفتاب اور ہواؤں کی طاقتیں بھی متوجہ ہوتی ہیں۔ غرض جب کائنات کی ساری قوتیں مل کر اللہ ﷻ کے اَمر سے ڈھانچہ تیار کر لیتی ہیں تو پھر اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ یہی صورت سارے جمادات، نباتات اور حیوانات کی ہے۔

---

[1] سورۃ المؤمنون: ۱۲، ۱۳، ۱۴

دوسرا اصول:

اس کائنات کی کوئی چیز باقی نہیں رہ سکتی جب تک بدن اور روح ملے ہوئے نہ ہوں، گویا بدن کی بقاء روح پر موقوف ہے اور روح کی بقا بدن پر۔ اگر آپ نے بدن کو چھوڑ کر خستہ وخراب کر دیا یا وہ خود ہی قدرتی طور پر خراب ہو گیا اور اس میں سکت باقی نہ رہی تو پھر اس میں روح نہیں ٹھہرتی، بلکہ پرواز کر جاتی ہے، اس لئے کہ بدن ہی روح کو سنبھالے رکھتا ہے، دونوں میں تلازم ہے۔

غرض انسان میں جب تک روح ہے تو انسان ہے ورنہ لاشہ ہے جو بے کار ہے۔ پھر جس طرح پورے بدن کے لئے ایک روح ہے اسی طرح بدن کے ہر جزء کے لئے ایک ایک روح ہے جو اسی کے ساتھ رہ سکتی ہے اگر اس جزء کو ختم کر دیا جائے تو یہ روح بھی نہ رہے گی۔ ایسا نہیں ہوگا کہ اگر ایک جزء کو ختم کر دیں تو اس کی روح کسی دوسرے جزء میں پہنچ جائے۔ مثلاً آنکھ پھوڑ دی جائے تو یہ نہیں ہوتا کہ دیکھنے کی قوت ناک میں آجائے بلکہ یہ قوت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح دوسرے اعضاء کا حال ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر قویٰ پیدا کئے ہیں ان میں روح اور قوت بھی ساتھ ساتھ پیدا کر دی ہے اور یہ دونوں مل کر کائنات کا حصہ بنتے ہیں۔ اگر دونوں کو الگ کر دیا جائے تو اسی حقیقت کو ''موت'' کہتے ہیں اور اس علیحدگی سے کائنات کی تمام اشیاء ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک اور اصول سمجھ لیجئے جو اسی سے متعلق ہے کہ بدن کے اندر جو قوتیں چھپی ہوئی ہیں ان کی پہچان ان ابدان ہی کے ذریعے سے کی جاتی ہے۔ مثلاً قوتِ بینائی کی شناخت آنکھ سے کی جاتی ہے اور قوتِ سماعت کی کان سے غرض یہ صورتیں ان قوتوں کے تعارف کا ایک ذریعہ ہیں اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو یہ تعارف ختم ہو جائے۔ اس اصول کا حاصل یہ ہوا کہ ''بدن روح کی پہچان کا ذریعہ ہے''۔

تیسرا اصول:

اگر آپ روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ بدن ہی کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں۔ عالمِ دنیا میں براہِ راست روح کو متاثر کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ مثلاً آپ روح پر گرمی کا عمل کرنا چاہیں تو بدن کو آگ کے سامنے لے جائیں گے، جب پہلے بدن گرم ہو جائے گا اس کے بعد روح کو گرمی پہنچے گی اور اگر ٹھنڈک پہنچانا

چاہیں تو آپ بدن پر پانی ڈالیں گے یا اس پر برف ملیں گے یا وضو کریں گے تو اس کے بعد روح کو ٹھنڈک پہنچے گی۔ غرض ہر تاثیر کے لئے بدن ذریعہ ہے، بغیر بدن کے روح پر اثرات نہیں پہنچ سکتے۔

خلاصہ:

بدن سے تین کام لئے جاتے ہیں: (۱) روح کے قرار اور قیام کا۔ (۲) روح کے تعارف اور پہچان کا۔ (۳) تاثیر کا، اور یہ تینوں باتیں اس قدر ظاہر ہیں کہ ان پر کسی دلیل کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

شرعی تین اصول:

اور یہ تینوں اصول جس طرح تکوینی ہیں، اسی طرح تشریعی بھی ہیں۔ یعنی اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک صورت ہے اور ایک روح، جس طرح بغیر صورت کے روح کا باقی رہنا ناممکن ہے، اس طرح اگر روح تک کوئی اثر پہنچانا چاہیں تو وہ صورت ہی کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے، اس کی مثالوں سے شریعت بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر وضو ہی کو لیجئے کہ اس کی ایک صورت ہے اور ایک روح۔ اس کی صورت تو وہ خاص ہیئت اور افعال ہیں جو انسان وضو کرنے کے وقت اختیار کرتا ہے یعنی ایک خاص طرح بیٹھ کر اعضاء کا دھونا وغیرہ اور یہی ہیئت اس کے تعارف کا ذریعہ ہے، چنانچہ آپ وضو کر رہے ہوں تو ہر شخص آپ کو دیکھ کر پہچان لے گا کہ آپ وضو کر رہے ہیں، کھانا نہیں کھا رہے، کیونکہ کھانا کھانے والے کی ہیئت اور ہے۔ یہ تو اس کی صورت ہے اور ایک اس کی روح ہے۔ یعنی طہارت حاصل کرنا تاکہ انسان دربارِ الٰہی میں حاضری کے قابل ہو سکے اور ایک اس کی تاثیر ہے یعنی وہ خاص قسم کا انشراح جو انسان کے قلب میں وضو کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ تو یہ طہارت اور انشراح بغیر وضو کی صورت اختیار کئے کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غسل کی بھی ایک صورت ہے یعنی تمام جسم کو دھونا اور ایک اس کی روح ہے یعنی طہارت اور صفائی اور اس کی تاثیر فرح و انبساط ہے۔ اب اگر کوئی شخص تمام عمر غسل نہ کرے تو اس کو فرح وانبساط کی وہ خاص کیفیت کبھی بھی نصیب نہ ہوگی۔ الغرض ہر چیز کی روح حاصل کرنے کے لئے اس کی صورت کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح آپ نماز کو لیجئے کہ اس کی صورت نیت باندھ کر کھڑا ہونا اور رکوع وسجود وغیرہ ادا کرنا ہے اور اس کی روح اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے اور اپنی عبدیت و بندگی کا اظہار کرنا ہے۔ اگر آپ نماز کی ہیئت اختیار نہ کریں

تو بندگی کی یہ خاص صورت کبھی بھی حاصل نہ ہوگی، اس طرح زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ عبادات ہیں کہ ہر ایک کی ایک روح اور ایک صورت ہے۔

محبوباتِ نفس کی قربانی:

تو یہ جو ''قربانی'' ہے اس کی بھی ایک صورت ہے اور ایک روح، صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثارِ نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور اللہ ﷻ کا قرب حاصل کرنا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ روح بغیر جانور ذبح کئے کیسے حاصل ہوسکتی ہے، کیونکہ یہ بات پہلے معلوم ہوچکی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے، نماز میں نماز کی روح، زکوٰۃ میں زکوٰۃ کی روح اور قربانی میں قربانی کی روح ڈالی جاتی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے اس کی جو صورت مقرر کردی ہے وہی اختیار کرنا پڑے گی تب وہ روح اس میں ڈالی جائے گی، اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[۱] ''یعنی تم خیر کامل کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے''۔

اور مال محبوب چیز ہے، مال میں سے بھی جانور زیادہ عزیز ہوتا ہے کیونکہ جاندار ہونے کی وجہ سے اس سے زیادہ محبت ہوتی ہے، اس لئے کہ اگر کوئی بے جان چیز ضائع ہوجائے تو آدمی دوسری گھڑ کر بنا سکتا ہے بخلاف جاندار کے اگر فنا ہوگیا تو بعینہٖ اسی طرح کا دوسرا نہیں ملتا۔ اور یہ مال تو ایسی چیز ہے کہ فنا ہوکر ہی نفع پہنچاتا ہے، اگر کسی کے پاس ایک کروڑ روپیہ رکھا ہوا ہو تو وہ بے کار ہے، اس سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو خرچ نہ کرے تو جب دنیوی منافع اس کو خرچ کئے بغیر نہیں مل سکتے تو ''رضاء حق'' جو اعلیٰ ترین نفع ہے وہ محبوبات قربان کئے بغیر کیسے حاصل ہوسکتی ہے؟ اور محبوبات کیا ہیں؟ جان، مال، اولاد، عزت آبرو وغیرہ۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ[۲]

''یعنی بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جانوں اور مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا''۔

---

[۱] آل عمران: ۹۲

[۲] سورۃ التوبۃ: ۱۱۱

غرض آپ کو ان میں سے ہر چیز لٹانی ہوگی تب کہیں بندگی کا اظہار ہوگا۔ درحقیقت جنّت تو ایمان کے بدلے میں ملے گی اور اعمال تو ایمان کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔ جیسے اگر سونا خریدا جائے تو اس کو کسوٹی پر گھسا کر دیکھا جاتا ہے، اگر کھرا ہے تو اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، ورنہ نہیں تو اس جگہ قیمت سونے کی ہوئی ہے، لکیروں کی نہیں جو کسوٹی پر پڑ جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح آخرت کے بازار میں جنّت کے عوض ایمان کی قیمت ادا کرنا ہوگی اور یہ ہمارے اعمال ان لکیروں کی طرح ہمارے ایمان کی پختگی کی علامت ہیں۔ اس لئے جنّت حاصل کرنے کے لئے ہمیں ''محبوباتِ نفس'' کو قربان کرنا لازمی ہے۔ اگر مال خرچ کرنے کا حکم ہو تو مال خرچ کرو، جان دینے کا حکم ہو تو جان نثار کرو، عزت کی ضرورت ہو تو وہ بھی قربان کرو۔ یہی عشق کی پختگی کی علامت ہے۔

ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے پھر یہی عرض کیا اور آپ ﷺ نے پھر وہی فرمایا کہ سوچ کر کہو کیا کہتے ہو؟ انہوں نے تیسری بار بھی یہی عرض کیا کہ مجھے آپ سے محبت ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مصیبتیں جھیلنے، فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرنے اور آفتیں جھیلنے کو تیار ہو جاؤ۔ اور ظاہر بات ہے کہ عاشق اپنی محبت کا ثبوت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک مصیبتیں نہ جھیلے، اسی لئے ارشاد ہے:

الٓمّٓ. اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ. وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ [۱]

''یعنی کیا لوگوں کا خیال ہے کہ محض "اٰمَنَّا" کہنے سے ان کا چھٹکارا ہو جائے گا اور اُن کی آزمائش نہ ہوگی حالانکہ ہم نے آزمایا ان سے پہلے لوگوں کو پس ضرور معلوم کر لے گا اللہ تعالیٰ سچّے لوگوں کو اور ضرور معلوم کر لے گا جھوٹوں کو''۔

---

[۱] سورۃ العنکبوت: ۱، ۲، ۳

روحِ قربانی اور شبہ کا جواب:

غرض اصل بیان یہ تھا کہ جس طرح اعمال کی روح ضروری ہے اسی طرح ان کی صورت بھی مطلوب ہے اس لئے کہ دنیا میں صورت اصل ہے اور روح اس کے تابع اور آخرت میں معاملہ برعکس ہوگا، روح اصل ہو گی اور صورت تابع تو اب یہ بات واضح ہوگئی کہ دنیا میں جس طرح ہر چیز کی روح کی بقا کے لئے صورت کی ضرورت ہے اسی طرح اعمالِ شرعیہ کی روح کی بقا کے لئے ان کے جسم وصورت کی ضرورت ہے اگر کوئی شخص کہے کہ اعمال میں تو اصل روح ہے اس لئے روح کو لے لو اور صورت کو چھوڑ دو تو اس کو چاہئے کہ یہ عمل پہلے اپنے اُوپر جاری کرے کہ اپنے بدن کو ختم کر دے اور خودکشی کرے کہ بس میں تو روح کو باقی رکھوں گا لیکن اگر خود بغیر صورت کے نہیں رہ سکتے تو پھر اعمالِ شرعیہ میں یہ عملِ جراحی کیوں کیا جاتا ہے؟

جیسا کہ شروع میں معلوم ہو چکا کہ کائنات میں جس طرح پورے بدن کے لئے ایک روح ہے اسی طرح ہر ہر چیز کی علیحدہ علیحدہ روح بھی ہے جیسے آنکھ میں بینائی کی قوت ایک روح ہے وغیرہ۔ اسی طرح سارے اعمال کا نام ''تقویٰ'' ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ [۱]

یعنی اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا لیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے، سو اگر کوئی یہ کہے کہ جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ تقویٰ اختیار کر لو کافی ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لو کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ [۲]

''تم پر روزوں کا حکم ہوا جیسے تم سے پہلے لوگوں پر حکم ہوا تھا شاید کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ''۔

تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہے۔ نماز کے متعلق ارشاد باری ہے:

---

[۱] سورۃ الحج: ۳۷

[۲] سورۃ البقرہ: ۱۸۳

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [۱]

''نماز بے حیائی اور بُرے کاموں سے روکتی ہے''۔

جس کا حاصل تقویٰ ہے۔ لہٰذا نماز اور روزہ بھی چھوڑ دیئے۔ پھر ارشاد ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا، وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ [۲]

''مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینا نیکی نہیں ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں کو، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں یہی لوگ سچے ہیں اور یہی متقی ہیں۔

لیجئے! سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا اس لئے سب کچھ چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے اس لئے کہ ہر ہر چیز کی روح علیحدہ ہے اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے اور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسری عبادت، صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قلب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ گدھا ہی رہے گا اسی طرح صدقہ، صدقہ ہی رہے گا قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کہا جا سکتا ہے تو دنیا میں چونکہ بغیر صورت چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنی ہی پڑے گی ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت

---

[۱] عنکبوت: ۴۵

[۲] البقرۃ: ۱۷۷

ضروری نہیں لیکن اگر آپ نے دنیا میں اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''اَلْاِیْمَانُ سِرٌّ وَالْاِسْلَامُ عَلَانِیَةٌ'' ''ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر''۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا کوئی عبادت نہیں ہوسکتی، اس لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

''مَاعَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ یَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ اِھْرَاقِ الدَّمِ''

''بقرہ عید کے روز سب سے زیادہ محبوب عمل قربانی ہی ہے''۔

تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کا قائم مقام ہوسکتا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا:

''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ مَاھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ'' ''یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''سُنَّةُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ'' ''تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنّت ہے''۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے استفسار کیا کہ ''فَمَا لَنَا فِیْھَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ'' ''یارسول اللہ اس میں ہمارا کیا نفع ہے؟'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''بِکُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ'' ''قربانی کے ہر بال پر ایک نیکی ملے گی''۔[1]

تو یہ اَجر وثواب صدقہ وغیرہ پر کیسے مرتب ہوسکتا ہے؟ کیونکہ صدقہ میں بال کہاں ہیں تو بات دراصل وہی ہے کہ ہر صورت میں اس کے مطابق روح ڈالی جاتی ہے۔

قربانی کی حقیقت:

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالیٰ جل جلالہ کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے! ان کو یہ گوارہ نہ ہوا اس لئے حکم دیا کہ تم جانور ذبح کر دو ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خواب کے ذریعہ بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے اسماعیل (علیہ السلام) کی قربانی پیش کریں۔ اب دیکھئے کہ یہ حکم

---

[1] السنن لابن ماجہ، کتاب الاضاحی، باب ثواب الاضحیۃ

اوّل تو اولاد کے بارہ میں دیا گیا اور اولاد بھی کیسی، فرزند اور فرزند بھی نالائق نہیں بلکہ نبی معصوم۔ ایسے بچے کو قربان کرنا بڑا مشکل کام ہے، حقیقت میں انسان کو اپنی قربانی پیش کرنا آسان ہے لیکن اپنی اولاد کی گردن پر چھری چلانا بہت مشکل کام ہے، مگر حکمِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منیٰ کے منحر میں تشریف لائے اور فرمایا بیٹا! مجھے اللہ تعالیٰ ﷻ نے حکم دیا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کروں۔ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فوراً عرض کیا اِفْعَلْ مَاتُؤْمَرُ جو آپ کو حکم ہوا ہے ضرور کیجئے۔

اطاعت کی انتہاء:

گویا فرمایا کہ اگر میری جان کی ان کو ضرورت ہے تو ایک جان کیا؟ اگر ہزار جانیں بھی ہوں تو نثار ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رسیوں سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے چھری تیز کی۔ اب بیٹا خوش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قربان ہو رہا ہوں اور ادھر باپ بھی خوش ہے کہ میں اپنے بیٹے کی قربانی پیش کر رہا ہوں، چنانچہ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اپنے بیٹے کی گردن میں چھری چلائی تو چھری کُند ہوگئی اور اس وقت حکم ہوا ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ'' ''بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں''۔ اب ہم اس کے عوض جنّت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں چنانچہ اسی دن سے گائے، مینڈھا یا بکری وغیرہ قربانی کے لئے فدیہ مقرر ہوگیا۔

قربانی اور صدقہ میں فرق:

اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے، چنانچہ انسان میں جان سپاری اور جان نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یہی اس کی روح ہے، تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے اور صدقہ کی روح مال ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اس طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن مقرر نہیں مگر اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے اور اس کا نام بھی ''یَوْمُ النَّحْرِ'' اور ''عِیْدُ الْاَضْحٰی'' یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔

تعاملِ اُمتِ محمدیہ ﷺ:

جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہے، حضراتِ انبیاء علیہم السلام کا بھی اور اُمّت کا اس پر اجماع ہے، انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا اس پر اجماع ہے اور قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں، اسی طرح اگر یہ کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں؟

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس ﷺ نے ہدایت فرمائی:

اَنْ نَّسْتَشْرِفَ الْعَيْنَ وَالْاُذُنَ وَاَنْ لَّا نُضَحِّيَ بِمُقَابَلَةٍ وَّلَا مُدَابَرَةٍ وَّلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ[1]

''ہم قربانی کی آنکھ اور کان کو خوب دیکھ بھال کر لیا کریں، ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ ہی وہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ ہی وہ جس کا کان چرا ہوا ہو اور نہ ہی وہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو''۔

اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جدا ہیں، پھر ساری اُمّت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آرہی ہے اور تعاملِ اُمّت سب سے بڑی دلیل ہے۔

منکرینِ قربانی پر طریقِ ردّ:

قربانی کے متعلق تو اب بیان ہو چکا لیکن اگر کہا جائے کہ آپ تو حدیث سے استدلال کر رہے ہیں حالانکہ ہم حدیث کو حجت ہی نہیں مانتے تو ایسے لوگوں سے پھر قربانی کے مسئلہ میں جھگڑا نہیں بلکہ پھر تو حدیث کے حجت ہونے پر گفتگو ہے، یہ ایک اصولی اختلاف ہے، ایسے لوگوں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ آپ قرآن مجید کو جو کلام اللہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کا کلام اللہ ہونا کیسے معلوم ہوا؟

اگر یہ جواب ہے کہ خود قرآن سے معلوم ہوا تو یہ ''مکابرہ'' ہے یعنی جو دعویٰ ہے وہی دلیل اور صریح غلطی

---

[1] السنن للترمذی، کتاب الاضاحی باب ما کیرہ من الاضاحی، ج: ۵، ص: ۵۴

ہے، درحقیقت جو شخص احادیث کا انکار کر رہا ہے وہ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا بھی منکر ہے کیونکہ قرآن بغیر حدیث کے حجت نہیں بن سکتا، جس طرح کوئی شخص بغیر رسول کے اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچ سکتا اسی طرح کلام اللہ تک بغیر کلامِ رسول ﷺ کے رسائی ممکن نہیں کیونکہ لغت کے زور سے اگر کلام اللہ کو حل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی مراد نہ ہوگی بلکہ اس شخص کی اپنی مراد ہوگی۔ جب تک پیغمبر یا پیغمبر کے نائبین کسی آیت کی مراد کو بیان نہ کریں وہ شریعت نہیں بن سکتی کیونکہ کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو کاغذ پر نہیں آسکتیں بلکہ لب ولہجہ بدلنے سے معنی بدل جاتے ہیں۔ مثلاً جملہ کیا حال ہے؟ کبھی اس کو استفسارِ حال کے واسطے استعمال کیا جاتا ہے اور کبھی تعجب کے لئے، کبھی تعظیم شان کے لئے اور کبھی تحقیر کے لئے، اب اگر یہ جملہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو بھیج دیں تو کیا وہ شخص اس کو پڑھ کر متکلم کی مراد کو سمجھ سکے گا؟ ہرگز نہیں بلکہ جو کچھ وہ سمجھے گا وہ اس کی اپنی مراد ہوگی چنانچہ اگر یہ شخص اس وقت تعجب کی حالت میں ہوگا تو اس کو تعجب کے لئے سمجھے گا اور اگر استفسارِ حال کا اس پر غلبہ ہوگا تو اس کے لئے سمجھے گا۔ تو یہ کیفیات کاغذ پر نہیں آسکتیں۔

طریقِ ردّ نمبر ۲:

اس کے علاوہ ایک چیز ''عُرف'' ہے یعنی کلام میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اہلِ عُرف کے پاس رہ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں، چنانچہ دیوبند میں ایک صاحب تھے جو کلکٹر کے یہاں منشی تھے کلکٹر اگرچہ انگریز تھا مگر اس کو خیال تھا کہ میں اُردو بہت اچھی جانتا ہوں چنانچہ اکثر وہ میر منشی صاحب سے بھی کہا کرتا تھا کہ وَل میر منشی! ''ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں''۔ اور یہ بے چارے منشی اس کا جملہ سُن کر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتے کیونکہ ملازمت کا سوال تھا۔ آخر ایک روز اس نے کسی بات پر میز پر ہاتھ مار کر کہا ''وَل منشی، ہم تم سے زیادہ اُردو جانتے ہیں''۔ اس مرتبہ ان کو بھی جوش آ گیا انہوں نے سوچ لیا کہ ملازمت رہے یا نہ رہے مگر کم از کم ایک مرتبہ اس کو جواب تو دے دوں۔ چنانچہ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے میز پر مکہ مار کر کہا کہ ''صاحب بہادر: اُردو کی ابجد بھی نہیں جانتے'' یہ سُن کر وہ انگریز بڑا حیران ہوا، اور کہا کہ ہمارا امتحان لو انہوں نے کہا اگر میں امتحان لوں تو صاحب بہادر بغلیں جھانکنے لگیں۔ اب تو صاحب بہادر واقعی بغلیں جھانکنے لگے کہ اس کا مطلب کیا ہوا، بہت غور کیا مگر کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا، آخر کہا کہ تین دن کی مہلت

دو۔ انہوں نے کہا کہ سات دن کی مہلت ہے۔

غرض اس نے جملے کو لُغت میں تلاش کیا، لغت میں بغل تو مِل گیا اور جھانکنا بھی مِل گیا مگر یہ جملہ کہاں بولا جاتا ہے؟ یہ نہیں سمجھ پایا، آخر کار اس نے سات دن کے بعد کہا کہ مطلب یہی ہے کہ بغل اُٹھا کر دیکھ لیا اور اُدھر کی بغل کو اسی طرح دیکھ لیا۔ میر منشی یہ سُن کر ہنس پڑے تب اس نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا مطلب ہے؟ میر منشی نے کہا کہ اس شرط پر بتاؤں گا کہ پھر کبھی اُردو دانی کا دعویٰ نہ کرو۔ چنانچہ اس نے اقرار کیا اور انہوں نے اس کا مطلب بتایا کہ دراصل یہ جملہ تحیر سے کنایہ ہے یعنی اگر صاحب بہادر کا امتحان لیا جائے تو وہ حیرت میں پڑ جائیں اور اس قسم کی غلطیاں ہونے کے متعدد واقعات ہیں غرض کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو ''عرف'' سے متعلق ہیں۔ غیر اہلِ عرف ان کو سمجھ ہی نہیں سکتے ہیں۔

جب ہماری زبان اور کلام میں محاورات ہیں تو قرآن مجید میں بھی ایسی چیزیں ہیں کہ ان کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو نبی کریم ﷺ کی صحبت نصیب تھی تو اب جو لوگ قرآن مجید کو سمجھنا چاہیں ان کو چاہئے کہ اہلِ عرف کی طرف رجوع کریں یعنی جناب رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف اور جو معنی وہ بتائیں ان کو صحیح سمجھیں، اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ [1]

''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اَن پڑھ لوگوں میں ایک رسول بھیجا جو انہی میں سے ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کے قلوب کو صاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں تعلیم کرتا ہے حالانکہ وہ لوگ اس سے قبل صریح گمراہ تھے''۔

اب دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کے تین فرائض بیان فرمائے یعنی تلاوت، تزکیہ اور تعلیم اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر کا کام صرف آیتیں پڑھ کر سنا دینا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کے قلوب کو پاک کرنا تا کہ وہ قرآن کے معانی سمجھنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ

[1] الجمعۃ: ۲

آیت میں ''تزکیہ'' کو تعلیم پر مقدم کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اسے حاصل کئے بغیر انسان کو قرآن مجید کے معانی سمجھنے کی استعداد حاصل نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قلوب کا ایسا تزکیہ کیا کہ وہ حضرات پھر قرآن کے معانی کو اسی طریقے سے سمجھنے لگے جس طرح حضور ﷺ نے تعلیم فرمائی۔ پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے تابعین کے قلوب کا تزکیہ کیا اور انہوں نے تبع تابعین کا۔ غرض اسی طرح سلسلہ وار آج تک یہ معانی ومطالب محفوظ ہیں۔ اس لئے ہمیں ادنیٰ سے ادنیٰ نکتہ بھی بغیر اُستاذ کے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

قرآن مجید ہمارے پاس امانت ہے، جس طرح ہم لفظوں کے امین ہیں اسی طرح ہم معانی کے بھی امین ہیں اور ہم کیا؟ خود آنحضرت ﷺ بھی الفاظ ومعانی دونوں کے امین تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ شروع شروع میں آیات کو رٹنے کی کوشش فرماتے تا کہ بھول نہ جائیں، اس لئے وحی نازل ہوئی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ [۱] آپ ﷺ قرآن پڑھنے کی خاطر وحی کے دوران زبان جلدی نہ ہلایئے اور زبان کیوں نہ ہلایئے اس لئے کہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ''ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور آپ سے پڑھوانا''۔ پھر آپ کو کیا کرنا چاہئے؟ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ [۲] جب وحی نازل ہو رہی ہو اس وقت سنتے رہئے پھر ہم ہی اس کا مطلب بیان کریں گے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔ اگر اس کے مطلب ومعانی خود سمجھ میں آسکتے تو یہ کیوں فرمایا جاتا، جب نبی کریم ﷺ کی سمجھ میں نہیں آسکتے تھے تو کسی اور کا کیا منہ ہے؟ یہی وجہ کہ بعض اوقات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کسی آیت کے متعلق آپ ﷺ سے سوال کرتے تو آپ ﷺ اس پر غور فرماتے رہتے۔ پھر کبھی تو من جانب اللہ آپ ﷺ کے قلب مبارک میں اس

---

[۱] القیامۃ: ۱۶

[۲] القیامۃ: ۱۷، ۱۸، ۱۹

کا مطلب ڈال دیا جاتا، ورنہ آپ حضرت جبرائیل علیہ السلام سے استفسار فرماتے، اگر ان کو معلوم ہوتا تو آپ ﷺ سے عرض کر دیتے ورنہ وہ فرماتے کہ میں حق تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تو قرآن مجید کے معانی اس طرح آپ کو مِن جانب اللہ بتائے گئے اور جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور خود حضور اکرم ﷺ کو معنی کے متعلق استفسار کی ضرورت پڑتی تھی حالانکہ آپ اہلِ زبان تھے، نورِ نبوت سے مُنوّر بھی تھے پھر کسی اور کو کیا حق ہے کہ وہ بغیر حدیث کے قرآن فہمی کا دعویٰ کرے؟

غرض آپ ﷺ قرآن مجید کے موجد یا مخترع نہ تھے بلکہ الفاظ ومعانی میں امین تھے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتا وہ آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو تعلیم فرما دیتے، اس طرح آپ ﷺ نے صحابہ کرام کے قلوب کو مانجھا اور تزکیہ فرمایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی مسائل پر اسی طرح غور فرمایا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے تابعین کے دلوں کو اسی طرح مانجھا اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو اسی طرح تزکیہ باطن سے آراستہ کیا اور یہ سلسلہ آج تک اسی طرح جاری ہے۔

ہم کو قرآن مجید کے جو مطالب پہنچے وہ حضور ﷺ کے شاگردوں سے پہنچے ہیں یہی وجہ ہے کہ پہلے زمانے میں ہر شخص قرآن مجید کا مفسر نہ بن سکتا تھا جب تک کسی ایسے ہی اُستاذ کا شاگرد نہ ہو اور جو شخص قرآن مجید یا حدیث کی تفسیر وغیرہ بیان کرتا اس سے سند پوچھی جاتی تھی اگر وہ شخص مستند ہوا، اس کی بات قابل قبول سمجھی جاتی تھی ورنہ ردّ کر دی جاتی تھی۔ مگر آج کل چونکہ ناواقفیت کا زمانہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا خوف لوگوں کے دلوں میں کم ہے اس لئے ہر وہ شخص جو ذرا عربی جانتا ہو وہ مفسرِ قرآن بننے کا مدعی ہے اور لوگ بغیر کسی تحقیق کے اس کی پیروی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کے مطالب صرف انہی لوگوں سے حاصل کرنے چاہئیں جو خود صحیح سمجھتے ہوں۔ یعنی بزرگوں کے صحبت یافتہ اور عالم کے شاگرد ہوں تاکہ ان کے اندر بھی تزکیہ نفس کا وہ وصف موجود ہو جس کے لئے نبی کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا گیا۔

حقیقت میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جو ساری اُمّت سے افضل ہیں وہ اسی صحبت کی برکت سے ہیں کہ ان کو نبی کریم ﷺ جیسی شخصیت کی صحبت نصیب ہوئی، جس سے ان کے دل صاف ہو گئے کہ اس میں صرف حق بات ہی سما سکتی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے شاگردوں کو اس نہج پر ڈالا اور ان کے قلوب کی صفائی و

تزکیہ کیا۔ ''اُولٰٓئِکَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ وَاَصْحَابُ اَبِیْ بَکْرٍ وَاَصْحَابُ عُمَرَ''۔

غرض یہ حضرات تھے کہ ان پر حق کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ حاصل یہ کہ کتاب اللہ تک ہم رسول مقبول ﷺ کے بغیر نہیں پہنچ سکتے اور ہم کو کتاب اللہ کے اندر غور وفکر کرنے کی اجازت بھی تب ہے کہ پہلے حضور ﷺ اس کا مطلب بیان فرمادیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ [۱]

''اور ہم نے نازل کیا آپ کی طرف قرآن مجید کو تاکہ آپ بیان فرمادیں لوگوں کے لئے جو ان کی طرف نازل ہوا، تاکہ وہ فکر کریں''۔

دیکھئے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ فرمایا کہ پہلے آپ ﷺ قرآن مجید کا مطلب بیان کریں اس کے بعد ''یَتَفَکَّرُوْنَ'' ہے۔ یعنی اس کے بعد لوگوں کو غور وفکر کی اجازت ہے تاکہ لوگ غور وفکر کرنے میں شریعت کی حدود سے نہ نکل جائیں۔

درحقیقت اگر ہر شخص اپنی اپنی عقل اور فہم کے مطابق غور کرنا شروع کردے تو قرآن مجید تو ایک کھیل تماشہ بن جائے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے بھی حدود وقیود مقرر کی جائیں، چنانچہ کردی گئیں۔ اب کسی کو بغیر نبی کریم ﷺ کے ''بیان'' کے قرآن مجید کی تفسیر کی اجازت نہیں اور چونکہ کلام اللہ کا مطلب سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ نے ہر کتاب کے ساتھ ایک نبی ضرور بھیجا، چنانچہ اگر توریت آئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تشریف لائے۔ صحفِ آدم علیہ السلام کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام بھی تشریف لائے اور انجیل کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور کے ساتھ حضرت داؤد علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور سب سے آخر میں قرآن مجید کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو بھیجا گیا۔ ورنہ اگر صرف زبان دانی اور لغت کے زور سے کلامِ الٰہی کو حاصل کیا جاسکتا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری کی کیا ضرورت تھی؟ بلکہ یہ ہوا کرتا کہ ایک کتاب کسی فرشتہ کے ذریعہ سے بیت اللہ کی چھت پر رکھوادی جاتی اور اعلان کردیا جاتا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس پر عمل کرو مگر ایسا نہیں کیا گیا کیونکہ کتاب کے ساتھ اس

---

[۱] النحل: ۴۴

کو سمجھانے اور پڑھانے کی بھی ضرورت تھی۔ ورنہ ہر شخص قرآن مجید سے اپنے نفس کے مطابق مطلب گھڑ کر استدلال کرلیا کرتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو خوارج سے مناظرہ کرنے کو بھیجا تو ان کو ہدایت فرمائی کہ ان کے سامنے قرآن سے استدلال مت کرنا بلکہ احادیث سے استدلال کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو تعجب ہوا اور دریافت فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ حالانکہ قرآن مجید کو میں خاص طور پر سمجھتا ہوں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے حق میں دعا فرمائی اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْقُرْاٰنَ یا اللہ! ابن عباس کو قرآن کا فہم عطا فرما۔[1]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ بے شک تم صحیح مطلب بیان کرو گے لیکن لوگ اس کا غلط مطلب بیان کردیں گے اور الفاظ سے کسی ایک کی بات متعین نہ ہوگی، اس لئے تم حدیث سے استدلال پیش کرنا کیونکہ حدیث نے قرآن کے معانی متعین کردیئے ہیں، جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہی۔

یہی وجہ ہے کہ زمانہ سابق میں بھی جب کوئی فرقہ ایسا ہوا کہ اس نے دین میں تحریف کا ارادہ کیا تو اس نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا کیونکہ حدیث ہوتے ہوئے کسی قسم کی تحریف کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ اس لئے اس نے پہلے اس کانٹے کو راہ سے ہٹایا مگر ساری دنیا جانتی ہے کہ آج وہ لوگ ختم ہوگئے اور ان کے ساتھ ان کی تحریفات بھی ختم ہوگئیں اور حدیث پر عمل کرنے والے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک باقی رہیں گے۔ الغرض حدیث کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

تقریر کا اصل موضوع تو قربانی کا مسئلہ تھا مگر درمیان میں چونکہ کچھ اصول کی بحث آگئی اسلئے بات ذرا طویل ہوگئی اگرچہ اس اصولی بحث کو بہت مختصر بیان کیا گیا۔ تاہم بحمد للہ ضروری باتیں آگئیں اور یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث پر بھی ایمان ضروری ہے اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

متعلقاتِ قربانی کی وضاحت:

اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہوجائیں گے، سو اوّل تو یہ خیال ہی غلط ہے کیونکہ روزانہ

---

[1] الصحیح للبخاری، کتاب المناقب، باب ذکر ابن عباس، رقم الحدیث: ۳۷۴۳

جولاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں، عید کے دن وہ ذبح نہیں ہوتے اس طرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہے جو کسی طرح بھی قابلِ اعتناء نہیں۔ پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔ پھر ان کی ساری کھالیں غرباء ومساکین میں تقسیم ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں خرچ ہوتا ہے، اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے تو بے شک مہاجرین کی امداد ضروری ہے مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر چھری کیوں چلتی ہے۔ کچھ اپنی خواہشات نفس پر بھی تو چھری چلایئے اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔ مثلاً سینما ہے، شراب ہے اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔

حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے اور ایک روح ہے اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے اور جیسے وہاں ہر صورت کی ایک خاص روح ہے جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی۔ اسی طرح یہاں بھی ایک روح ہے جو دوسرے میں نہیں آسکتی۔

اب سمجھئے کہ سارے اعمال شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی وانکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزے میں تزکیہ نفس کی صورت میں، جہاد میں شجاعت کی صورت میں، صدقہ میں اِنفاقِ مال کی صورت میں اور قربانی سے جان نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی (کی صورت میں حاصل ہونے والا تقویٰ) نہ ملا پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دے دے تو قیامت کے دن اس کو ثواب مل جائے گا مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی؟ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھ لیجئے کہ آپ نے ایک نوکر رکھا، جس کے سپرد کھانا پکانے اور کھانا کھلانے کی خدمت سونپی اب اس نوکر نے یہ کیا کہ کھانا تو پکایا نہیں مگر گھر کو صاف کر کے آئینہ بنا دیا۔ ہر چیز قرینے سے رکھ دی جھاڑو بھی دی، فرش بھی دھویا، جالے بھی صاف کئے۔ اب آپ جب گھر پہنچے اور دیکھا کہ ملازم نے گھر کو بہت صاف ستھرا کر رکھا ہے تو یقیناً آپ خوش ہوں گے مگر جب کھانے کے وقت آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے کھانا نہیں پکایا؟ تو کیا وہ ملازم جواب دے سکتا ہے

کہ صاحب میں نے گھر تو صاف کر دیا اب کھانے کا مطالبہ کیسا؟ ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ یہاں جو کام تیرے سپرد کیا تھا وہ تو تُو نے کیا نہیں اور ایک ایسا کام جو فی الجملہ اچھا ہے مگر تیرے سپرد نہ تھا۔ اس لئے تجھ کو یہ کام کھانا کھلانے کے بعد کرنا چاہئے تھا۔ اسی طرح صدقہ وخیرات تو عبادات نافلہ ہیں مگر قربانی واجب ہے تو صدقہ دینے سے اس کا مطالبہ باقی رہے گا۔

حاصل یہ کہ آپ جو صورت اختیار کریں گے اسی کی روح اس میں ڈالی جائے گی۔ جیسے انسان کی صورت میں انسان کی روح اور حیوان کی صورت میں حیوان کی پھر قربانی کی روح صدقہ میں کیونکر آسکتی ہے؟ اس لئے قیامت میں ہر ایک عمل کی مختلف صورتیں ہوں گی۔ مثلاً جو شخص مسجد بناتا ہے اس کو جنت میں مکان ملتا ہے۔ روزہ دار کے لئے قیامت کے دن دستر خواں بچھایا جائے گا۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ارشاد ہے کہ:

اِنَّهٗ لَيَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا[۱]

قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھالوں کے ساتھ موجود ہوگا۔

اس جگہ ان اجزاء کا ذکر ہے جن کو ہم بے کار سمجھ کر پھینک دیتے ہیں۔ یعنی اس کے ردی اجزاء پر بھی ثواب دیا جائے گا تو جو اصلی چیز یعنی گوشت ہے اس پر کیوں نہ ملے؟ پھر آگے ارشاد ہے:

وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْ بِهَا نَفْسًا[۲] قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تم اس عمل کو کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرو۔

تو مقبولیت کا درجہ بھی قربانی کے ساتھ خاص ہے۔ مسئلہ کا بیان تو ہو چکا مگر ایسے جزئی مسائل میں جو اجماعی چیزیں ہیں شبہ پیش آنا، انتہائی تنزل اور انحطاط کی علامت ہے۔ اب تک تو علماء کو صرف اصول ثابت کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی مگر افسوس اب جزئیات ومسلمات کو بھی ثابت کرنا پڑتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ علماء کے ذمہ ان کا ثابت کرنا نہیں یہ تو علماء کا فرض ہے کہ ان کو ثابت کریں مگر میرا مقصد یہ

---

[۱] السنن الکبریٰ للبیہقی، ج:۹، ص:۲۶۱

[۲] السنن للترمذی، ابواب الاضحیۃ، باب ماجاء فی فضل الاضحیۃ، ج:۵، ص:۴۴۴

ہے کہ اگر ہماری یہی رفتار رہی تو کہاں تک جزئیات کو ثابت کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں مسلمات سے بھی رہنے دیجئے یہ تو نہ ہو کہ ہر چیز کی دلیل کی ضرورت پڑنے لگے۔ یہ انتہائی پستی اور تنزل کی دلیل ہے جس کی وجہ علمِ دین کی طرف سے لاپروائی اور بے توجہی ہے جس کا علاج بجز اس کے کہ آپ لوگ علمِ دین حاصل کرنے کی طرف توجہ کریں اور میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ دوسرے علوم وفنون حاصل نہ کریں بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کریں تاکہ روزمرہ کے موٹے موٹے مسائل میں آپ کو شبہات پیش نہ آئیں اور آپ کو ہر شخص اپنی خواہشات کا غلام نہ بنا سکے۔ بلکہ آپ کو خود بھی حق وباطل میں امتیاز کی تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ قرآن مجید کا ترجمہ بھی کسی سے تعلیم کے طور پر حاصل کریں، خود دیکھنے میں ہزاروں غلطیوں کا احتمال ہے۔

اگر آپ کو کسی مسئلہ میں شبہ ہو اور اس کی وضاحت کی ضرورت ہو تو خود اپنی عقل سے کوئی رائے قائم کرنے کی بجائے علماء کی طرف رجوع کیجئے کہ دین بالکل بے غبار ہے بشرطیکہ آپ سمجھنے کا قصد رکھتے ہوں اور ہٹ دھرمی اور ضد کو اس میں ادنیٰ بھی دخل نہ ہو۔ اب میں بات ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ﷻ ہمیں شرور وفتن سے بچائے اور راہِ مستقیم پر قائم رکھے، اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہو۔[۱]

آمِیْنَ یَارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِیْنَ، بِرَحْمَتِکَ یَآاَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

(وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ)

---

[۱] ماخوذ از خطبات حکیم الاسلام بتغیر وتسہیل

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَامِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ فِيْهِنَّ الْعَمَلُ مِنْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ اَيَّامُ الْعَشْرِ فَاَكْثِرُوْا فِيْهِنَّ التَّكْبِيْرَ وَالتَّهْلِيْلَ وَالتَّسْبِيْحَ (الحدیث)

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل ومسائل

عشرۂ ذی الحجہ کے فضائل ومسائل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ،

وَالْفَجْرِ، وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ۔[۱]

قسم ہے فجر کے وقت کی اور ذی الحجہ کی دس راتوں (یعنی دس تاریخوں) کی (کہ وہ نہایت فضیلت والی ہیں) اور جفت کی اور طاق کی۔ جفت سے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ اور طاق سے نویں تاریخ مراد ہے، کذا فی الحدیث۔[۲]

فائدہ:

دُرِّمنثور میں متعدد سندوں سے روایت درج ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس آیت میں "لَيَالٍ عَشْرٍ" سے "عشرہ ذی الحجہ" مراد ہے اور وتر (طاق) سے عرفہ کا دن (یعنی نویں ذی الحجہ) اور جفت سے قربانی کا دن یعنی دسویں تاریخ مراد ہے۔

عشرۂ ذی الحجہ کا اجر وثواب:

میرے محترم بھائیو اور دوستو! یہ ذی الحجہ کا مبارک مہینہ چل رہا ہے، اس کے جو پہلے دس دِن ہیں، یہ انتہائی قیمتی دِن ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ الفجر میں جن دس راتوں کی قسم کھائی ہے ان سے مراد ذی الحجہ کی ابتدائی دس راتیں ہیں، اس سے عشرہ ذی الحجہ کی عزت، عظمت اور حرمت کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو جتنے ان دس دنوں میں عبادت کے اعمال محبوب ہیں کسی دوسرے دن میں اتنے محبوب نہیں۔

---

[۱] سورۃ الفجر: آیت نمبر: ۱ تا ۳

[۲] بیان القرآن، ج: ۱۲، ص: ۹۲

وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ سے کیا مراد ہے؟

۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ (وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ) قَالَ الشَّاهِدُ یَوْمُ الْجُمُعَةِ وَالْمَشْهُوْدُ یَوْمُ عَرَفَةَ[۱]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۷ھ) سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شاہد سے جمعہ کا دن اور مشہود سے عرفہ (۹ ذوالحجہ) کا دن مراد ہے۔

۲۔ عَنْ اَبِیْ مَالِكِ الْاَشْعَرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ یَوْمُ الْقِیَامَةِ وَاِنَّ الشَّاهِدَ یَوْمُ الْجُمُعَةِ وَاِنَّ الْمَشْهُوْدَ یَوْمُ عَرَفَةَ[۲]

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا یوم الموعود سے مراد قیامت کا دن ہے، شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے اور مشہود سے مراد (نویں ذی الحجہ) عرفہ کا دن ہے۔

۳۔ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ اَنَّهٗ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ سَیِّدَ الْاَیَّامِ یَوْمُ الْجُمُعَةِ وَهُوَ الشَّاهِدُ وَالْمَشْهُوْدُ یَوْمُ عَرَفَةَ[۳]

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۴ھ) روایت بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مبارک ارشاد فرمایا کہ دنوں کا سردار جمعہ کا دن ہے اور وہ شاہد ہے اور مشہود سے مراد عرفہ کا دن ہے۔

۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا (وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ) اَلشَّاهِدُ یَوْمُ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۳۳

[۲] تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۳۳

[۳] تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۳۳

عَرَفَةَ وَالْمَشْهُوْدُ يَوْمُ الْقِيَامَةِ[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) شاہد سے عرفہ اور مشہود سے قیامت کا دن مراد لیتے ہیں۔

۵۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ يَوْمُ الذَّبْحِ وَيَوْمُ عَرَفَةَ يَعْنِي الشَّاهِدَ وَالْمَشْهُوْدَ[۲]

حضرت امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۹۶ھ) فرماتے ہیں ذبح کا دن اور عرفہ کا دن یعنی شاہد اور مشہود کا مطلب ہے۔

عشرہ ذی الحجہ کے فضائل واحکام:

۱۔ وَفِيْ حَدِيْثِ جَابِرٍ فِيْ صَحِيْحَيْ اَبِيْ عَوَانَةَ وَابْنِ حَبَّانَ مَا مِنْ اَيَّامٍ اَفْضَلُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ اَيَّامِ عَشْرِ ذِي الْحَجَّةِ[۳]

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۷۸ھ) کی روایت میں جو صحیح ابوعوانہ اور صحیح ابن حبان میں ہے کوئی بھی دن اللہ تعالیٰ سبحانہ وتقدس کے نزدیک عشرہ ذی الحجہ کے دنوں سے افضل نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ عشرہ ذی الحجہ کے ایام نہایت افضل ترین ہیں۔

۲۔ امام المحدثین سراج الامت ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاریؒ (المتوفی ۲۵۶) فرماتے ہیں:

قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمَاتٍ اَيَّامَ الْعَشْرِ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) فرماتے ہیں قرآن کریم کی اس آیت میں ایام معلومات سے مراد ایام عشر ہیں اور وہ یہی ذی الحجہ کے دس دن ہیں"۔[۴]

---

[۱] تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۳۴

[۲] تفسیر ابن کثیر، ج: ۴، ص: ۶۳۴

[۳] فتح الباری، ج: ۲، ص: ۴۵۹، ط: مکتبہ سلفیہ

[۴] صحیح بخاری، ج: ۱، ص: ۱۳۲، ط: قدیمی، کراچی

۳۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ يَعْنِيْ ابْنَ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَامِنْ اَيَّامٍ اَلْاَعْمَالُ فِيْهَا اَفْضَلُ مِنْ اَيَّامِ الْعَشْرِ، قِيْلَ وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ وَلَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔[۱]

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ) فرماتے ہیں حضرت مدنی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا نہیں ہیں کوئی دن جن میں اعمال کیے جاتے تو وہ عشرہ ذی الحجہ سے افضل ہوں۔ (لہٰذا عشرہ ذی الحجہ تمام دنوں سے افضل ہے) عرض کیا گیا اللہ کے راستے میں جہاد بھی ان سے افضل نہیں؟ فرمایا جہاد بھی ان سے افضل نہیں۔[۲]

۴۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا الْعَمَلُ فِيْ اَيَّامٍ اَفْضَلُ مِنْهَا فِيْ هٰذِهٖ؟ قَالُوْا وَلَا الْجِهَادُ، قَالَ: وَالْجِهَادُ اِلَّا رَجُلٌ خَرَجَ يُخَاطِرُ بِنَفْسِهٖ وَمَالِهٖ فَلَمْ يَرْجِعْ بِشَيْءٍ[۳]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۶۸ھ) فرماتے ہیں کہ فخر الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی عمل ان دنوں (عشرہ ذی الحجہ) سے زیادہ افضل نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ کیا اللہ کے راستہ میں جہاد بھی اس سے افضل نہیں؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں جہاد سے بھی افضل، مگر وہ شخص جو اپنی جان اور اپنے مال سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہے، پھر واپس نہیں لوٹتا۔

۵۔ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ سَيِّدُ الشُّهُوْرِ شَهْرُ رَمَضَانَ وَاَعْظَمُهَا حُرْمَةً ذُوالْحَجَّةِ[۴]

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۷۴ھ) سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[۱] رواہ الطبرانی، قال الھیثمی رجالہ رجال الصحیح

[۲] مجمع الزوائد، ج: ۴، ص: ۱۶، مکتبہ القدسی القاہرہ

[۳] صحیح بخاری، ج: ۱، ص: ۳۲۲، ط: قدیمی، کراچی

[۴] غنیۃ الطالبین، ج: ۲، ص: ۴۶، ۴۷

نے ارشاد فرمایا مہینوں کا سردار رمضان ہے اور بہت بڑی حرمت والا مہینہ ذوالحجہ ہے۔

۶۔ شارح بخاری، امام المحدثین، جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ (المتوفی ۱۳۵۲ھ) فرماتے ہیں:

وَاعْلَمْ اَنَّ الْعِبَادَةَ فِيْ تِلْكَ الْعَشَرَةِ اَفْضَلُ مِنْهَا فِيْ سَائِرِ السَّنَةِ[۱]

تو جان لے اس بات کو کہ عبادت کرنا اس عشرہ (یعنی عشرہ ذی الحجہ) میں افضل ہے تمام سال میں عبادت کرنے سے (یعنی سال کے دنوں سے افضل دن عشرہ ذی الحجہ کے ہیں)۔

۷۔ حضرت امام نصر بن محمد بن احمد بن ابراہیم ابواللیث سمرقندیؒ (المتوفی ۳۷۳ھ) فرماتے ہیں کہ مفسرین حضرات نے آیت:

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً (اَلْاٰيَة)[۲] ''اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ لیا پھر دس راتوں کو ان تیس راتوں کا تتمہ بنایا پھر ان کے پروردگار کا وقت پورے چالیس راتیں ہوگیا''۔

اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ دس راتیں ذوالحجہ کے شروع کی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان دس راتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ کلام بخشا اور قرب واختصاص کی گفتگو سے سرفراز فرمایا اور ان ہی دس دنوں میں ان کے لئے وحی والی تختیاں لکھوائی گئیں۔

عشرہ ذی الحجہ افضل یا رمضان المبارک؟

اصل بات یہ ہے کہ راتوں کو دیکھا جائے تو پورے سال میں سے رمضان المبارک کے آخری عشرہ کی راتیں افضل ہیں اور اگر دنوں کو دیکھا جائے تو پورے سال کے ایام میں سے عشرہ ذی الحجہ کے دن افضل ہیں۔ چنانچہ ملا علی قاری حنفی رحمہ الباری (المتوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

وَالْمُخْتَارُ اَنَّ اَيَّامَ هٰذَا الْعَشَرِ اَفْضَلُ لِيَوْمِ عَرَفَةَ وَلَيَالِيْ عَشَرَةَ

---

[۱] فیض الباری، ج: ۲، ص: ۳۶۰، ط: مکتبہ محمد یعقوب الفراہی

[۲] سورۃ الاعراف: ۱۴۲

رَمَضَانَ اَفْضَلُ لِلَیْلَةِ الْقَدْرِ لِاَنَّ یَوْمَ عَرَفَةَ اَفْضَلُ اَیَّامِ السَّنَةِ وَ لَیْلَةَ الْقَدْرِ اَفْضَلُ لَیَالِی السَّنَةِ[۱]

مختار قول یہ ہے کہ دن تو عشرہ ذی الحجہ کے افضل ہیں یوم عرفہ کی وجہ سے اور راتیں رمضان کے اخیر عشرہ کی افضل ہیں لیلۃ القدر کی وجہ سے، کیونکہ یوم عرفہ سال کے ایام میں سب سے افضل ہے اور لیلۃ القدر سال کی راتوں کی راتوں میں سب سے افضل ہے۔

عشرہ ذی الحجہ کے روزوں کا اجر وثواب:

۱۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا مِنْ اَیَّامٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ اَنْ یُّتَعَبَّدَ لَهٗ فِیْهَا مِنْ عَشْرِ ذِی الْحَجَّةِ یَعْدِلُ صِیَامُ کُلِّ یَوْمٍ مِّنْهَا صِیَامَ سَنَةٍ وَقِیَامُ کُلِّ لَیْلَةٍ مِّنْهَا بِقِیَامِ لَیْلَةِ الْقَدْرِ[۲]

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۷ھ) فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بھی دن ایسا نہیں ہے کہ جس میں اللہ کی عبادت کرنا عشرہ ذی الحجہ سے زیادہ افضل ہو۔ عشرہ ذی الحجہ کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے''۔

یہ ایام اتنی فضیلت والے ہیں کہ ان ایام میں ایک روزہ ثواب کے اعتبار سے ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ایک رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے اور اس سے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ایک مسلمان جتنے بھی ان دنوں میں نیک اعمال اور عبادات کر سکتا ہے وہ ضرور کرے اور نو (۹) ذی الحجہ کا دِن عرفہ کا دِن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے حجاج کیلئے حج کا عظیم الشان رکن یعنی وقوفِ عرفہ تجویز فرمایا اور ہمارے لئے خاص اس نویں تاریخ کو نفلی روزہ مقرر فرمایا ہے۔

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح، ج: ۳، ص: ۳۰۷، ط: امدادیہ، ملتان

[۲] شرح السنہ ص: ۳۴۶، ج: ۴، جامع ترمذی ص: ۱۵۸، ج: ۱، ط: قدیمی، کراچی، سنن ابن ماجہ ص: ۱۲۴، ط: قدیمی، کراچی، مشکوۃ المصابیح ص: ۱۲۸، مکتبہ ایچ ایم سعید، کراچی

۲۔عجیب حدیث:

ایک اور روایت میں حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (المتوفی ۵۸ھ) فرماتی ہیں کہ ایک نوجوان تھا جو ذوالحجہ کا چاند نظر آتے ہی روزے شروع کر دیتا تھا۔ یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی، آپ ﷺ نے اسے بلا کر وجہ پوچھی۔ اس نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یارسول اللہ! یہ حج کے اور دینی شعائر کے دن ہیں۔ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعمال والے لوگوں کی دعاؤں میں مجھے بھی شامل فرمالیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا بے شک تجھے ہر دن کے روزہ کے بدلہ سو غلام آزاد کرنے کا، سو اُونٹ قربان کرنے کا اور سو گھوڑے مجاہدین کو سواری کیلئے دینے کا اَجر ملے گا۔[۱]

۳۔ اُم المومنین حضرت حفصہ بنت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہا (المتوفاۃ ۴۵ھ) فرماتی ہیں:

اِنَّهَا قَالَتْ اَرْبَعٌ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْرُكُهُنَّ صَوْمَ عَشْرِ ذِي الْحَجَّةِ وَعَاشُوْرَآءَ وَثَلَاثَةَ اَيَّامٍ مِّنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَانِ قَبْلَ الْغَدَاةِ۔[۲]

''آنحضرت ﷺ چار چیزیں نہیں چھوڑتے تھے: عشرہ ذی الحجہ کے روزے (عرفہ تک) عاشور (دس محرم) کا روزہ، ہر مہینہ میں تین روزے اور فجر کی نماز سے پہلے دو سنتیں''۔

فائدہ:

ذی الحجہ کی دسویں تاریخ سے تیرہویں تک چار یوم کا روزہ حرام ہے۔ اس واسطے ان دنوں کے روزہ کی فضیلت نو تاریخ تک کے لئے ہے۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۳۲ھ) سے روایت ہے: ذوالحجہ کے دس دنوں کے روزوں کا خاص خیال رکھو۔ ان میں دعا و استغفار اور صدقہ خوب کرو کہ میں نے تمہارے نبی ﷺ سے سُنا ہے کہ فرماتے تھے اس شخص کے لئے ہلاکت ہے جو ان دس دنوں کی بھلائی سے محروم رہا۔[۳]

---

[۱] تنبیہ الغافلین، ص: ۳۱۹، ط: مکتبہ الحرمین

[۲] غنیۃ الطالبین، ج: ۲، ص: ۴۸

[۳] تنبیہ الغافلین، ص: ۳۱۹

عشرہ ذی الحج میں ذکرِ الٰہی کی کثرت:

۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَامِنْ اَيَّامٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ فِيْهِنَّ الْعَمَلُ مِنْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ اَيَّامُ الْعَشْرِ فَاَكْثِرُوْا فِيْهِنَّ التَّكْبِيْرَ وَالتَّهْلِيْلَ وَالتَّسْبِيْحَ[۱]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۷۴ھ) فرماتے ہیں سرکار دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے نزدیک عشرہ ذی الحجہ کے دنوں کے عمل سے کوئی عمل کسی دن کا زیادہ محبوب نہیں۔ (یعنی عشرہ ذی الحجہ کے اعمال تمام دنوں سے محبوب ہیں)۔ پس تم ان دنوں میں تکبیر اللہ اکبر اور تہلیل لا الٰہ الا اللہ اور تسبیح سبحان اللہ زیادہ کہا کرو۔

تسبیح وتہلیل، تکبیر اور تحمید عربی زبان کے خاص الفاظ ہیں۔ تسبیح سے سبحان اللہ کہنا، تہلیل سے لا الہ الا اللہ کہنا، تکبیر سے اللہ اکبر کہنا اور تحمید سے الحمد اللہ کہنا مراد ہے۔ یہ بہت مبارک کلمات ہیں، احادیث میں ان کے بڑے فضائل ہیں۔

۲۔ ایک حدیث میں ہے رسولِ کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو روزانہ اُحد پہاڑ کے برابر عمل کرلیا کرے؟ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! اس کی کون طاقت رکھتا ہے؟ (کہ اتنے بڑے پہاڑ کے برابر عمل کرے؟) آپ ﷺ نے فرمایا ہر شخص طاقت رکھتا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا اس کی کیا صورت ہے؟ ارشاد فرمایا: سبحان اللہ کا ثواب اُحد سے زیادہ ہے، لا الہ الا اللہ کا ثواب اُحد سے زیادہ ہے، الحمد اللہ کا ثواب اُحد سے زیادہ ہے، اللہ اکبر کا ثواب اُحد سے زیادہ ہے۔''[۲]

۳۔ ایک دوسری حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

سَبِّحِ اللّٰهَ مِائَةَ تَسْبِيْحَةٍ فَاِنَّهَا تَعْدِلُ لَكَ مِائَةَ رَقَبَةٍ تُعْتِقِيْنَهَا مِنْ وُلْدِ

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ، ج: ۲، ص: ۲۷۰، ط: امدادیہ، ملتان

[۲] کذا فی مجمع الزوائد

اِسْمٰعِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ ، وَاحْمَدِي اللّٰهَ مِائَةَ تَحْمِيْدَةٍ فَاِنَّهَا تَعْدِلُ لَكِ مِائَةَ فَرَسٍ مُسْرَجَةٍ مُلْجَمَةٍ تَحْمِلِيْنَ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَكَبِّرِي اللّٰهَ مِائَةَ تَكْبِيْرَةٍ فَاِنَّهَا تَعْدِلُ لَكِ مِائَةَ بَدَنَةٍ مُقَلَّدَةٍ مُتَقَبَّلَةٍ، وَهَلِّلِي اللّٰهَ مِائَةَ تَهْلِيْلَةٍ (قَالَ اَبُوْ خَلْفٍ: اَحْسِبُهُ قَالَ) تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلَا يُرْفَعُ لِاَحَدٍ عَمَلٌ اَفْضَلُ مِمَّا يُرْفَعُ لَكِ اِلَّا اَنْ يَّأْتِيَ بِمِثْلِ مَا اَتَيْتِ ۔[1]

''سبحان اللہ'' سومرتبہ پڑھا کرو، اس کا ثواب ایسا ہے جیسے تم نے سوعربی غلام آزاد کئے اور ''الحمدللہ'' سومرتبہ پڑھا کرواس کا ثواب ایسا ہے جیسے تم نے سوگھوڑے مع سامان وغیرہ جہاد میں سواری کیلئے دے دیئے ہیں اور ''اللہ اکبر'' سومرتبہ پڑھا کرو یہ ایسا ہے جیسے تم نے سو اونٹ قربانی میں ذبح کئے اور قبول ہو گئے اور ''لا الہ الا اللہ'' سومرتبہ پڑھا کرواس کا ثواب تو تمام آسمان وزمین کے درمیان کو بھر دیتا ہے، اس سے بڑھ کر کسی کا کوئی عمل نہیں جو مقبول ہو۔

فائدہ:

یوں تو اس تمام عشرہ میں (یعنی ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں) تکبیر وتہلیل کی زیادتی پسندیدہ ہے جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا، لیکن نو تاریخ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ہر نماز کے بعد بلند آواز سے ایک مرتبہ تکبیر کہنا ضروری ہے جیسا کہ آثار السنن میں ابن ابی شیبہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معمول مروی ہے۔

تکبیراتِ تشریق:

ذی الحجہ کی نویں تاریخ کی صبح سے تیرہویں تاریخ کی عصر تک ہر فرض نماز کے بعد تکبیراتِ تشریق کا پڑھنا جماعت سے نماز پڑھنے والے اور تنہا نماز پڑھنے والے، شہری اور دیہاتی، مقیم اور مسافر، مرد اور عورت، سب پر واجب ہے، البتہ مرد متوسط بلند آواز سے پڑھے اور عورت آہستہ۔

وہ تکبیرات یہ ہیں:

---

[1] رواہ احمد باسناد حسن

''اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ''[۱] .

تکبیرات تشریق کی اصل:

حضرت مولانا ومولیٰ الروم شیخ اسماعیل البروسویؒ (المتوفی ۱۱۳۷ھ) فرماتے ہیں:

رُوِیَ اَنَّهٗ لَمَّا ذَبَحَهٗ قَالَ جِبْرَئِیْلُ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ فَقَالَ الذَّبِیْحُ: لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، فَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ: اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، فَبَقِیَ سُنَّةً[۲]

ایک روایت میں ہے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر رہے تھے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ (اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے) تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ (عبادت کے لائق صرف اللہ ہی ہے اور اللہ سب سے بڑا ہے)، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ ہی کیلئے تمام تعریفیں ہیں۔

بعض فقہائے کرام نے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ یوں فرمایا ہے کہ تکبیرِ تشریق کی اصلیت یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو لٹایا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فدیہ (مینڈھا) لے جاؤ لیکن یہ فدیہ (مینڈھا) لے کر آئے تو اس ڈر سے کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کر ڈالیں گے اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ پکارنے لگے۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب یہ آواز سنی تو بشارت وخوشخبری سمجھ کر پکار اُٹھے لَآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام سمجھے کہ فدیہ (مینڈھا) آگیا تو اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ

---

[۱] زوال السنہ عن اعمال السنہ ص ۳۷

[۲] تفسیر روح البیان، ج: ۷، ص: ۴۷۷، ط: استنبول، مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ

اَلْحَمْدُ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد (تعریف) اور اس کا شکر ادا کرنے لگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔[۱]

یہ تکبیرات ان ایام کا خاص عمل ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ تکبیر تشریق رکھی ہی اس لئے گئی ہے کہ اس سے شوکتِ اسلام کا مظاہرہ ہو اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد مسجد اس تکبیر سے گونج اُٹھے، لہٰذا اس کو بلند آواز سے کہنا ضروری ہے۔

اسی طرح عید الاضحیٰ کی نماز کے لئے جارہے ہوں تو اس میں بھی مسنون یہ ہے کہ راستے میں بلند آواز سے تکبیر کہتے جائیں، البتہ عید الفطر میں آہستہ کہنی چاہیے۔ یہ تکبیرِ تشریق خواتین کیلئے بھی مشروع ہے اور اس میں عام طور پر بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور خواتین کو تکبیر پڑھنا یاد ہی نہیں رہتا۔

۴۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (المتوفی ۷۴ھ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''کوئی دن ایسے نہیں جن میں اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت ہی محبوب ہوں اور عظمت والے ہوں سوائے ان دس دنوں کے۔ لہٰذا ان میں کثرت سے لا الٰہ الا اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر وغیرہ پڑھتے رہا کرو۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان پورے دس دنوں میں بستر پر ہوں یا مجلس میں اللہ اکبر ہی کہتے رہتے تھے۔ حضرت عطاء بن ابی رباحؒ (المتوفی ۱۱۴ھ) بھی ان دس دنوں میں راستے میں ہوں یا بازار میں تکبیر کہتے رہتے تھے۔

۵۔ حضرت جعفر بن سلیمانؒ (المتوفی ۱۷۸ھ) فرماتے ہیں:

میں نے ثابت بنانیؒ (المتوفی ۱۲۷ھ) کو دیکھا کہ ان دس دنوں میں اپنے وعظ وتذکیر کی مجلسوں میں بات کرتے کرتے اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر کہنا شروع کر دیتے اور فرماتے

---

[۱] فتاوی رحیمیہ، ج:۱۰، ص:۳۲

کہ یہ ذکر کے دن ہیں اور لوگوں کا بھی یہی معمول رہا۔ چنانچہ حضرت جعفرؒ فرماتے ہیں میں نے حضرت مالک بن دینارؒ (المتوفی ۱۳۵ھ) کو دیکھا کہ ایسا ہی کرتے تھے۔

نوٹ: حضرت امام فقیہ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ان دنوں میں جو شخص آہستہ آہستہ تکبیر کہتا ہے تو یہ افضل ہے اور جو بلند آواز سے کہتا ہے تو یہ بھی جائز ہے جبکہ مقصد ایک شرعی حکم کا اظہار ہو، تاکہ لوگوں کو بھی دھیان ہو جائے۔[۱]

۶۔ محی السنہ ابو محمد حسین بن مسعود فراء بغوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۱۰ھ) فرماتے ہیں:

وَرُوِیَ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ وَاَبَا هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَا یَخْرُجَانِ اِلَی السُّوْقِ فِیْ اَیَّامِ الْعَشْرِ یُكَبِّرَانِ وَیُكَبِّرُ النَّاسُ بِتَكْبِیْرِهِمَا[۲]

ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بازار کی طرف نکلے عشرہ ذی الحجہ میں دونوں تکبیر کہتے جا رہے تھے اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی تکبیر کہتے رہتے تھے۔

نویں ذی الحجہ کی فضیلت:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: مَامِنْ یَوْمٍ اَفْضَلُ مِنْ یَوْمِ عَرَفَةَ یُبَاهِیْ اللّٰهُ تَعَالٰی بِاَهْلِ الْاَرْضِ اَهْلَ السَّمَآءِ یَقُوْلُ اُنْظُرُوْا اِلٰی عِبَادِیْ شُعْثًا غُبْرًا جَاءُوْنِیْ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ یَرْجُوْنَ رَحْمَتِیْ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابِیْ فَلَمْ یُرَ یَوْمٌ اَكْثَرُ عِتْقًا مِّنَ النَّارِ مِنْ یَوْمِ عَرَفَةَ[۳]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما (المتوفی ۷۸ھ) سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عرفہ (نویں ذی الحجہ) کے دن سے افضل کوئی دن نہیں (اس دن) اللہ

---

[۱] تنبیہ الغافلین، ص: ۳۲۱

[۲] شرح السنۃ، ج: ۴، ص: ۳۰۱، ط: مکتبۃ الکتب الاسلامی

[۳] غنیۃ الطالبین، ج: ۲، ص: ۷۲

تعالیٰ آسمان والوں میں زمین والوں پر فخر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں میرے بندوں کو دیکھو ان کے بکھرے ہوئے بال ہیں اور گرد آلود چہرے ہیں۔ دور دور سے میرے پاس آئے ہیں۔ یہ میری رحمت کے اُمیدوار ہیں اور میرے عذاب سے ڈر رہے ہیں۔ لہٰذا کوئی دن ایسا نہیں پایا جاتا جس میں لوگ آگ سے اس قدر آزاد ہوں جس قدر عرفہ کے دن آزاد ہوتے ہیں۔

قَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْيَهُوْدِ لِابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا لَوْكَانَ هٰذَا الْيَوْمَ فِيْنَالَاتَّخَذْنَاهُ عِيْدًاقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَاوَاَيُّ عِيْدٍ اَكْمَلُ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ[۱]

ایک یہودی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا اگر یہ دن (عرفہ) ہم میں ہوتا تو ہم اس میں عید منایا کرتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا عرفہ کے دن سے بڑھ کر کون سی عید ہوسکتی ہے (یعنی اللہ کی طرف سے بخشش کا عام اعلان ہوتا ہے)۔

عرفہ کی وجہ تسمیہ:

قَالَ الضَّحَّاكُ اِنَّ آدَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لَمَّا اُهْبِطَ اِلَى الْاَرْضِ وَقَعَ بِالْهِنْدِ وَحَوَّاءَ بِجَدَّةَ فَجَعَلَ آدَمُ يَطْلُبُ حَوَّاءَ وَهِيَ تَطْلُبُهُ فَاجْتَمَعَا بِعَرَفَاتٍ يَوْمَ عَرَفَةَ وَتَعَارَفَا فَسُمِّيَ هٰذَا الْيَوْمُ عَرَفَةَ وَالْمَوْضِعُ عَرَفَاتٍ۔[۲]

حضرت امام ضحاک بن مزاحمؒ (المتوفی ۱۰۶ھ) فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام زمین پر اُتارے گئے تو آپ علیہ السلام ہند میں اور حضرت حوا علیہا السلام جدہ میں اُتری۔ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام دونوں ایک دوسرے کو تلاش کرنے لگے۔ پھر دونوں عرفہ (نویں ذوالحجہ) کے دن عرفات میں جمع ہو گئے اور ہر ایک نے

---

[۱] غنیۃ الطالبین، ج: ۲، ص: ۶۸

[۲] غنیۃ الطالبین، ج: ۲، ص: ۶۸

دوسرے کو پہچان لیا۔ لہٰذا وہ دن عرفہ اور جگہ عرفات کے نام سے مشہور ہوگئی۔

عرفہ (نویں ذی الحجہ) کے روزے کے فضائل:

۱۔ عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنِّیْ اَحْتَسِبُ عَلَى اللّٰهِ فِیْ صِيَامِ يَوْمِ عَرَفَةَ اَنْ يُّكَفِّرَ السَّنَةَ الَّتِیْ قَبْلَهٗ وَالسَّنَةَ الَّتِیْ بَعْدَهٗ[۱]

حضرت ابوقتادہ حارث بن ربعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۴ھ) فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتا ہوں کہ نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھنے والے کے ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں۔

۲۔ حضرت امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذیؒ (المتوفی ۲۷۹ھ) اس روایت کے بعد فرماتے ہیں وَفِی الْبَابِ عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ کہ اس قسم کی روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے اور فرماتے ہیں حَدِيْثٌ حَسَنٌ یہ حدیث حسن ہے پھر فرماتے ہیں قَدِ اسْتَحَبَّ اَهْلُ الْعِلْمِ صِيَامَ يَوْمِ عَرَفَةَ کہ نویں ذوالحجہ کا روزہ اہل علم کے نزدیک مستحب ہے۔[۲]

۳۔ امام المحققین حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد الازدی المصریٰ الطحاویؒ (المتوفی ۳۲۱ھ) فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِیِّ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ يَوْمِ عَرَفَةَ فَقَالَ يُكَفِّرُ السَّنَةَ الْمَاضِيَةَ وَالْبَاقِيَةَ[۳]

اس روایت میں بھی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۴ھ) فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا نویں ذوالحجہ کے روزے کے متعلق تو ارشاد فرمایا کہ ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔

۴۔ ایک اور روایت کے یوں الفاظ ہیں:

---

[۱] جامع ترمذی، ج:۱، ص:۱۵۷۔ صحیح لمسلم، ج:۱، ص:۳۶۷۔ الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۱۱، ۱۱۲

[۲] ترمذی، ج:۱، ص:۱۵۷

[۳] طحاوی، ج:۱، ص:۳۶۴

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ عَنْ قَتَادَةَ بْنِ النُّعْمٰنِ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ صَامَ يَوْمَ عَرَفَةَ غُفِرَلَهٗ سَنَةٌ اَمَامَهٗ وَسَنَةٌ بَعْدَهٗ[۱]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۷۴ھ) حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۳ھ) سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا فرمارہے تھے کہ جس نے عرفہ کے دن (۹ ذوالحجہ) کا روزہ رکھا، اس کے ایک سال گزشتہ اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف کردیے جاتے ہیں۔

حاجیوں کے لئے عرفہ کا روزہ:

یومِ عرفہ کا روزہ حاجی کے لئے اگر ضعف (کمزوری) کا اندیشہ نہ ہو بلا کراہت مستحب ہے اور اگر ضعف کا اندیشہ ہوتو مکروہ ہے۔[۲]

حجاج کرام کے ساتھ مشابہت کا حکم:

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر اور ان لوگوں پر جو بیت اللہ کے پاس حاضر نہیں ہیں اور حجِ بیت اللہ کی عبادت میں شریک نہیں ہیں اللہ تعالیٰ کے کرم کو متوجہ فرمانے اور ان کی رحمت کا اُمیدوار بنانے کیلئے یہ فرمادیا کہ ان حجاج بیت اللہ کے ساتھ تھوڑی سی مشابہت اختیار کرلو، جس طرح وہ بال نہیں کاٹ رہے ہیں تم بھی مت کاٹو، جس طرح وہ ناخن نہیں کاٹ رہے ہیں تم بھی مت کاٹو۔ یہ ان اللہ کے بندوں کے ساتھ مشابہت پیدا کردی جو اس وقت حجِ بیت اللہ کی عظیم سعادت سے بہرہ اندوز ہورہے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں بہانے ڈھونڈتی ہے:

جب ہمیں یہ حکم دیا کہ ان کی مشابہت اختیار کرلو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر جو رحمتیں نازل فرمانا منظور ہے اس کا کچھ حصہ تمہیں بھی عطا فرمانا چاہتے ہیں تاکہ جس وقت عرفات کے میدان میں ان اللہ کے

---

[۱] سنن ابن ماجہ، ص: ۱۲۴، ط: قدیمی، کراچی

[۲] کمافی الدر المختار وردّ المحتار ص ۲/ ۸۳۰) (امداد الفتاویٰ ص ۲/ ۱۰۰

بندوں پر رحمت کی بارشیں برسیں، اس کی بدلی کا کوئی ٹکڑا ہم پر بھی برسادے تو یہ مشابہت پیدا کرنا بھی بڑی نعمت ہے۔ اسی پر خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمہ اللہ صاحب کا یہ شعر ہے:

تیرے محبوب کی یارب مشابہت لے کر آیا ہوں حقیقت اسکو تو کردے میں صورت لیکر آیا ہوں

مسئلہ:

جس شخص کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو اس کے لئے مستحب ہے کہ بقرعید کا چاند نظر آنے کے بعد خط، ناخن اور بال نہ بنوائے جب تک قربانی نہ کرلے۔[۱] لیکن بغلوں اور زیر ناف بالوں کو اگر ۴۰ دن گزر گئے ہوں تو ان کی صفائی واجب ہے۔

بال اور ناخن نہ تراشنے کی عجیب توجیہ:

قربانی کرنے والا اپنی قربانی کو اپنی جان کے عوض میں فدیہ دیتا ہے کہ قیامت کے دن عذاب سے بچے اور اس سے قربتِ الٰہی زیادہ ہو تو گویا گناہوں کے کرنے اور حقوق اللہ میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے اپنی جان کو بڑے سے بڑے عذاب کا سزاوار جانتا ہے اور وہ قتل ہے، ہاں اتنی بات ہے کہ اس پر پیش قدمی سے اس لئے رُک گیا کہ خودکشی کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا قربانی کی برکت تمام اجزائے بدن کو شامل ہوگئی کہ کوئی ذرہ بدن کا خالی نہیں رہا اور نہ کوئی بال محروم رہا، اس لئے حکم دیا گیا کہ ان دِنوں میں بال اور ناخن نہ تراشے۔

عید الفطر اور بقرعید کی شب کو زندہ رکھنے کا مطلب:

حدیث میں عید الفطر اور بقرعید کی شب کو زندہ رکھنے کا حکم ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان راتوں کو عبادتِ الٰہی میں مشغول رکھے اور ذکر وتسبیح، صلہ رحمی، نیک لوگوں کی صحبت وہم نشینی میں اس وقت کو پورا کرے، اہل وعیال کے ساتھ انس ومحبت سے پیش آئے، عزیز واقارب سے میل ملاقات اور حسن سلوک کرے۔ یہ سب کارہائے خیر ہیں اور عبادتوں میں ان راتوں کو گزارے اور یہ جو فرمایا گیا کہ ان راتوں میں عبادت کرنے والے کا دل مردہ نہ ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے ہولناک اور دہشت

---

[۱] تعلیم الدین ص ۲۵۸

ناک دِن میں جب ہر طرف خوف وہراس اور دہشت وگھبراہٹ پھیلی ہوئی ہوگی، لوگ بدحواس اور مدہوش ہوں گے اور ان کی نشہ کی سی کیفیت ہوگی حالانکہ انہیں بدحواسی قطعاً نہ ہوگی لیکن عذابِ الٰہی ایسی سخت چیز ہے جس سے لوگوں کی یہ حالت ہوگی ایسے قیامت خیز دِن میں حق تعالیٰ اس بندہ کو تنعم اور باسعادت زندگی بخشیں گے، خوف ودہشت کا دور دور تک کوئی نشان نہ ہوگا، ہر بھلائی اس کے قدم چومے گی، اس پر رحمت ہی رحمت برستی ہوگی اور وہ بہت پرلطف اور پرمسرت زندگی میں مگن ہوگا۔

قربانی:

سب سے افضل عمل جو اللہ تعالیٰ نے ایام ذی الحجہ میں مقرر فرمایا ہے وہ قربانی کا عمل ہے اور یہ عمل سال کے دوسرے ایام میں انجام نہیں دیا جاسکتا ان کے علاوہ دوسرے اوقات میں چاہے کتنے جانور ذبح کرلے لیکن قربانی نہیں ہوسکتی۔ حج اور قربانی ان دنوں کے بڑے اعمال ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا:

"بقرعید کی دس تاریخ کو کوئی نیک عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کا خون بہانے سے بڑھ کر محبوب اور پسندیدہ نہیں اور قیامت کے دن قربانی کرنے والا اپنے جانور کے بالوں، سینگوں اور کھروں کو لے کر آئے گا (اور یہ چیزیں ثوابِ عظیم ملنے کا ذریعہ بنیں گی) نیز فرمایا کہ قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرفِ قبولیت حاصل کرلیتا ہے لہٰذا تم خوش دلی کے ساتھ قربانی کیا کرو"۔[1]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اے فاطمہ! جاؤ اپنی قربانی پر حاضری دو کیونکہ اس کے خون سے جونہی پہلا قطرہ گرے گا تمہارے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ نیز وہ جانور (قیامت کے دن) اپنے خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور پھر اسے ستر گنا (بھاری کرکے) تمہارے میزان میں رکھا جائے گا۔

---

[1] ترمذی شریف

حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (یہ عظیم الشان فضیلت سن کر بے ساختہ) عرض کیا یارسول اللہ! کیا یہ (فضیلت عظیمہ صرف) آلِ محمد ﷺ کے ساتھ خاص ہے کیونکہ وہ (واقعۃً) اس کارِ خیر کے زیادہ مستحق ہیں یا آل محمد ﷺ اور تمام مسلمانوں کیلئے عام ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (یہ عظیم الشان فضیلت) آلِ محمد ﷺ کیلئے تو بطور خاص ہے اور تمام مسلمانوں کیلئے بھی عام ہے (یعنی ہر مسلمان کو قربانی کرنے کے بعد یہ فضیلت حاصل ہوگی)۔

حکمِ قربانی اور عقل کے پجاری:

میرے بھائیو! امرِ الٰہی پورا کرنا دین ہے۔ قربانی میں ہم خون بہاتے ہیں، جو عقل کے پجاری ہیں وہ کہتے ہیں یہ اقتصادیات کا نقصان ہے، یہ مال ضائع کرنا ہے، ہزاروں لاکھوں جانور ذبح کرتے ہو کیا فائدہ اس کا، اس لئے کہ ان کے دماغ مادے میں الجھے ہوئے ہیں، اور جن کے دماغ امرِ الٰہی سے منور ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ آمر ہے، اُس کا کوئی بھی حکم مصلحت سے خالی نہیں۔ بعض دفعہ ہم مصلحت سمجھ لیتے ہیں اور بعض دفعہ نہیں سمجھتے۔ جیسے اللہ کے نبی نے امرِ الٰہی پورا کیا ہم ویسے کریں گے۔

اللہ کے نبی ﷺ مدینہ منورہ میں مسلسل قربانی کرتے رہے **کبشین** (دو دُنبے) **اَمْلَحَیْنِ** (دونوں چتکبرے، سفید اور سیاہ) کہیں لکھا ہے **موجوئین** (دونوں خصی)، کہیں فرمایا: آپ ﷺ نے دُنبہ ذبح کیا **یَطَأُ فِیْ سَوَادٍ وَیَنْظُرُ فِیْ سَوَادٍ وَیَبْرُکُ فِیْ سَوَادٍ**[1]

اُس کا منہ، آنکھیں، ٹانگیں اور گھٹنے کالے تھے۔ نبی علیہ السلام ہمیشہ حَسین جانور ذبح فرماتے، ایک دُنبہ اپنی طرف سے اور دوسرے کا ثواب پوری اُمت کیلئے ہوتا۔

آخری حج میں (حج اور عمرہ اکٹھا تھا اُس کے شکرانے کیلئے) آقائے نامدار ﷺ نے دونوں قربانیاں جمع کیں، دمِ تمتع یا دمِ قران بھی شامل تھا، دوسری قربانی بھی شامل تھی۔

تریسٹھ اونٹ آپ ﷺ مدینہ منورہ سے لے کر گئے، باقی اونٹ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے لائے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احرام باندھا کہ میرا احرام بھی اُسی نیت کے ساتھ ہے جس

---

[1] سنن ابی داؤد: باب ما یستحب من الضحایا، ج ۲ ص ۳۰

نیت کے ساتھ اللہ کے نبی ﷺ کا احرام ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے عمرے اور حج کا اکٹھے احرام باندھا ہے تو میری وہی نیت، اور اگر اللہ کے نبی ﷺ نے صرف حج کا احرام باندھا ہے تو میری بھی وہی نیت۔

حضور ﷺ نے دسویں کے دن اونٹ نحر کیے، باقی جانوروں میں ذبح ہے صرف اونٹ میں نحر ہے۔ ہمارے نبی ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اپنی عمر کے مطابق تریسٹھ اونٹ نحر فرمائے، (نبی جیسی طاقت کس کے پاس ہے؟ عام آدمی آٹھ دس کرے گا تو تھک جائے گا) آپ ﷺ جب نحر کر رہے تھے تو ہر اونٹ بھاگ بھاگ کر آ رہا تھا۔ باقی اونٹ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نحر کئے، سو پورے ہو گئے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا ہر اونٹ سے ایک بوٹی لے لو، اُسے ہنڈیا میں ڈال کر پانی ڈال دو، اس کا شوربہ مجھے دیدو، یہ برکت اور انوارات والا گوشت ہے، تاکہ برکت والی چیز میرے معدے میں جائے۔

تنبیہ:

آپ ﷺ نے سو اونٹ نحر فرمائے، تھوڑا سا شوربہ آپ نے نوش فرمایا باقی کو تو کچھ نہیں کیا تو نعوذ باللہ اللہ کے نبی ﷺ نے تو اقتصادیات کا بڑا نقصان کر دیا کہ سو اونٹ ایسے ذبح کرا ڈالے، اس کی بجائے مکہ مدینہ کی سڑکیں پکی کرا دیتے، ملحدین اس قسم کی باتیں مسلمانوں کے ذہنوں میں لاتے ہیں جو اللہ کے دین کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں، مسلمانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں تاکہ کسی طرح وہ قربانی چھوڑ دیں۔ کبھی کہتے ہیں حج کا کیا فائدہ، نماز پڑھنے کا کیا فائدہ، تو ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ آپ کے پیدا ہونے کا کیا فائدہ؟ میرے بھائیو! اصل حکمِ الٰہی کو پورا کرنا ہے جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔

حقیقی مُسلم:

میرے محترم بھائیو، دوستو! حقیقی مسلم وہ ہے جو اللہ کے سامنے گردن جھکا دے، اللہ کے حکم کے مقابلے میں سرِ مو (بال کے برابر) بھی تجاوز نہ کرے، جیسے اللہ تعالیٰ شانہٗ فرمائیں اللہ کے حکم کی بجا آوری، اللہ کے حکم کی اطاعت ویسے ہی کرے، حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق، یہ حقیقی مسلم ہے۔ ہمارا مذہب ہی اسلام ہے اور ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب بھی ہمیں یہی تعلیم دیتا ہے کہ ہم اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری خوشی سے کریں۔

بعض دفعہ حکمِ الٰہی طبیعت کو ناگوار ہوگا، بعض دفعہ حکمِ الٰہی طبیعت کے مطابق ہوگا، حکمِ الٰہی پورا کرنا ہے چاہے طبیعت کے موافق ہو یا طبیعت کے خلاف ہو، مختلف حالات تو پیش آئیں گے، کبھی طبیعت میں انقباض ہوگا، گھٹن ہوگی حکمِ الٰہی کی طرف خوشی سے نہیں چلے گا، کبھی حالات ناموافق ہوں گے، تو طبیعت سے بھی اثر نہ لے اور حالات سے بھی اثر نہ لے۔ ہر حال میں اللہ کے امر سے متاثر ہو یہ حقیقی مسلم ہے۔

یہ نہیں ہے کہ طبیعت چاہ رہی ہے تو نماز پڑھ لیں، طبیعت نہیں چاہ رہی تو نہ پڑھیں، میرے بھائیو! طبیعت چاہے یا نہ چاہے ہر حال میں حکمِ الٰہی پورا کرنا ہے، اکثر احکاماتِ الٰہیہ طبیعت اور خواہش کے خلاف ہیں، اس خواہش کو قربان کرنا، حکمِ الٰہی کو پورا کرنا یہ اسلام ہے اور ایسا کرنے والا مسلم ہے۔ اللہ ربُّ العزت خوش دلی اور جوش وجذبے کے ساتھ قربانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ضَحُّوْا فَاِنَّهَا سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (الحدیث)

عیدالاضحیٰ کا بیان

(عیدین میں خوشی کیسے منائیں؟)

عیدالاضحیٰ کا بیان

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[۱] فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ[۲] قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ[۳] قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ضَحُّوْا فَاِنَّهَا سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ۔

تمہید:

محترم عزیز بھائیو! تہوار اور انسان کی سماجی زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے اور کبھی نہیں ہوئی جس نے سال میں دو چار یا پانچ دس دن اس غرض کے لئے مخصوص نہ کئے ہوں۔ لوگوں کا ایک جگہ جمع ہونا، مشترک جذبات کا مظاہرہ کرنا، مل کر خوشیاں منانا، ایک قسم کی مقررہ عبادات ادا کرنا، اس سے افراد آپس میں جڑ کر ایک مربوط معاشرہ بنتے ہیں اور ان میں اجتماعی روح نہ صرف پیدا ہوتی ہے بلکہ ان تھوڑے تھوڑے وقفوں سے تازہ اور بیدار رہتی ہے۔

اسلام ایک دینِ فطرت اور دین کامل ہے جو کسی بھی انسانی جذبہ کو مٹانے نہیں آیا بلکہ صحیح جگہ لگانے آیا ہے، خوشی کا جذبہ انسان کا فطری جذبہ ہے، نفس کے ایسے ہی طبعی جذبات وحقوق کی رعایت کا عام اُصول

---

[۱] الذاریات: ۵۶

[۲] الکوثر: ۲

[۳] انعام: ۱۶۲

لسانِ نبوی ﷺ پر ارشاد ہوا کہ تم پر بدن کا بھی حق ہے، تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تم پر تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، لہٰذا روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، نیند بھی کیا کرو اور جاگو بھی، قیام اللیل بھی کرو اور راحت بھی۔

خوشی کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ خوشی کے مواقع پر خوشی ضرور منایئے۔ خوشی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اور اسلام کچھ مفید حدود وشرائط کے ساتھ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کی ترغیب دیتا ہے، دین ہرگز پسند نہیں کرتا کہ آپ مصنوعی وقار، غیر مطلوب سنجیدگی، ہر وقت کی مردہ دِلی اور افسردگی سے اپنے کردار کی کشش کو ختم کردیں۔ وہ خوشی کے جائز مواقع پر خوشی منانے کا پورا پورا حق دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ آپ ہمیشہ بلند حوصلوں، تازہ ولولوں اور نئی اُمنگوں کے ساتھ تازہ دم رہیں۔ جائز مواقع پر خوشی کا اظہار نہ کرنا اور خوشی منانے کو دینی وقار کے خلاف سمجھنا، دین کے فہم سے محرومی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر قوم کے کچھ خاص تہوار اور جشن کے دِن ہوتے ہیں جن میں اس قوم کے لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اچھا لباس پہنتے اور عمدہ کھانے پکاتے، کھاتے ہیں اور دوسرے طریقوں سے بھی اپنی اندرونی مسرت وخوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ گویا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، اسی لئے انسانوں کا کوئی طبقہ اور فرقہ ایسا نہیں ہے جس کے ہاں تہوار اور جشن کے کچھ خاص دِن نہ ہوں۔

اسلام میں بھی ایسے دو دِن رکھے گئے ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرے عید الاضحیٰ۔ بس یہی مسلمانوں کے اصل مذہبی وملی تہوار ہیں، ان کے علاوہ مسلمان جو تہوار مناتے ہیں ان کی کوئی مذہبی حیثیت اور بنیاد نہیں ہے بلکہ اسلامی نقطہ نظر سے ان میں سے اکثر خرافات ہیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اسلام نے دو اجتماعی تہوار عید الاضحیٰ اور عید الفطر مقرر کئے ہیں اور ان دونوں کو نفسانی قربانی اور مجاہدہ کے بعد رکھا ہے تاکہ یہ ذہن نشین کرایا جائے کہ اصل خوشی اور مسرت کا حق مجاہدہ اور قربانی کے بعد ہے اور اس کے بغیر خوشی بے معنی ہے۔

عید الاضحیٰ اسلام کے اہم ترین تہواروں میں سے ہے، یہ عید حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جذبہ ایثار وقربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے اور مسلمانوں کے اس عقیدے کا اظہار ہے کہ

انسان کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حکم کے آگے اپنی عزیز ترین چیز بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہیے۔

عید کا مفہوم:

''عید'' عربی کا لفظ ہے جس کے عربی میں کئی معنی آتے ہیں: ایک معنی خوشی کے ہیں، کیونکہ عیدین پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشی کا موقع ہوتا ہے اس لئے اس کو عید کہا جاتا ہے اور ایک معنی لوٹ کر آنے والی چیز کے ہیں، کیونکہ عیدین کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر سال بندوں پر مختلف قسم کے احسانات لوٹ کر آتے ہیں۔

عید کی وجہ تسمیہ:

۱۔ امام المحدثین حضرت علامہ محمد بن عبدالباقی بن یوسف زرقانی مالکیؒ (المتوفی ۱۱۲۲ھ) فرماتے ہیں:

عِيْدُ الْفِطْرِ وَالْاَضْحٰى مَشْتَقٌّ مِّنَ الْعَوْدِ لِتَكَرُّرِ كُلِّ عَامٍ اَوْلِعَوْدِ السُّرُوْرِ بِعَوْدِهٖ اَوْ بِكَثْرَةِ عَوَائِدِ اللّٰهِ عَلٰى عِبَادِهٖ فِيْهِ[۱]

عید الفطر اور عید الاضحیٰ لفظ عود سے بنے ہیں۔ عود کا معنی ہے لوٹنا، یہ دونوں دن ہر سال میں لوٹ کر آتے ہیں یا اس سے مراد بار بار خوشی کا لوٹنا ہے، یا پھر اللہ تعالیٰ کا لوٹنا ہے اپنے بندوں پر یعنی اپنے بندوں کو معاف کرنا، فضل کرنا۔

۲۔ الفقیہ النبیل علامہ علی بن سلطان محمد المعروف ملا علی قاریؒ (المتوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

قِيْلَ اِنَّمَا سُمِّيَ الْعِيْدُ عِيْدًا لِاَنَّهٗ يَعُوْدُ كُلَّ سَنَةٍ وَهُوَ مُشْتَقٌّ مِنَ الْعَوْدِ[۲]

کہا گیا ہے کہ عید کا نام عید اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہر سال یہ لوٹ کر آتا ہے۔ عود سے مشتق ہے، اس کا معنی ہے لوٹنا۔

۳۔ وَفِي الْاَزْهَارِ كُلُّ اِجْتِمَاعٍ لِلسُّرُوْرِ فَهُوَ عِنْدَ الْعَرَبِ عِيْدًا لِعَوْدِ السُّرُوْرِ بِعَوْدِهٖ وَقِيْلَ لِاَنَّ اللّٰهَ يَعُوْدُ عَلَى الْعِبَادِ وَالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ وَلِذَا قِيْلَ

---

[۱] زرقانی، ج:۱، ص:۳۶۲، ط: دار الفکر بیروت

[۲] مرقاۃ المفاتیح، ج:۳، ص:۲۸۳

لَيْسَ الْعِيْدُ لِمَنْ لَبِسَ الْجَدِيْدَ وَإِنَّمَا الْعِيْدُ لِمَنْ اَمِنَ الْوَعِيْدَ[۱]

کتاب ازہار میں ہے کہ ہر اجتماع جو خوشی کے لئے ہو وہ عربوں کے نزدیک عید ہے، خوشی کے آنے کی وجہ سے اور اس لئے بھی عید کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مغفرت اور رحمت کے ساتھ عود فرماتے ہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ جو شخص نئے نئے لباس پہنے تو یہ عید نہیں بلکہ عید اس شخص کی ہے جو وعید سے بچ جائے۔

۴۔ علامہ محمد امین بن عمر المعروف بابن عابدینؒ (المتوفی ۱۲۵۲ھ) فرماتے ہیں:

سُمِّيَ الْعِيْدُ بِهٰذَا الْاِسْمِ لِاَنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى فِيْهِ عَوَائِدَ الْاِحْسَانِ اَیْ اَنْوَاعَ الْاِحْسَانِ الْعَائِدَةِ عَلٰى عِبَادِهٖ فِيْ كُلِّ عَامٍ مِنْهَا الْفِطْرُ بَعْدَ الْمَنْعِ عَنِ الطَّعَامِ، وَصَدَقَةُ الْفِطْرِ وَاِتْمَامُ الْحَجِّ بِطَوَافِ الزِّيَارَةِ وَلُحُوْمُ الْاَضَاحِیْ وَغَيْرُ ذَالِكَ ، وَلِاَنَّ الْعَادَةَ فِيْهِ الْفَرَحُ وَالسُّرُوْرُ وَالنَّشَاطُ وَالْحُبُوْرُ غَالِبًا بِسَبَبِ ذٰلِكَ[۲]

اس کا نام عید اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان ہوتا ہے کہ ہر سال یہ دن اس کے بندوں پر آتے ہیں، ان میں سے ایک فطر ہے کھانے سے اپنے آپ کو روکے رکھنے کے بعد (یعنی پورے مہینے کے روزے پھر عید کے دن مہمانی) اور صدقہ فطر ادا کرنا (چونکہ اس میں غریبوں کی حاجت کا پورا کرنا ہے) اور طواف زیارت کر کے حج کو مکمل کرنا اور قربانیوں کا گوشت کھانا وغیرہ، اور دوسرا اس وجہ سے کہ عموماً اس میں خوشی وسرور اور فراخی ونعمت حاصل ہوتی ہے۔

اسلام میں تہواروں کا تصور:

اسلام چونکہ ایک عالمگیر اصلاحی پیغام ہے جو تمام دنیا کے انسانوں کو ایک خدا پرستانہ تہذیب کا پیرو بنانا چاہتا ہے، اس لئے اس نے جہاں زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے خاص رنگ پر ڈھالا ہے اسی طرح تہواروں کو بھی ایک نئی شکل دی ہے جو دنیا بھر سے مختلف ہے۔ اسلام کے نزدیک انسانی پیدائش کا مقصد عبادت ہے،

---

[۱] مرقاۃ المفاتیح، ج: ۳، ص: ۲۸۴

[۲] فتاوی شامی، ج: ۳، ص: ۴۴

اسلام نے ایسا نظامِ حیات پیش کیا ہے خواہ انتہائی خوشی اور مسرت کے لمحات ہوں یا غموں کے سنگین معاملات، کسی بھی موقع پر مسلمان عبادت سے کنارہ کشی نہیں کرسکتا، اسلامی تقریبات اپنے اندر خصوصی امتیازات وخصوصیات رکھتی ہیں۔

اظہارِ عبدیت:

اسلام ہر حالت میں اپنے ماننے والوں کو مقصدِ حیات سے آگاہ کرتا ہے جو کہ مالک کے احکام کی پابندی کرنا ہے، جس کا اظہار مندرجہ ذیل عبادتوں سے ہوتا ہے:

(الف) عیدالاضحیٰ سے ایک دن قبل صاحبِ استطاعت مسلمان اسلامی عبادت کا چوتھا رُکن حج ادا کرتے ہیں۔

(ب) تمام مسلمانانِ عالم ۱۰ ذی الحجہ کو اللہ کے حضور عیدالاضحیٰ کی نماز باجماعت ادا کرتے ہیں۔

(ج) جانوروں کو ذبح کرنے سے پہلے دُعا کا مفہوم اور تکبیراتِ عید بھی اسی جذبہ اطاعت کی خوشی کا اعلان کرتی ہیں۔

ایثار وقربانی:

مسلمان تو مجسمہ ایثار ہوتا ہے، اس کا اپنا کچھ بھی نہیں ہوتا، اس کا مال واولاد اور جان اللہ کی ملک ہے اور اس کی امانت ہے، جس کو قربان کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ عیدالاضحیٰ مال ودولت کے علاوہ جانی قربانی کا عظیم مظہر ہے۔

باہمی تعاون واشتراک:

اخوت ومساوات کا عالمگیر مظاہرہ اس تہوار کی اصل روح ہے۔ اہلِ اسلام کی اجتماعی خوشی اور اظہارِ اُخوت کا دِن ہے، مسرت منانے کا اجتماعی طریقہ عیدین کی نماز باجماعت ادائیگی، حج وفطرانہ وقربانی سے عیاں ہوتا ہے۔

اظہارِ مسرت کیسے؟

تہوار منانے کے طریقے بھی مختلف قوموں کے مختلف ہیں۔ کہیں تو تہوار صرف کھیل کود، راگ رَنگ اور

لطف وتفریح تک محدود رہتا ہے، لیکن کہیں تفریحات تہذیب کی حد سے گزر کر گناہ اور ناشائستگی کی حد تک پہنچ جاتی ہیں، کہیں ان اجتماعی تقریبوں سے فائدہ اُٹھا کر لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی روح پھونکنے اور کسی بلند نصب العین کے ساتھ گرویدگی اور محبت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

غرض ایک قوم کا تہوار منانے کا طریقہ گویا ایک پیمانہ ہے، کسوٹی ہے جس سے آپ اس کے مزاج اور اس کے حوصلوں اور اُمنگوں کو اعلانیہ ناپ کر دیکھ سکتے ہیں، جتنی بلند اخلاقی کی روح کسی قوم میں ہوگی اتنے ہی اس کے تہوار مہذب اور پاکیزہ ہوں گے، کوئی قوم اخلاقی اعتبار سے جتنی پست ہوگی وہ اپنے تہواروں میں اتنے ہی مکروہ مناظر پیش کرے گی۔

اسلام نے مسلمانوں میں مردہ دلی پیدا نہیں کی بلکہ معتدل طریقہ پر اظہارِ مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔ اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو، اسی لئے عید کے دونوں مواقع پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا ہے۔ تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستے سے لوٹیں تاکہ ہر طرف اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہو۔ جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی۔ اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدہ شکر بجالانا چاہیے تاکہ غایتِ مسرت کی حالت میں دنیوی غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدہ شکر بجالاتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا بھی یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ مؤمن کی خوشی یہ ہے کہ وہ خوشی دینے والے کو اور زیادہ یاد کرے، اس کے حضور سجدہ شکر بجالائے اور اپنے عمل وگفتار سے اللہ کے فضل وکرم اور عظمت وجلال کا اور زیادہ اظہار کرے۔

سال کے ان دو اسلامی تہواروں میں خوشی اور مسرت کا پورا پورا مظاہرہ کیجئے اور مل جل کر کھلی طبیعت سے کچھ تفریحی مشاغل فطری انداز میں اختیار کیجئے۔ اسی لئے ان دونوں تہواروں میں روزہ رکھنے کی ممانعت

ہے۔فرمانِ نبوی ﷺ ہے:

یہ ایام کھانے پینے، باہم خوشی کا لطف اُٹھانے اور اللہ کو یاد کرنے کے ہیں۔

فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اضحیٰ کے دن یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو عید مناؤں، اللہ تعالیٰ نے اس دن کو اس اُمت کے لئے عید کا دِن قرار دیا ہے۔[۱]

عید کے دن صفائی ستھرائی اور نہانے دھونے کا اہتمام کیجئے، حیثیت کے مطابق اچھے سے اچھا بقدر استطاعت لباس پہنئے، خوشبو لگایئے، عمدہ کھانا کھایئے اور بچوں کو موقع دیجئے کہ وہ جائز قسم کی تفریح اور کھیلوں سے جی بہلائیں اور کھل کر خوشی منائیں۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ عید کا دِن تھا کچھ لونڈیاں بیٹھیں وہ اشعار گا رہی تھیں جو جنگ بُعاث کے متعلق انصار نے کہے تھے کہ اسی دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، بولے نبی کریم ﷺ کے گھر میں یہ گانا بجانا کیسا؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ابوبکر رہنے دو، ہر قوم کے تہوار کا ایک دِن ہوتا ہے آج ہماری عید کا دِن ہے۔

ایک بار عید کے دن کچھ لوگ فوجی کرتب دکھا رہے تھے، آپ ﷺ نے یہ کرتب خود بھی دیکھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی اپنی آڑ میں لے کر دکھائے۔ آپ ﷺ ان لوگوں کو شاباش بھی دیتے جاتے تھے۔ جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا اب جاؤ۔

خوشی منانے میں اسلامی ذوق ومزاج اور اسلامی ہدایات وآداب کا ضرور لحاظ رکھئے۔ جب آپ کو کوئی خوشی حاصل ہو تو خوشی دینے والے کا شکر ادا کیجئے، خوشی کے ہیجان میں کوئی ایسا عمل یا رویہ اختیار نہ کیجئے جو اسلامی مزاج سے میل نہ کھائے اور اسلامی آداب وہدایات کے خلاف ہو۔ مسرت کا اظہار ضرور کیجئے لیکن اعتدال کا بہر حال خیال رکھئے۔ مسرت کے اظہار میں اس قدر آگے نہ بڑھئے کہ فخر وغرور کا اظہار ہونے لگے اور نیاز مندی اور عاجزی کے جذبات مِٹنے لگیں۔ قرآن میں ہے:

---

[۱] نسائی

اوران نعمتوں کو پاکر اِترانے نہ لگو جو اللہ نے تمہیں دی ہیں۔ اللہ اِترانے والے اور بڑائی جتانے والے کو ناپسند کرتا ہے اور خوشی میں ایسے سرمست نہ ہوجایئے کہ اللہ کی یاد سے غافل ہونے لگیں۔

پس ان تہواروں کے منانے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے وہ بھی اتنا پاکیزہ ہے کہ اس سے زیادہ نفیس، مہذب اور اخلاقی فائدوں سے لبریز طریقہ تصور میں نہیں آسکتا۔ اسلام رقص وسُرور، لہوولعب اور فسق وفجور کے میلے نہیں چاہتا، وہ اپنے بنائے ہوئے معاشرے کے میلوں کی فطری مانگ ایسی عید سے پوری کرنا چاہتا ہے جو اللہ پرستی، الفت ومحبت اور ہمدردی ومساوات کی پاکیزہ روح سے لبریز ہو۔ افسوس! بعد کے مسلمانوں نے اسلامی عید کی اصلی شان کو کسی حد تک جاہلیت کے افعال سے داغدار کردیا ہے۔

عید بطور یومُ الجائزہ ویومِ محاسبہ: تصویر کا دوسرا رُخ:

عید صرف مسرت اور شادمانی کا دن ہی نہیں یوم الاحتساب ویوم محاسبہ بھی ہے۔ کیا ہم عید منانے کے اہل اور حقدار ہیں؟ ہر مسلمان کا اپنے آپ سے پوچھنے کا سوال اور پھر پوری اُمتِ مسلمہ کے لئے سوالیہ نشان؟ یہ عیدالاضحیٰ کا جشن ملا، اسی وقت عیش وسرور کا دِن تھا جب تک عزت وعظمت ہمارے ساتھ تھی اور اقبال وکامرانی ہمارے آگے دوڑتی تھی، اللہ تعالیٰ ﷻ کی نعمتوں کا سایہ ہم پر تھا، ہم نے اللہ تعالیٰ ﷻ کی دی ہوئی عزت وکامرانی کو ہوائے نفس کی بتلائی ہوئی ذلت اور رسوائی کی راہ سے بدل لیا۔

لیکن عید کے موقع پر ملک ودیں کی شان وشوکت دیکھنے کو اب آنکھیں ترستی ہیں کیونکہ ہجومِ مؤمنین ہی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے ہے اور عیدِ آزاداں کی جھلک بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ ہماری عیدوں پر شکم پرور مناظر کثرت سے دکھائی دیتے ہیں اور روح پروری کا سامان بہت کم ہوتا ہے، عید کے لئے ضروری تھا کہ بڑے بڑے اجتماع ہوتے جن میں اتحاد ویگانگت کی روح کارفرما ہوتی۔

عید کے دن یتیم بچوں کا خیال کرنا بھی سنّت ہے:

آنحضرت ﷺ عید کے دن بھی یتیم بچوں کا خاص خیال فرماتے تھے۔ عید کی نماز کے لئے تشریف لے جارہے تھے کہ ایک بچہ بڑی پریشان کن حالت میں تھا تو آنحضرت ﷺ عید کی نماز سے پہلے اس کو گھر

لائے، غسل کروایا، اچھے کپڑے پہنائے، خوشبو لگائی اور اپنے مبارک کندھوں پر اُٹھایا اور اس کو تسلی دی۔ حالانکہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما بھی کندھوں پر تھے لیکن ان کو نیچے اُتارا اور یتیم بچے کو اپنے مبارک کندھوں پر بٹھایا۔

احکام ومسائلِ عید:

بقرعید کے دن مندرجہ ذیل کام سنت اور مستحب ہیں:

۱) صبح کو بہت سویرے اُٹھنا۔

۲) شریعت کے موافق آرائش کرنا، غسل کرنا۔

۳) فاضل بال اور ناخن وغیرہ صاف کرنا سوائے اس شخص کے جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو۔

۴) مسواک کرنا۔

۵) پاک وصاف عمدہ کپڑے جو میسر ہوں پہننا (مگر تکبر اور فخر کی نیت نہ ہو اور حد سے نہ بڑھا جائے، نہ ہی اس کے لئے قرض لیا جائے بلکہ میانہ روی ہو)

۶) خوشبو لگانا۔ عید کی نماز کے لئے جلدی پہنچنا۔

۷) کوئی عذر نہ ہو تو عیدگاہ میں نماز ادا کرنا۔

۸) عید کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا اور قربانی کے گوشت سے کھانے کی ابتداء کرنا (لیکن بعض لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ عید کی رات میں روزہ ہوتا ہے اور وہ قربانی کے گوشت سے افطار کیا جاتا ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں)

۹) کوئی عذر نہ ہو تو پیدل جانا۔

۱۰) عید کی نماز کو جاتے ہوئے راستے میں تکبیر تشریق: اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ درمیانی بلند آواز سے کہنا۔

۱۱) عید کی نماز کے لئے سکون، اطمینان، وقار اور نظروں کی حفاظت کے ساتھ چلنا۔

۱۲) صدقہ کا اہتمام اور کثرت کرنا۔ اللہ کی نعمتوں کا اظہار وشکر ادا کرنا۔

۱۳) جس راستہ سے جائیں اس کے علاوہ (راستہ) سے واپس آنا۔

عیدالاضحیٰ کی نماز جلدی پڑھنا مسنون ہے:

حضرت جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ بِنَا يَوْمَ الْفِطْرِ وَالشَّمْسُ عَلٰى قِيْدِ رُمْحَيْنِ وَالْاَضْحٰى عَلٰى رُمْحٍ[۱]

نبی کریم ﷺ عید الفطر کی نماز ہمیں ایسے وقت میں پڑھاتے تھے کہ سورج دو نیزوں کی مقدار بلند ہوتا تھا اور عیدالاضحیٰ کی نماز ہمیں ایسے وقت پڑھاتے کہ سورج ایک نیزہ کی مقدار بلند ہوتا تھا۔

عید کی بدعات ومنکرات:

آج کل عیدین کے حوالے سے بہت سی بدعات، منکرات اور رسمیں بھی ایجاد ہوگئی ہیں اور آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ عیدین کے اصل احکام اور بنیادی روح مغلوب ہوتی جارہی ہے اور ثانوی درجہ اختیار کررہی ہے (جیسا کہ اسلام کے بہت سے احکام مثلاً شادی بیاہ اور فوتگی وغیرہ میں اس کی نوبت پہنچ چکی ہے) اور اس کا شدید خطرہ ہے کہ آئندہ چل کر ان خود ساختہ چیزوں کو ہی عیدین کے اصل احکام سمجھ لیا جائے جیسا کہ اسلام کے علاوہ دوسرے مذہبوں میں اس قسم کی تحریف ہوئی ہے۔

حالانکہ جس بات کو شریعت نے ناجائز کہا ہے اس کو جائز سمجھنا گناہ ہے اور جس کو جائز بتلایا ہو مگر ضروری نہ کہا ہو اس کو ضروری سمجھ کر پابندی کرنا یا نام کمانے کو (اپنی بڑائی کے لئے) کرنا یہ بھی گناہ ہے۔ اسی طرح جس کام کو شریعت نے ثواب نہیں بتلایا اس کو ثواب سمجھنا گناہ ہے اور جس کو ثواب بتلایا ہو مگر ضروری نہ کہا ہو اس کو ضروری سمجھنا گناہ ہے اور جو ضروری نہ سمجھے مگر خلقت (لوگوں) کے طعن کے خوف سے اس کے چھوڑنے کو بُرا سمجھے یہ بھی گناہ ہے۔ اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کے اصل احکام کے ساتھ ساتھ ان خرابیوں کا بھی جائزہ لیا جائے جو ان میں پیدا ہوچکی ہیں یا پیدا ہورہی ہیں۔

---

[۱] تلخیص الحبیر بحوالہ السراج الوھاج، ج:۱، ص:۲۶۸

عید کے دن مختلف گناہوں میں مبتلا ہونا:

افسوس ہے کہ اس زمانہ کے بہت سے مسلمان عید کے دن خوب گناہ کرتے ہیں اور پھر ان گناہوں کو عید کے مبارک دن سے منسوب کرتے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) عید کے دن سینما، وی سی آر اور ٹیلی ویژن وغیرہ دیکھنا تو بہت سے لوگوں نے ضروری سمجھ رکھا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ عید کے دِن موسیقی اور گانے بجانے کے پروگرام چل رہے ہوتے ہیں، گھروں میں بھی ٹی وی کے اوپر عید کے حوالے سے پیش کئے جانے والے مختلف پروگرام چل رہے ہوتے ہیں جن میں گانے بجانے اور بے حیائی کا کھلم کھلا مظاہرہ پیش کیا جاتا ہے اور لوگ ان پروگراموں کا (نعوذ باللہ تعالیٰ) عید کی خوشی کی نشریات سمجھ کر دلچسپی کے ساتھ معائنہ کرتے ہیں۔

عید کی خوشی کو سینما بینی اور ان گناہوں کے ناپاک عمل سے گندہ کر دیتے ہیں، گناہ میں خوشی نہیں ہوتی، اللہ کو ناراض کرنے والی چیز کیسے خوشی کا باعث بن سکتی ہے۔

(۲) عید کی تیاری:

ایک خرابی عید کی تیاری کا فتنہ ہے اور یہ بھی ایک مستقل رسم بن گئی ہے۔ ہر شخص دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے، عید کے دن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے بلاشبہ خوشی کا دِن بنایا ہے اور اتنی بات بھی شریعت سے ثابت ہے کہ اس روز جو بہتر سے بہتر لباس ہو وہ پہنے لیکن اس غرض کے لئے آج کل بے شمار فضول خرچیوں کو عید کا ضروری حصہ سمجھ لیا گیا ہے۔ آج کل یہ بات ضروری سمجھ لی گئی ہے کہ کسی کے پاس گنجائش ہو یا نہ ہو مگر وہ ہر حال میں کسی نہ کسی طرح گھر کے ہر فرد کیلئے نئے جوڑے کا انتظام کرے۔

جس کی وجہ سے ایک درمیانہ آمدنی والے شخص کے لئے عید کی تیاری ایک مستقل مصیبت اور مسئلہ بن چکی ہے جس کا دین وشریعت سے کوئی تعلق نہیں اور اس میں کئی گناہ والی باتیں پائی جاتی ہیں۔ شریعت نے ہر مسلمان کو ہر موقع پر میانہ روی کی تعلیم دی ہے اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی فرمایا ہے۔

(۳) قربانی تک روزہ رکھنا:

آج کل بہت سے عوام اپنی قربانی ہونے تک بھوکا پیاسا رہنے کو روزہ کا نام دیتے ہیں اور جب تک

قربانی نہ ہوجائے اس وقت تک کھانے پینے کو ناجائز سمجھتے ہیں، یہ جہالت کی بات ہے۔عید کے دن تو ویسے ہی روزہ رکھنا حرام ہے۔لہٰذا قربانی ہونے تک روزہ کا تصور غلط ہے۔البتہ اپنی قربانی سے کھانے کی ابتداء کرنا مستحب ہے مگر یہ شرعاً روزہ نہیں نہ اس میں روزہ کا ثواب ہے نہ روزہ کی نیت ہے اور نہ ہی یہ حکم فرض، واجب ہے، صرف مستحب ہے اور دسویں تاریخ کے ساتھ خاص ہے۔

(۴) عید کارڈ:

عیدین کے موقع پر ایک دوسرے کو عید کارڈ بھیجنے کا رواج بہت عام ہوگیا ہے اور بعضوں نے تو اس کو اتنا ضروری سمجھ لیا ہے کہ اگر کسی کا عید کارڈ نہ پہنچے تو اسے بہت عیب کی بات سمجھا جاتا ہے جبکہ عید کارڈ کی رسم خواہ مخواہ کی فضول خرچی ہے اور یہ عیسائیوں کے کرسمس کارڈ کی نقل بھی ہے۔ان کی مشابہت اختیار کرنا منع ہے۔نیز اس میں اور بھی بہت سی برائیاں لازم آجاتی ہیں۔مثلاً جاندار کی تصویریں جس میں نیم برہنہ عورتوں کی تصویریں بھی ہوتی ہیں۔قرآنی آیات کی بے حرمتی، فخر، ریاء، نمود ونمائش، قیمتی اوقات کا ضیاع وغیرہ۔لہٰذا مروجہ خرابیوں کے ہوتے ہوئے عید کارڈ کا بھیجنا اور بھجوانا منع ہے، ہزاروں بندگانِ خدا زکوٰۃ اور قربانی ادا نہیں کرتے، غریب نان شبینہ تک کے محتاج ہیں مگر عید کارڈ کی وباء سے اپنے آپ کو نہیں بچاتے۔

(۵) عید کی نماز کے بعد مصافحہ ومعانقہ کی شرعی حیثیت:

سب سے پہلے مصافحہ اور معانقہ سے متعلق رسول اکرم ﷺ کے ارشادات ملاحظہ ہوں۔حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اکرم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

> یقیناً جب ایک بندہ مومن دوسرے بندہ مومن سے ملاقات کرتا ہے پھر اس کو سلام کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے مصافحہ کرتا ہے تو دونوں کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت کے پتے (موسم خزاں میں) خشک ہوکر گر جاتے ہیں۔

ملاقات کے وقت محبت ومسرت اور جذبہ اکرام واحترام کے اظہار کا ایک ذریعہ سلام کے علاوہ اور اس سے بالاتر مصافحہ بھی ہے جو عموماً سلام کے ساتھ اور اس کے بعد ہوتا ہے اور اس سے سلام کے مقاصد کی گویا تکمیل ہوتی ہے، بعض احادیث میں صراحۃً یہی بات فرمائی گئی ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ

عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سلام کا تکملہ مصافحہ ہے''۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہو اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ کی حمد اور اپنے لئے مغفرت طلب کریں تو ان کی مغفرت ہو ہی جائے گی''۔

محبت وتعلق کے اظہار کا آخری اور انتہائی ذریعہ معانقہ اور تقبیل (چومنا) ہے لیکن اس کی اجازت اسی صورت میں ہے جبکہ موقع محل کے لحاظ سے کسی شرعی مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ امام شعبی تابعیؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا (جب وہ حبشہ سے واپس آئے) تو آپ ان کو لپٹ گئے (یعنی معانقہ فرمایا) اور دونوں آنکھوں کے بیچ میں (ان کی پیشانی کو) بوسہ دیا۔

پس معانقہ سفر سے آنے پر ہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رحمۃ للعالمین ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب آپس میں ملاقات کرتے تھے تو مصافحہ کرتے اور جب کسی سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کیا کرتے تھے۔

مصافحہ ومعانقہ کی ممانعت کیوں؟

میرا آپ کا اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد ایک طرف گزشتہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتیں منسوخ ہوگئیں تو دوسری طرف آئندہ قیامت تک کیلئے نبوت کا دروازہ بند ہوگیا، گویا آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد ایک آپ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہٗ کی پسند وناپسند معلوم ہوسکتی ہے، اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسند وناپسند کا جو آئین دیا اسی کا نام دین وشریعت ہے، جس کی تکمیل کا اعلان آنحضرت ﷺ کے وصال سے تین مہینے پہلے میدانِ عرفات میں کر دیا گیا۔ اب نہ اس دین میں کمی ہوسکتی ہے اور نہ کسی اضافے کی گنجائش ہے۔ سنّت، طریقہ کو کہتے ہیں پس عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات اور عادات میں آنحضرت ﷺ نے جو طریقہ اپنایا وہ سنّت ہے اور اس کے خلاف بدعت ہے۔ طریقہ نبوی ﷺ کا علم ہمیں قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ سے ہوگا۔

آنحضرت ﷺ نے اپنی سنّت کے ساتھ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی سنّت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے خلفائے راشدین کی سنّت بھی سنّت نبوی کا حکم رکھتی ہے۔ نیز آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں، ان کو دین کے معاملہ میں ثقہ اور امین فرمایا ہے، ایک حدیث میں ارشاد ہے:

''میرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عزت کرو کیونکہ وہ تم میں سب سے پسندیدہ لوگ ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے، اس کے بعد جھوٹ کا ظہور ہوگا''۔

ایک حدیث میں ہے:

''میرا جو صحابی کسی زمین میں فوت ہوگا وہ قیامت کے دن لوگوں کا قائد اور نور بن کر اُٹھے گا''۔

الغرض کسی چیز پر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تعامل اس کے سنّت ہونے کی دلیل ہے اور چونکہ آنحضرت ﷺ نے تین زمانے کے لوگوں کو خیر القرون کے لوگ فرمایا ہے یعنی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، انکے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد (ان کو تابعین اور تبع تابعین کہا جاتا ہے) اسلئے ان تین زمانوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے جس چیز پر مسلمانوں کا عملدرآمد رہا وہ سنّت کے دائرے میں آتی ہے۔

سنّت کی اس تشریح سے بدعت کی حقیقت خود بخود معلوم ہوجاتی ہے، یعنی جو چیز آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہ اللہ علیہم کے زمانے میں معمول ومروج نہ رہی ہو اسے دین کی بات سمجھ کر کرنا بدعت کہلاتا ہے۔ اس کی مزید تشریح کیلئے چند چیزوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

شرعی حدود کی پابندی ضروری ہے:

شریعت نے ایک چیز ایک موقع پر تجویز کی ہے، جب ہم محض اپنی رائے اور خواہش سے اس کو دوسرے موقع پر تجویز کریں گے تو وہ بدعت بن جائے گی۔ مثلاً درود شریف نماز کی آخری التحیات میں پڑھا جاتا ہے، اگر ہم اجتہاد لڑائیں کہ درود شریف کوئی بُری چیز تو نہیں اگر اس کو پہلی التحیات میں پڑھ لیا جائے تو کیا حرج ہے؟ تو ہمارا یہ اجتہاد غلط ہوگا اور پہلی التحیات میں درود شریف پڑھنا بدعت کہلائے گا۔ فقہاء

اُمّت نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے پہلی التحیات میں درود شریف شروع کر لے تو اگر صرف اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی تک پڑھا تھا تو سجدہ سہو واجب نہیں ہوگا، کیونکہ یہ فقرہ مکمل نہیں ہوا، لیکن اگر عَلٰی مُحَمَّدٍ تک پڑھ لیا تو سجدہ سہو واجب ہو جائے گا، اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو نماز دوبارہ لوٹانی ہوگی۔

یا مثلاً کوئی شخص یہ اجتہاد کرے کہ اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ روضہ اقدس پر پڑھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے وطن میں بیٹھا یہی پڑھتا رہے تو کیا حرج ہے؟ اس کا یہ اجتہاد بھی بدعت کہلائے گا، اس لئے کہ فقہاء اُمّت نے ان الفاظ کے ساتھ سلام بھیجنے کا ایک خاص موقع مقرر کر دیا ہے، اگر اس موقع کے علاوہ بھی یہ صحیح ہوتا تو شریعت اس کی اجازت دیتی اور سلف صالحین اس پر عمل کرتے۔

اسی کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت سالم بن عبید صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلس میں ایک صاحب کو چھینک آئی تو اس نے کہا السلام علیکم، آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تجھ پر بھی اور تیری ماں پر بھی۔ وہ صاحب اس سے ذرا بگڑے تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو وہی بات کہی ہے جو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے۔ آپ کی مجلس میں کسی کو چھینک آتی اور وہ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تجھ پر بھی اور تیری ماں پر بھی، اور پھر ارشاد فرمایا کہ جب کسی کو چھینک آئے اسے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا چاہئے، سننے والوں کو یَرْحَمُکَ اللّٰہُ کہنا چاہئے اور اسے جواب میں پھر یَغْفِرُ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ کہنا چاہئے۔

مطلب یہ کہ السلام علیکم کا جو موقع شریعت نے تجویز کیا ہے اس سے ہٹ کر دوسرے موقع پر سلام کہنا بدعت ہے۔ اس کی ایک مثال نمازوں کے بعد مصافحہ کا رواج ہے، شریعت نے باہر سے آنے والے کیلئے سلام اور مصافحہ کو مسنون ٹھہرایا ہے مگر مجلس میں بیٹھے بیٹھے لوگ اچانک ایک دوسرے سے مصافحہ و معانقہ کرنے لگیں، سلف صالحین میں اس لغو حرکت کا رواج نہیں تھا، بعد میں نہ جانے کس مصلحت کی بناء پر بعض لوگوں میں فجر، عصر، عیدین اور دوسری نمازوں کے بعد مصافحہ کا رواج چل نکلا، جس پر علمائے اہلِ سنّت کو اس کے بدعت ہونے کا فتویٰ دینا پڑا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ باب المصافحہ میں لکھتے ہیں:

آنکہ بعضے مردم مصافحہ می کنند بعد از نماز یا بعد از جمعہ چیزے نیست بدعت است از جہت تخصیص وقت" یہ جو بعض لوگ عام نمازوں کے بعد یا جمعہ کے بعد مصافحہ کرتے ہیں یہ کوئی سنّت نہیں بلکہ وقت کی تخصیص کرنے کی وجہ سے بدعت ہے۔[۱]

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ علیہ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

اسی بنا پر ہمارے بعض علماء نے صراحت کی کہ یہ مکروہ ہے اس صورت میں یہ مذموم بدعتوں میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

ہمارے بعض علماء (احناف) اور دیگر حضرات نے صراحت کی ہے کہ نمازوں کے بعد جو مصافحہ کرنے کی عادت ہوگئی ہے یہ مکروہ ہے، باوجود یہ کہ اصل مصافحہ سنّت ہے۔ اس کے مکروہ و بدعت ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس خاص موقع پر مصافحہ سلف صالحین سے منقول نہیں۔[۲]

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں:

"رحمۃ للعالمین ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپس میں ملاقات کرتے تو مصافحہ کرتے اور جب کسی سفر سے واپس لوٹتے تو معانقہ کیا کرتے تھے۔"

اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مصافحہ اور معانقہ کرنے میں حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپس میں ملاقات ہوتی تو پہلے سلام کرتے اور سلام کے بعد مصافحہ کرتے اور جب سفر سے آتے تو معانقہ کرتے۔ مصافحہ اور معانقہ کا کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہ تھا۔ بس اسی طرح بالکل اسی تفصیل سے مصافحہ اور معانقہ کرنا مسنون و مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے، اس پر عمل کرنا چاہئے اسے نہ کوئی روک سکتا ہے نہ کسی کی مجال ہے۔

رہا فرض نمازوں اور عیدین کی نماز کے بعد کا مروجہ مصافحہ اور معانقہ سو ان احادیث اور دیگر صحیح احادیث

---

[۱] اشعۃ اللمعات، ج: ۴، ص: ۲۲

[۲] اختلاف اُمت اور صراط مستقیم ۹۴

میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین فرض نمازوں اور عیدین کے روز التزاماً مصافحہ اور معانقہ کیا کرتے تھے، یہ لوگوں نے اپنی طرف سے ایجاد کرلیا ہے اور سنّت بنالیا ہے بلکہ فرض وواجب کی طرح اس کی پابندی کی جاتی ہے اور اس کو ایسا ضروری کرلیا گیا ہے کہ اس کے بغیر عید ہی نہیں ہوسکتی اور جو اس پر عمل نہ کرے اس کو طرح طرح کے طعنے دیئے جاتے ہیں، حالانکہ مصافحہ اور معانقہ نہ عید کی سنّت ہے اور نہ اس کے فرائض وواجبات میں ہے۔ تو جو چیز سنّت عیدین ہے نہ فرض وواجب ہے اس کو عید کی سنّت قرار دینا یا فرض وواجب کا درجہ دینا کیا اپنی طرف سے اضافہ کرنا نہیں؟ یقیناً اضافہ ہے اسی لئے ایسا مصافحہ ومعانقہ بدعت ہے، پھر اس مصافحہ اور معانقہ کی شکل بھی بدل گئی ہے، وہ اس طرح کہ مسنون طریقہ یہ ہے کہ مصافحہ ملاقات کے وقت کریں، یہاں یہ صورت ہے کہ عیدین کے روز گھر سے ایک ساتھ نکلے، راستہ میں ملاقات رہی، ایک ساتھ عیدگاہ گئے، ساتھ بیٹھے، ساتھ نماز پڑھی۔ جب نماز اور خطبہ سے فارغ ہوتے ہیں تو مصافحہ ومعانقہ شروع ہوجاتا ہے اور اس پر غضب یہ کہ اکثر سلام بھی نہیں کرتے، بس گلے ملے اور سلام کی جگہ عید مبارک کہہ کر فارغ ہوئے اور اسی کو کافی سمجھتے ہیں، غور کیجئے؟ کیا یہ دین کو بدلنا نہیں ہے۔

علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''یہ بڑی مکروہ بدعت ہے۔ شریعت محمدی میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اس کے کرنے والے کو پہلی دفعہ تنبیہ کی جائے، نہ مانے تو دوسری دفعہ اس کو سزا دی جائے۔''

اور ابن الحاج مالکی رحمۃ اللہ علیہ مدخل میں تحریر فرماتے ہیں:

''یہ ایک بدعت ہے، شریعت میں مصافحہ کرنے کا وقت وہ بتایا گیا ہے جب مسلمان اپنے بھائی سے ملاقات کرے نہ کہ نمازوں کے بعد، لہٰذا جہاں شریعت نے مصافحہ رکھا ہے وہیں مصافحہ کرے (اس کے علاوہ دوسرے اوقات میں مثلاً نمازوں کے بعد) مصافحہ کرنے سے منع کیا جائے اور کرنے والے کو جو سنّت کے خلاف عمل کررہا ہے سختی سے روکا جائے۔''

ابن الحاج مالکی رحمۃ اللہ علیہ مدخل میں کہتے ہیں:

امام کو چاہئے کہ لوگوں نے جو مصافحہ نمازِ فجر، نمازِ جمعہ اور نمازِ عصر کے بعد ایجاد کیا ہے بلکہ بعض تو بڑھا کر پنجگانہ نماز کے بعد بھی کرنے لگے ہیں، اس سے منع کردے، کیونکہ یہ سب بدعت ہے اور شرع میں مصافحہ کا موقع صرف مسلمان کے اپنے بھائی سے ملاقات کا وقت ہے نہ کہ نمازوں کے بعد، پس جس جگہ شرع نے مقرر کیا ہے اسی جگہ رکھنا چاہئے اور مصافحہ سے منع کرنا چاہئے اور اس کے کرنے والے کو جبکہ خلافِ سنّت کرنے لگے زجر کرنا چاہئے۔

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عیدین یا جمعہ کی تخصیص سے مصافحہ ومعانقہ کرنا کئی وجہ سے مکروہ اور بدعت ہے:

۱۔ یہ کہ بسا اوقات یہ تخصیص جہلاء کے فسادِ اعتقاد کا باعث ہوتی ہے۔

۲۔ یہ کہ طریقہ روافض کا تھا کہ بعد نماز مصافحہ کرتے تھے اور آج ہمارے زمانے میں علاوہ مشابہت بالروافض کے مشابہت بالہنود بھی ہے کہ وہ اپنی ہولی کے روز ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔

۳۔ یہ کہ مصافحہ کا مسنون وقت ملاقات ہے۔

دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے، نیز کوئی شخص سفر سے آئے تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنّت سے ثابت ہے۔ ان دونوں مواقع کے علاوہ سنّت نہیں لیکن اگر سنّت سمجھے بغیر اتفاقاً بھی کرے تو گناہ بھی نہیں اور سنّت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چونکہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقہ کو سنت سمجھا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ آنحضرت ﷺ یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے ثابت نہیں، اس لئے علماء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔

فقہاء کی تصریح سے اجماع معلوم ہوتا ہے، پس مخالفت جائز نہیں بلکہ اتباع لازم ہے اور اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

''جو کوئی ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے طریقہ کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرے گا تو ہم اس پر وہی بات ڈالیں گے جو اس نے اختیار کی ہے اور دوزخ میں ڈالیں گے اور دوزخ بہت بُری جگہ ہے۔''

اگر فقہاء اس مصافحہ کو صاف مکروہ نہ کہتے بلکہ فی نفسہ مباح ہی ہوتا، تب بھی ہم اس زمانے میں اس کے مکروہ ہونے کا حکم لگاتے، کیونکہ لوگ اس کو ہمیشہ کرتے ہیں اور ضروری سنّت جانتے ہیں کہ اس کا ترک کرنا جائز نہیں سمجھتے اور یہ یقیناً وہی فتنہ ہے جس کے بارے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا ہے:

''تمہارا کیا حال ہوگا جب تم پر ایسا فتنہ آئے گا جس میں ادھیڑ بڈھا اور صغیر جوان ہو جائے گا، لوگوں میں ایسی بدعت پھیل جائے گی کہ اس کو سنّت سمجھ لیں گے، اگر اس کو بدلو تو کہیں گے سنّت بدل ڈالی، یا کہیں گے کیا یہ بُری بات ہے؟''۔

بدعات کا وبال:

معلوم ہوا کہ احکامِ عامہ سے امور خاصہ کا اثبات ہرگز صحیح نہیں ہے تاوقتیکہ ان کی تخصیص کیلئے کوئی الگ اور مستقل خاص دلیل موجود نہ ہو، کیونکہ شریعت کی کسی عام دلیل کو اپنی مرضی سے خاص کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں، مطلق کو اس طرح مقید کر دینا اور عمومات کو اس طرح سے خصوص کے قالب میں ڈھال دینا، یہی احداث فی الدین اور منصبِ تشریع پر دست دازی ہے۔ دلائلِ شرعیہ کی موجودگی میں اپنی رائے سے قیاس کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑے مجرم ہیں خصوصاً جبکہ ان میں اجتہاد اور تفقہ کی صحیح معنوں میں اہلیت ہی موجود نہ ہو۔

اہلِ بدعت کا وطیرہ ہے کہ وہ اپنی خواہش اور عقل کو ہر مقام پر دخل دیتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا گناہ اور عیب ہے؟ اس میں کیا خرابی ہے؟ یہ بھی جائز ہے، یہ بھی مستحب ہے اور کارِ ثواب ہے وغیرہ وغیرہ، مگر اس پر انہوں نے مطلقاً غور نہ کیا کہ اگر ایک چیز مطلق جائز ہے تو قید لگانے سے شاید وہ جائز نہ ہو۔ دیکھئے قرآن کریم کا پڑھنا کارِ ثواب ہے مگر بحالتِ رکوع وسجود پڑھنا منع ہے۔[۱]

لہٰذا جس عبادت کو شریعت مطہرہ نے کسی خاص کیفیت اور مخصوص ہیئت کے ساتھ مقید نہیں کیا اور اس کیلئے کسی خاص اہتمام اور اجتماع کی ترغیب نہیں دی تو یقیناً یہ مخصوص طرز وطریقہ بدعت ہوگا۔

حضرت نافع رحمہ اللہ (المتوفی ۱۱۷ھ) روایت کرتے ہیں:

---

[۱] مسلم شریف

''حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پہلو میں ایک شخص کو چھینک آئی اور اس شخص نے خود کہا'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ''حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا اس کا تو میں بھی قائل ہوں کہ'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ''لیکن ہمیں جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعلیم نہیں دی۔ ہمیں اس موقع پر اس کی تعلیم دی ہے کہ ہم'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ ''کہا کریں۔''

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ چھینک مارنے والا'' اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ '' کہے، مگر اس موقع پر'' وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ '' کے الفاظ کی آنحضرت ﷺ نے تعلیم نہیں دی۔ پوچھئے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ آپ نے درود وسلام سے کیوں منع کیا اور'' وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ '' کے الفاظ میں کیا حرج ہے؟ کیا جناب رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجنا بھی گناہ ہے؟ بے موقع اور بے محل درود وسلام سے تو وہابی منع کیا کرتے ہیں، آپ اس زمرہ میں کیسے شامل ہو گئے؟ مگر وہ تو سراپا مطیعِ رسول ﷺ تھے اور حمد و سلام کے موقع اور محل کو بخوبی جانتے تھے، اس لئے انہوں نے اس سے منع کیا۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی غرض سے داخل ہوا، اذان ہو چکی تھی، ایک شخص نے تثویب شروع کر دی (ابن ابی شیبہ مجاہد کے طریق سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مؤذن نے اذان کے بعد الصلوٰۃ الصلوٰۃ کے الفاظ سے تثویب کی اور لوگوں کو نماز کی دعوت دی، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا تو پاگل ہے، تیری اذان میں جو دعوت تھی کیا لوگوں کو بلانے کیلئے ناکافی ہے؟) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مجاہد سے فرمایا مجھے یہاں سے لے کر چل، اس لئے کہ یہ بدعت ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسجد سے چلے گئے اور نماز تک وہاں ادا نہ کی، چنانچہ دوسری روایت میں ہے مجھے اس بدعتی کے ہاں سے لے چل اور اس مسجد میں نماز نہ پڑھی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آخری عمر میں آنکھیں جاتی رہی تھیں، اس لئے آپ نے اپنے قائد سے یہ فرمایا کہ مجھے یہاں سے لے چلو۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے بدعت اور

اہلِ بدعت سے کیسی نفرت کی کہ انہوں نے ان کی مسجد میں نماز پڑھنی بھی گوارا نہ کی۔ آج کل کا دور ہوتا تو لوگ یہ کہہ دیتے کہ اس نے کسی کو گالیاں تو نہیں دیں بلکہ وہ نماز جیسی بہترین عبادت کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور ''اَلدَّالُّ عَلَی الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ'' یہ تو اَجر کا مستحق ہے، مگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو رمز شناس رسول تھے، ان کی دور رَس نگاہیں بدعات کی ظاہری چمک میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی تھیں، وہ ہدایت کے اصل منبع اور سرچشمہ تک رسائی کر لیتی تھیں۔

امام نووی رحمہ اللہ شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

''حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک مؤذن کو عشاء کی نماز کیلئے تثویب کرتے دیکھا اور فرمایا کہ اس بدعتی کو مسجد سے نکال دو۔'' اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی ایسی ہی روایت آتی ہے۔

ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعتیں پڑھا کرتا تھا اس نے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا کہ اے ابو محمد! کیا مجھے اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے کی وجہ سے سزا دے گا؟ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ نہیں لیکن تجھے اللہ تعالیٰ سنّت کی مخالفت کی وجہ سے ضرور سزا دے گا۔

حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۵۵ھ) کو کسی ختنہ میں دعوت دی گئی تو انہوں نے جانے سے صاف انکار کر دیا، جب ان سے اس انکار کی وجہ دریافت کی گئی تو صاف الفاظ میں یہ جواب ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ زمانہ رسالت مآب ﷺ میں ختنوں میں نہیں جایا کرتے تھے اور نہ اس کیلئے ہمیں دعوت دی جاتی تھی۔

حضرت عثمان بن ابی العاص بھی اسی قاعدہ سے کام لے رہے ہیں کہ چونکہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ختنوں میں بلائے جانے کا دستور نہ تھا اور نہ لوگوں کو دعوتیں موصول ہوتی تھیں اس لئے میں بھی اس میں شریک ہونے پر آمادہ نہیں ہوں۔ یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ جناب نبی کریم ﷺ نے ختنوں میں شریک ہونے سے منع کیا ہے لہٰذا میں شریک نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک عمل وہی مقبول ہوگا جو اخلاص اور اتباعِ سنّت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو، اگرچہ وہ

مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہو اور ایسا عمل بالکل رائیگاں ہوگا جو دیکھنے میں تو پہاڑ جتنا نظر آئے لیکن اس میں اخلاص اور اتباعِ سنّت کی جان اور روح موجود نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک موقع پر کیا ہی خوب ارشاد فرمایا، ایک روایت آتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، گھر میں کسی بی بی نے کہا اگر عبدالرحمٰن کے بچہ پیدا ہوا تو ہم (عقیقہ میں) ایک اُونٹ ذبح کریں گے، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا نہیں بلکہ سنّت ہی افضل ہے، وہ یہ کہ لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے (عقیقہ میں) ایک بکری ہی کافی ہے۔

اُونٹ اور دو بکریوں کی قیمت اور گوشت کا اگر موازنہ کیا جائے تو نمایاں فرق نظر آئے گا مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بکریوں کے بجائے اُونٹ پر محض اس لئے راضی نہیں کہ ان کے نزدیک سنّت کے خلاف ہے، اس لئے اگر اس کی قیمت یا گوشت زیادہ ہے تو پھر بھی اس کی چنداں قدر نہیں ہے، سنّت ہی افضل ہے اور اس کی پابندی لازم ہے۔

عید کی مبارکباد:

عید کی مبارکباد دینا (تحریری ہو یا زبانی یا بذریعہ فون) اگر تمام خرابیوں سے خالی ہو یعنی اس کی رسماً پابندی کی جائے اور نہ اس کے ساتھ فرض، واجب یا سنّت والا معاملہ کیا جائے اور جو اس کا اہتمام نہ کرے اس کو بُرا بھلا اور معیوب نہ تو کہا جائے اور نہ ہی سمجھا جائے اور جب ملاقات ہو تو پہلے باقاعدہ مسنون سلام کیا جائے۔ اس کے بعد ''عید مبارک ہو'' یا اس جیسا کوئی لفظ کہہ دیا جائے تو جائز ہے لیکن اگر حد سے آگے بڑھا جائے مثلاً اس کی رسمی پابندی کی جائے اور اس کو ضروری سمجھا جائے اور مبارکباد نہ دینے والے کو معیوب سمجھا جائے اور اس طرح کے درجہ سے بڑھا دیا جائے تو پھر مکروہ وممنوع ہے۔

عیدی یا گوشت کا لین دین:

عید کے دن عیدی کا لین دین، عید کی سنّت یا لازم نہیں (سنّت اور لازم سمجھے بغیر اور دوسری خرابیوں سے بچ کر صرف دوسروں کو خوش کرنے اور اظہارِ محبت کے لئے اخلاص کے ساتھ جائز ہے) لیکن قرض سمجھ کر یا بڑائی ظاہر کرنے کے لئے اس کا لین دین جائز نہیں اور آج کل عام طور پر اس میں فخر ونمود اور ادلہ بدلہ کی

نیت ہوتی ہے اور اس کا لین دین ضروری سمجھا جاتا ہے یہ ناجائز ہے۔

اسی طرح کھانے یا گوشت کا لین دین ضروری سمجھنا یا اس میں ادلہ بدلہ کی نیت کرنا بھی جائز نہیں۔ جیسا کہ بعض لوگوں میں رواج ہے کہ جس جگہ سے گوشت یا اور کوئی چیز آتی ہے تو بدلے کی نیت سے وہاں بھیجنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ البتہ اخلاص کے ساتھ بغیر کسی رسم کے اور واپسی کی اُمید کے بغیر کسی کو کچھ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

عید کے دن قبرستان جانے کا اہتمام:

آج کل بہت سے لوگ عیدین کے دنوں میں قبرستان جانے کا بھی بہت زیادہ اہتمام بلکہ التزام کرنے لگے ہیں اور اگر کوئی عیدین کے دنوں میں قبرستان نہ جائے تو اسے بہت معیوب خیال کرتے ہیں حالانکہ خاص عید کے دن قبرستان جانا عید کی سنّت نہیں۔ لہٰذا اس کا اہتمام والتزام اور عید کی سنّت یا حصہ سمجھنا اور عید کی نماز کی طرح اس کا اہتمام کرنا ممنوع ہے مگر عورتوں کا تو آج کے ماحول میں عید کے دن کے علاوہ بھی قبرستان جانا جائز نہیں اور اس میں کئی خرابیاں جمع ہیں۔

وفات والے گھر جانے کی رسم:

بعض لوگ پہلی عید پر فوتگی والے گھر میں جانے کی رسم ضروری سمجھتے ہیں، جس میں وہاں جا کر تعزیت اور افسوس کا اظہار و دعا کی جاتی ہے۔ جب کہ فوتگی کا کافی عرصہ گزر چکا ہوتا ہے اور اپنے موقع پر تعزیت کی سنّت بھی ادا کی جا چکی ہوتی ہے۔ اس کا بھی شریعت میں کوئی ثبوت نہیں' تعزیت تو خود ہی ایک مرتبہ کرنا سنّت ہے اور وہ بھی تین دن کے اندر اندر سنّت ہے۔

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عید کا دن جو کہ اللہ کی جانب سے خوشی کا دن ہے اور اس دن لوگ اللہ کے مہمان ہوتے ہیں، غم دوبالا اور تازہ کر کے عید کی اس خوشی کو غمی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس عمل کو بطور رسم کے اختیار کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔

وفات والے گھر میں سوگ کا سماں:

اسی طرح جس گھر میں وفات ہو جاتی ہے تو اس کے بعد آنے والی پہلی عید کے موقع پر اس گھر کے افراد

خوشی منانا اور اچھے کپڑے وغیرہ پہننا معیوب سمجھتے ہیں، جس دن یہ لوگ اللہ کے مہمان ہوتے ہیں اور خاص اس دن میں خوشی کا اظہار اور اچھا پہننا اللہ کو پسند ہے اس دن اچھے خاصے سوگوار بن جاتے ہیں، یہ بھی عوام کی خودساختہ رسم ہے۔ لہٰذا اس سے بھی بچنا چاہئے۔

قربانی پر اعتراضات کا جائزہ

کیا قربانی پیسوں کا ضیاع ہے؟

دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جو اپنی تقریبات پر، اپنے قومی اور بین الاقوامی تہواروں پر کروڑوں روپیہ صرف نہ کرتی ہو۔ آپ یورپ اور امریکہ کے کسی مادہ پرست آدمی کو بھی اس بات کا قائل نہیں کر سکتے کہ کرسمس پر ہر سال جو بے شمار دولت ساری دنیائے عیسائیت مل کر صرف کرتی ہے یہ روپے کا ضیاع ہے، اس لئے کہ یہ چیز ان کے اندر وحدت پیدا کرنے کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ ہر ایک تقریب ایک مخصوص صورت چاہتی ہے اور اس صورت کو عمل میں لانے کے لئے بہت کچھ صرف ہوتا ہے مگر کوئی قوم بھی یہ حماقت کی بات نہیں سوچتی کہ بس ہسپتال، مدرسے اور کارخانے ہی اصل چیز ہیں اور یہ تہوار اور تقریبات سب فضول ہیں۔

اور یہ ہر سال روپیہ ضائع ہونے کا آخر کیا مطلب ہے؟ یہ کہاں ضائع ہوتا ہے؟ قربانی کے لئے جو جانور خریدے جاتے ہیں ان کی قیمت ہماری قوم کے ان لوگوں کی جیبوں میں جاتی ہے جو ان جانوروں کو پالتے ہیں اور ان کی تجارت کرتے ہیں، اس کا نام اگر ضائع ہونا ہے تو پھر اپنے ملک کے سب بازار اور دُکانیں بند کر دینی چاہئیں۔

حال ہی میں ایک آواز اُٹھی ہے کہ ملک میں جانوروں کی روز بروز قلت ہوتی جارہی ہے اور اس وجہ سے دودھ اور گھی کی فراہمی کی کمی ہوتی جارہی ہے۔ جہاں تک جانوروں کی کمی کا تعلق ہے اسے بڑھا کر قحط کی حد تک نوبت پہنچانے کا غالباً اس سے زیادہ کارگر نسخہ کوئی اور نہیں ہوسکتا کہ ان کی کھپت دن بدن کم کی جاتی رہے کیونکہ جانور پالنے والے بھی اس کے ساتھ ساتھ گلہ بانی کا پیشہ چھوڑتے جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ذہنی انحطاط اور اخلاقی تنزل کی اس سے زیادہ شرمناک اور تصویر کوئی نہیں ہو

سکتی کہ ہمارے درمیان جو شخص چاہتا ہے اُٹھ کر ہمارے دین کے بالکل ثابت شدہ، مسلّم اور متفق علیہ حقائق بلکہ اس کی بنیادوں تک کو بھی بے تکلف چیلنج کر دیتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں حالانکہ اس کے پاس اپنے دعوے کے سوا نہ کوئی دلیل ہوتی ہے نہ شہادت۔

حرفِ آخر:

اُمت اگر عروج حاصل کرے گی تو اسی دین کا دامن تھام کر اور ذلیل ہوگی اس سے منہ موڑنے پر، یہی فیصلہ نبی کریم ﷺ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ ''اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اس کتاب کے ذریعہ بہت سی قوموں کو عروج بخشا اور بہت سی قوموں کو ذلت سے دوچار کیا۔

اور ارشاد عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے:

اَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْاِسْلَامِ ''اللہ نے ہمیں اسلام سے عزت دی ہے''۔

حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اسلامی تعلیمات کو سمجھنے اور موت تک ان پر عمل پیرا رہنے والا بنائے۔ آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (سورۃ الانعام:۱۶۲)

قربانی کے فضائل ومسائل

قربانی کے فضائل ومسائل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔

اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ، وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ، فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ[1]

تمہید:

میرے محترم بھائیو، دوستو اور بزرگو! تمام ادیان ومذاہب کا چند بنیادی باتوں پر اتفاق ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنی چاہئے۔ عبادت سے مراد خاص وہ اعمال ہوتے ہیں جن کو بندہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی رضا اور رحمت کا طالب بن کر اپنی بندگی اور عاجزی ظاہر کرنے کے لئے اور اپنے عمل سے اس کی معبودیت اور عظمت وکبریائی کی شہادت ادا کرنے کے لئے کرتا ہے، جیسے اسلام میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، ذکر، تلاوت اور قربانی وغیرہ۔ یہ سارے عبادتی اعمال بندہ صرف اس لئے کرتا ہے کہ اس کا معبود اس سے راضی ہو، اس پر رحمت فرمائے اور ان کے ذریعہ اس کی روح کو پاکیزگی اور ربُّ العالمین کا تقرب حاصل ہو۔

ذوالحجہ کے مہینے کی اس سے بڑی اور کیا فضیلت ہوگی کہ دو اہم عبادتیں جو سال بھر کے دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتیں ان کو انجام دینے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کو منتخب فرمایا۔ یہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ ان اُوقات کے علاوہ دوسرے اُوقات میں اگر ان عبادتوں کو کیا جائے گا تو وہ عبادت ہی نہیں شمار

---

[1] الحج: ۳۶

ہوں گی۔ ان میں سے ایک عبادت حج ہے، یہ ایسی عبادت ہے جو ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں میں انجام نہیں دی جاسکتی۔

اس مہینے کی دوسری خاص عبادت قربانی ہے۔ قربانی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ذی الحجہ کے تین دن (یعنی دس، گیارہ اور بارہ تاریخ) مقرر فرمادیئے ہیں۔ ان دنوں کے علاوہ اگر کوئی شخص قربانی والی عبادت کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی نے قربانی کا جانور متعین کیا ہوا تھا لیکن اس کی قربانی نہیں کی اور یہ تین دن گزر گئے، تب بھی اس جانور کو ذبح کرنا جائز نہیں بلکہ اس کو زندہ صدقہ کرنا ضروری ہے۔

تاریخ قربانی، پس منظر، ابتداء:

کسی حلال جانور کو اللہ تعالیٰ جل شانہ کا تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ذبح کرنا اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے آدم علیہ السلام اس دنیا میں تشریف لائے اور دنیا آباد ہوئی۔ سب سے پہلے قربانی حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے دی ''اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا''، یعنی جب کہ دونوں نے ایک ایک قربانی پیش کی۔[1]

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اس آیت کی تفسیر میں نقل فرمایا کہ ہابیل رضی اللہ عنہ نے ایک مینڈھے کی قربانی پیش کی اور قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار سے کچھ غلہ وغیرہ صدقہ کر کے قربانی پیش کی۔ حسبِ دستور آسمان سے آگ نازل ہوئی، ہابیل رضی اللہ عنہ کے مینڈھے کو کھا لیا اور قابیل کی قربانی کو چھوڑ دیا۔ قربانی کے قبول ہونے یا نہ ہونے کی پہچان پہلے انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں یہ تھی کہ جس قربانی کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ قبول فرماتے تو ایک آگ آسمان سے آتی اور اس کو جلا دیتی تھی۔ سورہ آلِ عمران میں اس کا ذکر صراحۃً آیا ہے:

بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ''یعنی وہ قربانی جس کو آگ کھا جائے''۔

اُمتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا یہ خصوصی انعام ہوا کہ قربانی کا گوشت اور مالِ غنیمت ان کے لئے حلال کر دیئے گئے، حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خصوصی فضائل اور انعاماتِ الٰہیہ

---

[1] سورہ مائدہ پارہ:۶

کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَآئِمُ ''یعنی میرے لئے مالِ غنیمت حلال کردیا گیا''۔

اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرتا مگر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی رحمت دیکھئے ان کو یہ گوارا نہ ہوا اس لئے حکم دیا کہ تم جانور ذبح کردو، ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کردیا۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طرف سے خواب کے ذریعے بشارت دی گئی کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کریں۔

قربانی کا ظاہر و باطن:

قربانی میں ظاہر و باطن دو چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اس کا ظاہر تو یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں گائے، بکری، دُنبہ وغیرہ ذبح کرے، اس کا باطن وہ جذبہ ہے جس نے سیدنا اسماعیل علیہ السلام اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو تعمیل اِرشادِ باری تعالیٰ کے لئے آمادہ کیا۔ قربانی کا بحیثیت عبادت کے مشروع ہونا اگرچہ آدم علیہ السلام کے زمانے سے ثابت ہے لیکن اس کی ایک خاص شان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مشہور واقعہ سے شروع ہوئی اور اسی کی یادگار کی حیثیت سے شریعت محمدی ﷺ میں قربانی کو واجب کیا گیا ہے۔ جب یہ واضح ہوگیا کہ قربانی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی یادگار کی حیثیت رکھتی ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ جانور کی قیمت کا صدقہ کردینا یا دوسرے کسی نیک کام میں لگادینا اس فریضہ سے سبکدوش نہیں کرسکتا جیسے روزہ کی جگہ نماز یا نماز کے بدلے روزہ کافی نہیں۔

لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ: ضَحُّوْا فَاِنَّهَا سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ ''قربانی کیا کرو کیونکہ یہ تمہارے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت ہے''۔

قربانی کا حکم سب مسلمانوں کیلئے عام ہے، حجاج کے لئے مخصوص نہیں۔ وفات یافتہ والدین، استاد، پیر، بزرگانِ دین، صحابہ کرام، اُمہات المؤمنین اور حضور سرورِ کائنات ﷺ کی طرف سے ایصالِ ثواب کی نیت سے اگر قربانی کردی جائے تو کرنے والے کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا ان بزرگوں کو ملے گا۔ قرآنِ پاک

ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیشہ سے تمام اُمتوں کے لئے اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے قربانی کا طریقہ مقرر کیا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ [۱] ''اور ہر اُمت کے لئے ہم نے قربانی کے طریقے مقرر فرمائے ہیں تاکہ وہ ان چوپائے (جانوروں) پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں دے رکھے ہیں''۔

اسی طرح شریعتِ محمدی میں اُمّت محمدیہ کیلئے بھی مقرر کیا گیا ہے:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ [۲]

''آپ فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے''۔

سورۃ الکوثر میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ''پس اپنے ربّ کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر''۔

قربانی اور زکوٰۃ میں فرق:

زکوٰۃ بھی صاحبِ نصاب پر واجب ہوتی ہے اور قربانی بھی صاحب نصاب پر واجب ہے مگر دونوں کے درمیان دو وجہ سے فرق ہے:

ایک فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لئے شرط ہے کہ نصاب پر سال گزر گیا ہو، جب تک سال پورا نہ ہوگا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، لیکن قربانی کے واجب ہونے کے لئے سال کا گزرنا کوئی شرط نہیں بلکہ اگر کوئی شخص عین قربانی کے دن صاحبِ نصاب ہوگیا تو اس پر قربانی واجب ہے، جبکہ زکوٰۃ سال کے بعد واجب ہوگی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ نصاب نامی (بڑھنے والا) ہو، شریعت کی اصطلاح میں سونا، چاندی، نقد روپیہ، مالِ تجارت اور چرنے والے جانور ''مال نامی'' کہلاتے

---

[۱] الحج: ۳۴

[۲] انعام: ۶۲

ہیں۔اگر کسی کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نصاب کے برابر ہو اور اس پر سال بھی گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مگر قربانی کے لئے مال کا نامی ہونا بھی شرط نہیں۔مثال کے طور پر کسی کے پاس اپنی زمین کا غلّہ اس کی ضروریات سے زائد ہے اور اس کی قیمت نصاب کے برابر ہے، چونکہ یہ غلّہ مال نامی نہیں اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں، چاہے سال بھر پڑا رہے لیکن اس پر قربانی واجب ہے۔اسی طرح دوسری ضرورت سے زائد اشیاء کا بھی نصاب میں حساب لگایا جائے گا۔

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ زکوٰۃ اور قربانی کا نصاب ایک ہی ہے اور ہم پر چونکہ زکوٰۃ فرض نہیں، لہٰذا قربانی بھی واجب نہیں، حالانکہ دونوں کا نصاب الگ الگ ہے۔زکوٰۃ صرف چار قسم کی چیزوں پر فرض ہوتی ہے:

۱۔سونا ۲۔چاندی ۳۔روپیہ پیسہ ۴۔تجارت کا سامان

اور قربانی میں ان چار چیزوں کے علاوہ ضرورت سے زیادہ چیزوں کو شامل کیا جاتا ہے۔پس قربانی کے دنوں میں جس شخص کے پاس زکوٰۃ والا نصاب ہو اس پر قربانی بھی واجب ہے اور اگر کسی شخص کے پاس زکوٰۃ والا نصاب نہ ہو لیکن ضرورت سے زائد سامان ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہو تو اس پر بھی قربانی واجب ہے، اگرچہ اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

عیدِ قربان کے دن فرزندِ آدم کا سب سے اونچا عمل:

فرمایا ذی الحج کی دسویں تاریخ یعنی عیدِ قربان کے دن فرزندِ آدم کا کوئی عمل اللہ کو قربانی سے زیادہ محبوب نہیں اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ زندہ ہو کر آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی رضا اور مقبولیت کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔پس اے اللہ کے بندو! دِل کی پوری خوشی سے قربانیاں کیا کرو۔

فرمایا جس شخص نے دل کی خوشی کے ساتھ اور طلبِ ثواب کے لئے قربانی کی وہ قربانی اس کے واسطے دوزخ کی آگ سے آڑ ہوگی۔

جو شخص طاقت رکھتا ہو اور پھر قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔[۱]

فقہائے اُمّت کا اتفاق:

ایک اہم شہادت عہدِ نبوت سے قریب زمانہ کے علمائے اُمّت کی ہے جو سب اس کو مسنون ومشروع کہتے ہیں اور کسی ایک فقیہ کا قول بھی اس کے خلاف نہیں ملتا۔

ایک اہم شہادت اُمّت کے متواتر عمل کی ہے، عیدالاضحیٰ اور اس کی قربانی جس روز سے آپ ﷺ نے شروع کی اس روز سے وہ مسلمانوں میں عملاً رائج ہوگئی۔ یہ ایک ایسا متواتر عمل ہے جس کی زنجیر ہمارے عہد سے آپ ﷺ کے عہد تک اس طرح مسلسل قائم ہے کہ اس کی ایک کڑی بھی کہیں غائب نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ویسا ہی تواتر ہے جس تواتر سے ہم کو قرآن پہنچا ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت کیا:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ؟ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهٗ وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ مِلَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ[۲]

یارسول اللہ! یہ قربانی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، اور ایک روایت میں ہے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے۔

قربانی کا مفہوم:

قربانی کا مفہوم یہ ہے:

اِرَاقَةُ الدَّمِ فِيْ زَمَانٍ مَخْصُوْصٍ لِوَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى

''مخصوص زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خون بہانا''۔

یعنی مخصوص چوپائے حلال جانوروں کو بہ نیت تقرب وحصولِ ثواب ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کے دنوں میں

---

[۱] احمد، ابن ماجہ

[۲] سنن ابن ماجہ، ص:۲۲۶، کنز العمال، ج:۵، ص:۲۲۹

ذبح کرنا قربانی کہلاتا ہے، جبکہ بندے کی نیت قربتِ الٰہی ہو۔ گوشت خوری کی نیت سے اس نے ذبح نہ کیا ہو۔ لفظ قربانی عربی لغت کے اعتبار سے ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کو کسی کے قرب کا ذریعہ بنایا جائے۔ شرعی اصطلاح میں قربِ الٰہی حاصل کرنا مقصود ہے۔ قربانی شعائرِ اسلام میں عظیم شعار ہے۔

عید قربان سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس شاندار اور بے نظیر قربانی کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہے جو انہوں نے تقریباً چار ہزار سال پہلے پیش کی تھی۔ قربانی کیا ہے، اپنی محبوب چیز، محبوب ترین ہستی کی خاطر قربان کرنا اور وہ محبوب ترین ہستی ذات باری تعالیٰ ہے۔ قربانی کی انتہائی صورت یہ ہے کہ جان قربان کی جائے، اسلام کی تاریخ ایسی قربانیوں سے بھری پڑی ہے جس کی ابتداء حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ہوئی۔

قربانی کا مقصد کیا ہے:

۱۔ قربانی اصل میں ''قربان'' سے ماخوذ ہے چنانچہ صراح میں لکھا ہے کہ ''**قُرْبَانٌ بِالضَّمِّ وَهُوَ مَا يُتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى يُقَالُ قَرَّبْتُ لِلّٰهِ قُرْبَانًا**''

''یعنی قربان اس چیز کو کہتے ہیں کہ جس کے ساتھ انسان اللہ تعالیٰ کا قرب ڈھونڈتا ہے چنانچہ کہتے ہیں **قَرَّبْتُ لِلّٰهِ قُرْبَانًا** یعنی میں نے اللہ کے لئے قربانی دی۔ چونکہ انسان قربانی سے قربِ الٰہی کا طالب ہوتا ہے اس لئے اس فعل کا نام بھی قربانی ہوا۔

۲۔ قربانی دراصل تصویری زبان میں ایک تعلیم ہے جسے جاہل اور عالم سب پڑھ سکتے ہیں وہ تعلیم یہ ہے کہ اللہ کسی کے خون اور گوشت کا بھوکا نہیں اس کی شان تو یہ ہے کہ ''**هُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ**''، یعنی وہ کھلاتے ہیں کھلائے نہیں جاتے، ایسا پاک اور عظیم الشان نہ تو کھانوں کا محتاج ہے نہ گوشت کے چڑھاوے کا بلکہ وہ تمہیں سکھانا چاہتا ہے کہ تم بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں اسی طرح قربان ہو جاؤ اور یہ بھی تمہارا ہی قربان ہونا ہے کہ اپنے بدلے اپنا قیمتی جانور قربان کر دو۔

۳۔ اللہ و رسول ﷺ سے زیادہ پیاری کوئی چیز نہیں ایسے محبوب ربُّ العالمین کا حق یہ ہے کہ جو چیز سب سے زیادہ پیاری ہو اس کو اس کے سامنے بطور نذر کے پیش کیا جائے اور حق تعالیٰ کے بعد سب سے

زیادہ پیاری چیز اپنی جان ہے۔ یہ حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے جان کے عوض میں اس کا ایک بدل مقرر فرمادیا کہ اس کو پیش کردو۔

قربانی کی حکمت:

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اوّل تو سب کے ہاں بیٹا ہوتا نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے یہ تو حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو بیٹے کے ذبح کے قائم مقام کردیا۔

قربانی کے ذریعہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ [۱]

اللہ ربُّ العزت کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کے پاس تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے۔

یہاں تقویٰ سے مراد بہت ہی بڑا کامل تقویٰ ہے جس کو اس مقام سے خصوصیت ہے اور خصوصیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ تقویٰ کا عام مفہوم تو تمام اعمال میں مشترک ہے پھر یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کو دوسرے عمل سے خاص امتیاز حاصل ہے، اس کا مقتضی یہ ہے کہ ہر عمل کے ساتھ جو تقویٰ متصل ہے اس کو بھی دوسرے عمل کے تقویٰ سے امتیاز حاصل ہو۔ پس جیسے قربانی کو دوسرے اعمال سے خاص امتیاز ہے اسی طرح اس میں جو تقویٰ ہے وہ بھی خاص قسم کا تقویٰ ہونا چاہئے، اب دیکھئے کہ وہ خاص قسم کا تقویٰ کیا ہے سو دوسری آیت میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ [۲]

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ایسا ڈرا کرو جیسا ڈرنے کا حق ہے اور بجز اسلام کے کسی

---

[۱] الحج: ۳۷

[۲] آل عمران: ۱۰۲

حالت پر جان مت دینا۔

مطلب یہ ہوا کہ کامل تقوی یہ ہے کہ اسلام پر موت ہو جائے، اسلام کے معنی کیا ہیں؟ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے، یہ معنی دوسری آیت سے معلوم ہوتے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا[۱] اور اس شخص سے اچھا کس کا دین ہے جو اپنے آپ کو اخلاصِ نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کا اتباع کرے جو خالص اللہ کے ہو رہے تھے۔

جب اسلام کے معنی یہ ہیں تو تقویٰ کامل یہ ہوا کہ اپنی جان اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں جیسا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے لڑکے کو ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے اور جو شخص اپنے لڑکے کے ذبح کرنے پر آمادہ ہو جائے وہ اپنی جان دینے پر تو ضرور آمادہ ہو جائے گا کیونکہ بیٹے کا ذبح کرنا اپنے ذبح سے زیادہ سخت ہے، پس کامل تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کے واسطے جان دے دے یعنی جان کو اس کے سپرد کر دے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسا کام کرے جس میں جان خرچ ہو جائے۔

قربانی کی روح:

قربانی کی روح اپنے آپ کو فدا کرنا اور اپنی قربانی کرنا ٹھہرا جس کے متعلق دوسری جگہ ارشاد ہے۔

''وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ'' [۲] ''اگر ہم یہ فرض کر دیتے کہ خودکشی کیا کرو یا شہر بدر ہو جایا کرو تو بہت کم لوگ کرتے''

اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی ایسی چیز ہے کہ اس میں مشروعیت کی صلاحیت تھی، چنانچہ سیدنا ابراہیم علیہ

---

[۱] النساء: ۱۲۵

[۲] النساء: ۶۶

السلام کے وقت مشروع ہوئی اور انہوں نے اس کو کیا، مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ فوراً ہی ایک عنایت کا ظہور ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ''وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ'' ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا۔[۱]

حکایت:

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ ایک دیہاتی بہت غریب تھا جس پر فاقے گزر رہے تھے اس کے گاؤں میں سخت قسم کا قحط پڑا کہ کنویں اور تالاب سب خشک ہو گئے، اس کی بیوی نے ایک دن کہا بغداد کا خلیفہ سنا ہے کہ بہت کریم ہے تم اس کے پاس جاؤ شاید تمہارا فقر و فاقہ زائل ہو جائے، اس نے کہا کہ خلیفہ کے پاس جانے کے لئے کوئی ہدیہ و نذرانہ بھی تو ہونا چاہئے خالی ہاتھ کیسے جاؤں اور میرے پاس اس کے لائق ہدیہ کہاں ہے۔ بیوی نے کہا کہ ہمارے فلاں گڑھے میں جو صاف شفاف پچھ پانی جمع ہے ایسا پانی خلیفہ نے کہاں دیکھا ہوگا تم یہ پانی ایک گھڑے میں بھر کر لے جاؤ، یہ رائے مرد کے بھی سمجھ میں آ گئی، چنانچہ گھڑا بھر کر لے چلا اور عورت نے مصلیٰ بچھا کر اس کے پاس پانی کے صحیح وسالم پہنچنے کی دعا کرنی شروع کی۔ ادھر وہ تمام راستے رَبِّ سَلِّمْ رَبِّ سَلِّمْ کا ورد کرتا ہوا چلا کہ الٰہی اس گھڑے کی خیر ہو اور میرے قدموں کی بھی خیر ہو کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے، کیونکہ اس بیچارے کے پاس تو سب کچھ یہی تھا۔

اللہ اللہ کر کے سلامتی کے ساتھ وہ گھڑا بغداد پہنچا اور دربار میں اطلاع واجازت کے بعد حاضر کیا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو وہ بدوی کہتا ہے کہ هٰذَا مَاءُ الْجَنَّةِ یہ جنّت کا پانی ہے، ایسا پانی کبھی کسی نے پیا نہ ہوگا، خلیفہ نے گھڑے کو کھولنے کا حکم دیا چونکہ عرصہ سے بند کیا ہوا تھا اس لئے کھولتے ہی (اس کی بدبو سے) دربار سڑ گیا۔

مگر خلیفہ کا کرم دیکھئے کہ اس نے ذرا بھی کسی انداز سے بدوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کو اس کی بدبو سے ایذا (تکلیف) ہوئی ہے بلکہ کمال یہ کیا کہ برسرِ دربار میں اس میں سے ایک گلاس بھروا کر چکھا اور بہت تعریف کی کہ نہایت نفیس ولطیف پانی ہے اور اس کو خاص اہتمام سے فلاں جگہ رکھا جائے چنانچہ اس

---

[۱] الصّٰفّٰت: ۱۰۷

وقت تو اٹھوا کر کسی جگہ رکھ دیا گیا اور بعد میں اس کی غیر موجودگی میں گرا دیا گیا۔

یہی معاملہ بلاتشبیہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہمارے اعمال تو سڑے ہوئے ہیں مگر حق تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی قدر فرماتے ہیں، پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اس بدوی کا گھڑا سونے کی اشرفیوں سے بھر کر واپس کیا جائے اور خدام سے کہا کہ اس کو دجلہ کے راستے سے لے جانا تاکہ تکان دور ہو اور فرحت ہو، نیز اس کو اپنے ہدیہ کی حقیقت اور ہمارے کرم کی عظمت کا مشاہدہ ہو جائے، چنانچہ جب وہ دجلہ پر پہنچا اور اس کی لطافت وشیرینی کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ اللہ اللہ یہ خلیفہ کیسا کریم ہے اس کو میرے گدلے اور بدبُودار پانی کی کیا ضرورت تھی جس کے شہر میں ایسی صاف وشفاف شیریں نہر چل رہی ہو اور اب معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اس کے ہدیہ کی جو کچھ تعریف کی تھی وہ محض اس کی دلجوئی تھی۔

بھائیو! یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے کہ ہمارے حسنات (نیکیاں) حقیقت میں سیئات (برائیاں) ہیں مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ ان کو طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں اور ہم کو اطاعت کرنے والوں میں داخل کر لیتے ہیں۔ یہ ہے يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ [1] اور جیسے خلیفہ نے سڑے ہوئے پانی کے بدلہ میں سونے کی اشرفیاں دی تھیں ایسے ہی یہاں جو اپنی جان پیش کرتے ہو (یعنی جانور کی قربانی کرتے ہو) وہ سڑی ہوئی ہے کیونکہ صفات رذیلہ (بُرے اخلاق وعادات) سے متصف ہے اور حق تعالیٰ اس کے عوض تم کو ایسی جان عطا فرماتے ہیں جو لطیف اور شفیف (پاک وصاف) ہے کیونکہ وہ اب متصف بصفات اللہ ہو جاتی ہے اسی کا نام فنا وبقاء ہے۔

---

[1] الفرقان: ۷۰

فضائلِ قربانی قرآن وسنت کی روشنی میں

قربانی ایک اہم عبادت اور شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کو عبادت سمجھا جاتا تھا مگر بتوں کے نام پر قربانی کرتے تھے۔ اسی طرح آج تک دوسرے مذاہب میں قربانی مذہبی رسم کے طور پر ادا کی جاتی ہے، بتوں کے نام پر یا مسیح کے نام پر قربانی کرتے ہیں۔ پارہ عم سورۂ کوثر میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے حکم دیا کہ جس طرح نماز اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہوسکتی، قربانی بھی اسی کے نام پر ہونی چاہیے۔ دوسری ایک آیت میں اسی مفہوم کو دوسرے عنوان سے اس طرح بیان فرمایا ہے: ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''[1]۔ بے شک میری نماز، میری عبادت اور میرا جینا مرنا سب کچھ اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

قربانی کی فضیلت تو ایسی ہے کہ واجب نہ ہو تب بھی کرنا چاہئے:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قربانی کی فضیلت اور اس کا ثواب تو اتنا ہے کہ اگر کسی کے ذمہ واجب بھی نہ ہو تو بھی ثواب حاصل کرنے کے لئے قربانی کرنے سے نہ رہے، آخر دنیا کے بہت سے کام بلا ضرورت محض تفریح کے واسطے کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اگر تھوڑا سا خرچ کردو گے تو کیا حرج ہوگا اور اگر ضرورت ہی پر مدار رکھتے ہو اور یوں کہتے ہو کہ صاحب جو فرائض اور واجبات ہیں ہم تو وہی ادا کریں گے تو دنیا کے کاموں میں اس پر عمل کیوں نہیں کرتے؟ ضرورت تو اس قدر ہے کہ سد رموق (یعنی جان بچانے کے لئے) جَو کی روٹی بھی کافی ہے۔ گرمی سردی کی ہلاکت سے بچاؤ کے لئے موٹا (ٹاٹ کا) کپڑا مل جائے وہ کافی ہے۔ پھر یہ پلاؤ اور زردے اور کوفتے کیوں کھاتے ہو؟ اور ململ مخمل (اور عمدہ باریک قسم کے کپڑے) کیوں پہنتے ہو؟ اللہ اکبر! نفس کو خوش کرنے میں تو غیر ضروری کام بھی کرلیں اور دین کے کام میں یہ پوچھتے ہو کہ صاحب کیا بہت ضروری ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر اس کے چھوڑنے (یعنی قربانی نہ کرنے) میں بہت بڑا حرج ہے تب تو اس کا اہتمام کریں ورنہ چھوڑ دیں۔

اعتقاد درست رکھنے کے لئے تو بیشک ضرور پوچھو کہ قربانی (ہم پر) ضروری ہے یا نہیں کیونکہ ضروری کو

---

[1] الانعام: ۱۶۲

ضروری اور غیر ضروری کو غیر ضروری کا اعتقاد رکھنا واجب ہے لیکن عمل کرنے کے لئے تو یہ پوچھنا کافی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں؟ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوتے ہیں تو بلا تامل نہایت مستعدی اور رغبت کے ساتھ اس کو کرو، بہت سے لوگ دین کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور بدنی اعمال (نماز وغیرہ) میں بڑے چاق وچوبند ہیں لیکن روپیہ خرچ کرنے کا جہاں وقت آیا تو حیلہ حوالہ کرتے ہیں (یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے)۔[۱]

محبت کا جھوٹا دعویٰ:

ایک حکایت یاد آتی ہے کہ ایک دیہاتی شخص کو کسی نے دیکھا کہ نہایت پریشان بدحواس ہے اور رو رہا ہے اور قریب میں روٹیوں کا تھیلا بھرا رکھا ہے، کسی نے پوچھا کیوں روتے ہو؟ کہا کہ میرا کتا مرا جارہا ہے، اس شخص نے کہا کہ تھیلے میں کیا ہے؟ کہنے لگا روٹیاں ہیں، اس نے کہا کہ پھر اس کو کیوں نہیں دیتا، کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں کہ اس کو روٹی دوں، روٹی میں پیسے خرچ ہوئے ہیں صرف آنسو بہانے کی محبت ہے کہ یہ مفت کے ہیں۔

بعض لوگوں کی محبت کا دعویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں ٹکا خرچ ہو وہاں صفر ہے اور یہاں تو درحقیقت خرچ بھی نہیں ہوتا کیونکہ صدقات وخیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ کہیں جاتا نہیں ہے، جو کچھ ہے اپنے ہی لئے ہے بلکہ قربانی تو ایسی شئے ہے کہ کچھ ہاتھ سے بھی نہیں نکلتا کیونکہ ثواب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ قربانی کے اجزاء (اور گوشت) تقسیم ہی کردو بلکہ اختیار ہے خواہ تقسیم کرو یا خود نفع اُٹھاؤ، ہاں بیچنے کی اجازت نہیں ہے، غرض سب اپنے پاس رکھو تب بھی ثواب ملتا ہے۔[۲]

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا، ہر سال برابر قربانی کرتے تھے، جس سے معلوم ہوا کہ قربانی صرف مکہ معظمہ کے لئے مخصوص نہیں، ہر شخص پر ہر شہر میں شرائط پائی جانے کے بعد واجب ہے اور مسلمانوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ اسی لئے جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک قربانی واجب ہے۔ بعض لوگوں کو قربانی کے واجب ہونے میں شبہ ہوتا ہے اور وہ قربانی کو ایک سنت عمل سمجھ کر نظر

---

[۱] ترغیب الاضحیہ ص ۱۲۷

[۲] از افادات حضرت تھانویؒ

انداز کر دیتے ہیں۔

قربانی کی فضیلت اور اس کا ثواب:

عَنْ زَيْدِ بْنِ اَرْقَمَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا هٰذِهِ الْاَضَاحِيُّ؟ قَالَ سُنَّةُ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالُوْا فَمَا لَنَا فِيْهَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ حَسَنَةٌ قَالُوْا فَالصُّوْفُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مِّنَ الصُّوْفِ حَسَنَةٌ[۱]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۶۶ھ) سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا کہ یہ قربانیاں کیا ہیں؟ ان کی حقیقت اور تاریخ کیا ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (تمہارے روحانی مورث) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مبارک سنّت ہے یعنی پہلے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا حکم دیا گیا تھا اور یہ انکی سنّت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا اے اللہ کے رسول! ہمارے لئے اس میں کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت فرمایا اُون کے ریشوں کا کیا حکم ہے؟ تو فرمایا اُون کے ہر ریشے کے بدلے میں بھی ایک نیکی ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا عَمِلَ ابْنُ اٰدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ اَحَبَّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ اِهْرَاقِ الدَّمِ وَاِنَّهٗ لَيَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِقُرُوْنِهَا وَاَشْعَارِهَا وَاَظْلَافِهَا وَاِنَّ الدَّمَ لَيَقَعُ مِنَ اللّٰهِ بِمَكَانٍ قَبْلَ اَنْ يَّقَعَ بِالْاَرْضِ فَطِيْبُوْا بِهَا نَفْسًا[۲]

صدیقہ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (المتوفاۃ ۵۸ھ) فرماتی ہیں فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بنی آدم کا کوئی بھی عمل قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی سے

---

[۱] سنن ابن ماجہ، ص: ۲۲۶، کنز العمال، ج: ۵، ص: ۲۲۹، الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۱۵۴

[۲] جامع ترمذی ج: ۱، ص: ۲۷۵، سنن ابن ماجہ، ص: ۲۲۶، الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۱۵۳

زیادہ یعنی خون بہانے سے زیادہ محبوب نہیں اور قربانی والا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں اور اپنے بالوں اور اپنے کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون قبل (پہلے) اس کے کہ زمین پر گرے (یعنی ذبح کرنے کے ارادے کے وقت ہی) بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تم اس کی وجہ سے (یعنی قربانی کر کے اپنے نفس کو خوش کرو) یعنی دل کی پوری خوشی سے قربانی کیا کرو۔

مذکورہ روایت کا مفہوم:

الفقیہ النبیل حضرت علامہ علی بن سلطان محمد القاری المعروف ملا علی قاریؒ (المتوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

قَالَ زَيْنُ الْعَرَبِ يَعْنِيْ اَفْضَلُ الْعِبَادَاتِ يَوْمَ الْعِيْدِ اِرَاقَةُ دَمِ الْقُرْبَانِ وَاَنَّهٗ يَاْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَمَا كَانَ فِي الدُّنْيَا مِنْ غَيْرِ نُقْصَانِ شَيْءٍ مِّنْهُ لِيَكُوْنَ بِكُلِّ عُضْوٍ مِّنْهُ اَجْرٌ وَيَصِيْرُ مَرْكَبُهٗ عَلَى الصِّرَاطِ وَكُلُّ يَوْمٍ مُّخْتَصٌّ بِعِبَادَةٍ وَّيَوْمُ النَّحْرِ خُصَّ بِعِبَادَةٍ فَعَلَهَا اِبْرَاهِيْمُ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مِنَ التَّضْحِيَةِ وَالتَّكْبِيْرِ وَلَوْكَانَ شَيْءٌ اَفْضَلَ مِنْ ذَبْحِ الْغَنَمِ فِيْ فِدَاءِ الْاِنْسَانِ لَمَافُدِيَ اِسْمَاعِيْلُ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ بِذِبْحِ الْغَنَمِ [1]

حضرت زین العرب ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقرہ عید کے دن سب سے افضل عبادت قربانی کے جانور کا خون بہانا ہے اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اسی طرح آئے گا جس طرح کہ دنیا میں قربانی سے پہلے بغیر کسی عیب کے تھا تاکہ وہ قربانی کرنے والے کے ہر ہر عضو کا نعم البدل بن جائے اور پل صراط پر اس کی سواری ہو اور ہر دن خاص کیا گیا ہے عبادت کے ساتھ اور قربانی کا دن خاص کیا گیا ہے اسی عبادت کے ساتھ جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا، چاہے وہ قربانی ہو یا تکبیروں کا عمل ہو اور اگر انسان کے فدیہ میں کوئی چیز بکری ذبح کرنے سے افضل ہوتی تو حضرت اسماعیل

[1] مرقاۃ المفاتیح، ج: ۳، ص: ۳۱۲، ط: امدادیہ، ملتان

علیہ السلام کا فدیہ بکری ذبح کرنے کو نہ بنایا جاتا۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَافَاطِمَۃُ قُوْمِیْ اِلٰی اُضْحِیَتِکِ فَاشْھَدِیْھَا فَاِنَّ لَکِ بِاَوَّلِ قَطْرَۃٍ تَقْطُرُ مِنْ دَمِھَا اَنْ یُّغْفَرَلَکِ مَا سَلَفَ مِنْ ذُنُوْبِکِ قَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! اَلَنَا خَاصَّۃً اَھْلَ الْبَیْتِ اَوْلَنَا وَلِلْمُسْلِمِیْنَ قَالَ بَلْ لَّنَا وَلِلْمُسْلِمِیْنَ[۱]

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؓ اُٹھ کر اپنی قربانی کے پاس جائیں اور وہاں حاضر رہیں اس لئے کہ اس جانور سے خون کے بہنے والے ہر قطرہ کے بدلہ میں آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گزشتہ سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا یہ (فضیلت) ہمارے اہل بیت کے لئے خاص ہے؟ یا یہ اور مسلمانوں کے لئے بھی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں، آپ ہی کے لئے نہیں بلکہ سب مسلمانوں کے لئے ہے۔

رَوَاہُ اَبُو الْقَاسِمِ الْاَصْبَھَانِیُّ عَنْ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ وَلَفْظُہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ قَالَ یَافَاطِمَۃُ قُوْمِیْ فَاشْھَدِیْ اُضْحِیَتَکِ فَاِنَّ لَکِ بِاَوَّلِ قَطْرَۃٍ تَقْطُرُ مِنْ دَمِھَا مَغْفِرَۃً لِّکُلِّ ذَنْبٍ اَمَا اِنَّہٗ یُجَاءُ بِلَحْمِھَا وَدَمِھَا تُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِکِ سَبْعِیْنَ ضِعْفًا قَالَ اَبُوْسَعِیْدٍ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! ھٰذَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ خَاصَّۃً فَاِنَّھُمْ اَھْلٌ لِّمَا خُصُّوْا بِہٖ مِنَ الْخَیْرِ وَلِلْمُسْلِمِیْنَ عَامَّۃً؟ قَالَ لِاٰلِ مُحَمَّدٍ خَاصَّۃً وَلِلْمُسْلِمِیْنَ عَامَّۃً. قَالَ الْمُنْذِرِیُّ وَقَدْ حَسَّنَ بَعْضُ مَشَایِخِنَا حَدِیْثَ عَلِیٍّ ھٰذَا وَاللّٰہُ اَعْلَمُ۔[۲]

حضرت ابوالقاسم اصبہانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ذکر کی

---

[۱] مجمع الزوائد، ج: ۴، ص: ۱۷، الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۱۵۴

[۲] الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۱۰۰، ط: بیروت

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اے فاطمہ! (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کھڑی ہو اور اپنی قربانی کے پاس رہو۔ اس لئے کہ آپؓ کے لئے اس جانور کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی ہر گناہ سے بخشش کا سبب ہو جائے گا۔ سُن لیں اس کا گوشت اور اس کا خون (بروزِ قیامت) لایا جائے گا۔ آپ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کے نامہ اعمال میں ستر گنا بڑھا کر تولا جائے گا۔ حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا یہ (فضیلت) آلِ محمد ﷺ کے لئے ہی ہے، اس لئے کہ وہی اس کے اہل ہیں کہ ان کو بھلائی کے لئے خاص کیا جائے یا دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی ہے؟ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: آلِ محمد (ﷺ) کے لئے خاص ہے اور دوسرے مسلمانوں کے لئے عام ہے۔

علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کو ہمارے بعض مشائخ نے حسن قرار دیا ہے۔

نوٹ:

کنز العمال کی روایت کے الفاظ میں کچھ فرق ہے لیکن روایت کا مفہوم یہی ہے۔

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا فَاطِمَةُ قُوْمِيْ فَاشْهَدِيْ اُضْحِيَتَكِ فَاِنَّهٗ يُغْفَرُلَكِ بِاَوَّلِ قَطْرَةٍ تَقْطُرُ مِنْ دَمِهَا كُلُّ ذَنْبٍ عَمِلْتِهٖ وَقُوْلِيْ (اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذَالِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ) قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هٰذَا لَكَ وَلِاَهْلِ بَيْتِكَ خَاصَّةً فَاَهْلُ ذٰلِكَ اَنْتُمْ اَمْ لِلْمُسْلِمِيْنَ عَامَّةً قَالَ بَلْ لِلْمُسْلِمِيْنَ. قَالَ الْحَاكِمُ صَحِيْحُ الْاِسْنَادِ[1]

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا اے فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھڑی ہوں اپنی قربانی کے پاس

[1] مستدرک حاکم، ج: ۴، ص: ۲۲۲۔ سنن الکبریٰ بیہقی، ج: ۹، ص: ۲۸۳

رہیں اس لئے کہ آپ کے جانور کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی ہر گناہ معاف کر دیا جائے گا جو آپ نے کیا ہو اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہیں ''اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذَالِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ'' بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اس کا کوئی بھی شریک نہیں اور اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمانوں میں سے ہوں۔ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! یہ آپ ﷺ کے لئے اور آپ ﷺ کے گھر کے لوگوں کے لئے خاص ہے۔ یعنی آپ ہی اس کے اہل ہو یا عام مسلمانوں کے لئے ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا سب مسلمانوں کیلئے۔ امام حاکم فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ یَوْمِ اَضْحٰی مَا عَمِلَ اٰدَمِیٌّ فِیْ ھٰذَا الْیَوْمِ اَفْضَلَ مِنْ دَمٍ یُھْرَاقُ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ رَحِمًا تُوْصَلُ[۱]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا عید الاضحیٰ کے دن آدمی کا کوئی عمل بھی زیادہ افضل نہیں قربانی کا خون بہانے سے، مگر یہ کہ صلہ رحمی کی جائے۔

ان روایات سے دو اہم فضیلتیں معلوم ہوئیں:

۱۔ قربانی کے جانور کا پہلا قطرہ گرتے ہی قربانی کرنے والے کی مغفرت ہو جاتی ہے۔

۲۔ قیامت کے دِن قربانی کا جانور خون اور گوشت کے ساتھ لایا جائے گا اور پھر اس کو ستر گنا وزنی کر کے میزان میں رکھا جائے گا۔ اس لئے نہایت خوش دلی اور فراخ دلی سے قربانی کرنی چاہیے۔ واجب نہ ہو تو بھی ان فضیلتوں کے حاصل کرنے کیلئے قربانی کر ہی لینی چاہیے۔

غور کیجئے! اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا کہ ایک قربانی کرنے سے ہزاروں لاکھوں نیکیاں مل

---

[۱] الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۹۹، ط: بیروت

جائیں۔ دُنبے اور بھیڑ کے بدن پر کتنے لاتعداد بال ہوتے ہیں اگر کوئی صبح سے شام تک گننا چاہے تو بھی نہ گن سکے تو سوچئے! ہمارے ہزار دو ہزار کے مقابلے میں کتنی بے حساب نیکیاں ہوئیں۔ اس قدر اجر وثواب کو دیکھ کر خوب بڑھ چڑھ کر قربانی کرنی چاہیے۔ واجب تو واجب ہے ہی اگر وسعت ہو تو نفلی قربانی بھی کرنی چاہیے۔ ان مبارک دنوں کے چلے جانے کے بعد پھر یہ دولت کہاں نصیب ہوگی اور اس آسانی سے یہ بے شمار نیکیاں کہاں میسر ہوں گی۔ پھر اگر اللہ جل شانہ نے مالی فراخی عطا فرمائی تو جہاں اپنی طرف سے قربانی کرتے ہیں وہاں اپنے مرحوم عزیزوں کی طرف سے بھی کر دیں، مثلاً ماں، باپ، بہن، بھائی وغیرہ ان کی طرف سے قربانی کرنے سے ان کی روح کو اتنا عظیم الشان ثواب پہنچ جائے گا اور کیا ہی اچھا ہو کہ محسنِ اعظم رحمت عالم ﷺ کی جانب سے اور آپ ﷺ کے اہلِ بیت کی طرف سے بھی قربانی کی جائے، ورنہ کم از کم اپنی واجب قربانی تو ضرور ہی کر دے۔ جس شخص نے قربانی واجب ہوتے ہوئے نہ کی تو اس سے بڑھ کر بدنصیب اور محروم کون ہوگا؟ اس کے متعلق وعید آگے آرہی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''عید کے دن قربانی کا جانور (خریدنے) کیلئے پیسے خرچ کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں اور چیزوں میں خرچ کرنے سے زیادہ افضل ہے۔''[۱]

رُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: یَآاَیُّھَا النَّاسُ ضَحُّوْا وَاحْتَسِبُوْا بِدِمَآئِھَا فَاِنَّ الدَّمَ وَاِنْ وَقَعَ فِی الْاَرْضِ فَاِنَّہٗ یَقَعُ فِیْ حِرْزِ اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ[۲]

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۴۰ھ) سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے لوگو! تم قربانی کرو اور اس کا خون گرتے ہی ثواب کی اُمید رکھا کرو۔ اس لئے کہ اس کا خون اگرچہ زمین پر گرتا ہے لیکن درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور نگہبانی میں داخل ہو جاتا ہے۔

---

[۱] طبرانی

[۲] الترغیب والترہیب، ج:۲، ص:۱۵۵

رُوِیَ عَنِ حُسَیْنِ بْنِ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ ضَحّٰی طِیْبَۃَ نَفْسِہٖ مُحْتَسِبًا لِاُضْحِیَتِہٖ کَانَتْ لَہٗ حِجَابًا مِّنَ النَّارِ[۱]

حضرت حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے نفس کی خوشی سے ثواب کی نیت سے قربانی کرتا ہے تو یہ قربانی اس کے لئے جہنم سے پردہ کا سبب ہوجاتی ہے۔ یعنی جہنم سے بچاؤ کا سبب بن جاتی ہے۔

آنحضرت ﷺ خود بھی ہمیشہ قربانی کیا کرتے تھے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ اَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْمَدِیْنَۃِ عَشْرَ سِنِیْنَ یُضَحِّیْ[۲]

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (المتوفی ۷۲ھ) فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے (ہجرت کے بعد) مدینہ طیبہ میں دس سال قیام فرمایا اور آپ ﷺ ہمیشہ ہر سال قربانی کرتے تھے۔

عَنْ اَنَسِ ابْنِ مَالِکٍ رضی اللہ عنہ قَالَ کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُضَحِّیْ بِکَبْشَیْنِ وَاَنَا اُضَحِّیْ بِکَبْشَیْنِ[۳]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۹۳ھ) فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ دو مینڈھوں کی قربانی کرتے اور میں بھی دو مینڈھوں کی قربانی کرتا ہوں۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ ضَحّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِکَبْشٍ اَقْرَنَ فَحِیْلٌ یَاْکُلُ فِیْ سَوَادٍ وَیَمْشِیْ فِیْ سَوَادٍ وَیَنْظُرُ فِیْ سَوَادٍ[۴]

---

[۱] الترغیب والترہیب، ج: ۲، ص: ۱۵۵

[۲] جامع ترمذی، ج: ۱، ص: ۲۷۷، مشکوٰۃ المصابیح، ص: ۱۲۹

[۳] صحیح بخاری، ج: ۲، ص: ۸۳۳

[۴] جامع ترمذی، ج: ۱، ص: ۲۷۵، سنن نسائی، ج: ۲، ص: ۲۰۴

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ ایسا مینڈھا ذبح کرتے جس کے سینگھ بھی ہوتے اور وہ کھاتا بھی سیاہی میں اور چلتا بھی سیاہی میں، اور دیکھتا بھی سیاہی میں (یعنی اس کا منہ، پاؤں اور آنکھیں سیاہ ہوتی تھیں)۔

عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ نَحَرَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ سَبْعَۃَ بُدَنٍ قِیَامًا وَضَحّٰی بِالْمَدِیْنَۃِ کَبْشَیْنِ اَمْلَحَیْنِ اَقْرَنَیْنِ[۱]

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے سات اُونٹ کھڑے ہوکر ذبح کئے اور مدینہ میں دو مینڈھے سفید اور سیاہ سینگ والے ذبح کئے۔

رَوَی الْبَزَّارُ مِنْ حَدِیْثِ رَافِعٍ مَوْلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا ضَحّٰی اشْتَرٰی کَبْشَیْنِ سَمِیْنَیْنِ اَقْرَنَیْنِ اَمْلَحَیْنِ[۲]

بزار کی روایت میں حضرت ابورافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ ﷺ کے غلام ہیں، ان سے مروی ہے کہ آپ ﷺ جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو دو موٹے تازے مینڈھے سینگوں والے سفید وسیاہ خریدتے۔

قربانی نہ کرنے والے کیلئے سخت وعید:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص قربانی کی گنجائش رکھے (یعنی صاحبِ نصاب ہو) اور پھر قربانی نہ کرے سو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔[۳]

فائدہ:

(رسول اللہ ﷺ کے ارشاد میں غور فرمایئے) حضور ﷺ کا حکم ہے کہ جس نے باوجود وسعت کے قربانی

---

[۱] صحیح بخاری، ج:۱، ص:۲۳۱

[۲] عمدۃ القاری، ج:۲۱، ص:۲۲۳

[۳] حاکم، ترغیب

نہ کی ہو وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آئے۔ یوں نہیں فرمایا کہ عیدگاہ میں نہ آئے بلکہ یوں فرمایا کہ اس کے قریب بھی نہ آئے، قربانی نہ کرنے والے سے کس قدر نفرت معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو حکم دیا کہ مسلمانوں کی عیدگاہ کے پاس بھی نہ بھٹکے۔

قربانی صرف تین دن ہے:

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ قربانی تین دن ہے اور یہی امام ابوحنیفہ، احمد و مالک رحمہم اللہ نے فرمایا۔ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں اس کی سند صحیح ہے۔ صاحب معرفۃ السنن بھی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہی نقل کرتے ہیں (لہٰذا تین دن قربانی ثابت ہوئی یعنی ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ ذوالحجہ)

اَخْرَجَهُ الطَّحَاوِيُّ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اَلْاَضْحٰى يَوْمَانِ بَعْدَ يَوْمِ النَّحْرِ. قَالَ الْمَارِدِيْنِيُّ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ[۱]

حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے مضبوط سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ذکر کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں قربانی دو دن ہے عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کے پہلے دن کے بعد۔ امام ماردینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس کی سند جید ہے۔

اسی طرح علامہ ابن جزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ اَلنَّحْرُ ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ[۲]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں قربانی تین دن ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

اَلنَّحْرُ ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ[۳] ''قربانی کے تین دن ہیں''۔

ایک اور سند کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

اَيَّامِ مَعْدُوْدَاتٍ، قَالَ: ثَلَاثَةُ اَيَّامٍ: يَوْمُ الْاَضْحٰى، وَيَوْمَانِ بَعْدَهٗ،

---

[۱] عمدۃ القاری، ج:۲۱، ص:۲۲۰

[۲] عمدۃ القاری، ج:۲۱، ص:۲۲۰

[۳] احکام القرآن للطحاوی، کتاب الحج والمناسک، رقم الحدیث:۱۵۶۹

اِذْبَحْ فِیْ اَیِّهِنَّ شِئْتَ [۱]

چند گنتی کے دِن ہیں، ایک تو عید الاضحیٰ کا دن اور دو دن اس کے بعد، ان میں سے آپ جس میں چاہیں (قربانی کا جانور) ذبح کریں۔

اس سے معلوم ہوا کہ خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک بھی قربانی کے تین دِن ہیں۔

حضرت ہشام دستوائی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

اَلذَّبْحُ بَعْدَ الْعِیْدِ یَوْمَانِ [۲] ذبح (یعنی قربانی) کے، عید الاضحیٰ کے بعد دو دن ہیں۔

عَنْ مَاعِزِ بْنِ مَالِكٍ اَوْ مَاعِزِ بْنِ مَالِكِ الثَّقَفِیِّ اَنَّ اَبَاهُ سَمِعَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ یَقُوْلُ اِنَّمَا النَّحْرُ فِیْ هٰذِهِ الثَّلَاثَةِ اَیَّامٍ [۳]

حضرت ماعز بن مالک یا حضرت ماعز بن مالک ثقفی فرماتے ہیں کہ ان کے والد (محترم) نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا آپ (تاکیدی کلمہ کے ساتھ) فرما رہے تھے کہ قربانی ان تین دنوں میں ہی ہوسکتی ہے۔

اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ اَلْاَضْحٰی یَوْمَانِ بَعْدَ یَوْمِ الْاَضْحٰی [۴]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ قربانی یوم النحر کے بعد دو دن ہے۔

قربانی واجب ہونے کے دلائل:

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کی نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے"۔[۵]

---

[۱] تفسیر ابن ابی حاتم، ج: ۲، ص: ۳۶۰، تحت سورۃ البقرہ، رقم الحدیث: ۱۸۹۴

[۲] احکام القرآن للطحاوی، کتاب الحج والمناسک

[۳] محلی، ج: ۷، ص: ۴۴۳

[۴] مؤطا امام مالک، ص: ۴۹۷، ط: قدیمی، کراچی

[۵] سورۃ الکوثر

اس آیت مبارکہ میں وَانْحَرْ کے معنی قربانی کرنے کے ہیں۔ جمہور مفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت عطا، حضرت مجاہد، حضرت قتادہ، حضرت عکرمہ اور حضرت حسن بصری رحمہم اللہ علیہم سے مستند روایات میں یہی ثابت ہے اور اس آیت میں امر (حکم) کا صیغہ لاکر قربانی کا حکم دیا گیا ہے جس سے قربانی کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے قربانی واجب ہوتے ہوئے قربانی نہ کرنے والے کو بڑی سخت وعید بیان فرمائی ہے اور ایسی سخت وعید کسی واجب کے چھوڑنے پر ہی ہوسکتی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جو شخص قربانی کی وسعت رکھتا ہو اور اس کے باوجود وہ قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

عیدگاہ میں حاضری سے کسی بدنصیب سے بدنصیب ہی کو روکا جاسکتا ہے، جو شخص قربانی کی وسعت رکھتا ہو پھر بھی وہ قربانی نہ کرے اس کے بارے میں کس قدر ناراضگی ٹپکتی ہے، کیا کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کی ناراضگی سہہ سکتا ہے؟

(۲) رسول اللہ ﷺ دس سال مدینہ میں رہے۔ ان دس سالوں میں قربانی کرتے رہے۔ حضور اقدس ﷺ کا باوجود مالی غربت کے ہمیشہ قربانی کرتے رہنا اور کبھی بھی اس کو نہ چھوڑنا یہ قربانی کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔

(۳) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ایک شخص نے قربانی کے متعلق سوال کیا کہ کیا قربانی واجب ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی فرمائی اور تمام مسلمانوں نے قربانی کی۔ پھر اس شخص نے دوبارہ یہی سوال کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ آپ عقل رکھتے ہیں؟

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قربانی کا واجب ہونا مراد لیا ہے اس لئے کہ سائل نے قربانی کے واجب ہونے ہی کے بارے میں سوال کیا تھا، اگر قربانی واجب نہ ہوتی تو آپ واضح طور پر قربانی کے واجب ہونے کی نفی فرمادیتے۔

(۴) حضرت مخنف ابن سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ عرفات کے میدان میں وقوف کررہے تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! ہر (صاحب استطاعت) گھر والے پر ہر سال قربانی واجب ہے۔

بہت سی احادیث میں عید کی نماز سے پہلے قربانی کر لینے کی صورت میں قربانی کو لوٹانے کا حکم آیا ہے۔ اس صورت میں قربانی کو لوٹانے کا حکم بھی قربانی کے واجب ہونے کی علامت ہے کیونکہ اگر قربانی واجب نہیں تھی تو دوبارہ قربانی لوٹانے کا حکم کیوں دیا جاتا؟

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ قربانی کا حکم حرم، منیٰ یا حاجی کے ساتھ خاص ہے اور اسکے علاوہ کسی دوسری جگہ یا دوسرے شخص پر قربانی لازم نہیں، یہ سراسر جہالت ہے کیونکہ قرآن وحدیث کے بے شمار دلائل اس پر موجود ہیں کہ قربانی کا حکم حاجیوں یا حرم ومنیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ جیسا کہ گزشتہ دلائل سے بھی واضح ہو چکا کہ ان سب میں حاجی یا حرم ومنیٰ کے ساتھ قربانی کو خاص نہیں کیا گیا اور خود حضور اکرم ﷺ نے مدنی زندگی میں ہمیشہ جو قربانی فرمائی وہ بھی حرم اور منیٰ میں یا حج کے دوران نہیں تھی بلکہ مدینہ منورہ میں تھی۔ البتہ حاجی جو منیٰ میں قربانی کرتے ہیں وہ قربانی عیدالاضحیٰ کی قربانی سے الگ ہے جو حج کے شکرانے میں کی جاتی ہے۔

کئی احادیث میں قربانی کے فضائل آئے ہیں جیسا کہ فضائل قربانی کی بحث میں گزرا، ان میں بھی کوئی تخصیص مذکور نہیں بلکہ وہ فضائل عام ہیں۔

قربانی کس پر واجب ہے؟

جس شخص کی ملکیت میں ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے بقدر نقدی یا تجارت کا سامان یا ضرورت سے زیادہ سامان یا ان پانچوں یا ان میں سے بعض چیزوں کا مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر ہو تو قربانی واجب ہے اور ایسے شخص کے لئے زکوٰۃ یا کوئی واجب صدقہ لینا بھی جائز نہیں۔

ٹی وی، وی سی آر، ڈش، ناجائز مضامین کی آڈیو کیسٹیں جیسی چیزیں ضروریات میں داخل نہیں بلکہ لغویات ہیں اور وہ تمام چیزیں جو گھروں میں رکھی رہتی ہیں اور سال بھر میں ایک مرتبہ بھی استعمال نہیں ہوتیں، ضرورت سے زیادہ ہیں اس لئے ان سب کی قیمت بھی حساب میں لگائی جائے گی۔

جس طرح مردوں پر قربانی واجب ہے اسی طرح صاحبِ نصاب عورتوں کے ذمہ بھی قربانی واجب ہے۔قربانی صرف اپنی طرف سے واجب ہے اولاد کی طرف سے واجب نہیں (کسی اور عزیز واقارب کی طرف سے بھی واجب نہیں) مثلاً کسی کی دس اولاد ہیں اور سب ایک ساتھ رہتے ہیں، باپ کی زندگی میں صرف باپ پر قربانی واجب ہوگی یعنی اپنے نام سے وہ قربانی کرے اور اگر بیوی صاحبِ حیثیت (صاحبِ نصاب) ہے تو اس کو بھی اپنی طرف سے قربانی خود ہی کرنا واجب ہے، شوہر کی قربانی بیوی کی طرف سے یا بیوی کی قربانی شوہر کی طرف سے کافی نہیں ہوگی، ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ قربانی کرنا ضروری ہے۔

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی سال اپنے نام سے قربانی کر لیتے ہیں اور کسی سال اپنی بیوی کی طرف سے یعنی ہر سال نام بدلتے رہتے ہیں، یہ جائز نہیں۔اگر صاحبِ نصاب ہو تو اس کو اپنی طرف سے قربانی کرنا ضروری ہے، اگر اپنے نام سے نہیں کی کسی دوسرے کے نام سے کر لی تو اس کے ذمہ وجوب باقی رہ جائے گا، دوسروں کے نام سے کرنے میں خود اس کا واجب ادا نہ ہوگا، بلکہ جتنے افراد مالک نصاب ہوں ان سب پر قربانی واجب ہوگی۔

قربانی کا وقت:

بقرعید کی دسویں تاریخ سے لے کر بارہویں تاریخ کی شام تک قربانی کرنے کا وقت ہے، چاہے جس دِن قربانی کرے لیکن قربانی کا سب سے افضل دِن بقرعید کا دِن ہے۔پھر گیارہویں تاریخ اور پھر بارہویں تاریخ۔بقرعید کی نماز ہونے سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں۔جب نمازِ عید پڑھ چکیں تب قربانی کریں، البتہ اگر کوئی دیہات میں یا گاؤں میں رہتا ہو، جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی، وہاں صبح صادق کے بعد قربانی کر دینا درست ہے۔

قربانی کا جانور بے عیب ہو:

قربانی کا جانور عمدہ اور بے عیب ہو، اس لئے کہ ایک روایت میں ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُصْفَرَّةِ وَالْمُسْتَأْصَلَةِ وَالْبَخْقَاءِ وَالْمُشَيَّعَةِ وَكُسْرَاءَ. وَالْمُصْفَرَّةُ: الَّتِيْ تُسْتَأْصَلُ اُذُنُهَا حَتّٰى يَبْدُوَ سِمَاخُهَا. ''وَالْمُسْتَأْصَلَةُ: الَّتِيْ اسْتُؤْصِلَ قَرْنُهَا مِنْ اَصْلِهٖ،

وَالْبَخْقَاءُ: الَّتِيْ تُبْخَقُ عَيْنُهَا، وَالْمُشَيَّعَةُ: الَّتِيْ لَا تَتْبَعُ الْغَنَمَ عَجَفًا وَضَعْفًا، وَالْكَسْرَاءُ: الْكَسِيْرَةُ[۱]

رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا مصفرہ سے، مستأصلہ سے، بخقاء سے، مشیعہ سے اور کسراء سے۔ مصفرہ وہ ہے کہ جس کے کان کاٹ دیئے گئے ہوں، یہاں تک کہ اُن کا (اندورنی) سوراخ نظر آنے لگے، مستأصلہ وہ ہے کہ جس کے سینگ جڑ سے نکل گئے ہوں، بخقاء وہ ہے کہ جس کی آنکھ پھوڑ دی گئی ہو (یا اُس کی آنکھ میں بینائی نہ ہو)، مشیعہ وہ ہے کہ جو ریوڑ کے پیچھے کمزوری اور ضعف کی وجہ سے نہ چل سکے اور کسراء وہ ہے جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَرْبَعٌ لَا يُضَحّٰى بِهِنَّ: اَلْعَوْرَاءُ الْبَيِّنُ عَوَرُهَا، وَالْمَرِيْضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا، وَالْعَرْجَاءُ الْبَيِّنُ ظَلَعُهَا، وَالْعَجْفَاءُ الَّتِيْ لَا تُنْقِيْ، فَقَالُوْا لِلْبَرَاءِ: فَإِنَّمَا نَكْرَهُ النَّقْصَ فِي السِّنِّ وَالْأُذُنِ وَالذَّنَبِ، قَالَ: فَاكْرَهُوْا مَا شِئْتُمْ، وَلَا تُحَرِّمُوْا عَلَى النَّاسِ[۲]

چار قسم کے جانوروں کی قربانی جائز نہیں، ایک ایسا کانا جانور جس کا کانا پن واضح وظاہر ہو اور دوسرا ایسا بیمار جس کی بیماری واضح وظاہر ہو اور تیسرا ایسا لنگڑا جانور جس کا لنگڑا پن واضح و ظاہر ہو اور چوتھا ایسا دبلا اور کمزور جانور کہ جس کی ہڈیوں میں گودا نہ ہو (کیونکہ یہ بھی بیماری ظاہر ہونے کی علامت ہے)

اس پر لوگوں نے حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ ہم تو دانت، کان اور دُم میں نقص ہونے کو مکروہ سمجھتے ہیں تو حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم جسے چاہو مکروہ سمجھو، لیکن لوگوں پر حرام قرار نہ دو۔

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الضحایا، باب ما یکرہ من الضحایا، رقم الحدیث: ۲۸۰۳

[۲] صحیح ابن حبان، کتاب الاضحیہ، رقم الحدیث: ۵۹۱۹

قربانی کے جانوروں میں سے کون سا افضل ہے:

اُمت میں سے اکثر اکابرؒ فرماتے ہیں کہ قربانی میں اُونٹ سب سے افضل ہے کیونکہ اگر ایک ہی شخص نے اُونٹ قربان کیا تو اس کی قیمت بھی بڑھ گئی اور اس سے نفع بھی زیادہ ہوسکتا ہے، لیکن اگر اُونٹ کا ایک حصہ ہو اور اس کے مقابلہ میں بھیڑ بکری ہو تو یہ بھیڑ بکری زیادہ افضل شمار ہوگی کیونکہ اس کی قیمت زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے اور اُونٹ کے ایک حصہ کی قیمت ایک بکری سے بہت کم ہے۔ چنانچہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَقَالَ الْمُوَفِّقُ اَفْضَلُ الْاَضَاحِيِّ اَلْبَدَنَةُ ثُمَّ الْبَقَرَةُ ثُمَّ الشَّاةُ ثُمَّ بَقَرَةٌ شُرِكَ فِيْهَا وَبِهٰذَا قَالَ اَبُوْ حَنِيْفَةَ وَالشَّافِعِيُّ، لِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْجُمُعَةِ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا اَقْرَنَ وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً وَمَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً[1]

امام موفق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ قربانی کے جانوروں میں سب سے افضل اُونٹ ہے۔ پھر گائے، پھر بکری اور پھر وہ گائے جس میں لوگوں نے شرکت کی ہو، اس کے حصے ہوں۔ یہی امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کی فضیلت کے بارے میں فرمایا جو سب سے پہلے جمعہ کے لئے آئے۔ گویا اس نے اُونٹ کی قربانی کی اور جو دوسرے نمبر پر آئے اس نے گائے قربان کی اور اس کے بعد آنے والے نے گویا مینڈھا قربان کیا۔ اس کے بعد آنے والے نے مرغی قربان کی اس کے بعد آنے والے نے انڈہ قربان کیا۔

وَلِاَنَّهٗ يَتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَكَانَتِ الْبَدَنَةُ فِيْهِ اَفْضَلُ كَالْهَدْيِ

[1] صحیح البخاری، ج:۱، ص:۱۲۱

وَلِاَنَّهَا اَكْثَرُ ثَمَنًا وَلَحْمًا وَاَنْفَعُ[۱]

اور اس لئے بھی اُونٹ افضل ہے کہ بندہ اس کے ذریعہ قرب الٰہی حاصل کرتا ہے جیسے ہدی میں اونٹ لے جانا افضل ہے، اور اس لئے بھی کہ اس کی قیمت زیادہ دینی پڑے گی اور گوشت بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس سے فوائد بھی زیادہ حاصل ہوتے ہیں۔

جمہور علمائے کرام کا مذہب یہی مذہب ہے لیکن حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بکری زیادہ افضل ہے اس لئے کہ اس کا گوشت بڑا عمدہ ہوتا ہے۔

امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَاخْتَلَفَ الْمَشَائِخُ اَنَّ الْبَدَنَةَ اَفْضَلُ اَوِ الشَّاةَ الْوَاحِدَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِذَا كَانَتْ قِيْمَةُ الشَّاةِ اَكْثَرَ مِنْ قِيْمَةِ الْبَدَنَةِ فَالشَّاةُ اَفْضَلُ لِاَنَّ الشَّاةَ كُلَّهَا تَكُوْنُ فَرْضًا وَالْبَدَنَةَ سُبُعُهَا يَكُوْنُ فَرْضًا وَالْبَاقِيْ يَكُوْنُ نَفْلًا وَمَا كَانَ كُلُّهَا فَرْضًا كَانَ اَفْضَلَ۔[۲]

مشائخ حضرات کا اس میں اختلاف ہے کہ اُونٹ کی قربانی افضل ہے یا اکیلی بکری کی تو ان میں سے بعض حضرات نے فرمایا کہ جب بکری کی قیمت اُونٹ کی قیمت سے زیادہ ہو تو تب بکری افضل شمار ہوگی اس لئے کہ بکری ایک ہی کی ساری کی ساری فرض قربانی ہوگی اور اُونٹ کے سات حصے ہوں گے لیکن عام طور پر کسی ایک کی طرف سے ایک ہی فرض حصہ ہوتا ہے اور باقی بطور نفلی ہو سکتے ہیں لیکن اگر سارے کا سارا فرض ہو تو پھر اُونٹ افضل ہوگا

امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ گائے کو شامل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَقَالَ الشَّيْخُ الْاِمَامُ اَبُوْ حَفْصٍ الْكَبِيْرُ اِذَا كَانَتْ قِيْمَةُ الشَّاةِ وَالْبَدَنَةِ سَوَاءً كَانَتِ الشَّاةُ اَفْضَلَ لِاَنَّ لَحْمَهَا اَطْيَبُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَلْبَقَرَةُ لِاَنَّهَا اَكْثَرُ لَحْمًا وَالشَّاةُ اَفْضَلُ مِنْ سُبُعِ الْبَقَرِ اِذَا اسْتَوَيَا فِيْ

---

[۱] اوجز المسالک، ج:۹، ص:۲۳۷

[۲] فتاویٰ قاضی خاں، ج:۳، ص:۳۳۱

الْقِيْمَةِ وَاللَّحْمِ لِاَنَّ لَحْمَ الشَّاةِ اَفْضَلُ فَاِنْ كَانَ سُبُعُ الْبَقَرِ اَكْثَرَ لَحْمًا فَسُبُعُ الْبَقَرَةِ اَفْضَلُ[۱]

اور امام ابوحفص کبیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب بکری اور اُونٹ کی قیمت برابر ہو تو اس وقت بکری افضل ہے۔ کیونکہ اس کا گوشت زیادہ عمدہ ہوتا ہے اور بعض فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ گائے افضل ہے کیونکہ اس کا گوشت زیادہ ہوگا اور لیکن گائے کے حصوں سے بکری افضل ہے جب دونوں کی قیمت بھی اور گوشت بھی برابر ہو کیونکہ بکری کا گوشت افضل ہے اور اگر گائے کے حصّے گوشت کے اعتبار سے بکری سے زیادہ ہوں تو گائے کے حصّے افضل ہیں۔

خلاصہ کے طور پر فرماتے ہیں:

فَالْحَاصِلُ اَنَّهُمَا اِذَا اسْتَوَيَا فِي الْقِيْمَةِ وَاللَّحْمِ فَاَطْيَبُهَا لَحْمًا اَفْضَلُ

خلاصہ یہ ہے کہ دونوں بکری اور اُونٹ یا بکری اور گائے اگر قیمت اور گوشت میں برابر ہوں تو جس کا گوشت زیادہ عمدہ ہوگا اس کی قربانی افضل ہوگی۔[۲]

بعض روایات میں بھیڑ، دُنبہ اور بکرے وغیرہ کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ نَزَلَ جِبْرِيْلُ (عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ) اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَاجِبْرِيْلُ كَيْفَ رَاَيْتَ عِيْدَنَا فَقَالَ لَقَدْ تَبَاهٰى بِهٖ اَهْلُ السَّمَآءِ اِعْلَمْ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ الْجَذَعَ مِنَ الضَّاْنِ خَيْرٌ مِّنَ السَّيِّدِ مِنَ الْمَعْزِ وَاِنَّ الْجَذَعَ مِنَ الضَّاْنِ خَيْرٌ مِّنَ السَّيِّدِ مِنَ الْبَقَرِ وَاِنَّ الْجَذَعَ مِنَ الضَّاْنِ خَيْرٌ مِّنَ الْاِبِلِ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ ذَبْحًا خَيْرًا مِّنْهُ فَدٰى بِهٖ

---

[۱] فتاویٰ قاضی خاں، ج: ۴، ص: ۳۳۱

[۲] فتاویٰ قاضی خاں، ج: ۴، ص: ۳۳۱

اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں (کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے) آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا اے جبرائیل (علیہ السلام) آپ نے ہماری عید کو کیسا پایا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا (اس عید کے موقع پر) آسمان والے آپس میں فخر کر رہے ہیں اور آپ ﷺ جان لیجئے کہ بے شک بھیڑ کا دُنبہ بکری سے زیادہ بہتر ہے (قربانی میں) اور بھیڑ کا دُنبہ گائے سے بھی زیادہ بہتر ہے اور یہی بھیڑ کا دنبہ اُونٹ سے بھی زیادہ بہتر ہے اگر اللہ کے نزدیک اس سے کوئی اور جانور بہتر ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس (ان کے بیٹے کے فدیہ میں) اس کو بھیج دیتے۔

اس روایت کے بارے میں امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحُ الْاِسْنَادِ اس روایت کی سند صحیح ہے۔ اور علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں صَحِيْحٌ یہ روایت صحیح ہے۔

تنبیہ: بعض لوگ نفسِ ذبح ہی پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ بے رحمی ہے۔ جانور کو تکلیف دینا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ذبح میں ایسی تکلیف نہیں ہوتی۔ موت طبعی میں زیادہ ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہو تو جو محبوبِ حقیقی کے حکم سے ہو وہ سب محبوب ہے تو جانور کے ذبح کو بے رحمی بتلانا سخت غلطی ہے۔

کیسے جانور کی قربانی کی جائے؟

افضل ہے کہ قربانی کا جانور، خوب صحت مند، خوبصورت اور بڑی جسامت کا ہو، چھوٹے جانوروں میں سب سے بہتر سینگوں والا چتکبرہ (جس میں سفید و سیاہ دونوں قسم کے بال ہوں) اور خصی دُنبہ مستحب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ قربانی سے چند دِن پہلے جانور کو گھر باندھ کر خوب کھلائے پلائے اور خاطر مدارت کرے لیکن اس کے گلے اور پیروں وغیرہ میں گھنٹیاں، گھنگھروں نہ پہنائے کیونکہ اس کی حدیث میں ممانعت ہے۔ اسی طرح فضول نمود و نمائش پر پیسہ خرچ نہ کرے۔

[1] مستدرک حاکم، ج: ۴، ص: ۲۲۲

مسئلہ:

اگر ایک جانور میں کئی شریک ہوں تو سب شریکوں کا ثواب کی نیت سے قربانی کرنا ضروری ہے۔ اگر شریکوں میں سے کسی ایک شریک کی نیت ثواب وقربانی کی نہ ہو بلکہ صرف گوشت کھانے یا تجارت کی نیت ہو تو کسی شریک کی قربانی بھی درست نہیں ہوگی۔

قربانی کے جانور کی عمر:

بکرا بکری کا ایک سال کا ہونا ضروری ہے۔ اگر اس کی عمر میں کچھ بھی کمی ہو تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، لہٰذا بکرا اگر سال پورا ہونے میں ایک آدھ روز بھی کم ہو تو اس کی قربانی نہ ہوگی۔ لیکن اگر بھیڑ اور دُنبہ چھ مہینے سے زیادہ اور ایک سال سے کم ہو مگر اتنا موٹا، تازہ، فربہ ہو کہ سال بھر کا معلوم ہوتا ہو اور سال بھر والے بھیڑ، دُنبوں میں اگر چھوڑ دیا جائے تو سال بھر سے کم نہ معلوم ہوتا ہو تو اس کی قربانی بھی جائز ہے اور اگر چھ مہینے سے بھی کم کا ہو تو اس کی قربانی قطعاً جائز نہیں خواہ وہ کتنا ہی موٹا تازہ ہو اور یہ حکم ایک سال سے کم عمر کا صرف بھیڑ اور دُنبہ کے بارے میں ہے۔

چنانچہ قطب الاقطاب مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۲۳ھ) فرماتے ہیں:

بکری سال سے کم کی درست نہیں مگر بھیڑ، دُنبہ، چھ ماہ کا اگر خوب موٹا ہو تو درست ہے۔[۱]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يُّعْسَرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذَعَةً مِّنَ الضَّأْنِ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم قربانی میں مسنہ ذبح کرلو، لیکن اگر مسنہ نہ پاؤ تو پھر (جذعہ) دُنبہ بھیڑ کا ذبح کرلو۔[۲]

چنانچہ علامہ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ صاحب (المتوفی ۹۷۱۲ھ) فرماتے ہیں مسنہ یا جذعہ کسی خاص جانور کا نام نہیں بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے جو قربانی کے جانور کی عمر میں استعمال ہوتی ہے۔ چنانچہ حنفی مسلک کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے کہ اُونٹوں میں وہ اُونٹ مسنہ کہلاتا ہے جو پورے پانچ سال کی عمر کا ہو اور

---

[۱] فتاوی رشیدیہ کامل، ص: ۵۵۱

[۲] صحیح لمسلم، ج: ۲، ص: ۱۵۵، سنن ابوداؤد، ص: ۳۸۲

چھٹے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ گائے بھینس اور بیل میں مسنہ اسے کہتے ہیں جو پورے دو سال کی عمر کا ہو اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو، اور بھیڑ اور دُنبہ میں مسنہ وہ ہے جو اپنی عمر کا پورا ایک سال گزار کر دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔ لہٰذا ان جانوروں میں قربانی کے لئے جانور کا مسنہ ہونا ضروری ہے۔ ہاں دُنبہ اور بھیڑ کا اگر جذعہ بھی ہو تو اس کی قربانی جائز ہے۔ جذعہ بھیڑ یا دُنبہ کا وہ بچہ کہلاتا ہے جس کی عمر ایک سال سے کم ہو مگر چھ ماہ سے زیادہ ہو۔

امام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَالثَّنِيُّ مِنَ الْبَقَرِ مَا اَتٰى عَلَيْهِ سَنَتَانِ وَطَعَنَ فِي الثَّالِثَةِ وَالثَّنِيُّ مِنَ الْغَنَمِ وَالْمَعْزِ مَا تَمَّتْ لَهٗ سَنَةٌ وَطَعَنَ فِي الثَّانِيَةِ وَيَجُوْزُ مِنَ الْاِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْمَعْزِ الثَّنِيَّانِ وَلَا يَجُوْزُ الْجَذَعَانِ اِلَّا الْجَذَعُ الْعَظِيْمُ مِنَ الضَّانِ وَهُوَ عِنْدَ الْفُقَهَآءِ الَّذِيْ اَتٰى عَلَيْهِ اَكْثَرُ السَّنَةِ اَيْ سِتَّةُ اَشْهُرٍ وَّشَيْءٌ مِّنَ الشَّهْرِ السَّابِعَةِ فَيَجُوْزُ اِذَا كَانَ عَظِيْمًا سَمِيْنًا بِحَيْثُ لَوْ رَاٰهُ اِنْسَانٌ يَحْسَبُهٗ ثَنِيًّا[1]

اور گائے میں سے ثنی وہ ہے جس کے دو سال گزر چکے ہوں اور تیسرے سال میں داخل ہو چکا ہو اور بکرا بکری کی عمر کا ایک سال مکمل ہو چکا ہو اور دوسرے میں لگ چکے ہوں اور قربانی اُونٹ، گائے اور بکری وغیرہ کی جائز ہے۔ بھیڑ اور دُنبہ کی قربانی اس شرط پر جائز ہے کہ خوب موٹا تازہ ہو اور فقہائے کرام فرماتے ہیں جس پر سال کا اکثر حصہ گزر چکا ہو، یعنی چھ مہینوں سے بڑھ کر ساتویں میں پہنچ چکا ہو تو اس کی قربانی جائز ہے جبکہ خوب موٹا لگے یہاں تک کہ اگر کوئی دور سے اس کو دیکھے تو سال بھر کا معلوم ہو۔

قربانی کے جانور کی عمر کا اعتبار ہوگا نہ کہ دانتوں کا:

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے کہ:

شرط یہ ہے کہ گائے، بھینس دو سال سے کم عمر کی نہ ہو اور اونٹ پانچ سال سے کم نہ ہو، اور بھیڑ بکری ایک سال سے کم عمر کی نہ ہو، اور چھ ماہ کا دُنبہ جس کا ساتواں مہینہ شروع ہوا ہو،

---

[1] فتاویٰ قاضی خاں، ج: ۴، ص: ۳۳۱

وہ جائز ہے۔ حدیث شریف میں لفظ ''مسنۃ اور ثنیہ'' آیا ہے جس کے معنی دو ہیں: سن رسیدہ جانور، دانت والا جانور۔

فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے عمر کا اعتبار کیا اور دانت کو اس کی علامت قرار دیا ہے، قربانی کا جانور ''مسنۃ'' ہو، یعنی سن رسیدہ، تو اس کی قربانی درست ہے، دانت کی علامت ہو تو بہتر ہے، دانت کی علامت پر مدار نہیں، دانت سن رسیدگی کی علامت ہے۔

یعنی ان دانتوں سے جانوروں کی عمروں کو پہچانا جاتا ہے، چنانچہ بکری اور بکرے کے ایک سال مکمل ہونے پر اور گائے، بھینس کے دو سال مکمل ہونے پر، اور اونٹ اور اونٹنی کے پانچ سال مکمل ہونے پر عام حالات میں سامنے کے پختہ دو دانت نکل آتے ہیں۔

کونسی قربانی افضل ہے؟

ایسے جانور کی قربانی کرنا افضل ہے جو فربہ اور موٹا تازہ ہو۔ چنانچہ ایک فربہ بکرے کی قربانی دو کمزور دُبلے بکروں کی قربانی سے افضل ہے، ایسے ہی زیادہ گوشت والی بکری کی قربانی کم گوشت والی بکری کی قربانی سے افضل ہے۔ بشرطیکہ گوشت خراب نہ ہو، یعنی زیادہ گوشت والی بکری کا گوشت خراب ہو تو پھر اس کی قربانی افضل نہیں ہے۔[1]

بھیڑ سے بکری افضل ہے، بکریوں اور اونٹوں میں مادہ کی قربانی نر سے بہتر و افضل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، بیل سے گائے بہتر ہے۔

جس قربانی کی قیمت زیادہ ہو وہ بہتر ہے اور اگر دو جانوروں کی قیمت برابر ہو لیکن ایک کا گوشت زیادہ ہے تو وہی بہتر و افضل ہے۔ نیز اگر دو لاغر (کمزور) بکریاں بھی اتنی ہی قیمت میں آتی ہیں اور ایک موٹی تازی بھی تو ایک فربہ خریدنا افضل و بہتر ہے۔

خصی جانور جبکہ گوشت کے لحاظ سے بہتر ہو تو وہ افضل ہے، بعض کا کہنا ہے کہ اگر فقراء اور نادار (ضرورت مند گوشت کے) زیادہ ہوں تو زیادہ گوشت والا جانور افضل ہے اور اگر حاجت مند کم ہوں تو پھر جس جانور کی قیمت زیادہ اور گوشت عمدہ ہو وہ افضل ہے۔

---

[1] مسائلِ عیدین وقربانی: ص ۱۲۷

بھینس کی قربانی کرنا شرعاً کیسا ہے؟

بھینس گائے کے حکم میں ہے، اس پر اُمّت کا اتفاق ہے۔ چنانچہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اِنَّمَا هِيَ بَقَرٌ كُلُّهَا یہ بھینس گائے ہی ہے یعنی اس کے حکم میں ہے۔[۱]

مزید فرماتے ہیں:

وَكَذَلِكَ الْبَقَرُ وَالْجَوَامِيْسُ اسی طرح گائے اور بھینس۔[۲]

حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تُحْسَبُ الْجَوَامِيْسُ مَعَ الْبَقَرِ بھینسوں کو گائے کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔[۳]

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اَلْجَامُوْسُ بِمَنْزِلَةِ الْبَقَرِ بھینس گائے کی طرح ہے (حکم کے اعتبار سے)۔[۴]

علامہ ابن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

وَاَجْمَعُوْا اَنَّ حُكْمَ الْجَوَامِيْسِ حُكْمُ الْبَقَرِ کہ اُمّت مسلمہ کا اتفاق ہے اس بات پر کہ بھینس کا حکم گائے کے حکم کی طرح ہے۔

چنانچہ علامہ ابوبکر بن علی بن محمد رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۸۰۰ھ) فرماتے ہیں:

يَدْخُلُ فِي الْبَقَرِ وَالْجَوَامِيْسِ لِاَنَّهَا مِنْ جِنْسِهَا یہ حکم گائے اور بھینس دونوں کے لئے ہے کیونکہ بھینس گائے کی جنس ہی سے ہے۔[۵]

---

[۱] موطا امام مالک، ج:۱، ص:۲۹۴

[۲] موطا امام مالک، ج:۱، ص:۲۹۴

[۳] موطا امام مالک، ج:۱، ص:۲۹۴

[۴] مصنف ابن ابی شیبہ، ج:۷، ص:۶۵

[۵] الجوہرۃ النیرہ، ج:۲، ص:۲۸۵

جانور کیسے ذبح کیا جائے؟

جانور کے ذبح کرنے میں چار رَگیں کاٹی جاتی ہیں۔ ایک حلقوم یعنی سانس کی نالی جسے نرخرہ بھی کہتے ہیں۔ دوسری مری یعنی کھانے پینے کی نالی، تیسری و چوتھی ودجین یعنی شہ رَگ جو حلقوم اور مری کے دائیں بائیں ہوتی ہے۔ اگر ذبح کرتے ہوئے یہ ساری رَگیں نہ کٹ سکیں بلکہ اکثر یعنی تین رگیں کٹ جائیں تو ذبح کے حلال ہونے کے لئے تین کا کٹ جانا بھی کافی ہے، اس سے کم کافی نہیں۔

جانور کو قبلہ رولٹا کر اور خود بھی قبلہ رُخ ہو کر بسم اللہ اللہ اکبر کہتے ہوئے گلے پر تیز چھری چلائے، یہاں تک کہ گلے کی مذکورہ چاروں یا کم از کم تین رگیں کٹ جائیں۔

قربانی کا جانور خود ذبح کرنا مستحب ہے:

فِيْهِ اِسْتِحْبَابُ اَنْ يَّذْبَحَ الْاُضْحِيَةَ بِنَفْسِهٖ اِنْ قَدَرَ عَلَيْهِ ''مستحب یہی ہے کہ انسان خود اپنے جانور کو قربان کرے، اگر ذبح پر قادر ہو۔''[۱]

صاحب درّ مختار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مستحب یہی ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے قربانی کرے، ورنہ کسی کو حکم دے۔[۲]

ذبح کے وقت کئی چیزوں کی رعایت ضروری ہے:

۱۔ جانور کو ذبح کرنے سے پہلے چارہ کھلائے، پانی پلائے، بھوکا پیاسا رکھنا مکروہ ہے۔

۲۔ مذبح (ذبح کرنے کی جگہ) میں لے جاتے وقت گھسیٹ کر لے جانا مکروہ ہے۔

۳۔ آسانی سے جانور کو گرائے بے جا سختی کرنا مکروہ ہے۔

۴۔ قبلہ رُخ بائیں کروٹ لٹائے (کہ جان آسانی سے نکلے) اس کے خلاف کرنا مکروہ ہے۔

۵۔ چار پیروں میں سے تین باندھے۔

۶۔ چھری تیز رکھے کند چھری سے ذبح کرنا مکروہ ہے۔

۷۔ چھری تیز کرنی ہو تو جانور سے چھپا کر تیز کرے۔ جانور کے سامنے تیز کرنا مکروہ ہے۔

---

[۱] شرح السنہ، ج: ۴، ص: ۳۳۵، مرقاۃ المفاتیح، ج: ۳، ص: ۳۰۸

[۲] درمختار، ج: ۹، ص: ۴۷۴

۸۔ جانور کو لٹانے سے پہلے چھری تیز کرے بعد میں تیز کرنا مکروہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جانور کو بچھاڑ کر چھری تیز کرنے لگا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو ایک سے زائد موت دینا چاہتے ہو۔

۹۔ ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا مکروہ ہے۔

۱۰۔ لٹانے کے بعد فوراً ذبح کرے۔ بے فائدہ تاخیر کرنا مکروہ ہے۔

۱۱۔ سختی سے ذبح نہ کرے کہ سر یا حرام مغز الگ ہو جائے۔

۱۲۔ ذبح کے بعد جانور سرد (ٹھنڈا) ہونے سے پہلے گردن علیحدہ نہ کرے اور نہ چمڑا اُتارے کہ یہ مکروہ ہے۔

یہ تمام احکام صرف قربانی کے ساتھ خاص ہی نہیں بلکہ ہر ذبح کے لئے ہیں۔[۱]

ذبح میں آنحضرت ﷺ کا مبارک عمل:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتٰی بِکَبْشَیْنِ اَمْلَحَیْنِ اَقْرَنَیْنِ عَظِیْمَیْنِ مَوْجُوْئَیْنِ فَاَضْجَعَ اَحَدَھُمَا فَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ ھٰذَا عَنْ مُحَمَّدٍ ثُمَّ اَضْجَعَ الْاٰخَرَ فَقَالَ بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰھُمَّ ھٰذَا عَنْ مُحَمَّدٍ وَاُمَّتِہٖ فَمَنْ شَھِدَ بِالتَّوْحِیْدِ وَشَھِدَ بِالْبَلَاغِ فَذَبَحَہٗ[۲]

آپ ﷺ چتکبرے سینگوں والے بڑے موٹے تازے خصی دو مینڈھے لائے۔ ان میں سے ایک کو لٹا کر بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ پڑھا اور فرمایا اے اللہ! یہ آپ کے محبوب ﷺ کی طرف سے ہے۔ پھر دوسرے مینڈھے کو لٹایا اور بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا، ساتھ یہ کلمات کہے کہ اے اللہ! یہ آپ کے محبوب ﷺ اور ان کی اُمت کی طرف سے جس نے آپ کی توحید اور

---

[۱] فتاویٰ رحیمیہ، ج:۱۰، ص:۶۸

[۲] سنن الکبریٰ بیہقی، ج:۹، ص:۲۶۸

میری رسالت کی گواہی دی۔ چنانچہ پھر آپ ﷺ نے اس کو ذبح کر دیا۔

بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

ذَبَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ مَوْجُوْئَيْنِ فَلَمَّا وَجَّهَهُمَا قَالَ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضَ عَلٰى مِلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَلَكَ عَنْ مُحَمَّدٍ وَّاُمَّتِهٖ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ثُمَّ ذَبَحَ[۱]

آنحضرت ﷺ عید الاضحیٰ کے دن سینگوں والے چتکبرے خصی دو مینڈھے ذبح فرماتے جب ان کا رُخ قبلہ کی طرف کرتے تو فرماتے میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف کر دیا جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا۔ میں ملتِ ابراہیمی پر عمل پیرا ہوں، یکتا ہو کر اسکی عبادت کرنے والا ہوں اور مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ بے شک میری نماز اور میری قربانی میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا اس اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے اسکا کوئی بھی شریک نہیں ہے اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں میں سے ہوں، اے اللہ! آپ سے اور آپ ہی کے لئے ہے آپ کے محبوب ﷺ اور اُن کی اُمّت کی جانب سے پس آپ کے نام سے شروع کرتا ہوں اور آپ کی ذات سب سے بڑی ہے۔

گوشت کی تقسیم کے متعلق مسائل:

مسئلہ: اگر بڑے جانور میں کئی شریک ہیں اور آپس میں گوشت تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ پوری احتیاط سے وزن کر کے تقسیم کریں۔ اندازہ سے تقسیم کر لینا جائز نہیں۔ اگرچہ باہم کمی وبیشی معاف کر دیں، یہ شریعت کا حق ہے جو کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتا، وزن نہ کرنے میں کمی وبیشی لازمی بات ہے جس میں سود کا گناہ ہوگا۔

---

[۱] سنن ابوداؤد، ص: ۳۸۶، مشکوۃ المصابیح، ص: ۱۲۸

مسئلہ: اگر وزن کی مشکل سے بچنا چاہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سری پائے یا کلیجی کے ٹکڑے کر کے ہر حصہ میں ایک ایک ٹکڑا رکھ دیا جائے، پھر اندازہ سے تقسیم کرنا بھی جائز ہو جائے گا، اور اگر شرکاء ایک ہی گھر کے افراد ہیں، جن کا کھانا وغیرہ اکٹھا ہوتا ہے تو تقسیم ضروری نہیں۔

دوسرے کی طرف سے قربانی کے مسائل:

واجب قربانی میں چونکہ دوسرے کے ذمہ ادائے واجب کا قصد ہوتا ہے وہ تو بغیر اس کی اجازت کے جائز نہیں البتہ اپنے متعلقین کی طرف سے بغیر ان کی اجازت کے بھی درست ہے۔ جب کہ ان کی طرف سے قربانی کرنے کی عادت ہو اور اگر قربانی کرنے کی عادت نہ ہو تو ان کی طرف سے ان کی اجازت کے بغیر قربانی درست نہ ہوگی بلکہ وہ ذبح کرنے والے کی طرف سے ہو جائے گی۔

اگر کسی جگہ یہ رواج ہو کہ شوہر اپنی بیوی یا باپ اپنی بالغ اولاد کی طرف سے قربانی کر دیا کرتا ہے اور بیوی اور اولاد کو بھی یہ بات معلوم ہو تو اس عرف اور رواج کی وجہ سے ان کی طرف سے قربانی درست ہو جائے گی۔ صریح اجازت لینا ضروری نہیں بلکہ رواج عرفی کافی ہوگا۔

غائب کی طرف سے قربانی کے مسائل:

کوئی شخص یہاں موجود نہیں ہے اور دوسرے شخص نے اس کی طرف سے بغیر اس کے کہنے کے قربانی کر دی تو یہ قربانی صحیح نہیں ہوئی اور اگر کسی جانور میں کسی غائب کا حصہ بدون اس کے اَمر کے تجویز کر لیا تو اور حصہ داروں کی قربانی بھی صحیح نہ ہوگی۔ البتہ اگر غائب آدمی خط لکھ کر اپنی طرف سے کوئی وکیل بنا دے تو اس کی طرف سے قربانی کر سکتے ہیں۔

حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دنبہ کی اپنی طرف سے قربانی فرمائی اور دوسرے دنبہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ قربانی اس کی طرف سے ہے جو میری اُمت میں سے مجھ پر ایمان لایا اور جس نے میری تصدیق کی۔[1]

فائدہ:

حضور ﷺ کا مطلب اپنی اُمت کو ثواب میں شامل کرنا تھا یہ مطلب نہیں کہ یہ قربانی سب کی طرف

---

[1] موصلی وکبیر، واسط

سے اس طرح ہوگئی کہ اب کسی کے ذمہ قربانی واجب نہیں ہے۔

فائدہ:

غور کرنے کی بات ہے کہ جب حضور ﷺ نے قربانی میں اُمّت کو یاد رکھا تو افسوس ہے کہ اُمتی حضور ﷺ کو یاد نہ رکھیں اور ایک حصہ بھی آپ ﷺ کی طرف سے نہ کیا کریں۔

حنش رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ دو دنبے قربانی کئے اور فرمایا ان میں ایک میری طرف سے ہے اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے، ان سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے مجھ کو اس کا حکم دیا ہے۔ میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔[۱]

مسئلہ:

جس قربانی میں دوسرے کو ثواب پہنچانا مقصود ہوتا ہے، وہ کئی افراد کی نیت کر کے بھی جائز ہے۔

فائدہ:

فقہائے احناف کے نزدیک رسول اللہ ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک بکری یا مینڈھے کو ایک سے زیادہ افراد کی طرف سے ذبح کرنے کا یہ عمل ایصالِ ثواب کی غرض سے تھا، جس میں قربانی تو تنہا ذبح کرنے والے کی طرف سے ہی ہوتی ہے، اور دوسرے لوگوں کو اس کے صرف ثواب میں شریک کیا جاتا ہے۔

مُردوں کی طرف سے قربانی:

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ میّت کی طرف سے قربانی کریں یا نہیں اور اگر کریں تو کیسے؟ تو سنو! قربانی مُردوں کی طرف سے بھی جائز ہے، ماں باپ شیخ، اُستاد، حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے بھی کر سکتے ہیں (اور کرنا چاہئے)۔

کسی کی طرف سے واجب قربانی کرنے اور قربانی کا ثواب پہنچانے میں فرق:

شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو کہ آپ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ قربانی میں ساری اُمّت کو یاد فرماتے تھے۔ اس حدیث سے کوئی یہ نہ سمجھ جائے کہ آپ ﷺ نے ایک حصہ میں ساری اُمّت کو شریک کیا لہٰذا ہمارے لئے بھی جائز ہے کہ ایک حصہ میں کئی آدمی شریک ہو جایا کریں بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ

---

[۱] ابوداؤد، ترمذی

نے قربانی سب کی طرف سے نہیں کی تھی بلکہ اپنی طرف سے کر کے اس کا ثواب ساری اُمّت کو بخش دیا، جیسے نفل قربانی کر کے اس کا ثواب کئی آدمیوں کو بخش دیا جاتا ہے تو یہ جائز ہے، باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمّت کو ثواب بخشا تو (پوری) اُمّت اس وقت موجود کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگوں کا یہ خیال کہ ثواب مُردوں ہی کو پہنچتا ہے، غلط ہے بلکہ زندوں اور آئندہ آنے والوں سب کو پہنچتا ہے۔[۱]

میّت کی طرف سے کی ہوئی قربانی کے گوشت کا حکم:

میّت کی طرف سے قربانی دو طرح پر ہے ایک یہ کہ میّت اپنے ترکہ میں سے قربانی کی وصیت کر کے مرا اس قربانی کا تمام گوشت مسکینوں کو دینا واجب ہے، دوسرا یہ کہ کوئی شخص اپنے مال سے تبرعاً میّت کی طرف سے قربانی کرے (خواہ اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو تو) اس میں قربانی کرنے والے کو اختیار ہے جتنا چاہے کھائے، جتنا چاہے دے، خواہ سب خود کھالے۔[۲]

اپنے بڑوں اور بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرنا چاہئے:

بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ وسعت (مالداری اور خوشحالی) کے باوجود ایک ہی جانور کی قربانی کرتے ہیں اگر کسی کو وسعت (گنجائش) ہو تو اس کو چاہئے گو واجب نہیں مگر آخر حقوق بھی کوئی چیز ہیں اس بناء پر مناسب ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا:

اور ایک قربانی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کرے، آپ کو اُمّت کے ساتھ کیسی محبت تھی کہ آپ اپنی طرف سے تو قربانی کرتے ہی تھے ایک قربانی زیادہ کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ ان لوگوں کی طرف سے کہ جو میری اُمّت میں سے قربانی کی وسعت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں ہے کہ **عَنْ مُّحَمَّدٍ وَّ اُمَّتِہٖ** (آپ کے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کی اُمت کی طرف سے) اور ایک روایت میں ہے **ھٰذَا عَمَّنْ اٰمَنَ بِیْ وَصَدَّقَنِیْ**[۳] یہ ہر اس اُمتی کی طرف سے ہے جو میرے اوپر ایمان لایا اور میری تصدیق کی۔

---

[۱] تعظیم الشعائر، سنت ابراہیم

[۲] امداد الفتاویٰ

[۳] جمع الفوائد

دیکھئے حضور ﷺ کو ہمارے ساتھ کیسی محبت تھی حالانکہ ہم اس وقت موجود بھی نہ تھے مگر آپ کو ساری اُمّت سے غائبانہ محبت تھی۔

اس لئے سب سے زیادہ اس کے مستحق تو حضور ﷺ ہیں کیونکہ آپ کے احسانات بے شمار ہیں۔ پھر غضب ہے کہ حضور ﷺ کو بھول جائیں اور آپ کی طرف سے قربانی نہ کریں۔ خصوصاً جبکہ حضور ﷺ نے ہمیں کسی موقع پر فراموش نہیں فرمایا یہاں تک کہ قربانی میں بھی یاد فرمایا تو اگر سال بھر میں چند روپے آپ کی طرف سے قربانی کرنے میں صرف ہو گئے تو کون سی دشوار بات ہے۔[۱]

جانور کی وہ چیزیں جن کا استعمال ممنوع ہے:

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ مِنَ الشَّاةِ سَبْعًا اَلْمَرَارَةَ وَالْمَثَانَةَ وَالْمَحْيَاةَ وَالذَّكَرَ وَالْاُنْثَيَيْنِ وَالْغُدَّةَ وَالدَّمَ[۲]

رسول اللہ ﷺ بکرے کی سات چیزوں کو مکروہ قرار دیا کرتے تھے: پِتہ اور مثانہ، اور مادہ کی پیشاب گاہ اور نر کی پیشاب گاہ اور خصیتین (یعنی کپورے) اور غدود اور خون۔

ایک روایت میں امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَكْرَهُ مِنَ الشَّاةِ سَبْعًا اَلدَّمَ وَالْحَيَاءَ وَالْاُنْثَيَيْنِ وَالْغُدَّ وَالذَّكَرَ وَالْمَثَانَةَ وَالْمَرَارَةَ کہ حضور ﷺ بکری کے سات اعضاء کھانے کو ناپسند فرماتے تھے: ۱۔خون، ۲۔مادہ جانور کی پیشاب گاہ ۳۔دونوں خصیے ۴۔غدود ۵۔نر جانور کی پیشاب گاہ ۶۔مثانہ ۷۔پِتہ۔[۳]

مسئلہ: اُوجڑی کھانا جائز ہے۔

مسئلہ: بعض لوگ ذبح سے پہلے ہی کھال فروخت کر دیتے ہیں سو یاد رہے کہ ذبح سے پہلے کھال کا

---

[۱] تعظیم الشعائر ملحقہ سنت ابراہیم ص ۲۳۸

[۲] المعجم الاوسط للطبرانی، رقم الحدیث: ۹۴۸۰، ط: دار الحرمین، القاہرۃ

[۳] سنن الکبریٰ بیہقی، ج: ۱۰، ص: ۷، مصنف عبد الرزاق، ج: ۴، ص: ۴۰۹

فروخت کرڈالنا حرام ہے۔

غریب آدمی کا قربانی کرنا مستحب ہے:

غریب آدمی کو قربانی کرنے کا مناسب اور مستحب ہونا بھی قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ارشاد ہے یَأْتُوکَ رِجَالًا کہ آئیں گے تیرے پاس پیادے، اور جو پیادے (یعنی پیدل) آئے گا وہ ظاہر ہے کہ غریب ہی ہوگا۔

جن کے ذمہ قربانی واجب ہے ان کو تو ضروری کرنا چاہئے اور ان شاء اللہ کریں گے باقی جن کے ذمہ واجب نہیں لیکن اتنی وسعت ہے کہ ایک حصہ قربانی کا کرلیں تو اس زائد خرچہ کی وجہ سے کسی حقِ واجب میں فرق نہ آئے وہ بھی مناسب ہے کہ کریں، اس کی فضیلت ایسی ہے کہ اس کا چھوڑنا بہت بڑے نفع سے محروم رہنا ہے اور جس کو بالکل ہی وسعت نہ ہو وہ مجبور ہے۔[۱]

انتہائی نادار قربانی نہ کرے:

بعض لوگ محض نادار ہیں یا ذخیرہ سے زیادہ ان کے ذمہ حقوق العباد ہیں جن کی ادائیگی فرضِ مقدم ہے (یعنی پہلے اس کو ادا کرنا ضروری ہے) مگر یہ لوگ ان سب حقوق کو نظر انداز اور پسِ پشت ڈال کر محض فخر اور قدیم وضع بنانے کے لئے (یعنی چونکہ ہمیشہ سے ہمارے یہاں قربانی ہوتی چلی آئی ہے) اس لئے قربانی کی پابندی کرتے ہیں اور پاس ہوتا نہیں تو ادھار کرتے ہیں۔

بعض لوگوں کو دیکھا کہ مُردوں تک کے کئی کئی حصے کرتے ہیں اور زندوں کے واجب حقوق مردہ کرتے ہیں حالانکہ یقینی بات ہے کہ ان پیسوں کو قرض میں ادا کرنا اس سے بہتر ہے کہ ان کے حصے خریدے جائیں ایسی صورت میں حقوق ضائع کرنے کا الزام (اور گناہ) الگ اور فسادِ نیت یعنی تفاخر اور ریا کا الگ۔

نفلی قربانی کب افضل ہے؟

البتہ کسی کا کوئی حق ضائع نہ ہو اور تفاخر (اور ریا دکھلاوا) بھی نہ ہو تو نفل قربانی کے مستحب اور محبت کی دلیل ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اسی طرح عام مردوں کی طرف سے مندوب ہے (یعنی مستحب امور میں سب سے افضل اور پسندیدہ ہے) اور ان حضرات کے حقوق کا مقتضی بھی ہے لیکن منفعت جب ہی مطلوب ہے

---

[۱] الضحایا ص ۱۶۶

جب اس میں کوئی مضرت (نقصان) نہ ہو (نفل قربانی منفعت ہے اور حقوق ادا نہ کرنا مضرت ہے)۔[۱]

قربانی کی کھال کے مسائل

قربانی کی کھالوں کو اس کے صحیح شرعی مصرف میں لگانا قربانی کرنے والے کا شرعی فریضہ ہے۔ اس بارے میں آج کل بہت کوتاہی پائی جارہی ہے۔ قربانی کا جانور دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کر کے خریدنے اور اس کو اپنی بساط کے مطابق انجام دینے کا کچھ نہ کچھ اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اس سے غفلت اختیار کی جاتی ہے کہ اس فریضہ کی تکمیل کرتے ہوئے کھال کو صحیح صحیح اُتروایا جائے اور اس کو بہتر مصرف تک پہنچایا جائے بلکہ کھال اُترنے کے بعد اسے کسی نہ کسی طرح بوجھ (وزن) سمجھ کر اپنے یہاں سے اُٹھوانے کی فکر رہتی ہے۔ خواہ اُٹھانے اور لے جانے والا کوئی بھی ہو حالانکہ جس طرح قربانی کرنا ایک مسلمان کی ذمہ داری اور ضرورت ہے اسی طرح کھال ایسی جگہ لگانا جو دنیا وآخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ہو یہ بھی اہم ضرورت اور ذمہ داری ہے اور قیامت کے دن جس طرح قربانی واجب ہوتے ہوئے قربانی نہ کرنے کا سوال ہوگا یہ بھی پوچھا جائے گا کہ کھال کو اس کے صحیح مصرف میں خرچ کیا اور لگایا یا نہیں؟

قربانی کی کھال یا تو یونہی خیرات کردے اور یا بیچ کر اس کی قیمت خیرات کردے۔ وہ قیمت ایسے لوگوں کو دے جن کو زکوٰۃ کا پیسہ دینا درست ہے اور قیمت میں جو پیسے ملے ہیں بعینہ وہی پیسے خیرات کرنا چاہئیں۔ اگر وہ پیسے کسی کام میں خرچ کر ڈالے اور اتنے ہی پیسے اور اپنے پاس سے دیئے تو اچھا نہیں مگر ادائیگی ہوگئی۔

اس کھال کی قیمت مسجد یا مدرسہ کی تعمیر میں یا مدرس، مؤذن اور امام کی تنخواہ میں دینا درست نہیں ہے۔ اگر ایسی غلطی کر لی ہے تو اس قدر رقم مسکینوں کو دے اور توبہ بھی کرے۔ آج کل قربانی کے دنوں میں بہت سی انجمنیں اور ویلفیئر ایسوسی ایشنز اور امدادی کمیٹیاں نکل آتی ہیں اور کھالیں اکٹھی کر لیتی ہیں۔ ان میں وہ بے دین بھی ہوتے ہیں جو اسلام اور قربانی کا مذاق بھی اُڑاتے ہیں مگر کھال کھینچنے کو تیار رہتے ہیں اور وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو شریعت کے قوانین سے واقف نہیں ہوتے۔ یہ لوگ شریعت کے احکام کی رعایت کے بغیر آزادرائے سے خرچ کرتے ہیں ان کو کھالیں دے کر ضائع نہ کریں، ان کو کھالیں دے کر آپ شرعی

---

[۱] اصلاح انقلاب ص ۱۶۷ ج ۱

ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوں گے۔

قربانی کی کھال، اون، آنتیں، گوشت، چربی یعنی جانور کا کوئی حصہ کسی خدمت اور مزدوری کے معاوضہ میں دینا جائز نہیں۔ بعض علاقوں میں کھال قصائی کو مزدوری کے طور پر دے دی جاتی ہے۔ قربانی کی کوئی چیز قصائی کو اُجرت میں دینا جائز نہیں۔ اس کی اُجرت الگ دینا چاہیے۔ امام اور مؤذن کو بھی حقِ خدمت کے طور پر دینا جائز نہیں۔

قربانی اور اقتصادی مسئلہ:

بعض لوگ روحانیت سے غافل ہو کر یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ قوم کا اتنا روپیہ جو تین دِن میں جانوروں کے ذبح پر ہر سال فضول اور بے جا خرچ ہوتا ہے اور اس کا کوئی مفاد نظر نہیں آتا، اگر یہی پیسہ رفاہی اور قومی مفادات پر لگایا جائے، غریب، نادار، ضرورت منداور فسادزدگان میں تقسیم کیا جائے تو بہت فائدہ ہو؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ قربانی کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور اہم عبادت ہے، جیسے حج کرنا، زکوٰۃ دینا اور اسی طرح کی دوسری مالی عبادات ہیں تو کیا ان عبادات کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ فضول خرچی اور مال کو بے جا خرچ کرنا ہے؟ اس طرح تو دین کا بہت بڑا حصہ اور بہت سے دینی احکام ہی کا اسلام سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، یہ کون سا دِین ہے؟

پس جب شریعت میں قربانی کا حکم ہے تو اسے عقلی اعتراضوں اور ذہنی ڈھکوسلوں کا شکار بنانا کسی طرح جائز نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں ہونے والی دوسری اور اصلی فضول خرچیاں (جن کا شریعت نے حکم بھی نہیں دیا) ان لوگوں کو نظر نہیں آتیں جبکہ اصل تو ان کے ختم کرنے اور مٹانے کی ضرورت ہے۔ ملک کی کتنی بڑی تعداد ایسی ہے جو سگریٹ نوشی، منشیات، کرکٹ، ہاکی اور دوسرے کھیل، جوئے بازی، گھوڑ دوڑ، ناچ گانا، فحش انٹرنیٹ پروگرام، ٹی وی، کیبل، وی سی آر، سینما، فضول تصویر سازی، اور مووی بازی اور دوسرے فحش میڈیائی پروگرام، فحش رسائل ومیگزین اور دیگر ناول اور ڈائجسٹ، بسنت، عید کارڈ، شادی کارڈ، گانوں اور دیگر غلط پروگراموں کی آڈیو، ویڈیو کیسٹس اور سی ڈیز، ویڈیو گیمز، آتش بازی، شادی بیاہ، مرگ وموت اور غمی وخوشی کی رسومات، مختلف فیشن، غیر شرعی بیوٹی پارلرز وغیرہ کی زد میں ہے جن کو چھوڑے اور توبہ کئے بغیر دنیا اور آخرت کی فلاح اور کامیابی ملنا مشکل ہے اور یہی پیسہ اگر قومی اور رفاہی مفادات پر خرچ کیا جائے تو بہت جلد ترقی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مال خرچ کرنے کے

بارے میں سنئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ[۱] جو چیز تم (حکم الٰہی کے مواقع میں) خرچ کرتے ہو اللہ تعالیٰ (اپنے خزانہ غیب سے تمہیں) اس کا بدلہ دے دیتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اشیاء صرف انسان اور حیوانات کے لئے پیدا فرمائی ہیں جب تک وہ خرچ ہوتی رہتی ہیں ان کا بدل منجانب اللہ پیدا ہوتا رہتا ہے۔ کائناتِ عالَم کی تمام چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ جس چیز کا خرچ زیادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی پیداوار بھی بڑھا دیتے ہیں اور جب ضرورت کم ہوجاتی ہے تو پیداوار بھی گھٹ جاتی ہے۔

جانوروں میں بکرے اور گائے کا سب سے زیادہ خرچ ہے کہ ان کو ذبح کر کے گوشت کھایا جاتا ہے اور شرعی قربانیوں اور کفارات وجنایات میں عموماً اور حج وعمرہ کے موقع پر بکثرت ان کو ذبح کیا جاتا ہے، وہ جتنے زیادہ کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی ہی زیادہ ان کی پیداوار اور بڑھا دیتے ہیں جس کا ہر جگہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ بکروں کی تعداد ہر وقت چھری کے نیچے رہنے کے باوجود دنیا میں زیادہ ہے۔ کتے، بلی کی تعداد اتنی نہیں حالانکہ کتے، بلی کی نسل بظاہر زیادہ ہونی چاہیے کہ وہ ایک ہی پیٹ سے چار پانچ بچے تک پیدا کرتے ہیں۔ گائے، بکری زیادہ سے زیادہ دو بچے دیتی ہے، گائے، بکری ہر وقت ذبح ہوتی رہتی ہے، کتے بلی کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا، مگر پھر یہ مشاہدہ ناقابلِ انکار ہے کہ دنیا میں گائے اور بکروں کی تعداد بنسبت کتے بلی کے بہت زیادہ ہے۔ آج اگر وہ تمام لوگ جن پر قربانی واجب ہے، قربانی کا فریضہ انجام دینا شروع کردیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس نسبت سے ان کی پیداوار بڑھا کر قیمت سستی فرمادیں۔

قربانی اور من گھڑت خیالات (اغلاط العوام):

۱۔ بعض لوگ اپنی واجب قربانی چھوڑ کر اپنے زندہ یا مرحوم والدین یا دوسرے رشتہ داروں کی طرف سے نفلی قربانی کرتے رہتے ہیں جبکہ اپنی واجب قربانی چھوڑ کر دوسرے کو نفلی قربانی کا ثواب پہنچانا جائز نہیں۔ البتہ اپنی واجب قربانی کے علاوہ مستقل طور پر دوسرے کو ثواب پہنچانے کی نیت سے قربانی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

---

[۱] سبا:۳۹

۲۔ بعض خواتین سمجھتی ہیں کہ سونا چاندی اگر استعمال ہو تو اس پر قربانی یا زکوۃ لازم نہیں خواہ کتنا زیادہ ہو اور اگر استعمال نہ ہو تو لازم ہے یہ سراسر غلط فہمی ہے۔

۳۔ بعض خواتین پر قربانی واجب ہوتی ہے اس کے باوجود یہ سمجھتی ہیں کہ ہماری قربانی ہمارے شوہروں کے ذمہ لازم ہے اور اگر ان کے شوہر ادا نہ کریں تو وہ خود بھی ادا نہیں کرتیں جب کہ عورت کے مال اور زیورات وغیرہ کی قربانی ان کے شوہروں پر لازم نہیں بلکہ ان پر خود اپنے مال سے لازم ہے۔ خواہ اس کے لئے زیور وغیرہ کیوں نہ بیچنا پڑے۔ البتہ اگر کسی عورت کا شوہر اپنی رقم سے اس کی طرف سے قربانی کردے تو جائز ہے۔

۴۔ بعض جگہ گھر کا سربراہ ایک قربانی کرلے تو اُسی کو سب افرادِ خانہ کی طرف سے کافی سمجھا جاتا ہے حالانکہ سربراہ کے علاوہ گھر کا کوئی اور فرد یا افراد نصاب کے مالک ہوں تو ان پر الگ سے اپنی قربانی واجب ہے۔ اس صورت میں گھر کے سب افراد کی طرف سے ایک بکرے کو یا گھر کے سربراہ کی طرف سے ایک قربانی کو کافی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے سربراہ کی نماز کو سب گھر والوں کی طرف سے کافی سمجھا جائے۔ اللہ پاک ہمیں سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

(وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ)

مکتبہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ
چوک سیدنا عمر فاروق
شاہ رکن عالم کالونی ملتان
Tel: 061-6775251, 0301-7574977, www.ubkmultan.com

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان

دینی و علمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل

حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان

درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین

ٹیلیگرام چینل